خواتین ڈائجسٹ

بانی و مدیرِ اعلیٰ ——— محمود ریاض

مدیرہ ——— نادرہ خاتون

مدیر ——— آذر ریاض

نائب مدیرہ ——— رضیہ جمیل

مدیرِ خصوصی ——— امت الصبور
بلقیس بھٹی

نفسیات ——— عدنان

اشتہارات ——— خالدہ جیلانی

خط و کتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی

ممبر آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
ممبر کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز
MEMBER
APNS
CPNE

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)	700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ -----	5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ----	6000 روپے

اپریل 2015

جلد 42 شمارہ 12

قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

مدیر

خواتین ڈائجسٹ کا اپریل کا شمارہ سالگرہ نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
43 واں سالگرہ نمبر۔
اللہ تعالیٰ کا کرم اور مہربانی ہے کہ خواتین ڈائجسٹ نے اپنی عمر کا ایک اور سال کامیابی سے طے کر لیا ہے۔
آج سے 43 سال پہلے محمود ریاض صاحب نے خواتین ڈائجسٹ کا اجرا کیا تو اپنی نوعیت کے لحاظ سے خواتین کے لیے واحد پرچا تھا۔ پہلے پرچے نے ہی قارئین کو چونکا دیا۔ اور پھر تیزی سے اس پرچے نے اردو دنیا میں ایک منفرد شناخت اور نام بنا لیا۔ اس کے بعد ادارہ خواتین ڈائجسٹ سے کرن اور شعاع کا اجرا کیا گیا۔ جو کامیابی اور مقبولیت کے لحاظ سے اسی تسلسل کا حصہ ہے۔
ہم نے اپنے ادارے سے شائع ہونے والے پرچوں میں ہمیشہ اس بات کا خیال رکھا کہ ان میں جو تحریریں شائع ہوں، وہ ہمارے ماحول، معاشرے، روایات، تہذیب سے مطابقت رکھتی ہوں۔ زندگی کی مثبت قدروں کو اجاگر کریں اور بدلتے وقت کے ساتھ ہم آہنگ ہوں۔
اور ہماری خوش نصیبی ہے کہ مصنفین نے ہماری اس کوشش میں ہمارا بھرپور ساتھ دیا۔ ان کی سوچ اور فکر کا مثبت عکس ان کی تحریروں میں نمایاں رہا۔
ہم اپنی مصنفین کے تہہ دل سے ممنون ہیں۔ خواتین ڈائجسٹ کی کامیابی درحقیقت ان کی کامیابی ہے۔
ہماری قارئین جو روز اول سے ہمارے ساتھ رہیں۔ ان کی محبتیں ہیں کہ آج خواتین ڈائجسٹ ایک مقبول اور باوقار پرچا ہے۔ ہم اپنی قارئین کے خلوص اور محبتوں کی دل سے قدر کرتے ہیں۔
ہماری دعا ہے کہ خواتین ڈائجسٹ اسی طرح ترقی کی منازل طے کرتا رہے اور آپ ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں۔ آمین۔

مصنفین سے سروے،

سالگرہ نمبر میں مصنفین سے سروے بھی شامل ہے۔ ماشاء اللہ ہماری مصنفین کا ایک وسیع حلقہ ہے اور شاید ہماری مصنفین کی رواں طبیعت کے لیے ہی کہا گیا ہے کہ ایک مضمون کو سو رنگ سے باندھوں، سوالات کے بہت دلچسپ جوابات موصول ہوئے۔ اس لیے ہم نے طے کیا ہے کہ اسے ایک مستقل سلسلہ بنا دیا جائے۔ اس طرح ہر ماہ دو مصنفین کے جوابات شامل ہوں گے۔
ہماری بہت سی مصنفین کو سوال نامہ موصول نہیں ہوا۔ انہیں ہم دوبارہ بھجوا رہے ہیں۔

اس شمارے میں،

- نمرہ احمد کا مکمل ناول ۔ نمل،
- تنزیلہ ریاض کا مکمل ناول ۔ عہدِ الست،
- نفیسہ ناز کا مکمل ناول ۔ آئینہ،
- عمیرہ احمد اور عفت سحر طاہر کے ناول،
- فاخرہ جبیں کا ناولٹ ۔ پُرخار راستوں پہ بہار،
- عنبرین اعجاز، سعدیہ ملک، تمثیلہ ناہید، کنیز نور علی اور ایمل رضا کے افسانے،
- مذاق رات کے ڈی جے ۔ محسن عباس سے ملاقات،
- ایمن خان سے باتیں،
- کرن کرن روشنی ۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- ہمارے نام، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

سالگرہ نمبر آپ کو کیسا لگا؟ اپنی رائے سے ضرور نوازیے گا۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے' اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری' صحیح مسلم' سنن ابوداؤد' سنن نسائی' جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے' وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں' وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

جاہلوں سے درگزر

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ عیینہ بن حصن آئے اور اپنے بھتیجے حربن قیس کے پاس ٹھہرے۔ یہ حر ان لوگوں میں سے تھے جن کو عمر رضی اللہ عنہ کا (جو کہ وہ خلیفہ تھے) قرب خاص حاصل تھا۔ اور حضرت عمر کے ہم نشیں اور مشیر قراء (اہل علم) ہوتے تھے' چاہے وہ ادھیڑ عمر کے ہوں یا جوان۔ چنانچہ عیینہ نے اپنے برادر زاد (بھتیجے) سے کہا۔

"اے بھتیجے! تمہیں اس خلیفہ کے ہاں خاص مرتبہ حاصل ہے' تم میرے لیے بھی اس سے ملاقات کی اجازت طلب کرو۔"

چنانچہ انہوں نے اجازت طلب کی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں اجازت مرحمت فرمادی۔ جب عیینہ اندر آئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہنے لگے۔

"اے ابن خطاب! اللہ کی قسم! تو ہمیں زیادہ عطیہ دیتا ہے اور نہ ہمارے بارے میں عدل کے ساتھ فیصلے کرتا ہے۔"

(یہ سن کر) عمر غضب ناک ہو گئے حتیٰ کہ انہوں نے اسے مارنے کا ارادہ کیا۔

حربن قیس نے ان سے کہا: "امیر المومنین! اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر سے کہا ہے۔

"عفو و درگزر اختیار کریں' نیکی کا حکم دیں اور جاہلوں سے اعراض کریں۔ (الاعراف 199)" اور یہ (میرا چچا بھی) جاہلوں میں سے ہے۔ اللہ کی قسم!"

جس وقت حر نے اس آیت کی تلاوت کی' حضرت عمر رضی اللہ عنہ (اسے سن کر) ذرا آگے نہ بڑھے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اللہ کی کتاب کے پاس فوراً" ٹھہر جانے (یعنی اس کے حکم پر عمل پیرا ہونے) والے تھے۔ (بخاری)

فوائد و مسائل : 1 حدیث میں قراء سے مراد آج کل کے قراء نہیں ہیں جو صرف فن تجوید کے ماہر اور خوش الحانی سے قرآن پڑھنے والے ہیں' بلکہ اس

سے مراد قرآن کے عالم' اس کے معانی و مفاہیم سے آگاہ اور حلال و حرام اور جائز و ناجائز کو سمجھنے والے فقہا ہیں۔ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے دربار میں ہم نشیں اور ان کے مشیران خاص یہی لوگ ہوا کرتے تھے۔ جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حکمرانوں کو اپنا مشیر دین کا علم اور اس کا شعور رکھنے والوں کو بنانا چاہیے' نہ کہ دنیاداروں کو' جن کا مقصد صرف دنیا کمانا اور اس کو جمع کرنا ہوتا ہے' کیونکہ اہل دنیا کے مشورے اخلاص اور خیر خواہی کے بجائے مخصوص مفادات اور خود غرضی پر مبنی ہوتے ہیں۔

2 اصحاب مجلس اور اہل مشاورت ہونے کے لیے علم و تقویٰ ضروری ہے' اس میں سن و سال کی کوئی قید نہیں۔

3 حاکم کو نہایت متحمل اور بردبار ہونا چاہیے۔

4 اسی طرح قبول حق میں بھی اسے کسی تامل کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔

5 آدمی میں اگر حق گوئی کی ہمت ہو اور وہ ہاں میں ہاں ملانے والا نہ ہو تو اصحاب اقتدار کی قربت میں کوئی مضائقہ نہیں۔

6 تعزیر (وہ سزا جو خلیفہ اپنی صوابدید پر کسی مجرم کو ایسے جرم میں دے جس میں حد نہ ہو) میں سفارش کی گنجائش موجود ہے' البتہ حدود میں ایسا کرنا ناجائز ہے۔

7 کمینے اور رذیل آدمی کی سفارش سے اجتناب کرنا چاہیے تاکہ اس کے کردار کی وجہ سے شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔

8 کسی بھی آدمی سے بات کرتے وقت اس کی قدر و منزلت کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

صبر

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"میرے بعد (ناروا) ترجیح دینے کا عمل ہوگا اور ایسے کام ہوں گے جنہیں تم برا سمجھو گے۔"

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سوال کیا: "اے اللہ کے رسول! (ان حالات میں) آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ (یعنی ہم کیا کریں؟)"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم وہ حق ادا کرو جو تمہارے ذمے ہوں اور جو تمہارے حق (دوسروں کے ذمے) ہوں ان کا سوال اللہ سے کرو۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل: 1 اس حدیث کا مطلب ہے کہ جب حکمران ایسے ہوں جو تمہارے حقوق ادا نہ کریں اور تم پر اپنے آپ کو اور اپنے اقربا وغیرہ کو ترجیح دیں تو تم صبر سے کام لو اور ان سے بغاوت کرنے کے بجائے بارگاہ الٰہی میں توبہ و استغفار اور ان کے شر اور مظالم سے بچنے کی دعا کرو' بشرطیکہ ان سے کفر صریح کا اظہار نہ ہو۔

2 حکمرانوں کے علاوہ عام معاشرتی زندگی میں بھی اگر کوئی شخص حق پر ہونے کے باوجود اپنا حق اللہ کی خاطر چھوڑ دیتا ہے تو اس کے لیے جنت کی بشارت ہے۔

3 برائی کو روکنے سے اگر شر پھیلتا ہو اور کسی بڑے فتنے کا خطرہ ہو تو صبر سے کام لیتے ہوئے برداشت کرنا چاہیے۔

4 معمولی اختلاف اور پروٹوکول نہ ملنے پر جماعت سے علیحدگی اختیار کرنا ناجائز ہے۔ انسان اگر سمجھتا ہے کہ اس کی خدمات کا صلہ نہیں دیا جارہا تو اسے صبر کرنا چاہیے۔

جہاد

ابو ابراہیم حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعض ان ایام میں جن میں آپ کا مقابلہ دشمن سے ہوا' انتظار فرمایا' (یعنی لڑائی کو موخر فرمایا) یہاں تک کہ جب سورج ڈھل گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں میں کھڑے ہوئے اور فرمایا۔

"لوگو! دشمن سے ملاقات (لڑائی) کی آرزو مت کرو' اور اللہ تعالیٰ سے عافیت (سلامتی) مانگو۔ لیکن جب

ایسا موقع آجائے کہ تمہاری دشمن سے مڈبھیڑ ہو جائے، تو ثابت قدمی سے لڑو! اور یہ بات جان لو کہ جنت تلواروں کے سائے تلے ہے۔"

پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی۔

"اے کتاب (قرآن مجید) کے اتارنے والے' بادلوں کو چلانے والے (دشمن کے) لشکروں کو شکست دینے والے! ان کو شکست فاش سے دوچار فرما اور ان کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل : 1 جہاد کے لیے بھرپور تیاری اور ہمہ وقت مستعد رہنے کی اگرچہ بڑی تاکید کی گئی ہے' تاہم اس کے باوجود دشمن سے مقابلے کی آرزو کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

2 صبر مومن کا بہت بڑا ہتھیار ہے' میدان جہاد میں صبر کا مطلب استقلال' پامردی اور موت سے بے خوف ہو کر لڑنا ہے۔

3 سارا اعتماد ہتھیاروں' مادی ساز و سامان اور اپنی قوت و کثرت پر نہ ہو بلکہ ان کے ساتھ ساتھ اللہ سے فتح و نصرت کی دعا بھی کی جائے۔

4 آپ صلی اللہ علیہ وسلم صبح صبح لڑائی کا آغاز فرماتے ورنہ سورج ڈھلنے کا انتظار فرماتے کہ مسلمانوں کی دعائیں ان کے شامل حال ہو سکیں جو وہ نماز ظہر کے وقت مجاہدین کے لیے کرتے ہیں۔

5 جہاد ہی میں مسلمانوں کی عزت اور معیشت کا استحکام پنہاں ہے۔ آج مسلمانوں کی ذلت و خواری کی بنیادی وجہ فریضہ جہاد سے روگردانی کے علاوہ کوئی نہیں ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔

"جب تم جہاد کو چھوڑ دو گے تب اللہ تم پر ذلت و خواری مسلط کر دے گا۔"

سچائی کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو! اور سچوں کے ساتھی بنو۔"

(التوبہ 119) اور فرمایا۔

"سچ بولنے والے مرد اور سچ بولنے والی عورتیں ... (اللہ نے ان کے لیے بخشش اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے)۔" (الاحزاب 35)

مزید فرمایا:

"اگر وہ اللہ سے سچ بولتے تو یہ ان کے حق میں بہتر ہوتا۔" (محمد-21)

فائدہ آیات : سچ کے معنی ہیں: خبر کا واقعے کے مطابق ہونا اور جھوٹ کا مطلب اس کے برعکس یعنی خبر کا واقعے کے مطابق نہ ہونا ہے۔ بعض کہتے ہیں سچ کا مطلب ہے' ظاہر و باطن اور جلوت و خلوت میں یکساں ہونا اور بعض کے نزدیک عمل کے احکام شرع کے تقاضوں کے مطابق ہونا' سچ ہے۔ سچ کے یہ سارے مفہوم ہی اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں اور ان سب پر سچ کا اطلاق صحیح ہے۔

سچ بولنا

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"یقیناً "سچائی' نیکی کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے اور آدمی سچ بولتا رہتا ہے' یہاں تک کہ اسے اللہ کے ہاں بہت سچا لکھ دیا جاتا ہے اور جھوٹ نافرمانی کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور نافرمانی جہنم کی طرف لے جاتی ہے۔ اور آدمی یقیناً" جھوٹ بولتا رہتا ہے' یہاں تک کہ اللہ کے ہاں اسے بہت جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل : 1 صدیق اور کذاب دونوں مبالغے کے صیغے ہیں۔ مطلب ہے کہ سچائی جس کی طبیعت ثانیہ بن جائے اور جھوٹ جس کی پختہ عادت بن جائے۔ جس طرح انسان دنیا میں اپنے اچھے یا برے اعمال کے ساتھ مشہور ہوتا ہے' اسی طرح اللہ کے ہاں بھی ہے۔

2 اللہ کے ہاں صدیق لکھے جانے کا مطلب سچائی کے اجر و ثواب کا' اور کذاب لکھے جانے کا مطلب جھوٹ کی سزا کا مستحق قرار پانا ہے۔

3 حدیث میں سچائی کی ترغیب ہے کیونکہ یہ خیر کا سبب ہے اور جھوٹ سے اجتناب کی تاکید ہے کیونکہ یہ منبع شر ہے اور منافقت کی علامت ہے۔

4 جھوٹ سے بسا اوقات وقتی طور پر فائدہ ہوتا ہے۔ اور انسان کسی نقصان سے بھی بچ سکتا ہے لیکن اس کا انجام نہایت بھیانک ہے۔ سچائی سے وقتی طور پر مشکلات آسکتی ہیں، لیکن انجام کار سرخروئی ہوتی ہے۔

5 سچائی کی برکت سے انسان کسی ناگہانی مصیبت سے بھی محفوظ رہتا ہے جیسا کہ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلی وحی کے موقع پر تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔ "اللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی ضائع نہیں کرے گا کیونکہ۔۔۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سچ بولتے ہیں۔" (صحیح مسلم، الایمان، حدیث 160)

اطمینان کا باعث

حضرت ابو محمد حسن بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سنے ہوئے یہ الفاظ یاد ہیں۔

"وہ چیز چھوڑ دے جو تجھے شک میں ڈالے اور اس کو اختیار کر جس کے متعلق تجھے شک و شبہ نہ ہو، اس لیے کہ سچ اطمینان (کا باعث) ہے اور جھوٹ شک اور بے چینی ہے۔"

(اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث صحیح ہے۔)

فوائد و مسائل : 1 اس سے معلوم ہوا کہ شبہات سے بچنا ضروری ہے تاکہ حرام کا ارتکاب نہ ہو، جیسا کہ دوسری حدیث میں ہے کہ جو شخص شبہات سے بچ گیا اس نے اپنے دین اور اپنی آبرو کو بچا لیا۔

2 شبہات کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ انسان خوامخواہ ہی تشکیک کا شکار رہے اور اللہ کی حلال کردہ چیزوں کو حرام کرتا رہے جیسا کہ بعض لوگ کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس چیز کے حلال اور حرام دونوں طرف دلائل ہوں اُسے ترک کردے مبادا کہ حرام میں واقع ہو جائے۔

شہادت کی تمنا

حضرت ابو ثابت، بعض کہتے ہیں: ابو سعید اور بعض کے نزدیک ابو الولید، سہل بن حنیف، جو بدری صحابی ہیں، سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص سچے دل سے اللہ سے شہادت مانگے (لیکن اسے کافروں سے لڑنے کا موقع نصیب نہ ہو) تو اللہ تعالیٰ اسے شہداء کے مرتبوں تک پہنچا دے گا۔ اگرچہ اسے اپنے بستر پر موت آئے۔" (مسلم)

فوائد و مسائل : 1 سچائی دو طرح کی ہوتی ہے، زبان سے سچ بولنا، دل کی سچائی۔ زبان سے سچ بولنے والے کا ذکر تو پہلے گزر چکا کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان فرما دیتا ہے اور اللہ کے ہاں اس کا شمار صدیقین میں ہونے لگتا ہے۔ اس حدیث میں جذبہ صادق کا ذکر ہے کہ اگر کوئی شخص سچے دل کے ساتھ کوئی کام اور نیکی کرنے کا عزم رکھتا ہے اور کسی وجہ سے حاصل نہیں کر پاتا تو سچائی کی اس برکت سے اللہ تعالیٰ اسے وہ مقام عطا کر دیتا ہے۔

2 اس میں خالص نیت کی فضیلت کا بیان ہے کہ دل میں نیت کر لینے ہی سے اللہ لوگوں کو شہداء کے مرتبوں پر فائز کر دیتا ہے اور اسی نیت کی خرابی سے میدان جہاد میں مرنے والوں کو جہنم میں ڈالے گا۔

جہاد

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"انبیاء میں سے ایک نبی نے جہاد (کے لیے نکلنے کا ارادہ) کیا تو انہوں نے اپنی قوم سے کہا: میرے ساتھ وہ شخص نہ نکلے جس نے کسی عورت سے (نیا نیا) نکاح کیا ہے اور وہ قربت کا۔۔۔ ارادہ رکھتا ہے لیکن ابھی اس نے یہ کام نہیں کیا، نہ وہ شخص نکلے جس نے گھر بنایا ہو

لیکن اس نے ابھی اس کی چھت نہیں ڈالی اور نہ وہ شخص جس نے (حاملہ) بکریاں یا اونٹنیاں خریدی ہیں، اور وہ ان کے بچے جننے کے انتظار میں ہو۔

چنانچہ ان پیغمبر نے (اس کے بعد) جہاد کے لیے اپنا سفر شروع کر دیا' وہ اس (جہاد والی) بستی میں عصر کی نماز کے وقت یا عصر کے قریب پہنچے انہوں نے سورج سے (خطاب کرتے ہوئے) کہا: "تو بھی اللہ کی طرف سے مامور (مقرر کردہ) ہے اور میں بھی اللہ کی طرف سے مامور ہوں۔ اے اللہ! اس سورج کو ہم پر روک لے۔ (یعنی لڑائی اور اس کا نتیجہ برآمد ہونے تک اسے غروب نہ فرما۔)"

چنانچہ سورج کو روک لیا گیا' یہاں تک کہ اللہ نے اس بستی کو ان کے ہاتھوں فتح کرا دیا۔ تو انہوں نے غنیمتیں جمع کیں اور (آسمان سے) اسے کھانے کے لیے آگ آئی لیکن اس نے اسے نہ کھایا۔

(یہ دیکھ کر) ان پیغمبر نے کہا۔

"بے شک تمہارے اندر خیانت کا عمل ہے' تم میں سے ہر قبیلے کا ایک آدمی مجھ سے آکر بیعت کرے۔"

چنانچہ اس طرح بیعت کرتے ہوئے ایک آدمی کا ہاتھ پیغمبر کے ہاتھ کے ساتھ چمٹ گیا۔ پیغمبر نے کہا۔

"بس تمہارے قبیلے کے اندر ہی خیانت کا عمل ہے' لہٰذا تیرا (پورا) قبیلہ میرے ہاتھ پر بیعت کرے۔"

تو ان میں سے دو یا تین آدمیوں کے ہاتھ پیغمبر کے ہاتھ کے ساتھ چمٹ گئے۔

پیغمبر نے کہا: "تمہارے اندر خیانت ہے۔"

چنانچہ وہ ایک سونے کا سر گائے کے سر کی مثل لے کر آئے اور اسے (کھلے میدان میں) رکھ دیا اور آگ نے آکر اسے کھا لیا۔ (یہ علامت تھی کہ جہاد کا یہ عمل مقبول ہے۔)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہم سے پہلے یہ غنیمتیں کسی کے لیے حلال نہیں تھیں۔ جب اللہ نے ہماری عاجزی اور کمزوری کو دیکھا تو اسے ہمارے لیے حلال فرما دیا۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل: 1 امام سیوطی کے نزدیک یہ پیغمبر حضرت یوشع بن نون علیہ السلام تھے۔ ان کے طرز عمل سے معلوم ہوا کہ مجاہدین کے دنیاوی معاملات کا معقول انتظام ضروری ہے تاکہ وہ پوری دل جمعی اور یکسوئی کے ساتھ مصروف جہاد رہیں۔

2 مال غنیمت کی حلت' امت محمدیہ کی خصوصیت ہے' ورنہ اس سے قبل اسے آگ کھا جاتی تھی۔

3 اس میں پیغمبر کے معجزے کا اثبات ہے کہ ان کے لیے سورج کی رفتار کو روک دیا گیا تاآنکہ انہوں نے فتح حاصل کر لی۔

4 خیانت اور بددیانتی بھی جھوٹ کی قسم ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے جہاد جیسا عظیم عمل بھی قبول نہیں ہوتا۔

5 جب متعین افراد ہوں اور وہاں کوئی چیز چوری ہو جائے تو چور تلاش کرنے کی خاطر سب کی تلاشی لینی جائز ہے۔

6 صحیح احادیث سے سورج کا رکنا صرف یوشع بن نون علیہ السلام کے لیے ثابت ہے۔ کسی اور کے بارے میں نہیں۔

برکت

حضرت ابو خالد حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"دونوں سودا کرنے والوں کو اس وقت تک اختیار ہے جب تک وہ جدا نہ ہوں۔ چنانچہ اگر وہ دونوں سچ بولیں اور چیز کی حقیقت صحیح صحیح بیان کر دیں (یعنی کوئی عیب وغیرہ ہو تو بتلا دیں) تو ان کے اس سودے میں برکت ڈال دی جاتی ہے اور اگر وہ چھپائیں اور جھوٹ بولیں تو ان کے سودے سے برکت مٹا دی جاتی ہے۔"

(بخاری و مسلم)

ایک دن ڈاکٹر کے ہاں

انشاء جی

پرانے زمانے میں آج سے تیس چالیس برس پہلے اگر کوئی آدمی بیمار ہوتا تھا تو ڈاکٹر کے پاس جاتا تھا۔ ڈاکٹر اسے دیکھتا تھا۔ اس کا معائنہ کرتا تھا۔ اسے بتاتا تھا کہ تمہیں کیا بیماری ہے۔ اسے دوا دیتا تھا اور ہدایت کرتا تھا کہ جا کر بستر میں لیٹ جاؤ' آرام کرو۔ مریض بستر میں جا کر لیٹتا تھا۔ آرام کرتا' دوا پیتا تھا' یا تو صحت یاب ہو جاتا تھا یا پھر صحت یاب نہیں ہوتا تھا۔

لیکن یہ سب پرانی باتیں ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ سائنس اور طب کی ترقی کے ساتھ یہ صورت حال نہیں رہی۔ اب یہ ہوتا ہے کہ پہلے مریض ایک بڑے ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے جو کنسلٹنگ ڈاکٹر کہلاتا ہے۔ ماہر یا مشیر کہہ لیجیے۔ وہ اسے دیکھ کر ہوں ہاں کرتا ہے اور اس کے دل کا معائنہ کرنے کے لیے ماہر امراض قلب کے پاس بھیجتا ہے۔ وہاں سے واپسی پر خون کا معائنہ کرنے کے لیے خون کے ماہر کے پاس بھیجتا ہے۔ پیشاب کا معائنہ کرنے کے لیے پیشاب کے ماہر کے پاس بھیجتا ہے۔

مریض اتنے میں جھنجلا جائے تو اس کے دماغ کا معائنہ کرنے کے لیے ماہر دماغ یا ماہر نفسیات کی طرف ہانک دیتا ہے۔ اس کے بعد اگر اس کے آپریشن کی ضرورت ہو تو ایک ماہر اسے انجکشن دے کر یا کلوروفارم سنگھا کر بے ہوش کرتا ہے' اور سرجن اس کا آپریشن کرتا ہے اور اس کے بعد زیادہ تر یہ ہوتا ہے کہ مریض صور اسرافیل کی آواز سن کر اٹھ بیٹھتا ہے تو دیکھتا ہے کہ فرشتے اس کا حساب کتاب لینے کے لیے رجسٹر لیے کھڑے ہیں۔

یہ سب تو ہوا۔ ہم سوچتے ہیں کہ اگر دوسرے پیشوں میں بھی یہ ہی خصوصی ماہرین کی ریل پیل ہو گئی تو کیا ہو گا۔ یہ لیجئے یہ اللہ دتہ صاحب ہیں۔ یہ دو گھنٹے سے ڈاکٹر بال جبریل' ماہر موئیات یعنی بالوں کے اسپیشلسٹ ہیں۔ ان کے کلینک میں بیٹھے باری کا انتظار کر رہے ہیں۔ آخر ایک چوبدار آواز لگاتا ہے۔ "مسٹر آلو شوربہ!"

اللہ دتہ صاحب احتجاج کرتے اٹھتے ہیں اور چوبدار کو بتاتے ہیں کہ میرا نام آلو شوربہ نہیں ہے' اللہ دتہ جنجوعہ ہے۔

اب مریض یا جو کچھ بھی آپ اسے کہیں ڈاکٹر بال جبریل کے حضور پیش ہوتا ہے۔ ان کے نام کے ساتھ ڈگریوں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ کاغذ ختم ہو جاتا ہے' ڈگریاں ختم نہیں ہوتیں۔

ڈاکٹر ایک نظر مریض کے چہرے پر ڈالتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ کچھ بال مریض کے چہرے پر نکل آئے ہیں۔ کچھ نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تاہم وہ اس سے سوالات کرتا ہے۔ اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں' اس کے والدین کے بارے میں' اس کی اولاد کے بارے میں کہ بچے کہاں کہاں پڑھتے ہیں۔ اس کے پیشے کے بارے میں' تاکہ اس کی آمدنی کا اندازہ ہو سکے' عادات کے بارے میں' پھر ایک محدب شیشہ لے کر اس کے چہرے کا معائنہ کرتا ہے۔ پھر سنجیدہ ہو جاتا ہے اور کہتا ہے۔ "سمجھ گیا' سمجھ گیا۔ آپ نے کب سے شیو نہیں کی؟"

مریض بتاتا ہے کہ "دو دن سے نہیں کی۔"

ڈاکٹر کہتا ہے۔ "میرا اندازہ صحیح نکلا۔ آپ کو شیو کرانے کی ضرورت ہے۔"

مریض کا چہرا لٹک جاتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ ڈاکٹر کا فرض اسے اس کے مرض سے آگاہ کرنا ہے۔ خواہ وہ حقیقت کتنی ہی خوف ناک کیوں نہ ہو' اسے خود بھی اپنے بارے میں یہ ہی شبہ یا گمان تھا۔ بیوی نے بھی یہ ہی بتایا تھا' لیکن وہ تو عورت ذات ہے۔ دل میں دبدھا تھی کہ شاید ڈاکٹر کچھ اور بتائے۔ کچھ اور تشخیص کرے۔ شاید اسے مہلت دے دے اور اسے حقیقت کا سامنا فوراً نہ کرنا پڑے۔ مریض ممیاتا ہے اور ڈاکٹر سے پوچھتا ہے۔ "ڈاکٹر صاحب کیا اسے ایک دو دن کے لیے ملتوی کر سکتا ہوں۔ آج کل دفتر میں کام زیادہ ہے' فرصت نہیں۔"

اسپیشلسٹ نے سختی سے کہا۔ "میں نے کہہ دیا نا کہ تمہیں شیو کی ضرورت ہے۔ تم چاہو تو اسے ملتوی کر دو' لیکن پھر نتائج کا ذمے دار میں نہ ہوں گا۔"

مریض نے ایک لمبی آہ کھینچی۔ "اچھا! اگر یہ ہی بات

ہے تو میں تیار ہوں۔ کر دیجئے میری شیو۔"
ڈاکٹر بال ماہر موئیات مسکرایا۔ اس نے کہا۔
"جناب میں شیو نہیں کرتا۔ میں تو صرف بالوں کا ماہر ہوں۔ میں تو تشخیص کرتا ہوں۔ اب آپ کو ماہر ریش و بروت ڈاکٹر سلمانی کے پاس بھیجتا ہوں۔"
اس نے گھنٹی بجائی تو اس کی سیکریٹری دوڑی دوڑی آئی۔
"مس زلف دراز! ان صاحب کے نام کا کارڈ بنا دو' شیونگ روم کے لیے۔ اگر ڈاکٹر سلمانی ہوں تو ان سے کہو ان کے چہرے پر موزبائی کا عمل بذریعہ تیزابی تیغ کریں اور مشاطگی کے لیے شانہ صدر رندانہ کا استعمال کریں۔"
مسٹر اللہ دتہ اور تو کچھ نہ سمجھے تیغ کے نام پر گھبرائے' انہیں معلوم نہ تھا کہ یہ استرے کا اصطلاحی نام ہے۔ تاہم چپ رہے کہ اب جو' ہو ہو ہو' اتنا ضرور پوچھا کہ "کیا اس کے لیے مجھے بے ہوش کیا جائے گا۔ کلورو فارم سنگھایا جائے گا؟"
ڈاکٹر نے پھر تبسم کیا اور کہا۔ "میری دانست میں اس کی ضرورت نہیں' لیکن زیادہ صحیح ڈاکٹر سلمانی ہی بتا سکتے ہیں۔ میرے خیال میں مس زلف دراز' ڈاکٹر صاحب کے پاس بھیجنے سے پہلے انہیں ماہر صابنیات کے پاس لے جاؤ۔ وہ ان کے چہرے پر صابن لگائیں۔ ماہر تولیات ان کے گلے میں تولیہ باندھیں۔"
سیکریٹری نے کچھ ڈاکٹر صاحب کے کان میں کہا۔ انہوں نے فکرمند ہو کر کہا۔ "یہ تو افسوس کی بات ہے کہ ماہر صابنیات گھنٹہ بھر بعد ملیں گے۔ دونوں ایک مریض کے ساتھ مصروف گفتگو ہیں۔ بڑا سنگین کیس ہے' پوری داڑھی صاف کرنی ہے اور ہاں مس زلف دراز ڈاکٹر سلمانی تو داڑھی مونڈیں گے۔ کان کے اوپر کے بال صاف کرنے کے ماہر ڈاکٹر دراز گوش بھی ہیں یا آج نہیں آئے۔"
مریض نے کہا۔ "کیا اس کے لیے علیحدہ اسپیشلسٹ ہے۔ داڑھی مونڈنے والا کانوں کے آس پاس کے بال صاف نہیں کر سکتا۔"
ڈاکٹر بال جبریل نے کہا۔ "بعض لوگ کر لیتے ہیں' لیکن خطرہ رہتا ہے کہ قینچی سے کان کی لو نہ کٹ جائے تم جانو آج کل کی سائنس بھی کافی ترقی کر گئی ہے۔"
"اچھی بات ہے۔" مریض نے راضی برضا ہو کر کہا۔

اس کے بعد ان کو ماہر شیمپوئیات کے پاس جانا ہو گا' لیکن اس سے پہلے امراض قلب کے ماہر کے پاس ہو آئیں یا شاید اس کی ضرورت نہ ہو۔ آپ بڑے کٹے معلوم ہوتے ہیں۔ بعض لوگ دوسری طرح کے ہوتے ہیں۔ ان کا شیمپو کیا جائے تو بے ہوش ہو جاتے ہیں اور چمپی کی جائے تو بعض اوقات جانبر نہیں ہوتے اور اس سارے عمل کے بعد میرے خیال میں جلائے پاپوش کی ضرورت بھی پڑے گی۔
مریض کے کان کھڑے ہوئے' لیکن سیکریٹری صاحب نے دلاسا دیا کہ مطلب بوٹ پالش سے ہے۔
اب مریض نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! مشورے کی فیس؟"
ڈاکٹر نے سرپرستی سے کہا۔ "اس کی آپ فکر نہ کریں۔ سیکریٹری صاحبہ وصول کر کے ہی آپ کو جانے دیں گی۔ ایمرجنسی کے لیے دروازے پر دو پہلوان بھی آپ نے دیکھے ہوں گے۔ اچھا خدا حافظ! اگلے آدمی کو آواز دو۔"
اور جب بے چارے اللہ دتہ صاحب ان سارے مراحل سے فارغ ہو گئے۔ داڑھی گھٹوا چکے اور چمپی کرا چکے تو "جلائے پاپوش" کے شعبے میں آئے۔ وہاں ایک لڑکا بوٹ پالش' برش اور صافی وغیرہ لیے بیٹھا تھا۔ مسٹر اللہ دتہ نے اطمینان کی سانس لی کہ ایک کام تو ایسا ہے کہ جس میں ماہر کی ضرورت نہیں پرانی چال پر چل رہا۔
"کون سے پاؤں پر پالش کروں صاحب!" لڑکے نے پوچھا۔
"بھئی اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اچھا داہنے پاؤں سے شروع کر دو۔"
وہ بولا۔ "جناب اس کے لیے آپ کو دوسرے کمرے میں جانا پڑے گا۔ میں صرف بائیں پاؤں کے جوتے پر پالش کرتا ہوں۔ وہ بھی صرف بوٹ پر' چپل اور سینڈل کی پالش کے ماہرین دوسرے ہیں۔"

(بہ شکریہ لی کاک)

باتیں ایمن خان سے

شاہین رشید

1 ''اصلی نام؟''
''ایمن خان۔''

2 ''پیار کا نام؟''
''بانی۔''

3 ''جنم دن / جنم شہر؟''
''20 نومبر 1998ء / کراچی۔''

4 ''مادری زبان؟''
''پٹھان ہوں مگر پشتو نہیں آتی۔''

5 ''قد / ستارہ؟''
''5 فٹ 5 انچ / اسکارپیو۔''

6 ''بہن بھائی / آپ کا نمبر؟''
''ہم دو بہنیں، جڑواں ہیں۔ دو بھائی جڑواں ہیں درمیان میں ایک بھائی ہیں ٹوٹل ہم پانچ ہیں۔''

7 ''تعلیم؟''
''فرسٹ ایر میں ہوں اور میڈیا سائنس پڑھی ہے میں نے۔''

8 ''شوبز میں آمد؟''
''شادی کی ایک تقریب میں پروفیشنل فوٹو گرافر بلائے تھے تو انہوں نے دیکھا۔ ہمارا آڈیشن لیا۔ آگے بھیجا تو بلاوا آگیا اور کمرشل کی آفر آگئی۔''

9 ''پہلا پروگرام اور وجہ شہرت؟''
''پہلا کمرشل تھا اور ڈرامہ میری بیٹی تھا اور شہرت بھی

اس سے ملی۔"

10 "پہلی کمائی؟"

"یاد نہیں۔ لیکن اپنے اوپر ہی خرچ کیے۔"

11 "شوبز کی برائی؟"

"کوئی برائی نہیں ہے جیسے آپ ہیں ویسے ہی لوگ ٹریٹ کریں گے۔"

12 "آپ کی صبح کب ہوتی ہے؟"

"صبح عموماً" ساڑھے نو بجے ہوتی ہے اور دس بجے گاڑی آجاتی ہے تو شوٹ پہ چلی جاتی ہوں۔"

13 "آپ کے سونے کا ٹائم؟"

"یہی کوئی بارہ ساڑھے بارہ بجے۔"

14 "صبح اٹھتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟"

"کہ دوبارہ سو جاؤں۔"

15 "تہوار کون سے پسند ہیں؟"

"مجھے سارے تہوار منانا اچھا لگتا ہے۔ خواہ عید ہو' یا قومی تہوار ہوں۔"

16 "گھر والوں کی کوئی بات جو بری لگتی ہو؟"

"نہیں کوئی بات بری نہیں لگتی۔۔۔ گھر والے بہت خیال رکھتے ہیں۔"

17 "جسمانی لحاظ سے کیا آپ مکمل ہیں؟"

"جی الحمد للہ مکمل ہوں۔ اللہ نے بہت اچھا بنایا ہے۔"

18 "کیا کنٹرول کرنے میں مہارت ہے؟"

"اپنی بھوک' بہت بھوک لگے تو کچھ نہ کچھ کھا لیتی ہوں۔"

19 "ریلیشن کون سا اچھا ہوتا ہے۔ رشتے داروں کا یا دوستوں کا؟"

"دونوں کا۔۔۔ دونوں کے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

20 "کس دن کا انتظار رہتا ہے؟"

"اپنے آف ڈے کا۔ تاکہ گھر والوں کے ساتھ گزار سکوں اور اپنی برتھ ڈے کا۔"

21 "کہاں جانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتی ہیں؟"

"اپنی دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے کے لیے یا نانی کے گھر۔"

22 "خوشی کا اظہار؟"

"اظہار نہیں کرتی چھو خود ہی چغلی کھا جاتا ہے خوشی میں۔"

23 "ضدی ہیں؟"

"بچپن میں بہت ضدی تھی' اب میچور ہو گئی ہوں۔"

24 "جب کوئی آپ کی بات نہیں مانتا تو؟"

"تو بس مت پوچھیں کہ کتنا غصہ آتا ہے۔"

25 "غصے میں کیا کرتی ہیں؟"

"منہ بند کر کے بیٹھ جاتی ہوں۔ اظہار نہیں کر سکتی۔"

26 "لڑکیوں میں کیا بات بری لگتی ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ بری تو کوئی نہیں ہے۔"

27 "لڑکے اچھے دوست ہوتے ہیں یا لڑکیاں؟"

"لڑکے اچھے دوست ہوتے ہیں۔ لڑکیوں کی بہ نسبت میرے جو لڑکے دوست ہیں وہ بہت اچھے ہیں' میرا خیال رکھتے ہیں۔"

28 "کوئی لڑکا مسلسل گھورے تو؟"

"میں تو نظر انداز کرتی ہوں' آخر کب تک گھورے گا۔"

29 "گھر میں کس سے ڈر لگتا ہے؟"

"بابا سے وہ غصے کے تیز ہیں۔"

30 "کیا دولت شہرت وقت سے پہلے ملی؟"

"نہیں۔۔۔ ایسا کچھ نہیں' میرے لیے یہی ٹائم مقرر تھا اللہ کی طرف سے۔"

31 "آپ کا حساب کتاب کون رکھتا ہے؟"

"میرے بابا۔۔۔ کیونکہ میرا ابھی آئی ڈی کارڈ نہیں بنا۔ تو بابا ہی سب حساب رکھتے ہیں اور ہمیشہ وہ ہی رکھیں گے۔ ان شاء اللہ۔"

32 "کس ملک میں گھومنے کا بہت شوق ہے؟"

"مجھے پاکستان بہت پسند ہے۔ اسے چھوڑنا نہیں چاہتی۔ بس ساری دنیا گھومنا چاہتی ہوں۔"

33 "شاپنگ پہ آپ کی پہلی خریداری؟"

"مجھے کریز ہے' میک اپ' شوز' بیگز' بلکہ ہر چیز کا تو ہر چیز کی خریداری کرتی ہوں۔"

34 "پیسہ خرچ کرتے وقت کیا سوچتی ہیں؟"

"یہی سوچتی ہوں کہ بہت محنت سے کمایا ہے ذرا سوچ کے خرچ کروں مگر ایسا ہوتا نہیں ہے۔"

35 "غربت میں وقت گزارا؟"
"اچھا اور برا وقت تو ہر ایک پہ آتا ہے۔"

36 "دوسروں سے کیا تحفہ لینا پسند کرتی ہیں؟"
"بس مجھے کوئی پیار سے ٹریٹ کرے۔ عزت دے اور ہمیشہ میرا ساتھ دے۔"

37 "ایک تحفہ جو اللہ کی طرف سے ملا؟"
"میری پوری فیملی، میرے بھائی، میرے والدین۔"

38 "موڈ کب اچھا ہو جاتا ہے؟"
"جب کوئی مجھے پیار سے بلائے۔"

39 "بستر چھوڑتے وقت سستی آتی ہے یا فوراً" اٹھ جاتی ہیں؟"
"کروٹیں بدلتی ہوں۔ پھر اٹھتی ہوں، اللہ سے دعا کرتی ہوں۔ شکر کرتی ہوں کہ زندگی کا ایک دن اور مل گیا۔"

40 "مذہب سے لگاؤ؟"
"بہت لگاؤ ہے۔ نماز روزے کی پابندی کرتی ہوں۔"

41 "چھٹی کا دن کہاں گزارنا پسند کرتی ہیں؟"
"تھوڑا اپنی فیملی کے ساتھ، تھوڑا اپنی دوستوں کے ساتھ اور تھوڑا وقت رشتے داروں کے ساتھ۔"

42 "لباس میں آپ کا انتخاب؟"
"شلوار قمیص۔"

43 "لڑکیوں کو حسین ہونا چاہیے یا ذہین؟"
"میرا خیال ہے ذہین، کوئی اسمارٹ لڑکیاں کتنی ہی خوب صورت ہوں انہیں کوئی پسند نہیں کرتا۔"

44 "گھر کے کس کمرے میں سکون ملتا ہے؟"
"نہ کمرہ نہ کچھ اور... بس مما کی گود میں سکون ملتا ہے۔"

45 "انڈین فلمیں پسند ہیں یا پاکستانی؟"
"میں دونوں دیکھتی ہوں۔"

46 "کس کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً" دیتی ہیں؟"
"اپنی مما کے کیونکہ وہی ہوتی ہیں جو میرا بہت خیال رکھتی ہیں اور میرے لیے پریشان ہوتی ہیں۔"

47 "بوریت کس طرح دور کرتی ہیں؟"
"گیمز کھیلتی ہوں اور what's app پر باتیں کرتی ہوں۔"

48 "مہمانوں کی آمد کیسی لگتی ہے؟"
"بہت بہت اچھی لگتی ہے۔"

49 "اگر حکومت میں کوئی عہدہ مل گیا تو؟"
"میں کچھ نہیں کر سکتی، اس لیے کوئی عہدہ قبول نہیں کروں گی۔"

50 "بچت میں کیا پسند ہے؟ بونڈ، گولڈ یا کیش؟"
"مجھے گولڈ پسند ہے۔ اس لیے وہ ہی خریدتی ہوں۔"

51 "نصیحت جو بری لگتی ہے؟"
"اگر کوئی بڑا نصیحت کرے تو کوئی مسئلہ نہیں۔ مگر پھر بھی زیادہ روک ٹوک پسند نہیں۔"

52 "وقت کی پابندی کا خیال رکھتی ہیں؟"
"بالکل کرتی ہوں۔"

53 "کن لوگوں پر دل کھول کر خرچ کرتی ہیں؟"
"اپنے دوستوں پہ۔"

54 "اپنی کمائی سے اپنے لیے کیا قیمتی چیز خریدی؟"
"ابھی تک تو نہیں خریدی مگر ضرور خریدنا چاہوں گی۔"

55 "کھانے کے لیے بہترین جگہ، چٹائی، اپنا بیڈ یا ڈائننگ ٹیبل؟"
"زمین پہ بیٹھ کر کھانا کھانا بہت پسند ہے۔"

56 "چھری کانٹے کا استعمال کرتی ہیں یا ہاتھ سے کھاتی ہیں؟"
"چاول ہاتھ سے ہی کھاتی ہوں۔ ویسے موڈ پر منحصر ہے۔"

57 "دنیا والوں سے کیا توقع رکھتی ہیں؟"
"کہ وہ میری عزت کریں۔"

58 "انٹرنیٹ اور فیس بک سے دلچسپی؟"
"زیادہ نہیں ہے۔ مگر پھر بھی استعمال کرتی ہوں۔"

59 "کوکنگ سے لگاؤ؟"
"بالکل بھی نہیں ہے۔"

60 "کپڑے ریڈی میڈ پسند ہیں یا سلواتی ہیں؟"

"میرے کپڑوں کی ڈیزائننگ میری مما کرتی ہیں۔"

61 "کوئی سوال جو بار بار کیا جاتا ہو؟"

"کہ آپ دونوں بہنوں میں کیا فرق ہے۔"

62 "کوکنگ سے لگاؤ نہیں ہے تو کوکنگ چینل سے؟"

"بہت زیادہ شوق سے دیکھتی ہوں۔"

63 "کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟"

"بالکل لگتا ہے۔ لال بیگ سے، چھپکلی سے، کتے سے ڈر لگتا ہے۔ مرغی سے ڈر لگتا ہے۔"

64 "کیا محبت اندھی ہوتی ہے؟"

"سنا ہے اور کتابوں میں بھی پڑھا ہے... تجربہ نہیں ہے۔"

65 "آپ کو دکھ ہوتا ہے؟"

"کسی کو تکلیف میں دیکھ کر۔"

66 "کون سی تقریبات پسند ہیں؟"

"شادی کی تقریبات بہت پسند ہیں اور تمام رسومات بھی۔"

67 "تحفہ دیتی ہیں یا کیش؟"

"کیش دیتی ہوں۔"

68 "تاریخی شخصیات میں کس سے متاثر ہیں؟"

"آپ موجود شخصیات کی بات کریں تو مجھے عمران خان بہت پسند ہیں۔"

69 "فون نمبر تبدیل کرنے کی عادت ہے؟"

"میں نے میٹرک کے بعد فون لیا اور اب تک نمبر تبدیل نہیں کیا۔"

70 "کس بات سے خوفزدہ رہتی ہیں؟"

"یہ جو روڈ پر موبائل وغیرہ چھین کر لے جاتے ہیں اور نہ دینے پر مار بھی دیتے ہیں۔"

71 "کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتیں؟"

"ماں باپ سے گلے ملے بغیر اور پھر بیگ اور موبائل لیے بغیر نہیں نکلتی۔"

72 "لوگوں میں جلدی گھل مل جاتی ہیں؟"

"بالکل جی۔ میں اپنے آپ کو اسٹار نہیں سمجھتی۔ سب میں گھل مل جاتی ہوں۔"

73 "ماں ناراض ہو جائے تو کیا کرتی ہیں؟"

"معافیاں مانگتی ہوں۔"

74 "پاکستان کے بارے میں کیا سوچتی ہیں؟"

"اس کے اچھے حالات کے لیے دعائیں کرتی ہوں۔"

75 "اپنی غلطی تسلیم کر لیتی ہیں؟"

"ہاں کر تو لیتی ہوں... مگر تھوڑی دیر لگا دیتی ہوں۔"

76 "اچھی اور بری عادت؟"

"میں اپنے جذبات پر کنٹرول نہیں کر سکتی۔ یہ میری اچھی عادت ہے اور بری یہ کہ دل ہی دل میں کڑھتی رہتی ہوں مگر کسی سے کچھ کہہ نہیں سکتی۔"

77 "دل کی سنتی ہیں یا دماغ کی؟"

"دونوں کو ساتھ ساتھ لے کر چلتی ہوں۔"

78 "بچپن کا کوئی کھلونا جو آج بھی سنبھال کر رکھا ہوا ہے؟"

"ایسا کوئی کھلونا نہیں ہے۔"

79 "غصے میں منہ سے کیا نکلتا ہے گالیاں یا بددعائیں؟"

"کچھ بھی نہیں، بس خاموش ہو کر بیٹھ جاتی ہوں۔"

80 "غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟"

"چھوڑ دیتی ہوں۔ مگر پھر سب کے اصرار پر کھا لیتی ہوں۔"

81 "مارننگ شو کیسے لگتے ہیں؟"

"اچھے لگتے ہیں اور کبھی کبھی شرکت بھی کرتی ہوں۔"

82 "بستر پر لیٹتے ہی سو جاتی ہیں کیا؟"

"بالکل... تھکی ہوئی ہوتی ہوں تو جلدی نیند آجاتی ہے۔"

83 "تحفے الماری میں بند کر کے رکھتی ہیں یا سجاتی ہیں؟"

"سجاتی ہوں۔ اپنے کمرے میں... مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ تحفوں کو سجانا۔"

"شہرت کو زوال آجائے تو؟"

"سب کچھ اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے... انسان کے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے۔"

☆

حرفِ سادہ کو دیا اعجاز کا رنگ

امت الصبور

میرے روز و شب تھے بندھے ہوئے موسموں کے مزاج سے
کبھی ایک لمحہ بھی سال تھا، کبھی سال پل میں گزر گیا

آپ کی محبتوں کے ساتھ ایک اور سال کا سفر تمام ہوا۔

43 برسوں پر محیط یہ سفر جتنا مشکل تھا، اتنا ہی آسان بھی تھا کہ اس سفر میں لگن اور شوق شامل تھا جس نے تھکنے نہیں دیا۔

گردش ماہ و سال کی نیرنگیوں میں کئی راستوں سے گزرے، کئی اتار چڑھاؤ دیکھے لیکن قافلہ شوق رکنے نہیں پایا، وہ شوق، وہ جستجو، وہ تلاش آج بھی جاری ہے۔

اس طویل سفر میں ہماری مصنفین نے ہمارا بھرپور ساتھ دیا۔ ان کی سوچ اور فکر کے رنگ لفظوں میں ڈھلے تو ان میں زندگی کے سارے منظر سمٹ آئے۔ ان کی تحریروں میں عہد حاضر کی کرب ناک حقیقتوں کی آگہی کے ساتھ ساتھ شگفتگی، دل آویزی اور خوابوں کے دلکش رنگ بھی شامل تھے انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے لاکھوں قارئین کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی، ان کے دلوں میں امید کے چراغ روشن کیے یہی وجہ ہے کہ خواتین ڈائجسٹ کے ذریعے مصنفین کو اپنی پہچان کے ساتھ ساتھ قارئین کی بے پایاں محبت و تحسین بھی ملی۔

فطری بات ہے، ہم جن کو پسند کرتے ہیں جن سے لگاؤ رکھتے ہیں ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتے ہیں، ہماری قارئین بھی مصنفین کے بارے میں ان کی ذات کے حوالے سے جاننا چاہتی ہیں۔

سالگرہ نمبر کے موقع پر ہم نے مصنفین سے سروے ترتیب دیا ہے، سوالات یہ ہیں۔

1 لکھنے کی صلاحیت اور شوق وراثت میں منتقل ہوا؟ یا صرف آپ کو قدرت نے تخلیقی صلاحیت عطا کی۔ گھر میں آپ کے علاوہ کسی اور بہن بھائی کو بھی لکھنے کا شوق تھا؟

2 آپ کے گھر والے، خاندان والے آپ کی کہانیاں پڑھتے ہیں؟ ان کی آپ کی تحریروں کے بارے میں کیا رائے ہے۔

3 آپ کی کوئی ایسی کہانی جسے لکھ کر آپ کو اطمینان محسوس ہوا ہو۔ اب تک جو لکھا ہے اپنی کون سی تحریر زیادہ پسند ہے؟

4 اپنے علاوہ کن مصنفین کی تحریریں شوق سے پڑھتی ہیں؟

5 اپنی پسند کا کوئی شعر یا اقتباس ہماری قارئین کے لیے لکھیں۔

آیئے دیکھتے ہیں مصنفین نے ان کے کیا جوابات دیے ہیں۔

اقبال بانو ۔۔۔۔ وہاڑی

خواتین ڈائجسٹ کے پیارے قارئین، رائٹرز اور اسٹاف کو سالگرہ مبارک ہو۔ آج عرصہ بعد میں سالگرہ کے اس سروے میں شریک ہوں تو دل میں عجیب سی خوشی ہو رہی ہے۔ جیسے پہلی بار سروے میں شامل

ہوں بہت سال پیچھے جاؤں تو بھی وہ دور بھی تھا جب میں امستل ۔۔ کے ساتھ مل کر سوالنامہ ترتیب دیتی تھی۔ چاہے وہ کسی سروے کے سوالات ہوتے یا رائٹرز کے لیے انٹرویو ٹائپ سوالات ۔۔ بہت مزے کے سوال بنائے جاتے پھر جو پسند نہ آتا اسے کاٹ دیتے۔ ہر سوال پر امستل کہتی۔ اقبال تم اس سوال کا کیا جواب دو گی؟ اس وقت خیال ہی نہیں تھا کہ مصلحت پسندی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ ذہن میں جو آیا کھٹ سے لکھ دیا۔ بس یہی خیال آتا تھا کہ جواب مزے کے ہوں' اور سچ بھی ہو۔ (مگر تنہائیوں کے دکھوں کا پتا نہ تھا) البتہ اب ایسا ہے کہ سوچتے ہیں' ایک لمحہ کو قلم کو روک کر لکھنا پڑتا ہے خیر عرصے سے کوئی افسانہ' ناولٹ خواتین ڈائجسٹ کے لیے نہیں لکھا۔ مگر امستل کا شکریہ کہ اس نے مجھے بھی "یاد" رکھا سوالنامہ بھیجا ۔۔ بہت شکریہ اب جی آپ کے سوالوں کے جواب ہو جائیں۔

(1) ۔ بچوں کی کہانیاں پڑھ کر لکھنے کا شوق ہوا تھا۔ ورنہ میرے خاندان میں کوئی قلم کا مزدور نہیں ہے۔ قدرتی تخلیقی صلاحیت تھی جو اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا کی بھائی بہنوں کو پڑھنے کا شوق ہے لکھنے کا نہیں۔

(2) ۔ ہاں میرے خاندان والے میری تحریریں' پڑھتے ہیں اور پسند بھی کرتے ہیں۔ پہلے بہنیں پڑھتی تھیں۔ اب بھانجیاں اور بھابھیاں بھی پڑھتی ہیں۔ کزنز بھی اور پڑھ کر رائے دیتی ہیں۔ (پرانے رسالے تلاش کر کے افسانے پڑھتی ہیں نا؟ جو مجھے یاد بھی نہیں۔)

(3) ۔ کوئی بھی تحریر جب دل و ذہن میں بہت شور مچاتی ہے تو اسے لکھ کر بہت اطمینان محسوس ہوتا ہے۔ تقریباً" چھ سو کے قریب کہانیاں لکھی ہیں۔ کچھ زبردستی لکھوائی گئیں۔ اور کچھ دل سے لکھیں جیسے میرا ناول "گونگے دکھ" ہے مجھے بہت پسند ہے۔ اس سوپ ڈرامہ "مرجائیں بھی تو کیا" بنایا گیا۔ "جو ٹی وی چینل" سے آن ایر ہوا۔ یہ ناول لکھ کر بہت اطمینان ہوا تھا۔

خواتین ڈائجسٹ میں ناولٹ "تجھے چاہتا نہیں لیکن" ۔۔ "سجنی او سجنی" ۔۔۔ "اور "تو سدا رہے سلامت" چھپے یہ اور اس کے علاوہ [illegible] چھپنے والے افسانے "جنری کا داغ" وہ قیامتیں جو گزر گئیں "چوڑی کھنکے گی" وغیرہ وغیرہ مجھے بہت پسند ہیں۔ ماہنامہ "کرن" میں چھپنے والا ناول "تجھے ہر جگہ پکارا" مجھے اس لیے بھی پسند ہے کہ محمود بابر فیصل صاحب نے صرف دو دن کے نوٹس پر پہلی قسط لکھوائی اور عنوان بھی انہوں نے خود تجویز کیا۔

میرا ناولٹ تھا کرن ہی میں "چاندنی اور آنگن" میری ابتدائی تحریروں میں سے ہے اور مجھے بہت اچھا

لگتا ہے۔

بلکہ مجھ سے زیادہ یہ میری تب کی فین شاہانہ بلوچ کو بھی پسند ہے۔ کبھی بات ہو تو اس کا ذکر کرتی ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ وہ اس کہانی کو اپنے بچوں فاطمہ اور علیان کو بھی بارہا سنا چکی ہے۔ بلکہ یہ کہانی اور خواتین ڈائجسٹ میں چھپنے والا ناولٹ "دشت رفاقت کا سفر" بھی اس کی یادوں میں زندہ ہے۔۔ اور مجھے یہ خوشی ہوتی ہے کہ میری فینز کو میری کہانیاں یاد ہیں۔ عنزہ علی بھی میری بہت پیاری فین ہے۔ اس سے میرا وعدہ تھا کہ خواتین کے سالگرہ نمبر کے لیے ناولٹ ضرور لکھوں گی مگر۔۔۔ سوری عنزہ۔ وعدہ جلد لکھوں گی۔

ہاں بھئی اب نئی لڑکیاں بھی تو جانیں کہ کوئی اقبال بانو بھی تھی اور 1990ء کی دہائی میں اس کا طوطی بولتا تھا۔ ہا۔ ہا۔

اللہ کا شکر ہے کہ میں نے خواتین کے ہر پرچے میں لکھا اور بہت پذیرائی ملی۔ خوشی یہ بھی ہے کہ میرے پڑھنے والے مجھے نہیں بھولے۔ (میرا خیال غلط تو نہیں، بہنو!)

(4) ۔ اپنے علاوہ میں سب مصنفین کو شوق سے پڑھتی ہوں کہ اپنی تحریر میں پڑھنے کے بعد خامیاں نظر آتی ہیں نا؟

میں پہلے بھی سب کو پڑھتی تھی جو میری ہم عصر رائٹرز تھیں اور آج بھی میں اپنے بعد آنے والی رائٹرز کو پڑھتی ہوں۔ آج کل لڑکیاں بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔

کیونکہ اب لڑکیاں بہت پڑھی لکھی ہیں۔ (خیر ڈبل ایم اے' ایل ایل بی تو ہم بھی ہیں) مگر یہ تو کمپیوٹر کے دور کے لوگ ہیں نا ایک کلک سے دنیا کی معلومات لے لی۔ دنیا ایک چھوٹے سے لیپ ٹاپ میں سما گئی ہے۔ ہمارے دور میں کسی باہر کے ملک کی کسی سڑک کا نام بھی غلط لکھ دیا جاتا تھا تو فوراً "پکڑائی" ہو جاتی تھی۔

آج کل کا رائٹر اور ریڈر بہت ذہین ہے۔ مگر ایک بات مجھے کہنے دیں کہ اب کہانیوں میں سے کہانی نکل گئی ہے۔۔۔ وہ محبتوں کی نرماہٹیں اور شرماہٹیں ختم ہو گئی ہیں۔ ارے ہمارے دور میں تو ہیروئن کا ہاتھ بھی ہیرو نہیں تھام سکتا تھا اور اب۔۔۔ خیر وقت وقت کی بات ہے۔

مجھے کہنے دیجئے کہ آج کی رائٹر طوالت کی خواہش میں اصل کہانی کو مار دیتی ہے بار بار واقعات ریپیٹ ہوتے ہیں تو مزا کرکرا ہو جاتا ہے جیسے بریانی کھاتے ہوئے منہ میں کوئی کنکر آجائے۔ ایک اور درخواست ہے رائٹرز سے کہ میڈیا کی طرف جانے والو! سال میں کم از کم دو چار کہانیاں ڈائجسٹ کے لیے بھی لکھ دیا کریں۔ پندرہ سو دو ہزار صفحات کے اسکرپٹ لکھتی ہیں۔ 40۔50 صفحات کا ناولٹ نہیں لکھا جا سکتا۔۔۔؟ یہ تو اچھی بات نہیں۔

کیا کہا۔۔۔؟ میں کیوں نہیں لکھتی۔۔۔؟

بھئی میں تو میڈیا میں آنے سے پہلے بھی کم کم لکھ رہی تھی۔ چلو آؤ سب لکھیں۔ کیا ابروڈ جانے والے اپنے پیارے وطن پاکستان کو بھول جاتے ہیں۔۔۔؟ سمجھ گئیں نا؟ یہاں بھی لکھو۔

پسندیدہ شعر۔

وہ کتابوں میں درج تھا ہی نہیں
جو پڑھایا سبق زمانے نے

پھانسیوں کا سیزن شروع ہے صاحب
اس عشق کو بھی کوئی لٹکا دے

اقتباس

ڈائری میں نجانے کب یہ نوٹ کیا تھا۔ مجھے بہت پسند ہے۔

"رشتے کبھی قدرتی موت نہیں مرتے۔ انہیں ہمیشہ انسان قتل کرتا ہے۔ اپنی نفرت سے' نظر اندازی سے اور غلط فہمی سے۔۔۔"

سائرہ رضا

1 ۔ لکھنے کی تو نہیں مگر پڑھنے کی عادت اور شوق ضرور

وراثت میں منتقل ہوا۔ امی اسکول ٹیچر تھیں اور اُن لوگوں میں سے (اب بھی ہیں) جو اس کاغذ تک کو جھاڑ جھپاڑ کر پورے انہماک سے پڑھتے ہیں۔ جس میں روٹی لپیٹ کر لائی گئی ہو۔

یہ ہی عادت مجھ میں بھی آئی۔ راستے میں پڑا کاغذ بھی اٹھا کر پڑھنا میری کمزوری بن چکی ہے۔ میں پڑھے بغیر رہ ہی نہیں سکتی۔ کبھی مجھے لگتا ہے یہ بھی ایک نشہ ہے۔ جس کا کہیں علاج نہیں۔ بچوں کے لیے آنے والا نونہال میری کوشش ہوتی ہے پہلے میں ہی پڑھ لوں۔

ہوش سنبھالا تو گھر میں "اخبار جہاں" دیکھا۔ بچوں کا صفحہ تو پڑھنا ہی ہے۔ پھر "تین عورتیں تین کہانیاں" اور پھر سلسلے وار کہانیاں اور آج کا دن۔ کیا کیا پڑھا۔ اور کتنا یاد نہیں۔ ہاں یہ یاد ہے کہ اپنی ہم عمر بچیوں میں 'میں واحد تھی۔ جو گھر بھر کا کاٹھ کباڑ اکٹھا کر کے بھوسی ٹکڑے والے کو دے دیتی اور بدلے میں پرانے رسالے خرید لیتی۔ آٹھ آنے کرائے پر عمران سیریز کو ایک ہی دن میں ختم کرنے کا جنون۔ اف۔

مجھے لگتا ہے ہم بچپن ہی سے اس راستے پر قدم رکھ دیتے ہیں۔ جو بعد میں ہماری منزل کا تعین کرتا ہے۔ یعنی یوں ہی پڑھتے پڑھتے میں لکھنے تک آ گئی۔

میں نے اپنی کتاب "دل موم کا دیا" کے پیش لفظ میں کچھ لائنز لکھی تھیں۔ شاید وہ بتا سکیں کہ کسی بھی انسان کی لکھنے کی صلاحیت دراصل ہے کیا۔

"ہم تخلیق کار قلم" کوئی آسمانی مخلوق نہیں۔ اللہ نے جب انسانوں میں کامیابی کی تقسیم کی تو کچھ کے حصے میں قلم آیا۔ ہم تو صرف قلم اٹھاتے ہیں۔ الفاظ تو سارے اس کے ہیں۔ وہی دماغ کی گرہ کھولتا ہے اور صفحۂ قرطاس پر رنگ بکھرنے لگتے ہیں۔"

دعا فقط یہ ہے کہ۔ ہم جیسے ادنیٰ ہرکارے وہی کہیں۔ جو اللہ چاہتا ہے اس قلم سے شر نہ نکلے۔ فقط خیر۔

تو کہہ سکتے ہیں کہ میری لکھنے کی صلاحیت قدرت کی طرف سے ہی ہے۔ الحمدللہ (باقی پورے خاندان میں دور دور تک کوئی نہیں ہے۔)

بہن بھائیوں میں۔ بہن حمیرا رضا کو پڑھنے کا شوق ہے اور میرا خیال ہے کہ اگر وہ توجہ دے تو لکھ بھی سکتی ہے۔ ہمارے پرچوں میں تبصرے کیا کرتی تھی۔ مگر جب میں نے باقاعدگی سے لکھنا شروع کیا۔ اس نے تبصرے لکھنے بند کر دیے 'فرمانا ہے۔

"مجھے سب سے زیادہ پسند تمہاری کہانیاں ہی آتی ہیں۔ تو ظاہر ہے میں ان ہی کی تعریف کروں گی۔ پھر لوگ کہیں گے یہ اچھا ڈراما ہے' ایک بہن لکھ رہی

ہے۔ دوسری تعریفیں کر رہی ہے۔ لہٰذا اب مجھے لکھنا ہی نہیں۔"

2 ۔ گھر میں امی، بہن اور چھوٹی بھابھی گلناز پڑھتی ہیں۔ رائے بہت اچھی ہوتی ہے۔ بھابھی ناصرہ پڑھتی نہیں ہیں مگر ہر ایک کو فخر سے بتاتی ضرور ہیں کہ ان کی نند۔۔۔ (اہم)

"ارے او جھگوری۔۔" پڑھ کر امی نے حمیرا سے کہا۔

"ایک جیسی دال روٹی کھلا کر پالتے ہوئے بچوں میں سے میں ایک ایسی بچی بھی پال رہی تھی۔ مجھے تو پتا ہی نہ چلا۔ کہاں سے آتا ہے اسے لکھنا۔۔ اور ایسے جملے۔۔"

(میں حیران رہ گئی۔۔۔ امی نے مجھے تو کبھی نہیں کہی یہ بات۔۔۔ مگر مجھے اندازہ ہے کہ وہ اب تک مسرت آمیز حیرت ہی سے دوچار ہیں۔)

میں ان کے ساتھ کہیں ملنے جلنے والوں میں جاؤں تو لوگ حال چال پوچھتے ہیں اور سائرہ کیا حال چال ہے کیا کرتی ہو۔ میں متانت سے الحمدللہ اور کرنا کیا ہے وہی بچے اور گھر۔۔۔ میرا جملہ مکمل نہیں ہوتا اور امی اسٹارٹ لیتی ہیں۔ اب میرے کارنامے اور اچیومنٹس۔۔۔ بزبان امی۔۔۔

اب سائرہ بغلیں جھانک رہی ہیں اور میں ہر بار سوچتی کہ امی کو منع کروں گی کہ امی نہ بتایا کریں لوگوں کو۔ اچھا نہیں لگتا۔

مگر پھر مجھے کچھ دن پہلے احساس ہوا۔ اگر میری اپنی بیٹی کی ہی کچھ خاص اچیومنٹس ہوں تو میں بھی فخر سے بتاؤں گی نا۔ بڑھاپے آ کر پھر امی سے ان کی خوشی کیوں چھینوں۔

لہٰذا امی کے لیے ایک ہی لفظ "لگے رہو۔"

چچا زاد، عاصمہ امین رضا نے بے حد سادگی اور خلوص سے کہا۔

"مجھے تو اتنا فخر محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب میری کزن نے لکھا ہے۔"

"اللہ حمیرا، سائرہ کتنی لائق ہے نا۔"

چچی کوشی پڑھتی ہیں اور تعریف بھی کرتی ہیں۔ میں نے انہیں اپنی کتاب گفٹ کی۔ انہوں نے سوٹ گفٹ کیا۔

شوہر صاحب پڑھتے وڑھتے کچھ نہیں ہیں۔ مگر کبھی موڈ میں ہوں تو۔۔

"مجھے پتا ہے تم اچھا لکھتی ہو۔" اور اگر زیادہ ہی موڈ میں ہوں تب۔

"دیکھا ہماری محبت نے تمہیں کیا سے کیا بنا دیا۔"

تب میں چلا پڑتی ہوں۔ ایسے ہی خوامخواہ۔ میں تو آٹھویں کلاس سے کہانیاں لکھ رہی ہوں۔ ایک تھا ارسلان اور ایک اس کا مرغا۔۔ مگر وہ اپنی کہہ کر یہ جا وہ جا۔

چھوٹا بھائی ایک پڑھی لکھی اسکول ٹیچر ماں کا بیٹا ہونے پر فخر کرتا ہے۔ بیشہ اب انداز کچھ یوں ہے۔

ہم دسترخوان پر کھانا کھانے بیٹھے ہیں۔ اسے میرے ساتھ جگہ ملی۔ اچانک تشکر آمیز انداز سے آسمان کی جانب دیکھ کر (چھیڑتا انداز۔۔۔)

"میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ ایک عظیم رائٹر میرے ساتھ کھانا کھا رہی ہے۔"

میرے سارے کام۔۔ کاغذ لانا۔۔ تحریریں پورے وقت پر ذمہ داری سے آفس لے کر جانا، یہ اس کا کام ہے۔ مجھے آفس لے کر جانے اور لانے کا کام بھی اکثر وہی کرتا ہے۔ باہر بیٹھ کر انتظار کرتا ہے۔ (شوہر صاحب ڈراپ کریں۔۔ یہ۔۔ لے لیتا ہے۔)

اب دوسرے بھائی تیمور رضا کی بھی سن لیں۔

میں کسی کونے میں بیٹھ کر خاموشی سے ۔۔ لکھ رہی ہوں۔ اس کی نظر پڑ گئی، سر پر پہنچ کر۔۔۔ "آخر تو کب تک جھوٹ لکھے گی یا تو اتنی لمبی لمبی چھوڑ کیسے لیتی ہے؟؟" (شدید حیرت)

میری کتاب چھپ کر آئی بے حدونی ہنڈلز۔

تیمور فون کرتا ہے۔

"تیری ڈھیر ساری ردی آئی ہے، تو بھوسی ٹکڑے

والے کو دے کی یا میں ہی دے دوں۔" میں فوراً" لجاجت بھرے لہجے سے۔

"نہیں میرے بھائی۔۔۔ بہت مہربانی مجھے دے جاؤ' میں خود ہی دے دوں گی۔"

3 ۔ اس سوال کا جواب نہایت آسان ہے۔ مجھے اپنی لکھی تمام چیزیں پسند ہیں۔ مگر۔۔۔ کوئی۔۔ ایک۔۔۔ تو پھر ایک نہیں دو۔۔۔ یقین کامل ہی بندگی ہے اور "محبت کہانی زندگی کہانی" (بلدیہ فیکٹری کے حادثے پر لکھا جانے والا افسانہ)

اور وہ سب تحریریں جن پر امتل کو اعتراضات ہوتے ہیں۔ میرے حساب سے وہی سب سے اچھی ہیں۔ (امتل غور فرمایئے۔ "ہیرو" کو لگا دیں)

یقین کامل پڑھنے کے بعد مجھے خود پر رشک آیا تھا۔ مجھے نہیں پتا یہ کہانی کیسے بنی۔۔۔ کیسے چلی اور اپنے منطقی انجام تک پہنچی۔ میرے پاس بس ایک جملہ تھا۔ اس کے بعد کیا ہوا' کیسے ہوا' کچھ خبر نہیں۔

میں ہچکیوں سے رو پڑی تھی کہ اتنی خوب صورت چیز اللہ نے مجھے دے دی۔ میں اس قابل کہاں ہوں۔

میرا ماننا ہے اللہ کے پاس لوح محفوظ پر سب لکھا ہے۔ تو رزق کی طرح میرے حصے کے لفظ اور جملے بھی طے ہیں۔ میں وہی دوں گی جو مجھے رب تعالیٰ سے عطا ہو گا۔ مجھے یقین کامل کے لفظ اور جملے تو چھوڑیے کاما اور فل اسٹاپ تک پسند ہیں۔

رنگریز میں جاذب سلطان نے خط بہت خوب صورت لکھے۔

4 ۔ آپ کو پتا ہے نا امتل۔۔۔ میں سب کو شوق سے پڑھتی ہوں اور پچھلے دنوں ایک خط میں' میں نے اپنی پسند بتائی تھی' تو وہی سب پسند ہیں۔ بلکہ کوئی بھی بندہ جس نے اچھا لکھا ہے وہ پسندیدہ ہو جاتا ہے۔

5 ۔ پہلے ہی میرے جوابات طوالت کی حد سے گزر چکے ہیں۔ لہٰذا اقتباس تو رہنے دیتے ہیں۔

شعر میں فیض صاحب کی رقیب سے بے حد پسند ہے۔ یہ مجھے مسمرائز کر دیتی ہے۔ رقیبوں کو ہمیشہ گالیاں پڑیں' کوسنے اور کمے۔۔۔ ڈنڈے۔۔۔ مگر یہ فیض صاحب ہی کا کمال ہے جو رقیب سے دل کی باتیں کرتے ہیں۔

تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی وہ رخسار وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے

رقیب سے محبوب کی شکایتیں' وہ بھی اس خوب صورتی سے اس کو بار بار پڑھیں پر دل بھرتا ہی نہیں

اور علی عباس زیدی کا یہ شعر

کیا سے کیا ہو گئی میری تصویر
ہاتھ پھر اس کا مل گیا ہو گا

سمیرا حمید

لکھنے کا شوق وراثت میں نہیں ملا' کیونکہ میرے

خاندان میں باقاعدہ لکھنے والی میں پہلی ہوں۔ ہمارے گھر میں جتنے افراد ہیں۔ ان کے لکھنے پڑھنے سے لے کر اپنے اپنے شعبے یا شوق ہیں۔ میرے ایک بھائی کا اپنے شعبے سے متعلق ایک کتاب لکھنے کا ارادہ ہے۔ ایک کا کالم لکھنے کا۔ یعنی لکھنے کا شوق رکھنے والے ہیں گھر میں۔ لیکن میں فی الحال پہلی ثابت ہو گئی ہوں جو باقاعدہ لکھنے لگی ہے۔

لکھنے کی صلاحیت قدرتی ہے۔ لیکن یہاں میں مستنصر تارڑ صاحب کی بات کا حوالہ دوں گی کہ "صلاحیت کتنی بھی قدرتی ہو وہ دس فیصد ہی ہوتی ہے۔" ان کی بات کو میں ایسے آگے بڑھاؤں گی کہ باقی کا نوے فیصد ہمیں حاصل کرنا ہوتا ہے۔

2 ۔ میرے گھر والے بس اتنا جانتے ہیں کہ کمرے میں بند ہو کر کچھ کرتی رہتی ہوں' قلم اور کاغذ کے ساتھ۔ قلم اور کاغذ کے ساتھ اس مصروفیت میں کیا نتیجہ نکلتا ہے' گھر والے اس کا نام تو جانتے ہیں۔ "لکھنا" لیکن کیا لکھا یہ نہیں۔ میرے نادر کو میری کہانیوں کے نام معلوم ہیں۔ بس اور باقی کے گھر والے کسی بھی کہانی یا کہانی کے نام سے بھی واقف نہیں۔

میرا چھوٹا بھائی میری کہانیوں کو پڑھنے کا اعزاز بخشتا ہے اور رائے کا تو معلوم نہیں' بار بار وہ مجھے یہ یاد دلاتا رہتا ہے کہ فلاں لفظ میں نے اتنی بار استعمال کیا فلاں اتنی بار۔ شاید اس کا خیال ہے کہ میں قلم کار نہیں زبان دان ہوں جو ہر کہانی کے ساتھ ایک نئی زبان ایجاد کرے گی۔ اس کی رائے جسے میں طنز کا نام دینا پسند کروں گی سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ میں بہت غور کرتی ہوں کہ لفظوں کی تکرار نہ ہو۔ گھر میں ایسے براہ راست رائے دینے والے موجود ہوں تو ایک فائدہ ہوتا ہے انسان ان کا گلا بھی دبا سکتا ہے اور بے جا تنقید پر ان کے سر پر کچھ دے بھی مارتا ہے۔ کیونکہ اگر وہ اپنی زبان کا استعمال کر سکتے ہیں تو کچھ ہاتھ پیر ہمیں بھی ہلانے چاہئیں۔

باقی خاندان میں پڑھنے کا تو رجحان ہے' لیکن ادب پڑھنے کا نہیں۔ تاریخ اور فلسفہ اور خاص کر نسلوں کی تاریخ اور جانوروں کے بارے میں معلومات وغیرہ' میرے ایک بھائی کے پسندیدہ موضوعات میں سے چند ایک ہیں۔ وہ شاید تب میری کہانی پڑھے گا جب میں کم سے کم منگولوں یا بگ فٹ کے بارے میں لکھوں گی۔ منگولوں کو تو شاید میں کہیں کسی کہانی میں لے بھی آؤں بگ فٹ کے لیے کوئی کہانی ابھی میرے ذہن میں آئی نہیں۔ ایک کو دنیا کے عظیم افراد کی آپ بیتیاں پڑھنے کا شوق ہے اور مجھے یقین ہے میں نے اپنی آپ بیتی لکھی بھی تو وہ بھی میرے گھر میں پڑھی نہیں جائے گی۔

3 ۔ یہ سوال کچھ مشکل سا ہے۔ میں کسی ایک بھی کہانی کا نام نہیں لوں گی پسندیدگی میں' چند ایک کہانیوں کے بارے میں بات کرتی ہوں۔ مجھے "مہر ثبت" لکھ کر ایک خاص طرح کا احساس ہوا تھا جو کسی اور تحریر کو لکھ کر نہیں ہوا۔ خاص کر خدا کے فرمان کو لے کر جو میں نے سطریں لکھی تھیں۔ ان سطروں نے دنوں مجھے اپنا مقید رکھا۔ "دائم الحبس" میں جب جمال سور کا ناچ دیکھتا ہے تو جمال کی بے خودی کو میں بہت وضاحت سے محسوس کر رہی تھی۔ اور "سرکی فی" کا کردار میرے لیے بہت خاص ہے' کیونکہ میں نے اس کے

کردار میں جان توڑ کوشش کی کہ وہ ایک معاشرتی نمائندہ بن سکے۔ کیونکہ بجی پوری کی پوری معاشرے پر ایک طنز تھی اور اس کی ہنسی کسی طمانچے کی طرح تھی تو اسے قہقہوں کی صورت اٹھایا جانا اور نکاح کی صورت محبوس کرنا میرے لیے کچھ خاص تھا۔

4 ۔ ہمیشہ اتفاق ایسا ہوا ہے میرے ساتھ کہ مجھ تک کسی کہانی یا کتاب کی جب شہرت پہنچتی ہے تو کتاب کے نام سے پہنچتی ہے۔ مصنف کے نام ـــــ کے ساتھ نہیں۔ تقریباً" آج تک جتنی کہانیاں یا کتابیں پڑھیں تو وہ کتاب کے نام سے پڑھیں' لکھاری کے بارے میں بعد میں معلومات لیں۔ اب میں اپنے پسندیدہ مصنفین کے بجائے میں پسندیدہ کتابوں کے بارے میں بات کرنا پسند کرتی ہوں۔ مجھے نئی نئی کتابیں دریافت کرنا اچھا لگتا ہے اور پچھلے دنوں ایک جاپانی مصنف ہاروکی موراکامی کی مختصر کہانیوں' ایلف شفق کی ناموس اور عرفان اورگا کی اک ترک خاندان' سرخ میرا نام اور دنیا بھر کے نوبل انعام یافتہ ادیبوں کی کاوشوں کے مجموعہ سے واقفیت بہت زیادہ اچھی لگی۔

"محبت داغ کی صورت" ناول پڑھا اور ایسی باکمال تحریر کی مصنفہ سے ملاقات خوب رہی۔ میمونہ صدف کا جو زیست کو' ایمل رضا کی "چور عورت" بہت اچھی کاوشیں رہیں۔ پسندیدہ اقتباس کے بحر میں سے چند قطرے۔

"جس درجے کی توفیق نہیں اس کا اعلان نہیں کرنا چاہیے۔ میرا علم بہت نہیں ہے' میں الجھا تو سکتی ہوں' سلجھانے کا فن نہیں جانتی۔ میں نے یہاں ان گنت ایسے مشورے دیے' جن کی یہاں ضرورت نہیں تھی۔" (فٹ پاتھ کی گھاس 'بانو قدسیہ)

الکیمسٹ سے یہ سطریں خاص کر دیے تو اس ناول کی ایک ایک سطر پارس پتھر ہے' اگر سمجھ آجائے تو دماغ کو سونا کر دے۔

"لوگ چیزوں کو اتنا پیچیدہ کیوں بناتے ہیں؟" اس نے دریافت کیا۔

"اس لیے کہ جن لوگوں کی ذمہ داری سمجھنا ہے وہ سمجھ سکیں۔ تصور کرو اگر ہر شخص نے سیسے کو سونے میں تبدیل کرنا شروع کر دیا تو سونے کی اہمیت ہی ختم ہو جائے گی۔"

"اگر کوئی شخص اپنی تقدیر سے الگ رہے تو وہ ہر چیز کو جان لے گا جسے جاننا چاہیے۔ بس ایک چیز ایسی ہے جس کے باعث خوابوں کو پانا ناممکن ہے اور وہ ناکامی کا خوف ہے۔ دنیا کی زبان سمجھنے کے لیے جرات ایک خصوصیت ہے۔"

عمیرہ احمد

آبِ حیات

آب حیات کی کہانی ماش ۔ کے تیرہ پتوں میں چھپی ہوئی ہے۔
2۔ ایک خوب صورت اتفاق نے امامہ اور سالار کو یکجا کردیا ہے۔ سالار نے امامہ کو ایر رنگز دیے ہیں۔ وہ بالکل ویسے ہی ہیں، جیسے امامہ شادی سے قبل پہنتی تھی اور جو اسے اس کے والد ہاشم نے دیے تھے۔ سکندر عثمان نے اس شادی کو کھلے دل سے قبول کیا۔
9۔ سی آئی اے ہیڈ کوارٹر کے ایک کمرے میں چار اشخاص گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے ایک پروجیکٹ پر کام کررہے ہیں۔ انہیں ایک شخص بلکہ اس کی پوری فیملی کے تمام بیرونی معاملات اور ذاتی زندگی کی تمام تر مکمل معلومات حاصل ہیں اور انہیں اس میں سے کسی ایسے پوائنٹ کی ضرورت ہے، جس کی بنیاد پر وہ اس شخص پر ہاتھ ڈال سکیں۔ لیکن اس شخص سمیت اس کی فیملی کے نہایت شفاف ریکارڈ سے اب تک کوئی مشکوک بات نہیں نکال سکے مگر آخری پندرہ منٹ میں انہیں اس فیملی کی کسی لڑکی کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے کوئی سراغ مل جاتا ہے۔
لے۔ وہ کئی راتوں سے تکلیف میں تھی۔ سکون آور ادویات کے بغیر سو نہیں پارہی تھی۔ وہ اپنے باپ سے بس ایک سوال

کرنے آئی تھی کہ اس نے اس کی فیملی کو کیوں مار ڈالا۔

6۔ اسپیلنگ بی کے بانوے مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے چودھویں راؤنڈ میں ہیں۔ تیرہ سالہ بچی نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک صرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست اسپیلنگ بتادی۔ ایک اضافی لفظ کے درست ہجے بتانے پر وہ مقابلہ جیت سکتا تھا۔ جسے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آجاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد مطمئن اور ذہین بچے کے چہرے پر پریشانی پھیلی جسے دیکھ کر اس کے والدین اور ہال کے دیگر مہمان بے چین ہوئے مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی سات سالہ بہن مسکرا دی۔

A۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بددیانتی کر رہی ہے مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کردی اور ترمیم شدہ باب کا پرنٹ نکال کر دیگر ابواب کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔

7۔ وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے۔ لڑکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر مرد نے انکار کردیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی نے پھر ڈانس کی آفر کی اس نے اس بھی انکار کردیا۔ وہ لڑکی اس مرد سے متاثر ہو رہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے کے بارے میں کہتی ہے۔ اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔

4۔ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اسے چھوڑ آئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال و جواب نے اسے سوچنے پر مجبور کردیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملول نظر آتی ہے۔

5۔ وہ جیسے ہی گھر آیا۔ معمول کے مطابق اس کے دونوں بچے اپنا کھیل چھوڑ کر اس کے گلے آلگے۔ حسب معمول اس کی بیوی نے بھی جو تیسری بار امید سے تھی اس کا پرتپاک استقبال کیا۔ وہ لان میں اپنی بیوی بچوں کو مطمئن و مسرور دیکھ کر سوچ رہا ہے کہ اگر وہ چند پیپر پھاڑ کر پھینک دے تو اس کی زندگی آئندہ بھی اسی طرح خوب صورت رہ سکتی ہے۔ مگر وہ ضروری فون آجاتا ہے۔ جس کا وہ انتظار کر رہا ہے۔ اب اسے اپنی فیملی اور استعفیٰ میں سے ایک چیز کا انتخاب کرنا تھا۔

8۔ پریذیڈنٹ ایک انتہائی مشکل صورت حال سے دوچار تھا۔ اس کا فیصلہ کانگریس کے الیکشنز پر بری طرح اثر انداز ہو سکتا تھا۔ کیبنٹ کے چھ ممبرز کے ساتھ پانچ گھنٹے کی طویل نشست کے بعد اسے پندرہ منٹ کا وقفہ لینا پڑا تھا۔ فیصلے کی ذمہ داری اس کے سر تھی۔ آخر کار وہ ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔

10۔ الزائمر کے مریض باپ کو وہ اپنے ہاتھوں سے یخنی پلا رہا تھا۔ اس کے انداز میں اپنے باپ کے لیے نہایت پیار' احترام اور تحمل ہے۔ اس کے باپ کو معلوم نہیں کہ وہ اس کے ہاتھ سے آخری بار کھانا کھا رہا ہے۔ اس کا سامان ایئرپورٹ پر جا چکا ہے اور وہ گاڑی کا انتظار کر رہا ہے۔

Q۔ وہ نیلے رنگ کی شفاف جھیل پر اس کے ہمراہ ہے۔ خوب صورت حسین مناظر میں گھری جھیل میں وہ صندل کی لکڑی کی کشتی میں سوار ہے۔

K۔ وہ تیسری منزل پر بنے اپارٹمنٹ کے بیڈ روم کی کھڑکی سے ٹیلی اسکوپ کی مدد سے ساٹھ فٹ کے فاصلے پر اس بینکوئٹ ہال پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ ٹائم نو بج کر دو منٹ ہو رہے ہیں۔ پندرہ منٹ بعد وہ مہمان بینکوئٹ ہال میں داخل ہوگا۔ وہ ایک پروفیشنل شوٹر ہے۔ اسے مہمان کو نشانہ بنانے کے لیے ہائر کیا گیا ہے۔

3۔ وہ اس سے اصرار کر رہی ہے کہ نجومی کو ہاتھ دکھایا جائے۔ وہ مسلسل انکار کرتا ہے مگر اس کی خوشی کی خاطر مان لیتا ہے نجومی لڑکی کا ہاتھ دیکھ کر بتاتا ہے کہ اس کے ہاتھ پر شادی کی دو لکیریں ہیں۔ دوسری لکیر مضبوط اور خوشگوار شادی کو ظاہر کرتی ہے۔ وہ دونوں ساکت رہ جاتے ہیں۔

آبِ حیات

ایک خوب صورت اتفاق نے سالار اور امامہ کو یکجا کر دیا۔ اس نے امامہ کو سال بعد دیکھا تھا۔ ان کی ابتدائی زندگی کا پہلا اختلاف لائٹ پر ہوا۔ سالار کو لائٹ آن کر کے سونے کی عادت تھی جبکہ امامہ کو روشنی میں نیند نہیں آتی تھی۔ لیکن سالار نے امامہ کی بات مان لی۔ صبح وہ امامہ کو جگائے بغیر سحری کر کے نماز پڑھنے چلا جاتا ہے' امامہ سحری کے لیے اٹھتی ہے تو فرقان کے گھر سے کھانا آیا رکھا ہوتا ہے۔ امامہ اسے سالار کی بے اعتنائی سمجھتی ہے۔ سعیدہ اماں سے فون پر بات کرتے ہوئے وہ رو پڑتی ہے اور وجہ پوچھنے پر اس کے منہ سے نکل جاتا ہے کہ سالار کا رویہ اس کے ساتھ ٹھیک نہیں ہے۔ سعیدہ اماں کو سالار پر سخت غصہ آتا ہے۔ وہ ڈاکٹر سبط علی کو بھی بتا دیتی ہیں کہ سالار نے امامہ کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ سالار ڈاکٹر سبط علی کے گھر امامہ کا روکھا رویہ محسوس کرتا ہے سعیدہ اماں بھی سالار کے ساتھ ناراضی سے پیش آتی ہیں۔ پھر امامہ اس رات سعیدہ اماں کے ہی گھر رہ جاتی ہے۔ سالار کو اچھا نہیں لگتا مگر وہ منع نہیں کرتا۔ امامہ کو یہ بھی برا لگتا ہے کہ اس نے ساتھ چلنے پر اصرار نہیں کیا۔ اس کو سالار سے یہ بھی شکوہ ہوتا ہے کہ اس نے اسے منہ دکھائی نہیں دی۔

سالار اپنے باپ سکندر عثمان کو بتا دیتا ہے کہ اس کی شادی آمنہ نامی جس لڑکی سے ہوئی ہے' وہ دراصل امامہ ہے۔ سکندر عثمان اور طیبہ سخت پریشان ہو جاتے ہیں۔ امامہ کو فرقان کے گھر روزانہ کھانا کھانے پر بھی اعتراض ہوتا ہے' وہ سالار کے سی فوڈ کھانے پر بھی۔ سکندر عثمان' طیبہ اور انیتا ان دونوں سے ملنے آتے ہیں اور امامہ سے بہت پیار سے ملتے ہیں۔ وہ سالار کا ولیمہ اسلام آباد میں کرنے کے بجائے اب لاہور میں کرنے کا منصوبہ بناتے ہیں۔ ڈاکٹر سبط امامہ سے سالار کے ناروا سلوک کے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو وہ شرمندہ ہی ہو جاتی ہے کیونکہ وہ بات اتنی بڑی نہیں تھی جتنی اس نے بنا ڈالی تھی۔ سالار' امامہ سے اسلام آباد چلنے کو کہتا ہے۔ تو امامہ خوف زدہ ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر سبط' سالار کو سمجھاتے ہیں۔ وہ خاموشی سے سنتا ہے۔ وضاحت اور صفائی میں کچھ نہیں بولتا مگر ان کے گھر سے واپسی پر وہ امامہ سے ان شکایتوں کی وجہ پوچھتا ہے۔ وہ جواباً" روتے ہوئے وہی بتاتی ہے' جو سعیدہ اماں کو بتا چکی ہے۔ سالار کو اس کے آنسو تکلیف دیتے ہیں' پھر وہ اس سے معذرت کرتا ہے اور سمجھاتا ہے کہ آئندہ جو بھی شکایت ہو کسی اور سے نہ کرنا' ڈائریکٹ مجھے ہی بتانا' وہ اس کے ساتھ سعیدہ اماں کے گھر سے جہیز کا سامان لے کر آتا ہے' جو کچھ امامہ نے خود جمع کیا ہوتا ہے اور کچھ ڈاکٹر سبط نے اس کے لیے رکھا ہوتا ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں گھٹیا رومانوی ناول دیکھ کر سالار کو کوفت

ہوتی ہے اور وہ انہیں تلف کرنے کا سوچتا ہے۔ مگر امامہ کی وجہ سے رک جاتا ہے۔ سالار اپنے بینک میں امامہ کا اکاؤنٹ کھلوا کر تیس لاکھ روپے اس کا حق مہر جمع کرواتا ہے۔ وہ امامہ کو لے کر اسلام آباد جاتا ہے اور ایئرپورٹ پر اسے بتاتا ہے کہ سکندر عثمان نے منع کیا تھا۔ امامہ کو شدید غصہ آتا ہے۔ گھر پہنچنے پر سکندر عثمان اس سے شدید غصہ کرتے ہیں۔

سکندر عثمان سالار کی اسلام آباد آمد پر پریشان ہو جاتے ہیں۔ امامہ کو اس گھر میں آ کر شدید ڈپریشن ہوتا ہے۔ وہ نو سال بعد سالار کے گھر سے اپنے گھر کو دیکھتی ہے۔ دو دن رہ کر وہ واپس آ جاتے ہیں۔ امامہ کہتی ہے کہ وہ اسلام آباد میں رہنا چاہتی ہے۔ سالار کی جاب یہاں ہے تو وہ مہینے میں ایک دفعہ آ جایا کرے۔ اس کی اس بات سے سالار کو دکھ ہوتا ہے۔ پھر جب وہ کہتا ہے کہ اسے امریکہ چلے جانا ہے تو امامہ کہتی ہے کہ وہ دوسری شادی کر لے۔ یہ تجویز سالار کے لیے شاکنگ ہوتی ہے۔ وہ امامہ سے اس کی توقع نہیں کرتا تھا۔

سالار امامہ کو کراچی لے کر جاتا ہے تو وہ انیتا کے گھر جاتی ہے۔ وہ سالار سے کہتی ہے کہ وہ بھی ایسا شاندار گھر چاہتی ہے جس میں سبزیوں کا فارم، فش فارم ہو اور وہ کم از کم ایک ایکڑ کا ہونا چاہیے۔ سالار حیران رہ گیا تھا۔ عید کے موقع پر اس کو میکے کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ سالار کے ساتھ ایک پارٹی میں شراب کی موجودگی پر اس کے دل میں سالار کے لیے بدگمانی آ جاتی ہے۔ جس کو سالار دور کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ اب ان چیزوں سے بہت دور جا چکا ہے۔ سالار بینک میں کام کرتا ہے۔ امامہ اس سے سود کے مسئلہ پر بحث کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے سود حرام ہے۔

امامہ سالار کا خیال رکھتی ہے۔ اس کی سالار کے دل میں قدر تھی، لیکن وہ زبان سے اظہار نہیں کرتا۔ سالار البتہ جلال کے لیے اس کے دل میں جو نرم گوشہ ہے اس سے بری طرح ہرٹ ہوتا ہے۔

سالار اپنا پلاٹ بیچ کر تقریباً ڈیڑھ کروڑ کی انگوٹھی خرید کر دیتا ہے۔ سکندر عثمان کو جب یہ بات پتا چلتی ہے تو وہ حیران رہ جاتے ہیں پھر وہ اس سے پوچھتے ہیں۔ "کہاں سے لی تھی یہ رنگ؟"

میں غارت گر (حصہ دوم)

چھٹی قسط

"کہاں سے لی تھی رنگ؟" بالآخر انہوں نے لمبی خاموشی کو توڑا۔

"Tiffany سے۔" انہیں ایسے ہی کسی نام کی توقع تھی۔

"ڈیزائن کرایا ہوگا؟" اس مالیت کی انگوٹھی نادر ہی ہو سکتی تھی۔

"جی' Jewellery statement۔"

اس نے Tiffany کی سب سے مہنگی رینج میں آنے والی جیولری کی کولیکشن کا نام لیا' وہ زندگی میں ہمیشہ قیمتی چیزیں خریدنے اور استعمال کرنے کا عادی تھا۔ سکندر یہ جانتے تھے' لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ انہیں اس کی اس عادت پر اعتراض ہوا تھا۔

"تو کوئی اس سے زیادہ مہنگی رنگ نہیں تھی؟ ابھی دوسرا پلاٹ پڑا تھا' چار ہیرے اور لگوا دیتے اس میں۔"

سکندر نے ٹیبل پر پڑے سگار کیس سے ایک سگار نکالتے ہوئے بے حد سنجیدگی سے اس سے کہا تھا۔ سالار کے دائیں گال میں ڈمپل پڑا۔ اس نے یقیناً "اپنی مسکراہٹ ضبط کی تھی۔ سکندر کا خیال تھا' یہ مسکراہٹ شرمندگی کی تھی۔ ان کے پاؤں تلے سے یقیناً" زمین کھسک جاتی اگر انہیں یہ پتا چلتا کہ اس نے پہلے دونوں پلاٹس بیچ کر اسے ایک نیکلس دینے کا سوچا تھا' لیکن پھر یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ اسے ایک انگوٹھی دینے کا خیال آیا جو امامہ مستقل طور پر پہن سکتی تھی۔

سگار سلگائے، ریوالونگ چیئر کی پشت سے ٹیک لگائے وہ اب بھی اسی پر نظریں جمائے ہوئے تھے اور خود پر مسلسل جمی ان کی نظروں نے سالار کو کنفیوز کرنا شروع کر دیا تھا۔
"میں کتابوں میں جب رانجھا، فرہاد، رومیو، مجنوں وغیرہ کے بارے میں پڑھتا تھا تو میں سوچتا تھا کہ یہ ساری لفاظی ہے، کوئی مرد اتنا الو کا پٹھا نہیں ہو سکتا، لیکن تم نے یہ ثابت کیا ہے مجھ پر کہ ہو سکتا ہے۔ کسی بھی زمانے میں کوئی بھی مرد کسی بھی عورت کے لیے عقل سے پیدل ہو سکتا ہے۔" سالار نے اس بے عزتی کو سر جھکائے شہد کے گھونٹ کی طرح پیا۔ اس کی اتنی بے عزتی کرنا تو سکندر کا حق تھا۔
"لیکن ان میں سے کسی کے باپ نے انہیں Yale میں پڑھانے کے بعد یہ سب کچھ کرتے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا، اور ان میں سے ہر ایک محبوبہ کے لیے پاگل تھا۔ بیوی کے لیے تو صرف ایک شاہ جہاں نے پیسے لٹائے تھے، وہ بھی اس کے مرنے کے بعد۔ تمہیں کیا ہو گیا تھا؟" سکندر نے جیسے اسے شرم دلائی تھی۔
"میں نے دراصل امامہ کو ابھی تک شادی کا کوئی گفٹ نہیں دیا تھا۔" اس کے لہجے میں بلا کا اطمینان تھا۔
سکندر زندگی میں پہلی بار اس کی ڈھٹائی سے متاثر ہوئے تھے۔ انسان اگر ڈھیٹ ہو تو پھر اتنا ڈھیٹ ہو۔
"تو اپنے پیسوں سے اسے گفٹ دیتے۔" انہوں نے طنزیہ کہا تھا۔
"وہ بھی دے دیے ہیں اسے۔" اس نے طنز کا جواب سنجیدگی سے دے کر انہیں حیران کر دیا۔
وہ اس "بادشاہ" کی شکل دیکھ کر رہ گئے جو اپنی بیوی پر اپنی سلطنت لٹانے پر تلا ہوا تھا۔
اپنا سگار ایش ٹرے میں رکھتے ہوئے وہ ٹیبل پر کچھ آگے جھکے اور انہوں نے بیٹے ایک ہمراز کی طرح اس سے کہا۔ "سالار! ایسا بھی کیا ہے امامہ میں کہ تم عقل سے پیدل ہو گئے ہو؟"
یہ طنز نہیں تھا، وہ واقعی جاننا چاہتے تھے۔
سالار نے چند لمحوں کے لیے سوچا پھر بے حد سادہ لہجے میں کہا۔
"بس، وہ اچھی لگتی ہے مجھے۔"
وہ اس وقت سکندر کو تیس سال کا مرد نہیں بلکہ تین سال کا ایک معصوم سا بچہ لگا تھا۔ جس کے لیے دنیا کی مہنگی ترین چیز کے حصول کی خواہش کی وجہ صرف اس کا "اچھا" لگنا تھا۔ اس اچھے لگنے میں سوپر لیٹو، کمپیریٹو، پازیٹو کوئی ڈگری نہیں ہوتی۔
ایک طویل سانس لیتے ہوئے وہ سیدھے ہو گئے۔ "اسے پتا ہے رنگ کی پرائس کا؟"
"نہیں۔"
سکندر کچھ اور حیران ہوئے۔ یہاں اپنی محبوبہ کو متاثر اور مرعوب کرنے کا کوئی جذبہ بھی کارفرما نہیں تھا۔
"آپ بھی ممی یا کسی دوسرے سے بات نہ کریں۔ میں نہیں چاہتا امامہ کو پتا چلے۔"
وہ اب ان سے کہہ رہا تھا۔ سکندر جواب دینے کے بجائے دوبارہ سگار کا کش لینے لگے۔
"باقی تیرہ لاکھ کا کیا کیا؟"
وہ اب کچھ اور "کارناموں" کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔
"سات لاکھ تو امامہ کو حق مہر کا دیا..... وہ ڈیو تھا۔" اس نے انہیں حق مہر کی اصل رقم بتائے بغیر کہا۔
"اور باقی چھ لاکھ میں نے کچھ خیراتی اداروں میں دے دیا، کیونکہ امامہ کی رنگ پر اتنے پیسے خرچ کیے تھے تو میں نے سوچا کچھ خیرات بھی کرنا چاہیے۔"
سکندر عثمان کا غصہ دھوئیں کے مرغولوں میں تحلیل ہو رہا تھا، غصے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ اسے فیاضی کہتے،

بے وقوفی کہتے یا فضول خرچی' لیکن سامنے بیٹھی ہوئی اپنی اس اولاد کے لیے ان کے دل میں نرم گوشہ ذرا کچھ اور وسیع ہوا تھا۔ وہ اس کے کوڈ آف لائف کو نہ کبھی سمجھے تھے' نہ کبھی بدل سکے تھے' لیکن اختلاف رکھنے کے باوجود' کہیں نہ کہیں وہ احترام کا ایک احساس بھی رکھتے تھے اس کے لیے۔

سالار نے باپ کے ہونٹوں پر ایک مشفقانہ' لیکن بے حد معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوتے دیکھی۔

"اور حق مہر صرف سات لاکھ تو نہیں ہوگا۔۔۔ ہے نا سالار؟ تو وہ کتنے ملین دیا گیا ہے؟"

انہوں نے بے حد پچکارتی ہوئی آواز میں اس سے کہا۔

سالار بے اختیار ہنسا۔ سکندر عثمان اس کے سیدھے جملوں میں چھپے پھندوں کو ڈھونڈنے میں ماہر تھے۔

"جانے دیں پاپا۔" اس نے ٹالا تھا۔

"یعنی millions میں ہے؟" ان کا اندازہ ٹھیک تھا۔

"اب میں جاؤں؟" سالار نے جواب دینے کے بجائے پوچھا۔ سکندر نے سر ہلا دیا۔

وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر ان کی طرف آیا اور اس نے جھکتے ہوئے کرسی پر بیٹھے سکندر کو ساتھ لگایا پھر وہ سیدھا ہو گیا۔

"سالار' جو دوسرا پلاٹ ہے' اس کے پیپرز مجھے لاہور پہنچ کر بھجوا دینا۔"

سکندر نے بڑے معمول کے لہجے میں اسے جاتے دیکھ کر اس سے کہا تھا۔

"پاپا! ٹرسٹ می۔" سالار نے کہا۔

"شٹ اپ۔"

"او کے۔" وہ ہنس پڑا تھا۔

وہ سگار پیتے ہوئے اس کے جانے کے بعد بھی اسی کے بارے میں سوچتے رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

"Oh Tiffany Statement." وہ اس رات کسی ڈنر پر تھے جب اس کی رنگ مسز زیویئرز نے نوٹس کی تھی۔

وہ بزنس کلاس کا ایک بڑا نام تھیں اور خود اپنے لباس اور جیولری کے لیے بھی بے حد شہرت رکھتی تھیں۔ ان کا کسی چیز کو نوٹس کرنا خاص اہمیت رکھتا تھا۔

"مائی ویڈنگ رنگ۔" امامہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ اس کا ہاتھ پکڑے اس رنگ کو بے حد مرعوب انداز میں دیکھ رہی تھیں اور ان کا یہ انداز اس ٹیبل پر بیٹھی تمام خواتین میں اس رنگ کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا کر رہا تھا۔

The most beautiful and expensive piece
of jewellary under this roof to night

(آج رات اس چھت کے نیچے یہ سب سے خوب صورت اور سب سے مہنگی جیولری ہے) مسز زیویئرز نے جیسے اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔

Lucky woman your husband's taste is class a part

(لکی وومین! تمہارے شوہر کا ذوق بہت اعلا ہے)

امامہ ان ستائشی جملوں پر قدرے فخریہ انداز میں مسکرائی۔ وہ رِنگ جب سے اس کے ہاتھ کی زینت بنی تھی اسی طرح نوٹس ہو رہی ہے۔

"کیا قیمت ہوگی؟" بائیں جانب بیٹھی مسز زبیر نے بھی اس کی رنگ کو ستائشی انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے نہیں پتا۔ شاید چار یا پانچ لاکھ۔" امامہ نے گلاس اٹھا کر پانی کا گھونٹ لیتے ہوئے اندازہ لگایا۔

ایک لمحہ کے لیے اس نے ٹیبل پر چھا جانے والی خاموشی کو محسوس کیا پھر خود پر جمی نظروں کو۔

"ڈالرز یا پاؤنڈز؟"

اس نے بے حد حیرانی سے مسز زویئرز کی شکل دیکھی، پھر ہنس پڑی۔ اس نے اسے مذاق سمجھا تھا۔

"میرا شوہر اتنا بے وقوف نہیں ہو سکتا۔" اس نے بے ساختہ کہا۔

مسز زویئرز نے دوبارہ یہ سوال نہیں کیا۔ وہ سمجھی تھیں امامہ قیمت بتانا نہیں چاہتی۔

"سالار! اس رنگ کی کیا قیمت ہے؟" اس رات بیڈ پر بیٹھے ناول پڑھتے امامہ کو یک دم مسز زویئرز کا سوال یاد آیا۔ اپنا ہاتھ سالار کے سامنے پھیلاتے ہوئے اس نے کہا۔

"کیوں؟" وہ بھی کوئی کتاب پڑھتے ہوئے چونکا تھا۔

"مسز زویئرز نے اور سب لوگوں نے بھی بہت تعریف کی۔" اس نے بے حد فخریہ انداز میں کہا۔

"دیٹس گڈ۔" وہ مسکرا کر دوبارہ کتاب کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"مسز زویئرز نے قیمت پوچھی تھی میں نے کہا چار یا پانچ لاکھ ہوگی۔ انہوں نے پوچھا ڈالرز یا پاؤنڈز۔ میں نے کہا میرا شوہر اتنا بے وقوف نہیں ہو سکتا۔" وہ بے اختیار کتاب پر نظریں جمائے ہنس پڑا۔

"کیا ہوا؟" وہ چونکی۔

"کچھ نہیں۔ کچھ پڑھ رہا تھا۔" سالار نے بے ساختہ کہا۔

"تو کیا قیمت ہے اس کی؟" امامہ نے دوبارہ پوچھا۔

"یہ انمول ہے۔" سالار نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"کوئی بھی چیز جو تمہارے ہاتھ میں ہو انمول ہے۔"

"پھر بھی۔" اس نے اصرار کیا۔

"Two hundred and fifty six." سالار نے ڈالرز ساتھ نہیں لگایا۔

"اوہ اچھا، میں زیادہ ایکسپینسو (مہنگی) سمجھ رہی تھی۔" وہ کچھ مطمئن ہو گئی اور دوبارہ ناول دیکھنے لگی۔ وہ اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ اسے فریب دینا 'بہلانا' بے حد آسان تھا اور یہ آسانی بعض دفعہ اسے بڑی مشکل میں ڈال دیتی تھی۔

امامہ نے چند لمحے بعد اس کی نظروں کو اپنے چہرے پر محسوس کیا۔ اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا، وہ کتاب گود میں الٹائے اسے دیکھ رہا تھا۔

"کیا ہوا؟" وہ مسکرا دی۔ وہ ان نظروں کی عادی تھی۔ وہ بعض دفعہ اسے اسی طرح بے مقصد دیکھتا رہتا تھا۔

"تمہیں کچھ بتانا چاہتا تھا۔"

"کیا؟"

"You are the best thing ever happened to me"

وہ ایک لمحہ کے لیے حیران ہوئی پھر ہنس پڑی۔ اس کمپلیمنٹ دینے کی اس وقت کیا وجہ تھی وہ سمجھ نہیں پائی۔

"آئی لو یو۔" وہ پھر ہنس پڑی۔ وہ اس بار بلش ہوئی تھی۔

"تھینک یو۔" جواب وہی تھا' جو ہمیشہ آتا تھا۔ اس بار وہ ہنس پڑا۔

☼ ☼ ☼

"امامہ۔۔۔" وہ گاڑی کے دروازے کو بند کرتی' کرنٹ کھا کر پلٹی تھی۔
وہ جلال تھا' پارکنگ میں اس کے برابر والی گاڑی سے اسے نکلتے ہوئے دیکھ کر ٹھٹکا تھا۔
"او مائی گاڈ آمنہ۔۔۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آج تم سے یہاں ملاقات ہوگی۔"
"ہاؤ آر یو۔" وہ بے حد ایکسائیٹڈ انداز میں اس کی طرف آیا تھا۔
وہ بت بنی اسے دیکھ رہی تھی۔ بعض چیزیں بلاؤں کی طرح انسان کے تعاقب میں رہتی ہیں۔ جہاں بھی ملتی ہیں' انسان کا خون خشک کر دیتی ہیں۔ گاڑی کی چابی مٹھی میں دبائے' وہ بھی زرد چہرے کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا وہ اب بھی اس کا خون نچوڑ لینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔
"اگر نہیں ملے تو سالوں نہیں ملے اور اب ایک ہی سال میں دوبارہ ملاقات ہو رہی ہے۔"
وہ اس کی اڑی ہوئی رنگت پر غور کیے بغیر' بے تکلف دوستوں کی طرح کہہ رہا تھا۔
امامہ نے بالآخر مسکرانے کی کوشش کی۔ یہ ضروری تھا۔۔۔ بے حد ضروری تھا۔۔۔ جلال انصر سے زیادہ خود اس کے لیے۔۔۔ اسے نہ وہ "پرانا دوست" سمجھ سکتی تھی' نہ بے تکلف ہو سکتی تھی۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اسے صرف ایک ہی رشتے اور تعلق کا خیال آیا۔۔۔ ایک ہی خیال آسکتا تھا اسے۔
"میں ٹھیک ہوں۔۔۔ آپ کیسے ہیں؟"
اس نے مسکرانے کی کوشش کی' نظریں تو وہ اب بھی اس سے نہیں ملا سکتی تھی۔ وہ ویسا ہی تھا' جیسا اس نے اس کے کلینک پر آخری ملاقات میں دیکھا تھا۔ وزن پہلے سے کچھ بڑھ گیا تھا اور ہیئر لائن کچھ اور پیچھے چلی گئی تھی' لیکن اپنی زندگی میں وہ اس کا جو امیج لیے بیٹھی تھی' اس کو ان دونوں چیزوں سے فرق نہیں پڑ سکتا تھا۔
"میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔۔۔ میں نے چند ماہ پہلے شادی کر لی ہے۔"
اس کی سمجھ میں نہیں آیا' اس نے اسے یہ خبر دینا کیوں ضروری سمجھا' کیا اس کا اس سے کوئی تعلق تھا؟ یا وہ اسے اس انفارمیشن سے پہلے ہی بتا دینا چاہتا تھا کہ وہ "available" نہیں ہے۔ اس آخری ملاقات میں جو کچھ وہ اس سے کہہ چکا تھا اس کے بعد وہ دستیاب ۔۔۔ ہوتا بھی تو کم از کم اتنی عزت نفس تو وہ رکھتی تھی یا وہ اسے "ضرورت مند" سمجھ رہا تھا اور سمجھ بھی رہا تھا تو کیا غلط کر رہا تھا۔ میری ہی غلطی تھی اگر یوں

بھیک لینے اس کے پاس نہ گئی ہوتی تو کم از کم اس کے سامنے سر تو اونچا رکھ سکتی تھی۔ وہ خود کو ملامت کرنے لگی تھی۔ اور اس کی خاموشی نے جلال کو کچھ اور محتاط کیا۔

"بہت اچھی ہے میری بیوی' وہ بھی ڈاکٹر ہے۔ برٹش نیشنل ہے' اسپیشلائزیشن بھی اس نے وہیں سے کی ہے۔ امیزنگ وومین۔" اس نے چار جملوں میں اس پر اپنی بیوی کی حیثیت واضح کردی تھی۔

ایک لمحے کے لیے وہ بھول گئی تھی کہ وہ بھی کسی کی بیوی ہے۔ اپنے پیروں کے نیچے زمین لیے کھڑی تھی۔ اس کے منہ سے کسی دوسری عورت کے لیے "میری بیوی" کے الفاظ نے چند لمحوں کے لیے اسے اسی طرح ادھیڑا تھا۔

"مبارک ہو۔" اس نے بالآخر وہ لفظ کہے' جو اسے کہنے چاہیے تھے۔

"تھینکس' میں تم کو ضرور بلاتا اگر میرے پاس تمہارا کانٹیکٹ نمبر ہوتا۔ پہلی بار تو نہیں بلا سکا تھا' لیکن دوسری بار تو بلا سکتا تھا۔" جلال نے بات کرتے کرتے جیسے مذاق کیا تھا۔ وہ مسکرا نہیں سکی۔ وہ بھی اس کے اس مذاق پر مسکرا نہیں سکتی تھی۔

"تم نے تو اس کے بعد کوئی رابطہ ہی نہیں کیا۔ کوئی فون' کوئی وزٹ' کچھ نہیں... میں تو انتظار ہی کرتا رہا۔" وہ اب اس کا جائزہ لے رہا تھا اور اسے اس میں ہونے والی تبدیلیوں کا بھی احساس ہوا تھا۔

یہ امامہ سات آٹھ ماہ پہلے والی امامہ سے بے حد مختلف تھی۔ وہ اب بھی پہلے کی طرح ایک چادر میں ملبوس تھی' لیکن اس کی چادر اور لباس بے حد نفیس اور مہنگے تھے باوجود اس کے کہ وہ Casual Dress میں تھی۔ اس کے ہاتھوں اور کانوں میں پہنی ہوئی جیولری نے جلال کو ایک لمحہ کے لیے چونکایا تھا۔ اس کی ویڈنگ فنگر میں ایک رنگ تھی' لیکن یہ وہ وہم تھا جس کی وہ تصدیق نہیں چاہتا تھا۔ کیوں۔؟ پتا نہیں کیوں یہ وہ چہرہ نہیں تھا' جسے اس نے اپنے کلینک پر دیکھا تھا۔ میک اپ سے عاری چہرے کے ساتھ وہ امامہ اسے ڈری' سہمی' کنفیوزڈ اور بہت بجھی ہوئی لگی تھی۔ سامنے کھڑی امامہ کے چہرے پر بھی میک اپ نہیں تھا اور اس کے بال بھی بے حد عام انداز میں ڈھیلے جوڑے کی شکل میں لپٹے ہوئے اس کی گردن کی پشت پر نظر آرہے تھے۔ یوں جیسے وہ اتفاقاً کسی کام سے گھر سے نکلی ہو۔ لیکن اس کے باوجود اس کے چہرے اور آنکھوں میں ایک چمک تھی۔ اس کی باڈی لینگویج ویسی ہی تھی جیسی بارہ سال پہلے کی امامہ کی طرح تھی' وہ امامہ جس سے پہلی بار مل کر وہ اٹریکٹ ہوا تھا۔ کیئرلیس' بے نیاز' لیکن بے حد پُراعتماد اور پرسکون۔ ایک نظر میں ہی جلال کو احساس ہو گیا تھا کہ امامہ ہاشم بہت بدل چکی ہے' کیسے اور کیوں؟ اسے تھوڑی سی بے چینی ہوئی۔

اس کے عقب میں کھڑی ایک قیمتی گاڑی کو بظاہر سرسری دیکھتے ہوئے' جلال نے اس سے پوچھا۔

"تم اب بھی اسی فارماسیوٹیکل کمپنی میں کام کرتی ہو؟" اس کا جی چاہا تھا کہ کاش اس میں آنے والی ساری تبدیلیاں کسی بونس' کسی ہینڈسم پے پیکیج کی مرہون منت ہوں۔ کمینی خواہش تھی' لیکن جلال انصر کی اس وقت یہی خواہش تھی۔ مرد کو اپنی متروکہ عورت کو Moved on دیکھ کر ہتک کا احساس ہوتا ہے اور وہ اس احساس سے بچنا چاہتا تھا۔

"نہیں میں نے جاب چھوڑ دی تھی۔" اس نے مدھم آواز میں کہا۔

"اوہ! اچھا۔" وہ بڑبڑایا۔

"تو تم کچھ نہیں کر رہیں آج کل؟"

امامہ چند لمحے خاموش رہی۔ اگلا جملہ کہنا مشکل تھا مگر بے حد ضروری تھا۔

"میری شادی ہو گئی ہے۔" وہ اب بھی یہ نہیں کہہ سکی کہ میں نے شادی کر لی۔ جلال کے چہرے سے ایک لمحہ

کے لیے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔
"اوہ! اچھا کانگریچولیشنز۔" وہ بروقت سنبھلا تھا۔ امامہ نے اس کی آواز کی لڑکھڑاہٹ نوٹس نہیں کی۔
"تم نے بتایا ہی نہیں — نہ انوائٹ کیا۔ کیا کرتا ہے وہ؟"
"آپ جانتے ہیں اسے۔ سالار سکندر۔" اس نے گلا صاف کر کے کہا۔
"اوہ۔" ایک لمحے کے لیے جلال کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں بچا۔
"وہ بینکر ہے میں جانتا ہوں۔" جلال اس کی بات کاٹ کر اسے سالار کا بینک اور اس کی ڈیز گنیشن بتانے لگا۔
"آپ کو کیسے پتا ہے؟" وہ حیران ہوئی۔
"آدھے شہر کو تمہارے شوہر کے بارے میں پتا ہو گا۔ بزنس کمیونٹی سے میرا کافی ملنا جلنا ہے تو اس کے بارے میں پتا چلتا رہتا ہے۔ دو چار بار گیدرنگز میں دیکھا بھی ہے میں نے لیکن ملاقات نہیں ہوئی۔" وہ اب نارمل ہو رہا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔
"آؤ لنچ کرتے ہیں۔ گپ شپ لگائیں گے، اتنے عرصے بعد ملے ہیں۔ بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔" اس نے بے تکلفی اور گرم جوشی سے کہا۔
وہ شہر کے مصروف اور مہنگے ترین ڈاکٹرز میں سے ایک تھا۔ پرانی محبوبہ کے لیے وقت نکالنا مشکل ہوتا لیکن شہر کے سب سے زیادہ بااثر بینکر کی بیوی کے لیے وقت نکالنا مشکل نہیں تھا۔ امامہ ہاشم ایک دم اس کی سوشل نیٹ ورکنگ کے ایک مضبوط ترین امیدوار کے طور پر سامنے آگئی تھی۔
"نہیں میں گروسری کے لیے آئی ہوں — ڈنر کے لیے کچھ چیزیں چاہیے تھیں مجھے۔"
امامہ نے اسے ٹالنا چاہا۔ اسے یقین تھا وہ اصرار نہیں کرے گا۔ جلال کے بارے میں اس کے اندازے آج بھی غلط تھے۔
"یار! گروسری بھی ہو جائے گی میں خود کروا دوں گا لیکن لنچ کے بعد۔ وہ سامنے ریسٹورنٹ ہے ایک۔ گھنٹے میں فارغ ہو جائیں گے ہم۔" جلال نے اسے بات مکمل کرنے نہیں دی۔
"خیر۔" اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن جلال کچھ بھی سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ وہ بادل نخواستہ اس کے ساتھ ریسٹورنٹ میں چلی آئی۔
"تو کیسی گزر رہی ہے تمہاری لائف اپنے شوہر کے ساتھ؟" مینیو آرڈر کرتے ہی جلال نے بڑی بے تکلفی کے ساتھ اس سے پوچھا۔ امامہ نے اس کا چہرہ دیکھا، وہ صرف سوال نہیں تھا، جلال جیسے یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ اس کے علاوہ کسی دوسرے مرد کے ساتھ خوش رہ سکتی ہے یا نہیں۔
"بہت اچھی گزر رہی ہے، میں بہت خوش ہوں سالار کے ساتھ۔"
اسے حیرت ہوئی اس سوال کا جواب دینا کتنا آسان کر دیا تھا سالار نے۔ کچھ کھوجنا، ٹٹولنا یا چھپانا نہیں پڑا تھا۔ وہ اس کے ساتھ "خوش" تھی۔
"گڈ، ارینج میرج تو نہیں ہو گی۔؟ سالار اور تم نے اپنی مرضی سے کی ہو گی۔" اس نے جلال کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی۔ وہ اس سوال سے کیا جاننا چاہتا تھا؟
"ہاں! سالار نے اپنی مرضی سے مجھ سے شادی کی ہے۔ اس نے اپنی فیملی سے پوچھا نہیں تھا بلکہ بتایا تھا۔ سالار کا خیال تھا کہ مرد کو شادی کرتے وقت اپنی مرضی دیکھنی چاہیے، فیملی کی نہیں۔"
جلال کے چہرے کا رنگ بدلا تھا اور خود وہ بھی چند لمحے تک کوئی اگلا جملہ نہیں بول سکی۔ اس نے وہ آخری بات کس حوالے سے اور آخر کیوں کہی تھی، اس کی وجہ اس وقت وہ خود بھی سمجھ نہیں پائی تھی۔ وہ نہ اسے کوئی طعنہ

دینے آئی تھی، نہ گلہ کرنے، پھر ایسی بات؟

"بہت زیادہ انڈیپینڈنٹ سوچ رکھتا ہے وہ۔" اس نے چند لمحوں بعد جلال کو جیسے کچھ تاویل دینے کی کوشش کی۔ تاویل پچھلے جملے سے بھی زیادہ چبھی تھی۔

"ظاہر ہے، سالانہ لاکھوں کمانے والے شوہر کی تعریف بیوی پر فرض ہوتی ہے۔"

اس بار اس کا ہنس کر کہا ہوا جملہ امامہ کو چبھا تھا۔

"لاکھوں کا تو مجھے نہیں پتا لیکن اچھے شوہر کی تعریف بیوی پر فرض ہوتی ہے۔"

جلال نے اس کے جملے کو نظرانداز کرتے ہوئے ہنس کر کہا۔ "تو پتا رکھا کرو نا اس کے لاکھوں کا۔ کیسی بیوی ہو تم۔؟ ڈیڑھ دو کروڑ تو بنا ہی لیتا ہو گا سال میں۔ بہت بڑے بڑے mergers کروا رہا ہے تمہارا شوہر، تمہیں پتا نہیں؟"

"نہیں ہم اور چیزوں کے بارے میں باتیں کرتے ہیں۔ "ضروری" چیزوں کے بارے میں۔"

اس کا لہجہ بے حد سادہ تھا لیکن جلال کے پیٹ میں گرہیں پڑی تھیں۔ اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔ بعض دفعہ ہنسی کی شدید ضرورت پڑ جاتی ہے۔

"چالاک مردوں کو ایسی ہی بیویوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ تم لوگوں کی رہائش کہاں ہے؟"

اس نے جوتا مارا، پھر معصومیت سے سوال کیا۔

امامہ نے اس کے تبصرے پر کچھ کہنے کے بجائے اسے اپنا ایڈریس بتایا۔ وہ اس کے ساتھ سالار کو مزید ڈسکس نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"اوہ! اپارٹمنٹ۔ وہ بھی رینٹیڈ۔ کوئی گھر لینا چاہیے تھا تم لوگوں کو۔ اگر تم لوگ انٹرسٹڈ ہو تو میرے دو تین گھر ہیں اچھے پوش ایریاز میں۔ تم لوگ رینٹ کر لو۔" جلال نے فیاضانہ آفر کی۔

"نہیں، نہیں، ضرورت نہیں ہے۔ ہم کمفرٹیبل ہیں وہاں۔" امامہ نے کہا۔

وہ اب اسے اپنے گھر کی تفصیلات بتانے لگا۔ اس کا رقبہ، اس کا نقشہ اور دنیا جہاں کا وہ سامان جو اس نے اپنے گھر کے اندر اکٹھا کیا تھا۔

"تم سالار کے ساتھ آؤ نا کسی دن کھانے پر۔" بات کرتے کرتے اس نے یوں کہا کہ جیسے وہ واقعی صرف "دوست" ہی تھے، اور دوست ہی "رہے" تھے۔ وہ بول نہیں سکی، اگر وہ بے حس تھا تو بہت ہی زیادہ تھا، اگر ظالم تھا تو انتہا کا تھا۔

"اوہ، جلال صاحب۔ دیکھیں! یہاں ملاقات ہو رہی ہے۔"

وہ ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا جو ریسٹورنٹ کے اندر اپنی بیوی کے ساتھ ان کی ٹیبل کے پاس سے گزرتے ہوئے جلال سے ملنے لگا۔ امامہ چونک کر اس آدمی کی طرف متوجہ ہوئی۔

"یہ بھابھی ہیں؟" وہ آدمی اب جلال سے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں، یہ میری ایک پرانی دوست ہیں۔" جلال نے فوراً سے بیشتر کہا۔

امامہ نے اس آدمی کی آنکھوں میں عزت کا ایک تاثر آتے اور پھر جلال کے تعارف پر اسے غائب ہوتے دیکھا۔ ایک رسمی ہیلو کے بعد وہ آدمی دوبارہ جلال سے گفتگو میں مصروف ہو گیا۔ اس نے اور اس کی بیوی نے امامہ کی طرف دوسری نظر بھی نہیں ڈالی تھی، وہ بے چین ہوئی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ جلال کے اس ادھورے تعارف سے کیا سمجھے ہوں گے۔ جلال کی کوئی گرل فرینڈ۔ کوئی ٹائم پاس۔ کوئی ڈیٹ۔ یا پھر اس کے اسپتال میں کام کرنے والی کوئی ڈاکٹر یا نرس جسے جلال وقت گزاری کے لیے لنچ پر وہاں لے آیا تھا۔

"جلال! میں اب چلتی ہوں۔ بہت دیر ہو رہی ہے۔"

اسے پتا نہیں اچانک کیا ہوا تھا' وہ اپنا بیگ اٹھا کر یک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ جلال کے ساتھ وہ کپل بھی چونکا۔

"نہیں' کھانا آنے والا ہے' کھا کر نکلتے ہیں۔" جلال نے کہا۔

"نہیں' مجھے گروسری کرکے پھر کوکنگ بھی کرنی ہے اور میرے شوہر کو تو گھر آتے ہی کھانا تیار ملنا چاہیے۔ آج ویسے بھی اس نے کچھ خاص ڈشز کہی ہیں۔"

مسٹر اور مسز فاروق نے اس بار مسکرا کر اسے دیکھا تھا' وہ بھی جواباً مسکرائی تھی۔ اس نے "شوہر" کا لفظ کیوں استعمال کیا تھا؟ وہ نہیں جانتی تھی۔ شاید اس کپل کی آنکھوں میں عزت کی اس نظر کو دوبارہ دیکھنے کے لیے' جو چند لمحے پہلے جلال کی بیوی سمجھنے پر ان کی آنکھوں میں جھلکی تھی۔ اس کا انداز اتنا حتمی تھا کہ جلال اس بار اس سے اصرار نہیں کر سکا۔

"اچھا' سالار کا کوئی وزیٹنگ کارڈ اور اپنا کانٹیکٹ نمبر تو دے دو۔" اس نے امامہ سے کہا۔ اس کے بیگ میں سالار کے چند کارڈز تھے' اس نے ایک کارڈ نکال کر جلال کے سامنے ٹیبل پر رکھ دیا۔

"اپنا فون نمبر بھی لکھ دو۔"

وہ ایک لمحہ کے لیے ہچکچائی پھر اس نے اسی کارڈ کی پشت پر اپنا سیل فون نمبر لکھ دیا۔

جلال کے پاس کھڑا آدمی تب تک اس کارڈ پر نام پڑھ چکا تھا۔

"وہ! آپ سالار سکندر کی بیوی ہیں؟" وہ اس کے سوال پر بری طرح چونکی۔

"فاروق صاحب بھی بینکر ہیں' سالار کو جانتے ہوں گے۔" جلال نے فوراً سے پیشتر کہا۔

"بہت اچھی طرح سے۔" اس آدمی کا انداز اب مکمل طور پر بدل چکا تھا۔ وہ ایک مقامی انویسٹمنٹ بینک کے ایگزیکٹیوز میں سے تھا۔ اس نے امامہ کو اپنی بیوی سے متعارف کروایا۔

"آپ کے شوہر بہت بریلینٹ بینکر ہیں۔"

وہ مسز فاروق سے ابھی ہاتھ ملا رہی تھی' جب فاروق نے سالار کے لیے ستائشی کلمات ادا کیے۔

"ہمیں انوائٹ کیا تھا' اس نے کچھ ماہ پہلے ویڈنگ ریسپشن پر' لیکن ہم امریکہ میں تھے۔" مسز فاروق اب بڑی گرم جوشی سے کہہ رہی تھیں اور امامہ کی جان پر بن آئی تھی۔ وہ اندازہ نہیں کر پائی تھی کہ وہ سالار کے کتنے قریب تھے یا صرف سوشل سرکل کا حصہ تھے۔

جو کچھ بھی تھا' وہاں جلال کے پاس بیٹھ کر اپنے شوہر کے کسی شناسا سے ملنا' اس کی زندگی کے سب سے ایمبیرسنگ لمحات میں سے ایک تھا۔

"بہت کلوز فرینڈ شپ ہے امامہ اور سالار کے ساتھ میری' بلکہ فیملی ٹائیز ہیں۔ بس درمیان میں کچھ عرصہ آؤٹ آف ٹچ رہے ہیں ہم۔ دس بارہ سال تو ہو گئے ہوں گے ہماری فرینڈ شپ کو امامہ؟" اس کی سمجھ میں نہیں آیا' وہ کیا کہہ رہا تھا۔ اس نے کچھ حیرانی سے جلال کو دیکھا۔

"ویری نائس۔ آپ سالار کے ساتھ آئیں کسی دن ہماری طرف۔" فاروق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"شیور۔ بس' سالار کچھ مصروف ہے آج کل۔" امامہ نے قدرے گڑبڑا کر مسکراتے ہوئے کہا۔ چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد وہ انہیں خدا حافظ کہتے ہوئے وہاں سے نکل آئی تھی' لیکن وہ بے حد اپ سیٹ تھی۔ وقت ایک بار پھر گیارہ سال پیچھے چلا گیا تھا' اسی میڈیکل کالج میں۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا تھا پھر کئی سال کے بعد جلال کے ساتھ ہونے والی پہلی ملاقات اور پھر آج اس کا سامنا۔

وہ ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں کیا خریدنے آئی تھی' بھول گئی تھی۔ وہ ٹرالی لیے ایک شیلف سے دوسرے شیلف کو

دیکھتے گزرتی رہی' پھر خالی ٹرالی پر نظر پڑنے پر اس نے ہڑبڑاہٹ میں سوچا کہ وہ کیا خریدنے آئی تھی 'لیکن ذہن کی اسکرین پر کچھ بھی نمودار نہیں ہوا تھا' اس نے بے مقصد چند چیزیں اٹھائیں اور پھر باہر آگئی۔ جلال کی گاڑی اب وہاں نہیں تھی۔ اس کی گاڑی کے برابر والی جگہ خالی تھی۔ معلوم نہیں اسے کیوں یہ توقع تھی کہ وہ ریسٹورنٹ سے باہر آکر' اس کے لیے وہاں بیٹھا ہوگا۔ کم از کم اتنا انتظار تو کرتا کہ اسے خود رخصت کرتا۔ اسے خوش فہمی نہیں رہی تھی پھر بھی اسے اتنی کرٹسی کی تو اس سے توقع تھی۔

پارکنگ سے گاڑی نکالنے کے بعد اسے ایک دم احساس ہوا کہ وہ گھر نہیں جانا چاہتی' پھر اسے وہ ساری چیزیں یاد آنے لگیں' جنہیں وہ خریدنے کے لیے آئی تھی لیکن اب وہ دوبارہ کسی گروسری کے لیے جانے کے موڈ میں نہیں تھی۔ بے مقصد وہ سڑک پر ڈرائیو کرتے ہوئے' اسے خود اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ اس کا خیال تھا اس نے کچھ غلط ٹرن لیے تھے اور وہ راستہ بھول گئی ہے۔ بہت دیر بعد اسے احساس ہوا کہ وہ لاشعوری طور پر اس روڈ پر جا رہی تھی' جس طرف سالار کا آفس تھا۔ یہ بے حد احمقانہ حرکت تھی۔ وہ مال روڈ پر تھی اور اب ون وے کی وجہ سے واپس نہیں پلٹ سکتی تھی۔ جب تک وہ یوٹرن لیتی' تب تک وہ اس کے آفس کو کراس کر چکی ہوتی۔ ایک سگنل پر ایک لمبے چوڑے ٹریفک جام میں پھنسے اسے وہ سڑک اور اپنی زندگی' ایک جتنا لمبے لگے تھے' وہ ڈیڑھ گھنٹے پہلے سالار کے ساتھ خوش تھی' لیکن اب وہ خوش نہیں تھی۔

اے سی کی کولنگ یک دم خراب ہونا شروع ہو گئی تھی۔ اس نے اے سی بند کر دیا' وہ کچھ دیر اپنی زندگی میں "گرمی" ہی چاہتی تھی۔ جلال انصر جیسے اس کے جسم کا وہ زخم تھا جو ہر بار ہاتھ لگنے سے رسنے لگتا تھا اور ہر بار ہی اس کا یہ وہم باطل ہو جاتا تھا کہ وہ "زخم" بھر گیا ہے۔

گاڑی بند ہو گئی اور سگنل کھل گیا تھا۔ بے تحاشا ہارن کی آوازوں پر اس نے چونک کر گاڑی اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی۔ وہ ناکام رہی اور بری طرح نروس ہوئی۔ گاڑی کوشش کے باوجود اسٹارٹ نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ایکسپرٹ ڈرائیور نہیں تھی اور اپنے پیچھے گاڑیوں کی لمبی قطار کے ہارن کسی بھی ایکسپرٹ ڈرائیو کو اسی طرح بوکھلا دیتے۔ ایک ٹریفک وارڈن اس کے قریب آگیا۔

"گاڑی خراب ہو گئی ہے' اسٹارٹ نہیں ہو رہی۔" امامہ نے اس سے کہا۔

"پھر لفٹر سے اسے ہٹانا پڑے گا' ورنہ ٹریفک جام ہو جائے گا۔" اس نے اسے بتایا۔

سگنل تب تک دوبارہ بند ہو چکا تھا۔ وہ وائرلیس پر لفٹر کو بلانے لگا اور وہ بے حد ہڑبڑائے ہوئے انداز میں گاڑی کو اسٹارٹ کرنے کی کوشش کرنے لگی' وہ ناکام رہی تھی۔ لفٹر آنے پر وہ گاڑی سے باہر نکل آئی۔ لفٹر میں بیٹھا آدمی اس کو قریبی پارکنگ میں پہنچانے کے بارے میں اسے بتاتے ہوئے کسی رکشہ یا ٹیکسی میں اسے وہاں تک جانے کا کہہ کر غائب ہو گیا۔ مال روڈ پر اس ٹریفک کے درمیان اسے کوئی رکشہ یا ٹیکسی نہیں مل سکتی تھی۔ ہاں' واحد کام جو وہ کر سکتی تھی' وہ سڑک کراس کر کے کچھ فاصلے پر سالار کے آفس تک جانا تھا۔ اسی خالی الذہنی کے عالم میں مال روڈ عبور کر کے اس نے سیل نکال کر سالار کو فون کرنا شروع کر دیا۔ سالار کا فون آف تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اسے اس کے آفس ہی جانا تھا۔ چند منٹ اور چلنے کے بعد اس کے جوتے کا اسٹریپ نکل گیا۔ آج برا دن نہیں تھا بلکہ بدترین دن تھا۔ پسینے سے شرابور ٹوٹے ہوئے جوتے کے ساتھ وہاں کھڑے اس نے ایک بار پھر کسی رکشہ یا ٹیکسی کو ڈھونڈا۔ وہ اس ٹوٹے ہوئے جوتے کے ساتھ اس کے آفس نہیں جانا چاہتی تھی' لیکن فی الحال اسے اس کے علاوہ کوئی چارہ نظر نہیں آیا تھا۔ اسے اپنی حالت پر رونا آنے لگا تھا' لیکن اس رونے کا تعلق اس کی اس حالت سے زیادہ اس کی ذہنی کیفیت سے تھا۔ وہ اس وقت کچھ ایسی ہی دلبرداشتہ تھی۔

اس کے بینک کی اس شاندار عمارت کے سامنے جوتا گھسیٹتے' وہ ایک لمحہ کے لیے ہچکچائی لیکن پھر اس کے ذہن

میں آیا کہ وہ سیدھی اس کے آفس چلی جائے۔
گارڈز کو اپنا تعارف کرواتے ہوئے اس نے ان کی آنکھوں میں اتنی حیرانی اور بے یقینی دیکھی تھی کہ اس کی عزت نفس میں کچھ اور کمی آئی تھی لیکن مین ریسیپشن میں داخل ہوتے ہی اس کی عزت نفس مکمل طور پر ختم ہو گئی تھی۔ شاندار انٹیریئر والا وسیع و عریض ماربلڈ ہال اس وقت سوٹڈ بوٹڈ کورپوریٹ کلائنٹس سے بھرا ہوا تھا۔ آفس کا یہ لے آؤٹ کبھی اس کے تصور میں آجاتا تو وہ وہاں کبھی نہ آتی لیکن اب وہ آچکی تھی۔ ٹوٹی ہوئی چپل فرش پر گھسیٹتے ہوئے اسے اپنا آپ واقعی معذور لگ رہا تھا۔ ریسیپشن کاؤنٹر پر اس نے سالار سکندر سے اپنا رشتہ ظاہر کرنے کی حماقت نہیں کی تھی۔
"مجھے سالار سکندر سے ملنا ہے۔"
اس نے ریسیپشنسٹ سے پوچھنے پر کہا۔ پہلے اگر پسینہ تپتی دھوپ کی وجہ سے آرہا تھا تو اب یہاں اس ماحول کی وجہ سے اسے ٹھنڈا پسینہ آرہا تھا۔
"کیا آپ نے اپائنٹمنٹ لیا ہے میڈم!"
ریسیپشنسٹ نے بے حد پروفیشنل انداز میں مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا۔ اس کا ذہن ایک لحہ کے لیے بلینک ہو گیا۔
"اپائنٹمنٹ۔" وہ حیران ہوئی تھی۔ اس نے جواب دینے کے بجائے ہاتھ میں پکڑے سیل پر ایک بار پھر اس کا نمبر ڈائل کیا۔ اس بار کال ریسیو نہیں ہوئی تھی لیکن بیل بجی تھی۔
"میں اس کی دوست ہوں۔" اس نے کال ختم کرتے ہوئے بے ربطی سے کہا۔
"ابھی وہ ایک میٹنگ میں ہیں۔ میں تھوڑی دیر میں انفارم کر دیتی ہوں۔ آپ کا نام؟"
ریسیپشنسٹ نے کہا۔
"امامہ۔" وہ اپنا نام بتا کر ہال میں پڑے صوفوں میں سے ایک صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔
اسے تقریباً پندرہ منٹ انتظار کرنا پڑا۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے ہوئے آتے جاتے لوگوں کو دیکھتے اسے یہ لمحے بہت طویل لگے تھے۔
پندرہ منٹ بعد اس نے چند افراد کے ساتھ سالار کو بات چیت کرتے ریسیپشن پہ نمودار ہوتے دیکھا۔ وہ اس سے کافی فاصلے پر تھا اور ادھر ادھر نظر دوڑائے بغیر وہ ان لوگوں کے ہمراہ ریسیپشن کی انٹرنس تک گیا تھا۔ ایک لحہ کے لیے امامہ کو خدشہ ہوا کہ وہ کہیں ان کے ساتھ باہر نہ نکل جائے، لیکن وہ دروازے سے کچھ پہلے ان لوگوں سے ہاتھ ملانے لگا تھا۔ وہ یقیناً "انہیں" چھوڑنے کے لیے وہاں آیا تھا۔
چند منٹ دروازے پر ان لوگوں کے ساتھ بات کرنے کے بعد وہ ادھر ادھر دیکھے بغیر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا دوبارہ واپس جانے لگا، ریسیپشنسٹ نے اسے روکا۔ اس نے یقیناً "دور صوفے سے کھڑی ہوتی امامہ کو دیکھ لیا تھا ورنہ وہ سالار کو کبھی وہاں روک کر اس کے کسی وزیٹر کے بارے میں انفارم نہ کرتی۔ امامہ نے سالار کو ریسیپشنسٹ کی بات سنتے اور پھر ٹھٹکتے دیکھا، وہ اپنی ایڑیوں پر گھوم گیا تھا۔ وہ بہت فاصلے پر تھی، لیکن اتنے فاصلے پر نہیں تھی کہ وہ اسے دیکھ یا پہچان نہ پاتا۔ اسے سالار کے چہرے پر اتنی دور سے بھی حیرت نظر آئی، پھر وہ مسکرایا تھا۔ اس نے پلٹ کر ریسیپشن سے یقیناً "اس کا تعارف کروایا، پھر وہ رکے بغیر اس کی طرف بڑھ آیا۔ اگر وہ اس سے گھر میں سامنا کر رہی ہوتی تو اس وقت وہ سالار سے لپٹ کر بچوں کی طرح رو رہی ہوتی، وہ کچھ ایسی ہی ذہنی حالت میں تھی لیکن وہ یہاں یہ نہیں کر سکتی تھی۔
"what a pleasant surprise"

اس نے قریب آتے ہوئے کہا۔ وہ بے حد خوشگوار موڈ میں تھا۔
"میرا جوتا ٹوٹ گیا ہے۔" اس نے بے ربطی سے جواب دیا۔ اس نے سالار سے نظریں ملائے بغیر سر جھکائے ہوئے کہا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس کی آنکھیں پڑھے کیونکہ وہ جانتی تھی' وہ اس کی آنکھوں کو کھلی کتاب کی طرح پڑھ سکتا تھا۔
"سامنے سگنل پر میری گاڑی خراب ہو گئی۔ اور لفٹو اسے کہیں لے گیا ہے۔ اور یہاں تمہارا آفس تھا تو میں یہاں آگئی۔ لیکن شاید نہیں آنا چاہیے تھا کیونکہ تم مصروف ہو۔ بس تم مجھے گھر بھجوا دو۔" اس نے جواباً "ایک کے بعد ایک مسئلہ بتاتے ہوئے اسے بے حد بے ڈھنگے انداز میں کہا۔
"نو پرابلم۔" سالار نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے اسے تسلی دی۔
"سوری میم' آپ مجھے اپنا تعارف کرا دیتیں تو میں آپ کو آفس میں بٹھا دیتی۔"
ڈیسک پر بیٹھی لڑکی نے اس کے قریب آکر معذرت کی تھی۔
"اٹس او کے۔ کسی کو بھیج کر یہاں قریب کسی شو اسٹور سے اس سائز کا جوتا منگوائیں۔"
اس نے اس لڑکی سے کہا اور پھر اگلا جملہ امامہ سے کہا۔
"امامہ' یہ ٹوٹا ہوا جوتا اتار دو۔"
"اتار دوں؟" وہ ہچکچائی۔
"ہاں۔ کوئی حرج نہیں۔ میرے باتھ روم میں وضو کے لیے سلیپرز ہیں' وہ پہن کر پاؤں دھولینا تب تک نیا جوتا آجائے گا تمہارے لیے۔ اور کس سگنل سے گاڑی لے کر گئے ہیں؟"
امامہ نے اسے اندازے سے بتایا۔
اس نے ڈیسک سے آنے والی لڑکی کو گاڑی کا نمبر بتاتے ہوئے کچھ ہدایات دیں۔ وہ تب تک ٹوٹے ہوئے جوتے سے اپنا پاؤں نکال چکی تھی۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے' وہ اسے وہاں سے لے آیا۔ اپنے ہاتھ پر اس کی گرفت سے امامہ نے محسوس کیا کہ اسے اس وقت اس سہارے کی بے حد ضرورت تھی۔ ایک پاؤں میں جوتا نہ ہونے کے باوجود' وہ بڑی سہولت سے چلتے ہوئے اس کے آفس میں آگئی تھی۔ وہ راستے میں ملنے والے افراد سے اسی ریلیکسڈ اور عام سے انداز میں اسے متعارف کرواتا کوریڈور سے اپنے آفس آگیا تھا۔
"ویسے تم اس طرف آکیسے گئیں؟" اپنے آفس کا دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے امامہ سے پوچھا۔
"میں۔" اسے کوئی بہانہ یاد نہیں آیا۔ اس کا ذہن اس وقت کچھ اتنا ہی خالی ہو رہا تھا۔ سالار چند لمحے جواب کا انتظار کرتا رہا پھر اس نے بات بدل دی۔
"تم کھڑی کیوں ہو بیٹھ جاؤ۔" اپنے ٹیبل کی طرف جاتے ہوئے اس نے انٹر کام کا ریسیور اٹھاتے ہوئے اس سے کہا۔
اس کے سائیڈ ڈیسک پر رکھی اپنی ایک فریمڈ تصویر سے نظریں ہٹاتے ہوئے' وہ کمرے کے ایک کونے میں پڑے صوفوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی۔ وہ انٹر کام پر اس کے لیے کوئی جوس لانے کا کہہ رہا تھا' جب اس کا فون بجنے لگا۔ اس نے اپنا سیل فون اٹھا کر کال ریسیو کی' چند لمحے وہ فون پر بات کرتا رہا پھر اس نے امامہ سے کہا "امامہ! تمہارا کریڈٹ کارڈ کہاں ہے؟"
وہ اس کے سوال پر چونک گئی۔ اس کے پاس ایک سپلیمنٹری کارڈ تھا۔
"میرے بیگ میں۔"
"ذرا چیک کرو۔" اس نے بیگ سے والٹ نکالا اور پھر باری باری اس کے تمام حصے چیک کیے۔ وہاں کارڈ نہیں

تھا۔اس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔
"اس میں نہیں ہے۔" اس نے اڑی ہوئی رنگت کے ساتھ سالار سے کہا۔
اس نے جواب دینے کے بجائے فون پر کہا۔
"بالکل' میری بیوی چھوڑ آئی تھیں وہاں۔ میں منگوالیتا ہوں۔ تھینک یو۔" اس نے فون بند کردیا۔ امامہ کی جیسے جان میں جان آئی۔
"کہاں ہے کارڈ؟" امامہ نے پوچھا۔
"کہاں شاپنگ کی ہے تم نے؟" سالار نے اس کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔
اسے ڈیپارٹمنٹل اسٹور یاد آیا۔
"وہاں چھوڑ دیا تھا میں نے؟" اسے جیسے یقین نہیں آیا تھا۔
"ہاں' اسٹور کے منیجر نے ہیلپ لائن کو انفارم کیا۔وہ تمہارے سیل پر ٹرائی کرتے رہے' لیکن تم نے کال ریسیو نہیں کی' اب انہوں نے مجھے کال کیا ہے۔"
وہ بیگ سے اپنا سیل نکال کر دیکھنے لگی۔ اس پر واقعی بہت ساری مسڈ کالز تھیں' لیکن یہ کب آئی تھیں۔؟ شاید جب وہ ریسپشن میں بیٹھی اپنی سوچوں میں غرق تھی۔
ایک آدمی ایک ٹرے میں پانی اور جوس کا گلاس لے کر آگیا۔ اسے اس وقت اس کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ پیاس کی وجہ سے نہیں بلکہ شرمندگی کی وجہ سے۔
سالار دوسرے صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔ اس دوران انٹرکام دوبارہ بجا اور وہ اٹھ کر گیا۔ گاڑی کا پتا چل گیا تھا۔
"امامہ گاڑی کے پیپرز کہاں ہیں؟" اس نے ایک بار پھر فون ہولڈ پر رکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔
امامہ کو اپنی اگلی حماقت یاد آئی' پیپرز گاڑی میں ہی تھے۔ وہ پیپرز اور لائسنس دونوں وہاں چھوڑ کر آئی تھی۔ اس برانڈ نیو گاڑی پر اگر کوئی ہاتھ صاف کرتا تو اس خوش قسمت کو گاڑی کے ساتھ یہ دونوں چیزیں بھی انعام میں ملتیں۔ کیونکہ ڈنڈو اسے مطلوبہ پارکنگ میں چھوڑ کر وہاں سے جا چکا تھا۔ اس پر اسٹیکر لگا ہوتا تو شاید وہ اسے کہیں اور لے کر جاتا' لیکن اب وہ اسے قریبی پارکنگ میں چھوڑ گئے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا مالک گاڑی کے پیچھے آ رہا ہوگا۔
جوس یک دم اس کے حلق میں اٹکنے لگا تھا۔
"گاڑی میں۔" اس نے نظریں ملائے بغیر کہا۔ جواباً" اسے ملامت نہیں کی گئی' جس کی وہ توقع کر رہی تھی۔
"آئی ڈی کارڈ کی کاپی ہے؟" وہ کسی کو گاڑی لانے کے لیے بھیجنا چاہتا تھا' اور حفظ ماتقدم کے طور پر آئی ڈی کارڈ یا گاڑی کے پیپرز ساتھ دینا چاہتا تھا' تاکہ اگر اسے پارکنگ میں چیک کیا جائے تو گاڑی لانے میں دقت نہ ہو۔ وہ گلاس رکھ کر ایک بار پھر آئی ڈی کارڈ اپنے بیگ میں ڈھونڈنے لگی' وہاں بھی اس کا کوئی وجود نہیں تھا۔ اسے یاد آیا کہ وہ دوسرے بیگ میں تھا۔ اس کا دل وہاں سے بھاگ جانے کو چاہا۔ اسے خود پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ اس دفعہ سالار نے اس کے جواب کا انتظار نہیں کیا۔
"میرے پیپرز میں دیکھو' میری وائف کے آئی ڈی کارڈ کی کاپی ہوگی' وہ ڈرائیور کو دے دو اور کار کی چابیاں بھی بھجوا دیتا ہوں۔" اس نے فون پر کہا۔
"تمہیں اگر فریش ہونا ہو تو میرے سلیپرز یہاں پڑے ہیں۔"
یہ آفر بے حد بروقت آئی تھی۔ اسے واقعی اس وقت کوئی ایسی جگہ چاہیے تھی جہاں وہ اپنا منہ چھپا لیتی۔ اس نے زندگی میں کبھی خود کو اتنا ناکارہ اور احمق محسوس نہیں کیا تھا۔
باتھ روم کا دروازہ بند کیے' وہ اپنے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارتی گئی۔ پانی کچھ بہا نہیں پا رہا تھا' نہ شرمندگی' نہ وہ

ہتک' نہ اس کا رنج۔

"سنا ہے' تمہاری کوئی گرل فرینڈ آئی ہے؟"

اس نے باہر رمشہ کی آواز سنی۔ وہ سالار کو چھیڑ رہی تھی اور وہ جواباً" ہنسا تھا۔

"ہاں' آج کی Disasterous میٹنگ کے بعد' کسی گرل فرینڈ کا ایک وزٹ تو ڈیزرو کرتا تھا میں۔" وہ آئینے میں اپنے عکس کو دیکھتے ان کی گفتگو سنتی رہی۔ دونوں اب کسی کلائنٹ اور آج کی میٹنگ کو ڈسکس کر رہے تھے۔ اس کا دل چاہا تھا وہ واپس کمرے میں نہ جائے' وہ اس سین سے غائب ہونا چاہتی تھی۔

باتھ روم کا دروازہ کھلنے پر رمشہ خیر مقدمی انداز میں اس کی طرف آئی۔

"چلو کسی بہانے تمہاری بیگم تو یہاں آئیں۔" رمشہ نے اس سے ملتے ہوئے کہا تھا۔

سالار جواب دینے کے بجائے صرف مسکرایا۔ چند منٹ وہ کھڑی باتیں کرتی رہی' پھر اس نے کہا۔

"اب اگلی میٹنگ ہے' تو تم آرہے ہو کیا؟"

"ہاں' میں آتا ہوں۔ تم اسٹارٹ کرلو میٹنگ' میں دس پندرہ منٹ میں آجاتا ہوں۔"

اس نے کہا۔ رمشہ' امامہ کو خدا حافظ کہتے ہوئے نکل گئی۔

"تم چلے جاؤ' گاڑی آئے گی تو میں چلی جاؤں گی۔" اس نے کمرے میں پڑے جوتے کے ڈبے سے نیا جوتا نکالتے ہوئے سالار سے کہا۔ اسے لگ رہا تھا وہ اس وقت ایک خواہ مخواہ کی لائبیلٹی بن کر آئی تھی۔

"تم سینڈوچ کھاؤ۔ تم نے اتنی محنت سے بنا کر دیے تھے' آج کلائنٹس کے ساتھ لنچ کیا ہے' یہ کھا نہیں سکا۔" وہ ٹیبل پر پڑے سینڈوچ کا ایک ٹکڑا کھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" اس وقت حلق سے کچھ اتارنا بہت مشکل تھا۔

"کیوں بھوک نہیں ہے؟ لنچ کیا ہے تم نے؟"

"نہیں' لیکن بھوک نہیں ہے۔"

"پھر کھاؤ' صرف ایک کھالو۔" وہ اسے بہلا رہا تھا۔ امامہ کے ساتھ کوئی مسئلہ تھا اور اس وقت پوچھنا بے کار تھا۔ جب بھی وہ پریشان ہوتی اسی طرح چیزیں بھولتی تھی' اور ان تین مہینوں میں سالار اس چیز کا عادی ہو چکا تھا۔ وہ جانتا تھا' وہ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گی۔ یہ اس کے لیے اب کوئی غیر معمولی بات نہیں رہی تھی۔

وہ اب سر جھکائے سینڈوچ کھانے لگی تھی جو اس نے پلیٹ میں اس کے سامنے رکھا تھا۔ اس کا خیال تھا وہ اب اس کی ان تمام حرکات پر کوئی تبصرہ کرے گا مگر وہ اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ سینڈوچ ختم ہونے کے بعد اس نے امامہ سے چائے کا پوچھا اور اس کے انکار پر اس نے انٹر کام پر کسی سے ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کے لیے کہا۔

"میں تمہیں اپنی گاڑی میں بھجوا رہا ہوں۔ تمہاری گاڑی جب آئے گی تو میں بھجوا دیتا ہوں۔"

"میں خود ڈرائیو کر کے چلی جاتی ہوں۔" اس نے کہا۔

"نہیں' ڈرائیور تمہیں ڈراپ کرے گا۔ تم اپ سیٹ ہو اور میں نہیں چاہتا تم ڈرائیو کرو۔" وہ بول نہیں سکی' یہ جاننے کے باوجود کہ وہ بڑی آسانی سے جان گیا ہو گا کہ اس وقت اسے کوئی پریشانی تھی۔

"میں خود چلی جاتی ہوں۔" اس نے بینک کی ایگزٹ پر سالار سے کہا۔

"یار' کلائنٹس کو بھی یہاں تک چھوڑنے آجاتا ہوں' تم تو بیوی ہو میری۔" وہ مسکرایا تھا۔

ڈرائیور پارکنگ میں کھڑی گاڑی دروازے کے سامنے لے آیا تھا۔ ڈرائیور گاڑی کا دروازہ کھولنے کے لیے آیا مگر اس سے پہلے سالار اس کے لیے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول چکا تھا۔

وہ گاڑی میں بیٹھنے کے بجائے اسے رک کر دیکھنے لگی۔ وہ اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی مگر اس کے حلق میں ایک بار پھر سے گرہیں پڑنے لگی تھیں۔

"Anything else Ma'am" سالار نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ سمجھا کہ وہ اسے کچھ کہنا چاہ رہی ہے۔

"تھینک یو۔" اس نے بالآخر کہا۔

"Always at your disposal ma'am"

اس نے اپنا بازو اس کے گرد پھیلاتے ہوئے اسے گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ گاڑی میں بیٹھ گئی' سالار نے دروازہ بند کر دیا۔ چلتی ہوئی گاڑی میں سے امامہ نے ایک لمحے کے لیے مڑ کر دیکھا۔ وہ ابھی وہیں کھڑا تھا' وہ یقیناً گاڑی کے مین روڈ پر جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا تھا۔

جس کی ذمہ داری تھی وہ شخص اس کے لیے کھڑا تھا۔ وہ جلال کی ذمہ داری نہیں تھی' پھر وہ کیوں یہ توقع کر رہی تھی کہ وہ اس کے لیے اتنی کرٹسی دکھاتا۔ اس نے ٹھیک کیا تھا' اسے ڈرائیور کے ساتھ بھیجا تھا۔ وہ واقعی اس وقت گاڑی ڈرائیو کرنے کے قابل نہیں تھی۔ وہ اپنی گاڑی میں ہوتی تو گاڑی سڑک کے کنارے کھڑی کر کے اندر بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر روتی۔ نہ وہ اتنی بے وقعت تھی جتنی ہر بار جلال کے سامنے جا کر ہو جاتی تھی' نہ وہ اتنی انمول تھی جتنا یہ شخص اسے سمجھ رہا تھا۔ ایک اسے کوئلہ سمجھ کر ملتا تھا' اور دوسرا کوہ نور۔ وہ بے وقعتی کانچ کی طرح لگتی تھی اور یہ وقعت خنجر کی طرح۔ لیکن دونوں چیزیں زخمی کرتی تھیں اسے۔

وہ گھر آ کر بھی بہت دیر تک لاؤنج میں بے مقصد بیٹھی رہی تھی۔ آج کا دن بے حد برا تھا' بے حد۔ کوئی چیز اسے پرسکون نہیں کر پا رہی تھی۔ تکلیف دہ یادوں کا ایک سلسلہ تھا جو ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔

"کیا ہوا ہے تمہیں؟" سالار نے رات کو کھانے کی ٹیبل پر اس سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" جواب حسب توقع تھا۔

سالار نے کھانا کھاتے کھاتے ہاتھ روک کر اسے دیکھا۔

"کوئی پریشانی نہیں ہے' میں بس اپنی فیملی کو مس کر رہی ہوں۔" اس نے جھوٹ بولا۔

یہ واحد طریقہ تھا جس سے اس گفتگو کا موضوع اس کی ذات سے ہٹ سکتا تھا۔

سالار نے اسے کریدا نہیں تھا۔ وہ بعض دفعہ اسی طرح پریشان ہوتی تھی۔ اور وہ اسے صرف بہلانے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ آج بھی اس نے یہی کچھ کیا۔ وہ ڈنر کے بعد کام کے لیے اپنے اسٹڈی روم میں چلا گیا۔ امامہ نے سونے کی کوشش کی' لیکن وہ سو نہیں سکی۔ ایک بار پھر سب کچھ فلم کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے آنے لگا' وہ فلم جو آج بار بار چلتی رہی تھی۔

کتنا وقت اس نے اندھیرے میں بستر میں چت لیٹے' چھت کو گھورتے ہوئے گزارا تھا' اسے اندازہ ہی نہیں ہوا۔ اس کی سوچوں کا تسلسل تب ٹوٹا تھا جب کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ سالار سونے کے لیے حتی الامکان آہستگی سے دروازہ کھولتے ہوئے اندر آیا تھا۔ پھر دروازہ بند کر کے وہ لائٹ آن کیے بغیر اسی طرح احتیاط سے دبے پاؤں واش روم کی طرف چلا گیا تھا۔

امامہ نے آنکھیں بند کر لیں' نیند اب بھی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ کپڑے تبدیل کر کے سونے کے لیے بیڈ پر آ کر لیٹا تھا۔ اس نے امامہ کی طرف کروٹ لی اور پھر امامہ نے اس کی آواز سنی۔

"تم جاگ رہی ہو؟" اس نے اپنی کمر کے گرد سالار کا بازو حمائل ہوتے ہوئے محسوس کیا۔

"تمہیں کیسے پتا چل جاتا ہے؟" وہ کچھ جھلاّئی تھی۔
"پتا نہیں کیسے؟ بس پتا چل ہی جاتا ہے۔ کیا پریشانی ہے؟" ایک لمحہ کے لیے اس کا دل چاہا وہ اسے بتادے اپنی اور جلال کی ملاقات کے بارے میں 'لیکن دوسرے ہی لمحہ اس نے اس خیال کو جھٹک دیا تھا۔ اس سارے واقعے میں بتانے والی کوئی چیز نہیں تھی۔ کوئی ایسی چیز جو کسی کے لیے بھی قابل اعتراض ہوتی 'وہ سالار کو بھی یہ نہیں سمجھا سکتی تھی کہ وہ جلال کی کن باتوں پر تکلیف محسوس کر رہی تھی تو پھر بتانے کا فائدہ کیا ہوتا۔
"کچھ نہیں 'بس میں ڈپریسڈ تھی۔"
"اسی لیے تو کہا تھا کہ باہر چلتے ہیں۔" وہ اب اس کے بازو پر سہلانے والے انداز میں ہاتھ پھیر رہا تھا۔
"میں ٹھیک ہوں اب۔" امامہ نے یک دم ۔۔۔ کسی ننھے بچے کی طرح اس کے سینے میں منہ چھپاتے ہوئے اس سے کہا۔ اس کے سر کو چومتے ہوئے وہ اسے تھپکنے لگا' امامہ کا دل بھر آیا۔ اگر اس کی زندگی میں جلال انصر کے نام کا کوئی باب نہ آیا ہوتا تو کیا ہی اچھا تھا۔ وہ اس شخص کے ساتھ بہت خوش رہ سکتی تھی' جس کے سینے میں منہ چھپائے' وہ اس وقت ماضی کو سوچنے میں مصروف تھی۔ زندگی میں وہ لوگ کیوں آتے ہیں جو ہمارا مقدر نہیں ہوتے 'وہ مقدر نہیں بنتے تو اذیت کا کانٹا کیوں بن جاتے ہیں؟

☼ ☼ ☼

جلال کے ساتھ ہونے والی وہ ملاقات اس کے لیے ایک اتفاق تھا' ایک ایسا اتفاق جسے وہ دوبارہ نہیں چاہتی تھی۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتفاقی ملاقات اس کے لیے بہت خطرناک اثرات لے کر آنے والی تھی مہینوں یا سالوں میں نہیں بلکہ دنوں میں۔
دو دن بعد وہ ایک ڈنر میں مدعو تھے۔ وہ اس وقت سالار کے ساتھ کھڑی چند لوگوں سے مل رہی تھی جب اس نے ہیلو کی ایک شناسا سی آواز سنی۔ امامہ نے گردن موڑ کر دیکھا اور پھر ہل نہیں سکی۔ وہ فاروق تھا۔ جو بے حد گرم جوشی کے ساتھ سالار سے مل رہا تھا۔
"میری بیوی۔۔۔" سالار اب اس کا تعارف کروا رہا تھا۔
"تعارف کی ضرورت نہیں ہے' میں پہلے ہی ان سے مل چکا ہوں۔" فاروق نے بے حد گرم جوشی سے کہا۔ سالار نے کچھ حیران سا ہو کر فاروق کو دیکھا۔
"آپ پہلے مل چکے ہیں امامہ سے؟"
"بالکل 'ہم ابھی پرسوں ہی تو ملاقات ہوئی ہے۔ ڈاکٹر جلال انصر کے ساتھ لنچ کر رہی تھیں۔ دراصل جلال ہمارے فیملی ڈاکٹر ہیں' انہوں نے بتایا کہ یہ ان کی پرانی کلاس فیلو ہیں اور جب انہوں نے آپ کا وزیٹنگ کارڈ نہیں دیا تب مجھے پتا چلا کہ یہ آپ کی وائف ہیں۔" فاروق بڑے خوشگوار انداز میں کہہ رہا تھا۔
"میں نے اور میری مسز نے تو کھانے پر انوائٹ کیا تھا' لیکن انہوں نے کہا کہ آپ آج کل مصروف ہیں۔"
فاروق نے نہ امامہ کی فق ہوتی رنگت کو دیکھا' نہ سالار کے بے تاثر چہرے کو۔ جو کچھ وہ کہہ رہا تھا' سالار کو اس پر یقین نہیں آرہا تھا' لیکن یقین نہ کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی وجہ نہیں تھی۔ اس کے کان جیسے سن ہو رہے تھے۔ اس نے گردن موڑ کر اپنے بائیں طرف کھڑی امامہ کو دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ وہ فی الحال اس کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ جلال انصر کے ساتھ مل رہی تھی۔۔۔ اور کب سے؟
فاروق کی بات سنتے ہوئے امامہ نے خشک ہوتے ہوئے حلق کے ساتھ سالار کے چہرے پر نظر ڈالی۔ وہ بغور فاروق کی بات سن رہا تھا اور اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔ اس نے اس کے بے تاثر چہرے کو دیکھ کر غلط اندازہ لگایا تھا۔

میں اسے سب کچھ بتا دوں گی وہ میری بات سمجھ لے گا' اس کے بے تاثر چہرے نے امامہ کو عجیب سی خوش فہمی کا شکار کیا تھا۔ وہ ابتدائی شاک سے نکلنے لگی تھی۔ مجھے پرسوں ہی سالار کو بتا دینا چاہیے تھا' تب اسے یہ شرمندگی نہ ہوتی۔ اسے ذرا پچھتاوا ہوا۔ وہاں کھڑے فاروق کی بات سنتے اور سالار کے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے اس نے ان حالات میں سالار کے رد عمل کو بالکل غلط سمجھا تھا اور کیوں نہ سمجھتی' اتنے مہینوں سے وہ جس شخص کے ساتھ رہ رہی تھی' وہ اس کے ناز نخرے اٹھانے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر رہا تھا۔ اس نے اسے کبھی یہ تاثر نہیں دیا تھا کہ وہ اس سے ناراض ہو سکتا تھا یا اس کی کسی غلطی پر اسے معاف نہیں کر سکتا تھا۔

"آپ ظہیر صاحب سے ملے ہیں؟" اس نے یک دم سالار کو فاروق کی بات کاٹتے دیکھا۔

"آئے ہوئے ہیں کیا؟"

"ہاں' ابھی ہم لوگ آپ ہی کی بات کر رہے تھے۔ آئیں میں آپ کو ملواتا ہوں۔" سالار' فاروق کو لیے ایک طرف چلا گیا۔

امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نے موضوع بدلا تھا یا وہ فاروق کو واقعی کسی ظہیر صاحب سے ملوانا چاہتا تھا۔ وہ دوبارہ پلٹ کر اس کی طرف نہیں آیا۔ وہ ڈنر کے دوران بھی مردوں کے ایک گروپ کے پاس کھڑا رہا۔ وہ خود بھی اپنی کچھ دوسری شناسا خواتین کے ساتھ کھڑی رہی۔ ایسا پہلی بار ہو رہا تھا کہ کسی پارٹی میں وہ اس کے پاس ہی نہ آیا ہو۔ اسے کچھ پریشانی ہونے لگی' لیکن اسے ابھی بھی یقین تھا سالار اس چیز کو بہت بڑا ایشو نہیں بنائے گا۔

پارٹی کے ختم ہونے پر میزبانوں سے رخصت ہو کر وہ ہوٹل کی لابی کے دروازے پر اپنی کار کے انتظار میں کھڑے ہو گئے۔ امامہ نے ایک بار پھر اس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی۔ اس کا چہرہ اتنا ہی بے تاثر تھا' جتنا پہلے تھا۔ لیکن اس کی خاموشی اور سنجیدگی بے حد معنی خیز تھی۔ امامہ نے بات کا آغاز کرنے کا سوچا اور تب ہی ہوٹل کا ایک ملازم ان کی گاڑی ڈرائیو وے میں لے آیا تھا۔ سالار اسے مخاطب کیے بغیر باہر نکل گیا۔ اسے اب شبہ نہیں رہا تھا۔ کہ اس کی اس اچانک خاموشی اور بے اعتنائی کی وجہ کیا تھی۔

گاڑی میں بیٹھے ہوئے بھی اس کی خاموشی اسی طرح تھی۔ گاڑی کے مین روڈ پر آنے کے چند منٹوں کے بعد امامہ نے اس طویل خاموشی کو توڑنے کی کوشش کی۔

"تم ناراض ہو مجھ سے؟"

"Will you please shut up" وہ فریز ہو گئی تھی۔

"میں اس وقت گاڑی ڈرائیو کرنا چاہتا ہوں' تمہاری بکواس سننا نہیں چاہتا۔" وہ اس پر چلایا نہیں تھا' لیکن جو کچھ اس کی نظروں اور اس کے ٹھنڈے لہجے میں تھا' وہ امامہ کو مارنے کے لیے کافی تھا۔ اسے پہلی بار احساس ہوا' کہ بات اتنی معمولی نہیں' جتنی وہ سمجھ رہی تھی۔ وہ اسے دوبارہ مخاطب کرنے کی ہمت نہیں کر سکی۔ اتنے مہینوں میں اس نے پہلی بار اسے اندھا دھند گاڑی ڈرائیو کرتے دیکھا تھا۔

اپارٹمنٹ میں داخل ہونے کے بعد وہ اپنی جیکٹ لاؤنج میں صوفے پر پھینکتے ہوئے سیدھا کچن میں گیا۔ امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کچن میں جائے یا اس کے بیڈ روم میں آنے کا انتظار کرے۔ اپنی چادر اتارتے ہوئے وہ کچھ دیر اپارٹمنٹ کے بیرونی دروازے کے پاس ہی کھڑی رہی۔ اس کا ذہن اب ماؤف ہونے لگا تھا۔ وہ اتنے مہینوں سے ایک "عاشق" اور "دوست" کے ساتھ رہ رہی تھی اور آج پہلی بار ایک "شوہر" کا سامنا کر رہی تھی۔

کوریڈور میں کھڑے کھڑے اس نے اپنے سینڈلز اتارے۔ تب ہی اس نے سالار کو کچن ایریا سے پانی کا گلاس لے جاتے اور پھر ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پر بیٹھتے دیکھا۔ اب اس کی پشت امامہ کی طرف تھی۔ پانی کا گلاس خالی کر کے ٹیبل پر رکھتے ہوئے وہ اب اپنے گلے سے ٹائی اتار رہا تھا۔ وہ چند لمحے کھڑی اسے دیکھتی رہی' پھر آگے بڑھ

آئی۔ کرسی کھینچ کر وہ بیٹھی ہی تھی کہ وہ کرسی دھکیلتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔
"سالار! میری بات تو سنو!"
"ابھی کچھ اور رہ گیا ہے جو تم نے مجھے بتانا ہے؟"
اس نے سالار کی آنکھوں میں اپنے لیے کبھی تحقیر نہیں دیکھی تھی لیکن آج دیکھ رہی تھی۔
"مجھے وضاحت کا موقع تو دو۔"
"وضاحت۔۔۔؟ کس چیز کی وضاحت۔۔۔؟ تم مجھے یہ بتانا چاہتی ہو کہ تم نے اپنے ایکس بوائے فرینڈ کے لیے اپنے شوہر کو دھوکا دینا کیوں ضروری سمجھا؟" اس کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے۔
"یا تم مجھے یہ بتاؤ گی کہ تمہارے ایکس بوائے فرینڈ کی وہ کون سی خوبی ہے جو تمہیں اپنے شوہر میں نظر نہیں آئی۔" وہ اپنے لہجے سے اسے کاٹ رہا تھا۔
"اس سے بہتر یہ ہے کہ تم مجھے صرف یہ بتا دو کہ تم کب سے اس سے مل رہی ہو؟"
"میں اتفاقاً اس سے ملی تھی۔۔۔ صرف ایک بار۔"
اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کچھ کہنے کی کوشش کی۔ سالار نے ڈائننگ ٹیبل پر پوری قوت سے ہاتھ مارا تھا۔
"Stop befooling me woman!"
وہ پوری قوت سے چلایا تھا۔ امامہ کی آواز بند ہو گئی۔ اس کے ہاتھ کانپنے لگے یوں جیسا ختم ہو رہا تھا۔
"تم سمجھتی ہو میں اب تم پر اعتبار کروں گا۔ تم نے میری نظروں میں آج اپنی عزت ختم کر لی ہے۔
"You are nothing but a bloody cheater "
وہ کہتے ہوئے وہاں رکا نہیں تھا۔ بیڈ روم میں جانے کی بجائے وہ اسٹڈی روم میں چلا گیا تھا۔
امامہ نے مٹھیاں بھینچ کر جیسے اپنے ہاتھوں کی کپکپاہٹ کو روکنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے الفاظ اس کے کانوں میں بار بار گونج رہے تھے۔ وہ بے حد تکلیف دہ تھے لیکن اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ اس کی کاٹ دار نظریں تھیں۔
بات اتنی بڑی نہیں تھی جتنی سالار نے بنالی تھی' لیکن بات اتنی چھوٹی بھی نہیں تھی جتنی اس نے سمجھی تھی۔ وہ اس کے اور جلال کے ماضی کے تعلق سے واقف نہ ہوتا تو کبھی بھی کسی کلاس فیلو کے ساتھ کھانا کھانے پر اتنا ہنگامہ کھڑا نہ کرتا' وہ کنزرویٹو نہیں تھا۔
اسے خود ہی جلال سے ملاقات کے بارے میں بتا دینا چاہیے تھا۔ وہاں بیٹھے' بہتے آنسوؤں کے ساتھ اب وہ خود کو ملامت کر رہی تھی۔
وہ اٹھ کر بیڈ روم میں آگئی۔ سونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ ماؤف ذہن اور حواس کے ساتھ صرف سالار کے الفاظ ذہن سے نکالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سوال یہ نہیں تھا کہ وہ اسے غلط سمجھ رہا تھا' سوال یہ تھا کہ ایسا کیوں ہوا؟ کیا وہ بھی اسے اسی طرح ناقابل اعتبار سمجھتا ہے' جس طرح وہ اسے سمجھتی ہے۔
وہ ساری رات جاگتی رہی۔ سالار بیڈ روم میں نہیں آیا تھا۔ اسے یقین تھا' صبح تک اس کا غصہ ختم نہیں تو کم ضرور ہو جائے گا اور وہ اس سے دوبارہ بات کرنا چاہتی تھی۔
وہ فجر کے وقت کمرے میں آیا تھا۔ اس پر ایک نظر ڈالے بغیر وہ کپڑے تبدیل کر کے نماز پڑھنے کے لیے چلا گیا تھا۔
اس کی واپسی ہمیشہ کی طرح جم اور جاگنگ کے بعد آفس جانے سے کچھ دیر پہلے ہوئی تھی۔ اس نے امامہ کو تب بھی مخاطب نہیں کیا تھا۔ امامہ کے نکالے ہوئے کپڑوں کے بجائے' وہ اپنے نکالے ہوئے کپڑے لے کر واش روم

میں گیا تھا۔
وہ کچھ دلبرداشتہ سی ہو کر کچن میں ناشتا تیار کرنے لگی۔ سالار تیار ہو کر لاؤنج میں آیا' لیکن ناشتے کی ٹیبل پر جانے کی بجائے وہ اسٹڈی روم میں چلا گیا۔ اسے پتا تھا کہ وہ اپنا لیپ ٹاپ لینے وہاں گیا تھا' لیکن یہ وہ ناشتا کرنے کے بعد کیا کرتا تھا' آج پہلے لینے کا مطلب تھا کہ۔۔۔۔
"سالار! ناشتا لگا دیا ہے میں نے۔" اس کے اسٹڈی روم سے نکلنے پر امامہ نے اسے کہا تھا۔
"اس کے لیے تم جلال کو بلاؤ۔" اس نے بات نہیں کی تھی' اسے کوڑا مارا تھا۔ وہ سفید پڑ گئی۔ وہ ایک لمحہ رکے بغیر اپارٹمنٹ کا دروازہ کھول کر نکل گیا۔ اسے احساس نہیں ہوا کہ وہ کتنی دیر وہیں ڈائننگ ٹیبل کے قریب کھڑی رہی۔ اس کے لفظ کسی خاردار تار کی طرح اس کے وجود کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھے۔
وہ سارا دن کچھ نہیں کھا سکی تھی۔ اس نے دوبار سالار کو کال کی' لیکن اس نے کال ریسیو نہیں کی۔ اسے یہی توقع تھی۔ اس نے ٹیکسٹ میسج کے ذریعے اس سے معافی مانگی۔ اس نے ٹیکسٹ میسج کا بھی کوئی جواب نہیں دیا۔
وہ روزانہ سات یا آٹھ بجے کے قریب گھر آجاتا تھا۔ اگر کبھی اسے دیر سے آنا ہوتا تو وہ اسے مطلع کر دیا کرتا تھا' لیکن اس دن وہ رات کو تقریباً" دس بجے کے قریب گھر آیا تھا۔
"آج بہت دیر ہو گئی؟" امامہ نے دروازہ کھولنے پر پوچھا۔ سالار نے جواب نہیں دیا۔
وہ کھڑی صرف اسے دیکھتی رہ گئی۔ لاؤنج میں ریموٹ کنٹرول سے ٹی وی آن کرتے ہوئے وہ بیڈ روم میں چلا گیا۔ یہ جیسے اشارہ تھا کہ وہ دوبارہ ٹی وی دیکھنے کے لیے وہاں آئے گا۔ امامہ کو یقین تھا کہ وہ کھانا نہیں کھائے گا' لیکن بوجھل دل کے ساتھ اس نے کھانا لگانا شروع کر دیا تھا۔
وہ دس پندرہ منٹ کے بعد کپڑے تبدیل کر کے لاؤنج میں آگیا تھا۔ فریج سے ایک انرجی ڈرنک نکال کر وہ لاؤنج کے صوفہ پر بیٹھ کر چینل سرفنگ کرنے لگا۔
"کھانا تیار ہے!" امامہ نے اسے انفارم کیا۔ وہ ٹی وی دیکھتا رہا۔
"تم کھانا کیوں نہیں کھا رہے؟" وہ آگے بڑھی۔ اس نے ٹی وی سے نظریں ہٹا کر اسے کہا۔
"یہ میرا گھر ہے' یہاں موجود ہر چیز میری ہے اور کھانا کھاتا یا نہ کھانا میرا مسئلہ ہے تمہارا نہیں۔" اس کی آنکھوں میں بے رخی کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔
"میں نے تمہارے انتظار میں ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔" اس نے کبھی اس شخص کے سامنے اپنا ایسا لہجہ رکھنے کا سوچا تک نہیں تھا۔ وہ "محبت" نہیں بلکہ "رشتہ" تھا جو اس کو کمزور کر رہا تھا۔
"Stop this bullshit." وہ چینل تبدیل کرتے ہوئے عجیب سے انداز میں ہنسا تھا۔
"میں تمہارے ہاتھوں بے وقوف ضرور بن گیا ہوں' لیکن بے وقوف ہوں نہیں۔"
"سالار! تم جو سمجھ رہے ہو' ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔" وہ اس کے سامنے کے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔
"بالکل ٹھیک کہا تم نے جو میں تمہیں سمجھ رہا تھا' وہ واقعی غلط تھا۔"
امامہ کے حلق میں پھر گرہیں پڑنے لگی تھیں۔
"تم میری بات کیوں نہیں سن لیتے۔۔۔؟" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
"امامہ! آج میرے سامنے رونا مت' تم مجھے استعمال کر رہی ہو' ایکسپلائٹ کر رہی ہو۔ کرو' لیکن ایموشنلی بلیک میل مت کرو مجھے۔"
وہ اس کی آنکھوں میں نمودار ہوتے آنسوؤں کو دیکھ کر بری طرح مشتعل ہوا تھا۔

"ٹھیک ہے' تم بات نہیں سننا چاہتے' مت سنو' لیکن معاف کرو مجھے۔ میں تم سے ایکسکیوز کرتی ہوں۔ میری غلطی تھی' مجھے اس سے نہیں ملنا چاہیے تھا۔" اس نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا تھا۔ دنیا کا سب سے مشکل کام اپنے ناکردہ گناہ کے لیے معذرت کرنا تھا' اسے اب احساس ہو رہا تھا۔

"اس طرح ملنے کے بجائے' تمہیں اس سے شادی کر لینی چاہیے۔" اس نے اس کی بات کاٹ کر کہا تھا۔

"سالار! وہ شادی شدہ ہے۔" وہ بات مکمل نہیں کر سکی' اس کے آنسو بہنے لگے تھے اور اس کے بات ادھورا چھوڑنے پر وہ سلگا تھا۔

"بہت دکھ ہے تمہیں اس کے شادی شدہ ہونے کا؟ تو کہو اسے' تم سے سیکنڈ میرج کر لے یا بیوی کو طلاق دے' لیکن اسے ایسا کرنے کی کیا ضرورت ہے' تم تو ویسے ہی اسے available ہو۔"

وہ سانس نہیں لے سکی' کم از کم اسے اس کی زبان سے یہ سننے کی توقع نہیں تھی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" اس نے بے یقینی سے کہا۔

"تم جو مطلب نکالنا چاہتی ہو' نکال لو۔" اس نے سامنے پڑی ٹیبل پر انرجی ڈرنک کا کین اور ریموٹ کنٹرول دونوں رکھتے ہوئے کہا۔

"میرے کریکٹر پر بات کر رہے ہو تم؟" اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا تھا۔

"کریکٹر ہے تمہارا؟" اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

"کریکٹر تھا تو شادی کی تھی تم نے۔" اسے اپنی بھرائی ہوئی آواز سے خود جھنجلاہٹ ہونے لگی تھی۔

"شادی نہیں' غلطی کی تھی۔ And I regret it۔" وہ اس کا منہ دیکھ کر رہ گئی۔ خاموشی کا ایک لمبا وقفہ آیا تھا۔ پھر اس نے اپنے حلق میں پھنسا آنسوؤں کا گولہ نگلتے ہوئے کہا۔

"میری فیملی ہوتی نا تو میں تم سے اس طرح کی ایک بات بھی نہ سنتی' لیکن اب اور کچھ مت کہنا' ورنہ میں تمہارا گھر چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔"

سالار نے جواب میں ٹیبل پر پڑا اپنا سیل اٹھایا۔ اس نے فرقان کو کال کی۔

"تمہارا ڈرائیور سو تو نہیں گیا؟"

"نہیں۔" دوسری طرف سے فرقان نے کہا۔

"تمہیں ضرورت ہے؟"

"ہاں۔"

"اچھا' میں اسے بتاتا ہوں۔" سالار نے سیل فون بند کر دیا۔

"ڈرائیور تمہیں چھوڑ آتا ہے' تم پیکنگ کر کے جا سکتی ہو' لیکن مجھے کبھی یہ دھمکی مت دینا کہ تم گھر چھوڑ کر چلی جاؤ گی' جو کچھ تم میرے گھر میں بیٹھ کر کر رہی ہو' بہتر ہے تم یہاں سے چلی جاؤ۔" وہ اٹھ کر بیڈ روم میں چلا گیا تھا۔

وہ بت کی طرح وہیں بیٹھی رہی۔ اس نے اسے دھکے دے کر گھر سے نہیں نکالا تھا' لیکن وہ یہی محسوس کر رہی تھی۔ چند منٹ وہ وہیں بیٹھی رہی پھر وہ یک دم اٹھ کر اپارٹمنٹ سے باہر نکل آئی۔ لفٹ میں اس نے اپنے دوپٹے سے بھیگی آنکھوں اور چہرے کو رگڑ کر خشک کرنے کی کوشش کی۔ وہ ڈرائیور کے سوالوں سے بچنا چاہتی تھی۔

"مجھے سعیدہ اماں کی طرف چھوڑ دو۔" اس کے نیچے پہنچنے تک ڈرائیور فرقان کی گاڑی نکالے ہوئے تھا۔ اس نے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اسے کہا۔

رات کے سوا گیارہ بجے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر وہ پورے راستے آنسو بہاتی اور آنکھوں کو رگڑتی رہی۔ اس نے

زندگی میں ایسی بے عزتی کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ اسے ایک بار پھر اپنے ماں باپ بری طرح یاد آرہے تھے۔
سعیدہ اماں نے نیند سے اٹھ کر دروازہ کھولا اور اسے دروازے پر دیکھ کر وہ بری طرح پریشان ہوئی تھیں مگر اس سے زیادہ پریشان وہ اسے اندر آکر بلک بلک کر روتے دیکھ کر ہوئی تھیں۔
"سالار نے گھر سے نکال دیا؟" وہ سن کر حواس باختہ ہو گئی تھیں۔ وجہ کیا تھی' وہ سعیدہ اماں کو تو کیا' کسی کو بھی نہیں بتا سکتی تھی۔
"بھائی جان کو فون ملا کر دو' میں ان سے بات کرتی ہوں ایسے کیسے گھر سے نکال سکتا ہے وہ۔" سعیدہ اماں کو غصہ آنے لگا تھا۔
اس نے ان کے اصرار کے باوجود آدھی رات کو ڈاکٹر سبط علی کو فون نہیں کیا۔ یہ مصیبت اس کی تھی' وہ اس کے لیے لوگوں کی نیندیں خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔
وہ خود پچھلی رات نہیں سوئی اور اب اسی طرح روتے ہوئے اس کا سر درد سے پھٹنے لگا تھا۔ فجر کی نماز کے بعد وہ سونے کے لیے لیٹ گئی۔ نیند مشکل سے آئی تھی' لیکن آگئی تھی۔
دوبارہ اس کی آنکھ دوپہر کو کھلی اور آنکھ کھلنے پر اسے یہ سب کچھ بھیانک خواب کی طرح لگا تھا۔
"سالار نے کوئی فون تو نہیں کیا؟" اس نے سعیدہ اماں کے کمرے میں آنے پر پوچھا۔
"نہیں' تم نہالو میں کھانا لگا رہی ہوں' پھر بھائی صاحب کی طرف چلتے ہیں۔" سعیدہ اماں کہہ کر کمرے سے نکل گئیں۔ پتا نہیں اسے کیوں امید تھی کہ وہ اب پچھتا رہا ہو گا' شاید اس کے چلے جانے کے بعد اسے احساس ہو گیا ہو گا کہ اس نے زیادتی کی ہے۔ بارہ گھنٹے غصہ ختم ہونے کے لیے کافی تھے' اگر یہ سب کچھ اس نے غصے میں کیا تھا تو۔
اس نے بوجھل دل کے ساتھ شاور لیا اور سعیدہ اماں کے گھر پڑے ہوئے اپنے کپڑوں میں سے ایک جوڑا نکال کر پہن لیا۔ وہ پچھلے کئی مہینوں سے اتنے قیمتی کپڑے پہننے کی عادی ہو گئی تھی کہ اپنے جسم پر وہ جوڑا اسے خود ہی عجیب سا لگ رہا تھا۔ اسے بہت بھوک لگ رہی تھی' لیکن کھانے کے دو لقمے لیتے ہی اس کی بھوک مر گئی۔ سعیدہ اماں نے زبردستی اسے کھانا کھلایا۔ وہ کھانے کے فوراً بعد ڈاکٹر صاحب کی طرف جانا چاہتی تھیں' لیکن امامہ ڈاکٹر صاحب کو ان کے آفس فون پر اس طرح کی گفتگو سے پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ سالار ہفتے میں دو دن ڈاکٹر صاحب کے پاس رات کو جایا کرتا تھا اور آج بھی وہی دن تھا جب اسے وہاں جانا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ ڈاکٹر صاحب سے اس کے بارے میں جو کہنا چاہتا ہے' اس سے پہلے ہی کہہ دے۔ کم از کم اسے بیٹھے بٹھائے شرمندگی کا وہ بوجھ نہ اٹھانا پڑے جو اس سارے معاملے کے بارے میں انہیں بتا کر اسے اٹھانا پڑتا' لیکن سعیدہ اماں اس پر تیار نہیں تھیں۔ وہ زبردستی اسے ساتھ لے کر ڈاکٹر صاحب کے گھر آگئی تھیں۔ کلثوم آنٹی سب کچھ سن کر سعیدہ اماں کی طرح حواس باختہ ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب ابھی آفس سے نہیں آئے تھے۔
"لیکن بیٹا جھگڑا کس بات پر ہوا؟" امامہ کے پاس اس ایک سوال کا جواب نہیں تھا۔
سعیدہ اماں اور کلثوم آنٹی کے ہر بار پوچھنے پر اسے احساس ہوتا کہ اس سوال کا جواب اس کی نیت صاف ہونے کے باوجود اس کو مجرم بنا رہا تھا۔ اگر وہ سعیدہ اماں اور کلثوم آنٹی کو یہ بتاتی کہ وہ اپنے ایک پرانے دوست کے ساتھ کھانے پر گئی تھی یا کسی پرانے کلاس فیلو کے ساتھ تھی تو دونوں صورتوں میں وہ کبھی بھی اچھے ردعمل کا اظہار نہ کرتیں۔ وہ یہ سب کچھ ڈاکٹر صاحب کو بھی نہیں بتا سکتی تھی جو گھر آتے ہی اسے اس طرح دیکھ کر پریشان ہوئے تھے۔
"اسے میرے کریکٹر پر شک ہے۔" اس نے ان کے بار بار پوچھنے پر سر جھکائے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر سبط علی کو جیسے

شاک لگا تھا۔ سعیدہ اماں اور کلثوم آنٹی بھی بول نہیں سکی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کے بعد اس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

"وہ رات کو آئے گا تو میں اس سے بات کروں گا۔ پریشانی کی بات نہیں ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا سب کچھ۔" انہوں نے امامہ کو تسلی دی۔

"میں اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ میں جاب کرلوں گی، لیکن میں اب اس کے گھر نہیں جاؤں گی۔"

ڈاکٹر سبط علی نے اس کی کسی بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ اب بھی جیسے شاک میں تھے۔ سالار سکندر کے بارے میں جو تاثر وہ آج تک بنائے بیٹھے تھے، وہ بری طرح مسخ ہوا تھا۔ وہ خود کو یہ یقین دلانے کی کوشش کررہے تھے کہ یہ سب کسی غلط فہمی کا نتیجہ ہو سکتا ہے، ورنہ سالار اس لڑکی کو آدھی رات کو اپنے گھر سے اس طرح کے الزام لگا کر خالی ہاتھ نہیں نکال سکتا تھا، جسے وہ اپنی بیٹی کہتے تھے۔

فرقان اس رات اکیلا آیا، سالار اس کے ساتھ نہیں تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے لیکچر کے بعد اسے روک لیا اور سالار کے بارے میں پوچھا۔

"وہ کچھ مصروف تھا اس لیے نہیں آسکا۔" فرقان نے اطمینان سے کہا۔

"آپ کو اس نے بتایا ہے کہ اس نے امامہ کو گھر سے نکال دیا ہے۔" فرقان چند لمحے بول نہیں سکا۔

"امامہ کو؟" اس نے بے یقینی سے کہا۔

"آپ کے ڈرائیور کے ذریعے ہی اس نے امامہ کو کل سعیدہ بہن کے گھر بھجوایا تھا۔"

فرقان کو پچھلی رات سالار کی کال یاد آگئی۔

"مجھے یقین نہیں آرہا۔ کیسے۔ ہمطلب۔۔۔"

فرقان کا دماغ واقعی چکرا گیا تھا۔ سالار امامہ پر جس طرح جان چھڑکتا تھا، کم از کم اس کے لیے یہ بات اتنا ممکن نہیں تھا کہ وہ اسے گھر سے نکال سکتا ہے اور وہ بھی اس طرح آدھی رات کو۔ وہ اسے کل جم میں بہت خاموش سا لگا اور آج وہ جم میں آیا ہی نہیں تھا، لیکن اس کے وہم و گمان میں بھی یہ نہیں تھا کہ اس خاموشی کا کوئی تعلق امامہ سے ہو سکتا ہے۔

"میں اسے ابھی فون کرتا ہوں، میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔"

فرقان نے پریشان ہوتے ہوئے سالار کو اپنے سیل سے کال کی، سالار کا سیل آف تھا۔ اس نے دوبارہ گھر کے نمبر پر ٹرائی کیا، کسی نے فون نہیں اٹھایا۔ اس نے کچھ حیران ہو کر ڈاکٹر صاحب کو دیکھا۔

"فون نہیں اٹھا رہا۔ سیل آف ہے۔ میں گھر جا کر بات کرتا ہوں اس سے۔ آپ امامہ کو میرے ساتھ بھیج دیں۔" فرقان واقعی پریشان ہو گیا تھا۔

"نہیں، امامہ آپ کے ساتھ نہیں جائے گی۔ اس نے نکالا ہے، وہ معذرت کر کے خود لے کر جائے۔" ڈاکٹر سبط علی نے بے حد دوٹوک انداز میں کہا۔

"آپ اسے جا کر میرا پیغام دے دیں۔" فرقان نے کبھی ڈاکٹر سبط علی کو اتنا سنجیدہ نہیں دیکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

سالار نے بیل کی آواز کو چند بار نظر انداز کرنے کی کوشش کی، لیکن پھر اسے اندازہ ہو گیا کہ فرقان جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا اور اس کا یہ ارادہ کیوں تھا، وہ جانتا تھا۔ اس نے جا کر دروازہ کھولا اور پھر دروازہ کھلا چھوڑ کر اندر آگیا۔

"تم نے امامہ کو گھر سے نکال دیا ہے؟" فرقان نے اندر آتے ہوئے اپنے عقب میں دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے نہیں نکالا' وہ خود گھر چھوڑ کر گئی ہے۔" سالار نے پیچھے دیکھے بغیر اسٹڈی روم میں جاتے ہوئے کہا۔

"مجھ سے جھوٹ مت بولو۔ تم نے خود مجھے ڈرائیور کو بھیجنے کے لیے کہا تھا۔"

فرقان اس کے پیچھے اسٹڈی روم میں آگیا۔

"ہاں' کہا تھا کیوں کہ اس نے مجھے گھر چھوڑنے کی دھمکی دی تھی تو میں نے کہا ٹھیک ہے' تمہیں کل جانا ہے' تم آج چلی جاؤ' لیکن میں نے اسے نہیں نکالا۔"

اس نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بے تاثر چہرے کے ساتھ کہا۔ فرقان نے سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھرے ایش ٹرے کو دیکھا اور پھر اس سلگتے ہوئے سگریٹ کو جو وہ دوبارہ اٹھا رہا تھا۔

"بیویاں گھر چھوڑنے کی دھمکیاں دیتی ہی رہتی ہیں' اس کا مطلب یہ نہیں کہ انہیں اس طرح گھر سے نکال دو۔" فرقان نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"دیتی ہوں گی' But she dare not do that to me"

اس نے فرقان کی بات کاٹ کر کہا۔

"ڈاکٹر صاحب کتنے پریشان ہیں' تمہیں اس کا اندازہ ہے؟"

"یہ میرا اور اس کا معاملہ ہے' وہ ڈاکٹر صاحب کو درمیان میں کیوں لے کر آئی ہے؟" وہ بگڑا تھا۔

"وہ کیسے نہ لے کر آتی' تم اسے گھر سے نکالو گے اور ڈاکٹر صاحب کو پتا نہیں چلے گا؟"

"وہ چاہتی تو نہ پتا چلتا' اگر اتنی جرات تھی کہ گھر سے چلی گئی تو پھر اتنا حوصلہ بھی ہونا چاہیے تھا کہ منہ بند رکھتی۔" اس نے سگریٹ کا ٹکڑا ایش ٹرے میں پھینک دیا۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟"

"کچھ نہیں۔"

"کس بات پر جھگڑا ہوا ہے تم دونوں کا؟"

"بس' ہو گیا کسی بات پر۔" وہ کم از کم وجہ بتانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ فرقان آدھے گھنٹے کے سوال و جواب اور بحث کے باوجود اس سے وجہ نہیں پوچھ سکا تھا' پھر جیسے اس نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے' جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب تم اسے لے آؤ۔"

"یہ میں نہیں کروں گا۔ نہ میں نے اسے نکالا ہے' نہ میں اسے لے کر آؤں گا۔ وہ خود آنا چاہتی ہے تو آجائے۔" اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"اور ڈاکٹر صاحب یہ سب نہیں ہونے دیں گے۔ وہ اپنی مرضی سے گئی ہے یا تم نے اسے نکالا ہے' ڈاکٹر صاحب کا پیغام یہی ہے کہ تم جا کر معذرت کر کے اسے لے کر آؤ۔" سالار خاموش رہا۔

"میرے ساتھ چلو' ابھی اسے لے آتے ہیں۔"

"میں نہیں جاؤں گا' ڈاکٹر صاحب سے میں خود بات کر لوں گا۔"

"ابھی کرو بات۔"

"میں ابھی بات نہیں کرنا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں' وہ کچھ دن وہاں رہے' یہ اس کے لیے اچھا ہو گا۔"

فرقان اگلے دو گھنٹے وہیں بیٹھا اسے سمجھاتا رہا' لیکن وہ اس کے انکار کو اقرار میں بدل نہیں سکا۔ وہ بے حد ناخوش سالار کے اپارٹمنٹ سے گیا اور اس کی خفگی نے سالار کی فرسٹریشن میں اضافہ کیا۔

اس نے فرقان سے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ واقعی امامہ کو گھر سے بھیجنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اس نے اسے دھمکانے کی کوشش کی تھی اور اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ واقعی اٹھ کر چلی جائے گی۔ اس کے اس طرح چلے جانے سے سالار کے اشتعال میں اضافہ ہوا۔ اس سے شادی کے بعد وہ پہلی بار ضد میں آیا تھا اور یہ صحیح تھا یا غلط' ایک مرد کی طرح اب اسے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ فرسٹریٹڈ تھا' اپ سیٹ تھا' لیکن اب ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

ڈاکٹر سبط علی اگلے چار دن اس کا انتظار کرتے رہے۔ وہ نہیں آیا' نہ ہی اس نے انہیں فون کیا۔ انہیں خود اسے فون کرنے میں عار تھا۔ انہیں کہیں نہ کہیں یہ توقع تھی کہ وہ ان کا اتنا احترام ضرور کرتا تھا کہ ان کا پیغام ملنے پر آجائے گا' لیکن اس کی مکمل خاموشی نے جیسے انہیں ذہنی دھچکا پہنچایا تھا۔ امامہ اس دن سے انہیں کے گھر پر تھی۔ انہوں نے یہ بہتر سمجھا تھا کہ جب تک یہ مسئلہ حل نہیں ہو جاتا' وہ انہیں کے گھر رہے۔ فرقان' ڈاکٹر سبط علی کے گھر اور سالار کے اپارٹمنٹ کے درمیان گھن چکر بنا ہوا تھا۔ وہ ہر روز ڈاکٹر صاحب کے پاس آ رہا تھا' یہ جیسے اس کی طرف سے اس شرمندگی کو ظاہر کرنے کی ایک کوشش تھی' جو وہ سالار کے اس رویے پر محسوس کر رہا تھا۔

اس صورت حال میں سب سے زیادہ ابتر ذہنی حالت امامہ کی تھی۔ اسے یہ یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ سالار اس کے معاملے میں اس طرح کا رویہ دکھا سکتا ہے۔ وہ گھر میں ڈاکٹر صاحب اور کلثوم آنٹی کی پریشانی دیکھ کر خود کو اور بھی زیادہ مجرم محسوس کر رہی تھی' اور اسی ذہنی تناؤ کی وجہ سے اسے بخار رہنے لگا تھا۔

چوتھے دن ڈاکٹر سبط علی نے سالار کو فون کر دیا۔ وہ آفس میں بیٹھا ہوا تھا' اور سیل پر ڈاکٹر صاحب کا نمبر دیکھتے ہوئے وہ چند لمحے ہل نہیں سکا۔ یہ ایک ایسی کال تھی جس سے وہ بچنا بھی چاہتا تھا اور جسے وہ اٹینڈ نہ کرنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ رسمی سلام دعا کے بعد ڈاکٹر سبط علی نے کسی تمہید کے بغیر اس سے کہا۔

"آپ اگر شام کو میری طرف آسکتے ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ میں آجاتا ہوں۔ اگر معاملہ حل ہو سکا تو بہتر ہوگا' ورنہ معاملہ ختم کر دیں گے۔"

ان کے الفاظ میں اس کے لیے کسی قسم کا ابہام نہیں تھا۔

"میں آجاؤں گا۔"

"مہربانی ہوگی آپ کی۔" انہوں نے کسی مزید بات کے بغیر سلام کر کے فون بند کر دیا۔

وہ فون ہاتھ میں پکڑے بیٹھا رہا۔ ڈاکٹر سبط علی کا یہ لہجہ اس کے لیے نیا تھا' لیکن غیر متوقع نہیں تھا۔ غیر متوقع صرف وہ جملہ تھا جو انہوں نے آخر میں کہا۔ معاملہ ختم کرنے تک کی نوبت کیسے آگئی تھی' اس کے نزدیک یہ صرف ایک جھگڑا تھا۔ پہلی بار اس کے پیٹ میں گرہیں پڑی تھیں۔

اس شام کو ڈاکٹر سبط علی نے ہمیشہ کی طرح اسے دروازے پر ریسیو نہیں کیا تھا' نہ اس سے مصافحہ کیا اور نہ ہی وہ اس کے لیے اٹھے تھے۔ وہ ملازم کے ساتھ اندر آیا۔ ڈاکٹر سبط علی لاؤنج میں کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ اس کے آنے پر انہوں نے وہ کتاب بند کر کے ایک طرف رکھ دی۔ سالار سلام کرنے کے بعد سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"میں تم سے بہت لمبی چوڑی بات نہیں کروں گا' سالار!" سالار نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

وہ پہلی بار ان کے منہ سے تم کا طرز تخاطب سن رہا تھا اور وہ بھی اپنے لیے، ورنہ وہ اپنے ملازم کو بھی آپ کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔

"میں پچھلے چار دن سے صرف اس بات پر شرمندہ ہوں کہ میں نے امامہ کی شادی تم سے کیوں کروائی۔۔۔ تم اس قابل نہیں تھے۔ محبت کے دعوے کرنا اور بات ہوتی ہے، لیکن کسی عورت کو اپنے گھر میں عزت سے رکھنا ایک بالکل الگ بات۔۔۔ تم صرف پہلا کام کر سکتے تھے۔"

لاؤنج سے منسلک کمرے میں وہ ڈاکٹر صاحب کی آواز اور اس کی خاموشی دونوں کو سن رہی تھی۔

"اپنی بیوی کو اس طرح گھر سے نکالنے والے مرد کو میں مرد تو کیا انسان بھی نہیں سمجھتا۔ تمہیں اگر اس بات کا پاس نہیں تھا کہ وہ تمہاری بیوی ہے، تو اس بات کا پاس ہونا چاہیے تھا کہ وہ میری بیٹی ہے۔ میری بیٹی کو تم نے اس طرح خالی ہاتھ آدھی رات کو گھر سے نکالا ہے۔"

"میں نے اسے گھر سے نہیں نکالا وہ خود۔" سالار نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

ڈاکٹر صاحب نے اس کی بات کاٹ دی۔

"تم نے گاڑی ارینج کی تھی۔" اندر بیٹھی امامہ کانپنے لگی تھی۔ اس نے ڈاکٹر صاحب کو کبھی اتنی بلند آواز میں بات کرتے نہیں سنا تھا۔

"تمہیں جرأت کیسے ہوئی کہ تم اس کے کریکٹر کے بارے میں بات کرو؟"

سالار نے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"آپ نے اس سے پوچھا کہ یہ بات میں نے کیوں کی تھی؟" اندر بیٹھی امامہ کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔ صرف یہی ایک بات تھی جس پر وہ گلٹی تھی اور جس کا اعتراف وہ اتنے دن سے کسی سے نہیں کر پائی تھی۔

"میں اس سے کچھ نہیں پوچھوں گا۔ میں تمہارے کردار کو نہیں جانتا، لیکن وہ نو سال سے میرے پاس ہے وہ کوئی ایسا کام نہیں کر سکتی جس پر تم اس کے کردار پر انگلی اٹھاتے۔"

اسے یقین تھا وہ اب جلال کا نام لے گا۔۔۔ اب لے گا۔۔۔ اس کا پورا جسم سرد پڑ رہا تھا۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ۔ اس کا دل سیکنڈز سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے دھڑک رہا تھا۔ سالار کا ایک جملہ اس وقت ڈاکٹر صاحب کی نظروں میں اسے ہمیشہ کے لیے گرانے والا تھا، لیکن اس طرف خاموشی تھی۔

پھر امامہ نے اس کی آواز سنی، ایک لمحے کے لیے اسے لگا اس کا دل رک جائے گا۔

"آئی ایم سوری۔" اسے یقین نہیں آیا، یہ وہ جملہ نہیں تھا جسے سننے کی اسے توقع تھی۔ اس کی معذرت نے اسے شاک دیا تھا تو ڈاکٹر صاحب کو کچھ اور مشتعل کیا۔

"ایک بات یاد رکھنا تم سالار۔ جو کچھ تمہیں زندگی میں ملنا ہے، اس عورت کے مقدر سے ملنا ہے۔۔۔ یہ تمہاری زندگی سے نکل گئی تو خواری کے سوا اور کچھ نہیں ہاتھ آنا تمہارے۔۔۔ ہاتھ ملو گے ساری عمر تم۔۔۔ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ اللہ نے تمہیں امامہ کا کفیل بنایا ہے۔۔۔ کبھی رازق بننے کی کوشش بھی مت کرنا، تم رازق نہیں ہو اس کے۔۔۔ اللہ تم سے بہتر کفیل دے دے گا اسے۔۔۔ تم سے زیادہ مہربان، تم سے زیادہ خیال رکھنے والا۔۔۔"

وہ "کاٹو تو لہو نہیں" کے مصداق بنا بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر سبط علی نے کبھی ایسی باتیں نہیں کی تھیں۔۔۔ کبھی بھی نہیں۔۔۔ شرم ساری سی شرم ساری تھی جو وہ محسوس کر رہا تھا اور اندر بیٹھی امامہ بھی ندامت کے ایک ایسے ہی سمندر میں غرق تھی۔

"اسے گھر میں رکھنا ہے تو عزت سے رکھو، ورنہ ابھی اور اسی وقت اس کو چھوڑ دو۔ تم سے کئی گنا اچھے انسان کے ساتھ بیاہ دوں گا جو اسے تم سے زیادہ اچھے طریقے سے اپنے گھر کی عزت بنا کر رکھے گا۔"

"میں' آپ سے اور اس سے' بہت شرمندہ ہوں۔ آپ اسے بلائیں' میں اس سے معذرت کر لیتا ہوں۔"
اسے گھٹنے ٹیکنے میں دیر نہیں لگی تھی۔
اندر بیٹھی امامہ زمین میں جیسے گڑ کر رہ گئی تھی۔ یہ آخری چیز تھی' جس کی توقع اسے سالار سے تھی۔
کلثوم آنٹی اسے بلانے آئی تھیں اور اس کا دل چاہا تھا کہ وہ کہیں بھاگ جائے۔ زندگی میں اپنے شوہر کا جھکا ہوا سر دیکھنے سے بڑی ندامت کا سامنا اس نے آج تک نہیں کیا تھا' کیا ملامت تھی جو لاؤنج میں آکر بیٹھتے ہوئے اس نے خود کو کی تھی۔ یہ سب کچھ اس کی غلطی سے شروع ہوا تھا۔
"میں بہت زیادہ معذرت خواہ ہوں جو کچھ ہوا' نہیں ہونا چاہیے تھا۔ جو کچھ کیا' غلط کیا میں نے' مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" اس نے سر یا نظریں اٹھائے بغیر اس کے بیٹھتے ہی کہا تھا۔ امامہ کے رنج میں کچھ اور اضافہ ہوا۔ آج سالار کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی اور اس کا ذمہ دار وہ اپنے آپ کو ٹھہرا رہی تھی۔
"بیٹا! آپ جانا چاہ رہی ہیں تو چلی جائیں اور نہیں جانا چاہتیں تو..." ڈاکٹر صاحب نے اس سے کہا۔
"نہیں' میں جانا چاہتی ہوں۔" اس نے اپنی آنکھیں رگڑتے ہوئے کہا۔
"ٹھیک ہے پھر اپنا سامان پیک کر لیں۔" ڈاکٹر صاحب نے اس سے کہا' وہ اٹھ کر کمرے میں آگئی۔ دو دن پہلے کلثوم آنٹی نے اسے کچھ کپڑے اور ضرورت کی چیزیں لا کر دی تھیں' اس نے انہیں ایک بیگ میں رکھ لیا۔ ڈاکٹر صاحب امامہ کے اٹھتے ہی اسٹڈی روم میں چلے گئے اور وہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔
"بیٹا کھانا لگواؤں۔" کلثوم آنٹی نے جیسے ماحول کو بہتر کرنے کی کوشش کی۔
"نہیں' میں کھانا کھا کر آیا تھا۔"
اس نے اب بھی نظریں نہیں اٹھائیں۔ وہ نظریں اٹھانے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔
ملازم سوفٹ ڈرنک کا ایک گلاس اسے دے کر گیا۔ سالار نے کچھ کہے بغیر گلاس اٹھا کر چند گھونٹ لے کر رکھ دیا۔
اسے اپنی چیزیں پیک کر کے باہر آنے میں پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ سالار نے کھڑے ہو کر خاموشی سے اس سے بیگ لے لیا۔ ڈاکٹر صاحب بھی تب تک اسٹڈی روم سے نکل آئے تھے۔ وہ ان دونوں کو گاڑی تک چھوڑنے آئے تھے مگر ہمیشہ کی طرح وہ سالار سے بغل گیر نہیں ہوئے۔
گاڑی کے سڑک پر آنے تک دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی' پھر سالار نے کہا۔
"میں تم سے بہت شرمندہ ہوں' I mis behaved with you"
وہ دوبارہ اس سے معذرت کی توقع نہیں کر رہی تھی۔
"سالار' میں تم سے بہت شرمندہ ہوں مجھے نہیں پتا تھا کہ ابو کو اتنا غصہ آ جائے گا۔ انہوں نے تمہارے ساتھ..."
سالار نے اس کی بات کاٹ دی۔ "نہیں' ٹھیک کیا انہوں نے جو بھی کیا' غلط تو کچھ بھی نہیں کیا انہوں نے' لیکن میں نے تمہارے کیریکٹر کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔"
"تمہارا مطلب ہے' تم یہ سب کچھ کہو گے اور میں یہ نہ سمجھوں کہ تم میرے کیریکٹر پر انگلی اٹھا رہے ہو؟"
سالار خاموش رہا تھا۔
"وہ مجھے اتفاقاً اس دن پارکنگ میں مل گیا تھا۔" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے کہنا شروع کیا۔ سالار نے اس بار اسے نہیں ٹوکا۔
"ابھی چند ماہ پہلے اس نے دوسری شادی کی ہے۔ اس نے لنچ کے لیے اصرار کیا۔ مجھے خیال بھی نہیں آیا کہ

تمہیں بُرا لگ سکتا ہے اور میں نے تو لنچ بھی نہیں کیا تھا۔ کچھ دیر ریسٹورنٹ میں بیٹھے رہے پھر وہ آدمی اور اس کی مسز آ گئیں۔ مجھے دیر ہو رہی تھی تو میں وہاں سے گھر آ گئی' بس اتنی سی بات تھی۔ میری غلطی بس یہ تھی کہ میں نے تمہیں بتایا نہیں کہ میں اس سے ملی تھی۔"

"اور میری غلطی یہ تھی کہ میں نے تمہاری بات نہیں سنی' سن لینی چاہیے تھی' I over reacted ۔"

وہ اب مدھم آواز میں اعتراف کر رہا تھا۔

"بے عزتی کروائی تھی اس لیے۔" وہ بڑبڑایا تھا۔

وہ اس سے کہنا چاہتی تھی کہ وہ اس وقت اس کی کس قدر احسان مند ہو رہی تھی' لیکن وہ کہہ نہیں پا رہی تھی۔ اس کی ایک لمحے کی خاموشی نے اس کی عزت رکھی تھی اور پچھلے تمام دن کے رویوں کا جیسے کفارہ ادا کر دیا تھا۔ وہ احسان مندی کے علاوہ اس وقت اس شخص کے لیے کچھ محسوس نہیں کر رہی تھی۔ اس وقت تشکر اور شرمندگی' کے سوا کوئی تیسری چیز اس کے پاس نہیں تھی۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔

"مجھے نہیں پتا تھا کہ تمہیں کسی آدمی کے ساتھ میرا ملنا اتنا برا لگے گا' ورنہ میں تو کبھی۔۔۔" کچھ دیر کے بعد اس نے کہا تھا۔

سالار نے اس کی بات کاٹی۔ "وہ "کوئی" آدمی نہیں تھا امامہ!"

"وہ اب میرے لیے صرف "کوئی" آدمی ہے۔" سالار نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ اس نے ناک رگڑتے ہوئے آنکھوں کو ایک بار پھر صاف کرنے کی کوشش کی۔

"طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟"

"ہاں' ٹھیک ہے۔" اس نے امامہ کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر جیسے ٹمپریچر چیک کیا۔

"بخار ہے؟"

"تھوڑا سا ہے۔"

"ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہوں۔"

"نہیں میڈیسن لے رہی ہوں میں۔۔۔ بیگ میں ہے۔" وہ خاموش ہو گیا۔

انہوں نے ایسی خاموشی میں پہلے کبھی سفر نہیں کیا تھا۔ اس ایک واقعے نے اعتماد کے اس رشتے میں کچھ عجیب دراڑیں ڈالی تھیں جو پچھلے چند ماہ میں ان کے درمیان بن گیا تھا۔

اس رات گھر آ کر بھی ان کے درمیان بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ امامہ میڈیسن لے کر سونے کے لیے لیٹ گئی اور سالار تقریباً ساری رات اسٹڈی روم میں بیٹھا سگریٹ پیتا رہا۔ وہ پچھلی تین چار راتوں سے یہی کچھ کر رہا تھا' لیکن آج وہ بہت زیادہ پریشان تھا۔ آخری چیز جس کی وہ کبھی توقع نہیں کر سکتا تھا' وہ ڈاکٹر سبط علی کا ایسا ہتک آمیز رویہ تھا۔ یہ سب اس کی اپنی غلطی کا نتیجہ تھا اور اسے یہ ماننے میں عار نہیں تھا۔

اس کو اتنا غصہ کیوں آیا؟ اور اس طرح کا غصہ؟ وہ خود بھی یہ سمجھ نہیں پایا تھا۔ وہ غصیل نہیں تھا۔ کم از کم پچھلے دس سالوں میں ایسے بہت کم مواقع آئے تھے جن پر کسی سے اس کی خفگی اتنی طویل ہوئی' جتنی امامہ سے ہو گئی تھی۔ وہ جلال سے جیلس نہیں تھا' وہ ان سیکیور تھا۔ وہ اس کے معاملے میں کس طرح بے اختیار تھی' اس کا مظاہرہ وہ دس سال پہلے بہت اچھی طرح دیکھ چکا تھا۔ جلال کا ایک دم دوبارہ ان کی زندگی کے منظر نامے میں اس طرح نمودار ہونا' سالار کو ایک مرد کے طور پر بے حد ہتک محسوس ہوئی تھی۔

وہ پچھلے کئی مہینوں سے اسے خوش کرنے کے لیے آخری حد تک جا رہا تھا۔ اس نے اس کے ناز نخرے اٹھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ شعوری اور لاشعوری طور پر ایک مرد کی طرح وہ ہر وہ چیز کر رہا تھا جو امامہ کو خوش

کرتی۔ اسے یقین تھا' وہ سب کچھ امامہ کے دل سے جلال انصر نامی شخص سے متعلقہ ہر طرح کے جذبات نکال دے گا اور اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ ایسا ہو بھی رہا ہے۔ وہ اس کے قریب آرہی تھی' لیکن جلال انصر کسی بھوت کی طرح یک دم دوبارہ نمودار ہو گیا تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ اسے اتنی خوب صورتی سے دھوکا دے رہی تھی۔

وہ دو دن پہلے ہونے والی ایک ایک بات کو یاد کرکے سلگتا رہا۔ وہ اگر اتفاقی ملاقات بھی تھی تو اس کے بعد اس نے امامہ کی جو حالت دیکھی تھی' وہ اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ چار دن تک وہ آفس' گھر' جم ہر جگہ صرف ایک ہی بات کے بارے میں سوچ سوچ کر جیسے پاگل ہو رہا تھا۔ وہ ایسا کیسے کر سکتی تھی؟

اس دن اس کے آفس میں جو آخری چیز امامہ بھولی تھی' وہ باتھ روم بیسن کی سل پر اس کی شادی کی رنگ تھی۔ وہ رنگ اس کے جانے کے بعد سالار کو وہاں ملی تھی۔ اس کا خیال تھا اسے گھر پہنچ کر رنگ یاد آجائے گی' لیکن اس دن تو کیا اگلے دو دن تک امامہ کو وہ رنگ یاد نہیں آئی تھی۔ یہ بات سالار کے لیے حیران کن تھی۔ وہ مسلسل انگلی میں رہنے والی کسی قیمتی چیز کو اس طرح کیسے فراموش کر سکتی تھی۔

جلال انصر سے ہونے والی اس ملاقات کے بعد اس نے اس رنگ کے اتارنے کو جیسے نیا مفہوم پہنا دیا تھا۔ اس کی زندگی میں سالار سکندر کے ساتھ باندھے ہوئے اس رشتے کی شاید کوئی اہمیت تھی' ہی نہیں۔ سالار کو ایک نیا مفہوم ڈھونڈنے میں دیر نہیں لگی تھی' مگر اس اشتعال میں بھی وہ کوئی ایسا ارادہ نہیں رکھتا تھا کہ امامہ کے ساتھ ہونے والے اس جھگڑے کو' جلال کے نام کا ٹیگ لگا کر سب کے سامنے رکھ دیتا۔ اس کے حوالے سے یہ ایک آخری چیز تھی' جو وہ کرتا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ چند دن مزید اسے اسی طرح وہاں رہنے دے گا اور پھر آنے کے لیے کہہ دے گا' لیکن ڈاکٹر سبط علی کے گھر جانے کے بعد معاملات نے جو رخ اختیار کیا تھا' وہ اس کے وہم گمان میں بھی نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼
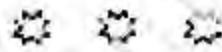
"باجی! آپ کہاں تھیں؟"

اگلی صبح وہ ملازمہ کے بیل دینے پر جاگی تھی۔ دروازہ کھولنے پر اسے دیکھتے ہی ملازمہ نے پوچھا۔

"میں چند دن اپنے گھر رہنے کے لیے گئی ہوئی تھی۔" اس نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

"طبیعت ٹھیک ہے آپ کی؟" ملازمہ نے اس کا چہرہ غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں! نہیں' بس تھوڑا سا بخار ہے اور کچھ نہیں۔" اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"کوئی خوش خبری تو نہیں۔ ہے باجی؟"

وہ بیڈ روم کی طرف جاتے جاتے ملازمہ کے جوش پر ٹھٹکی اور پھر بری طرح شرمندہ ہوئی۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے' تم صفائی کرو۔"

منہ ہاتھ دھو کر اور کپڑے تبدیل کرکے جب وہ واپس آئی تو ملازمہ اسٹڈی روم کی صفائی کر رہی تھی۔ سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھرے ایش ٹرے نے اسے چونکا دیا تھا۔

"مجھے لگتا ہے باجی! سالار صاحب سگریٹ پینے لگے ہیں۔ ہر روز اسی طرح ایش ٹرے بھرا ہوتا ہے سگریٹوں سے۔ اب روز روز تو کوئی مہمان نہیں آتا ہوگا۔" ملازمہ نے ایش ٹرے خالی کرتے ہوئے اس پر جیسے انکشاف کیا۔

وہ جواب دیے بغیر وہاں سے نکل آئی۔ کچن کے فریج میں ہر چیز اسی طرح پڑی تھی جس طرح وہ چھوڑ کر گئی تھی۔

وہ یقیناً "پچھلے کچھ دنوں میں گھر پر کھانا نہیں کھا رہا تھا' ورنہ فریز کی ہوئی چیزوں میں سے کچھ نہ کچھ استعمال ہوا ہوتا۔

فون کی بیل ہونے پر' وہ کچن میں اپنے لیے ناشتا بناتے ہوئے باہر نکل آئی۔ وہ سالار تھا جو عام طور پر اسی وقت اسے کال کیا کرتا تھا۔ اتنے دنوں کے وقفے کے بعد فون پر اس کی آواز اسے بے حد عجیب لگی تھی۔

"کیسی طبیعت ہے تمہاری؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔" اس نے کہا تھا۔

"ناشتا کر کے گئے تھے آفس؟" اسے کچن میں کوئی استعمال شدہ برتن نظر نہیں آیا تھا۔

"نہیں لیٹ ہو گیا تھا۔ ناشتے کے لیے ٹائم نہیں تھا۔"

"مجھے جگا دیا ہوتا میں بنا دیتی۔" اس نے کہا۔

"نہیں' مجھے بھوک بھی نہیں تھی۔" رسمی جملوں کے بعد اب وہ خندق آگئی تھی جس سے دونوں بچنا چاہ رہے تھے اور بچ نہیں پا رہے تھے۔ ایک دوسرے سے کچھ کہنے کے لیے ان کے پاس یک دم الفاظ نہیں رہے تھے۔

"اور؟" وہ خود کوئی بات ڈھونڈنے میں ناکام رہنے کے بعد اس سے پوچھنے لگا۔

"کچھ نہیں۔" وہ بھی اتنی ہی خالی تھی۔

"رات کو کہیں باہر کھانا کھانے چلیں گے۔" اس نے کہا۔

"اچھا۔" گفتگو پھر اسکوائر ون پر آگئی۔ سالار نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔

وہ بہت دیر ریسیور پکڑے بیٹھی رہی۔ بہت فرق تھا اس گفتگو میں جو وہ ایک ہفتہ پہلے فون پر کرتے تھے اور اس گفتگو میں جو وہ اب کر رہے تھے۔ دراڑیں بھرنا زیادہ مشکل تھا کیوں کہ نشان کبھی نہیں جاتے' وہ بھی یہی وقت محسوس کر رہے تھے۔

اس نے زندگی میں اس ایک ہفتے میں جو کچھ سیکھا تھا' وہ شادی کے اتنے مہینوں میں نہیں سیکھا تھا۔ کسی انسان کی محبت کبھی "غیر مشروط" نہیں ہو سکتی۔ خاص طور پر تب' جب کوئی محبت' شادی نام کے رشتے میں بھی بندھی ہو۔ سالار کی محبت بھی نہیں تھی۔ ایک ناخوش گوار واقعہ اسے آسمان سے زمین پر لے آیا تھا۔ وہ زمینی حقائق اسے پہلی بار نظر آئے تھے' جو پہلے اس کی نظروں سے اوجھل تھے۔ وہ صرف محبوبہ نہیں تھی' بیوی بن چکی تھی۔ ایک مرد کے لیے اسے اب زندگی' دل اور ذہن سے نکالنا زیادہ آسان تھا۔ سالار نے دوسروں کی نظروں میں اس کی عزت ضرور رکھ لی تھی' لیکن اس کی اپنی نظروں میں اسے بہت بے وقعت کر دیا تھا۔ خوش فہمیوں اور توقعات کا پہاڑ آہستہ آہستہ ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔

وہ شام کو جلدی گھر آگیا تھا اور وہ جانتی تھی کہ یہ ارادی طور پر تھا۔ اس کے لیے بیرونی دروازہ کھولنے پر اس نے ہمیشہ کی طرح گرم جوشی سے اسے اپنے ساتھ نہیں لگایا تھا۔ اس سے نظر ملانا' مسکرانا اور اس کے قریب آنا شاید اس کے لیے بھی بہت مشکل ہو گیا تھا۔ پہلے سب کچھ بے اختیار ہوتا تھا' اب کوشش کے باوجود بھی نہیں ہو پا رہا تھا۔

کھانے کے لیے باہر جاتے ہوئے بھی گاڑی میں ویسی ہی خاموشی تھی۔ دونوں وقفے وقفے سے کچھ پوچھتے پھر یک حرفی جواب کے بعد خاموش ہو جاتے۔

وہ پہلا ڈنر تھا جو انہوں نے ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے اپنی ڈنر پلیٹ کو دیکھتے ہوئے کیا تھا اور دونوں نے کھانا کسی دلچسپی کے بغیر کھایا تھا۔

واپسی بھی اسی خاموشی کے ساتھ ہوئی تھی۔ وہ ایک بار پھر سونے کے لیے بیڈ روم میں اور وہ اسٹڈی روم میں چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

اگلی صبح اس نے ایش ٹرے پھر سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھرا ہوا دیکھا۔ وہ فجر کے بعد اسٹڈی روم میں گئی، جب وہ جم میں تھا۔ وہ بھرا ہوا ایش ٹرے اس کی ذہنی حالت کو کسی دوسری چیز سے زیادہ بہتر طریقے سے بیان کر رہا تھا۔ وہ اس بات سے پریشان ہوئی کہ وہ اسموکر نہیں تھا، لیکن عادی بن رہا تھا۔ پوچھنے کا فائدہ نہیں تھا، اس کے پاس کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی۔

اگلے دن وہ تقریباً ایک ہفتے کے بعد ناشتے کی ٹیبل پر تھے۔ بات کرنا، نظر ملانے سے زیادہ آسان تھا اور وہ بات کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ شرمندگی اور ان تکلیف دہ احساسات کو ختم کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھے جو اس ٹیبل پر بن بلائے مہمانوں کی طرح موجود تھے، لیکن وہ مہمان ٹیبل چھوڑنے پر تیار نہیں تھے۔

ایک ہفتہ کے بعد ہی وہ گھر کا بنا ہوا لنچ آفس لے کر جا رہا تھا۔ وہ امامہ سے کہہ نہیں سکا کہ اس نے پورا ہفتہ گھر پر ناشتے سمیت کھانا کھانا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ گھر اتنے دن اس کے لیے بھوت بنگلہ بنا رہا۔ گھر سے نکلتے ہوئے اس نے امامہ سے کہا۔

"میری دراز میں تمہاری رنگ ہے، وہ لے لینا۔" امامہ نے جیسے کرنٹ کھا کر اپنا ہاتھ دیکھا۔

"میری رنگ...؟" وہ رنگ اسے پہلی بار یاد آئی تھی۔

"وہ میں نے کہاں رکھ دی؟"

"میرے آفس کے واش روم میں۔" اس نے باہر نکلتے ہوئے بے تاثر لہجے میں کہا۔ وہ کھڑی رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

کئی دنوں کے بعد اس رات سالار نے رغبت سے کھانا کھایا تھا۔ وہ عام طور پر ایک چپاتی سے زیادہ نہیں کھاتا تھا، لیکن آج اس نے دو چپاتیاں کھائی تھیں۔

"اور دوں؟" امامہ نے اسے دوسری چپاتی لیتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔ وہ خود چاول کھا رہی تھی۔

"نہیں، میں پہلے ہی اوور ایٹنگ کر رہا ہوں۔" اس نے منع کر دیا۔

امامہ نے اس کی پلیٹ میں کچھ سبزی ڈالنے کی کوشش کی، اس نے روک دیا۔

"نہیں، میں ویسے ہی کھانا چاہ رہا ہوں۔" امامہ نے کچھ حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ بے حد گہری سوچ میں ڈوبا اس چپاتی کے لقمے لے رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اسے اس کے ہاتھ کی چپاتی پسند ہے، لیکن اس نے اسے صرف چپاتی کھاتے پہلی بار دیکھا تھا۔ اس دن پہلی بار اس نے آخری لقمہ اسے نہیں دیا۔ وہ کھانا کھانے کے بعد ٹیبل سے اٹھ گیا۔ وہ برتن اکٹھے کر رہی تھی، جب وہ کچھ پیپرز لیے آیا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" امامہ نے کچھ حیرانی سے ان پیپرز کو دیکھا جو وہ اس کی طرف بڑھا رہا تھا۔

"بیٹھ کر دیکھ لو۔" وہ خود بھی کرسی کھینچتے ہوئے بیٹھ گیا۔

وہ بھی کچھ الجھے انداز میں پیپرز لے کر بیٹھ گئی۔

پیپرز پر ایک نظر ڈالتے ہی اس کا رنگ فق ہو گیا تھا۔

"طلاق کے پیپرز ہیں یہ؟" وہ بمشکل بول سکی۔

"نہیں، میں نے اپنے وکیل سے ایک divorce deed تیار کروایا ہے۔ اگر کبھی خدانخواستہ ایسی صورت حال ہو گئی کہ ہمیں الگ ہونا پڑا تو یہ تمام معاملات کو پہلے سے کچھ خوش اسلوبی سے طے کرنے کی ایک

کوشش ہے۔"

"مجھے تمہاری بات سمجھ نہیں آئی۔" وہ اب بھی حواس باختہ تھی۔

"ڈرو مت... یہ کوئی دھمکی نہیں ہے۔ میں نے یہ پیپرز تمہارے تحفظ کے لیے تیار کروائے ہیں۔" سالار نے اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لیا۔

"کیسا تحفظ؟" اسے اب بھی ٹھنڈے پسینے آرہے تھے۔

"میں نے علیحدگی کی صورت میں فنانشل سیکورٹی اور بچوں کی کسٹڈی تمہیں دی ہے۔"

"لیکن میں تو طلاق نہیں مانگ رہی۔" اس کی ساری گفتگو اس کے سر کے اوپر سے گزر رہی تھی۔

"میں بھی تمہیں طلاق نہیں دے رہا' صرف قانونی طور پر خود کو پابند کر رہا ہوں کہ میں علیحدگی کے کیس کو کورٹ میں نہیں لے جاؤں گا۔ فیملی کے ذریعے معاملات کو طے کرنے کی کوشش کریں گے اور اگر نہ ہوئے تو میں تمہیں علیحدگی کا حق دے دوں گا اور ایسی صورت میں اگر ہمارے بچے ہوئے تو ان کی کسٹڈی تمہیں دے دوں گا۔ ایک گھر اور کچھ رقم بھی تمہیں دوں گا۔ جو بھی چیزیں اس سارے عرصے میں حق مہر تحائف' جیولری یا روپے اور پراپرٹی کی صورت میں تمہیں دوں گا' وہ سب خلع یا طلاق' دونوں صورتوں میں تمہاری ملکیت ہوں گی' میں ان کا دعویٰ نہیں کروں گا۔"

"یہ سب کیوں کر رہے ہو تم؟" اس نے بے حد خائف انداز میں اس کی بات کاٹی۔

"میں اپنے آپ سے ڈر گیا ہوں امامہ۔" وہ بے حد سنجیدہ تھا۔

"میں کبھی سوچ نہیں سکتا تھا کہ مجھے تم پر اتنا غصہ آسکتا ہے۔ میں نے تمہیں گھر سے نہیں نکالا لیکن میں نے اس رات یہ پروا نہیں کی کہ تم گھر سے جا رہی ہو تو کیوں جا رہی ہو اور کہاں جا رہی ہو؟ میں اتنا مشتعل تھا کہ مجھے کوئی پروا نہیں تھی کہ تم بحفاظت کہیں پہنچی بھی ہو یا نہیں۔" وہ بے حد صاف گوئی سے کہہ رہا تھا۔

"اور پھر اتنے دن میں نے ڈاکٹر صاحب کی بھی بات نہیں سنی۔

I just wanted to punish you" وہ ایک لمحہ کے لیے رکا۔

"اور اس سب نے مجھے خوف زدہ کر دیا۔ میرا غصہ ختم ہوا تو مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ میں اتنا گر سکتا ہوں' میں تمہارے ساتھ اس طرح بی ہیو کر سکتا ہوں' لیکن میں نے کیا۔ بہر حال میں انسان ہی ہوں' تم کو ساتھی کے بجائے حریف سمجھوں گا تو شاید آئندہ بھی کبھی ایسا کروں۔ ابھی شادی کو تھوڑا وقت ہوا ہے۔ مجھے بہت محبت ہے تم سے' میں بہت خوشی خوشی یہ سارے وعدے کر سکتا ہوں تم سے' سب کچھ دے سکتا ہوں تمہیں' لیکن کچھ عرصے بعد کوئی ایسی سچویشن آگئی تو پتا نہیں ہمارے درمیان کتنی تلخی ہو جائے۔ تب شاید میں اتنی سخاوت نہ دکھا سکوں اور ایک عام مرد کی طرح خود غرض بن کر تمہیں تنگ کروں۔ اس لیے ابھی ان دنوں' جب میرا دل بہت بڑا ہے تمہارے لیے' تو میں نے کوشش کی ہے کہ یہ معاملات طے ہو جائیں' صرف زبانی وعدے نہ کروں تمہارے ساتھ۔ میری طرف سے میرے والد کے سگنیچر ہیں اس پر' تم ڈاکٹر صاحب سے بھی اس پر سائن کروالو۔ ڈاکٹر صاحب چاہیں تو یہ پیپرز وہ اپنے پاس رکھ لیں یا تم اپنے لاکر میں رکھوا دو۔" وہ آنکھوں میں آنسو لیے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

"میں نے تو تم سے کوئی سیکیورٹی نہیں مانگی۔" اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"لیکن مجھے تو دینی چاہیے نا... میں یہ پیپرز جذبات میں آکر نہیں دے رہا ہوں تمہیں' یہ سب کچھ بہت سوچ سمجھ کر کر رہا ہوں۔ تمہارے بارے میں بہت پوزیسو' بہت ان سیکیور رہوں امامہ..."

وہ ایک لمحہ کے لیے ہونٹ کاٹتے ہوئے رکا۔

"اور اگر کبھی ایسا ہوا کہ تم مجھے چھوڑنا چاہو تو میں تمہیں کتنا تنگ کر سکتا ہوں، تمہیں اندازہ بھی نہیں ہے' لیکن مجھے اندازہ ہو گیا ہے۔" وہ پھر رک کر ہونٹ کاٹنے لگا تھا۔

"تم میرا ایسا واحد اثاثہ ہو' جسے میں پاس رکھنے کے لیے فیئر اور فاؤل کی تمیز کے بغیر کچھ بھی کر سکتا ہوں اور یہ احساس بہت خوف ناک ہے میرے لیے۔ میں تمہیں تکلیف پہنچانا چاہتا ہوں' نہ تمہاری حق تلفی چاہتا ہوں۔ ہم جب تک ساتھ رہیں گے' بہت اچھے طریقے سے رہیں گے اور اگر کبھی الگ ہو جائیں تو میں چاہتا ہوں ایک دوسرے کو تکلیف دیے بغیر الگ ہوں۔"

وہ اس کا ہاتھ تھپکتے ہوئے اٹھ کر چلا گیا تھا۔ وہ پیپر زہاتھ میں لیے بیٹھی رہی۔

✲ ✲ ✲

پودوں کو پانی کب سے نہیں دیا؟ اگلی صبح اس نے ناشتے کی ٹیبل پر سالار سے پوچھا۔

"پودوں کو؟" وہ چونکا۔

"پتا نہیں۔ شاید کافی دن ہو گئے۔" وہ بڑبڑایا تھا۔

"سارے پودے سوکھ رہے تھے۔" وہ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے حیران ہوئی تھی۔ وہ جم سے آنے کے بعد روز صبح پودوں کو پانی دیا کرتا تھا۔ اس سے پہلے بھی امامہ نے اسے اپنی روٹین بھولتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ سلائس کھاتے کھاتے یک دم اٹھ کر ٹیرس کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ چند منٹوں کے بعد وہ کچھ پریشان سا واپس آیا تھا۔

"ہاں' مجھے خیال ہی نہیں رہا۔" اس صبح وہ پودوں کو پانی دے کر آئی تھی۔

"تمہاری گاڑی فی الحال میں استعمال کر رہا ہوں۔ دو چار دن میں میری گاڑی آجائے گی تو تمہاری چھوڑ دوں گا۔" اس نے دوبارہ بیٹھتے ہوئے امامہ سے کہا۔

"تمہاری گاڑی کہاں ہے؟"

"ورکشاپ میں ہے لگ گئی تھی۔" اس نے عام سے لہجے میں اسے کہا' وہ چونک گئی۔

"کیسے لگ گئی؟"

"پتا نہیں کیسے لگ گئی' میں نے کسی گاڑی کے پیچھے مار دی تھی۔" وہ کچھ معذرت خواہانہ انداز میں اسے بتا رہا تھا۔ وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی' وہ سلائس پر مکھن لگا رہا تھا۔ وہ ایک پرفیکٹ ڈرائیور تھا اور یہ ناممکن تھا کہ وہ کسی گاڑی کو پیچھے سے ٹکر مار دے۔

گھر میں آنے والی دراڑیں مرد اور عورت پر مختلف طریقے سے اثر انداز ہوتی ہیں۔ عورت کی پریشانی آنسو بہانے' کھانا چھوڑ دینے اور بیمار ہو جانے تک ہوتی ہے۔ مرد ان میں سے کچھ بھی نہیں کرتا اس کا ہر رد عمل اس کے آس پاس کی دنیا پر اثر انداز ہوتا ہے' مگر وہ ایک رشتہ دونوں کے وجود پر اپنا عکس چھوڑتا ہے۔ مضبوط ہو تب بھی کمزور ہو تب بھی ٹوٹ رہا ہو تب بھی دونوں اپنی مرضی سے اس رشتے سے نکلنا چاہ رہے ہوں تب بھی۔

امامہ نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں۔

✲ ✲ ✲

اس رات وہ ڈاکٹر صاحب کے گھر اس واقعے کے بعد پہلی بار ان کے لیکچر کے لیے گیا تھا۔ امامہ ہمیشہ کی طرح آج بھی اس کے ساتھ تھی۔ وہ عام طور پر لیکچر والے دن وہاں آتے ہوئے امامہ کو ساتھ لے آیا کرتا تھا یا سعیدہ اماں کی طرف چھوڑ دیتا تھا جن کا گھر وہاں سے دس پندرہ منٹ کے فاصلے پر تھا۔ جتنی دیر وہ لیکچر سنتا امامہ' سعیدہ اماں یا آنٹی کے پاس بیٹھی رہتی پھر وہ وہاں سے کھانا کھا کر آجاتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے آج بھی سالار کا استقبال کسی گرم جوشی کے بغیر صرف ہاتھ ملا کر کیا تھا۔ لیکچر کے بعد ڈنر پر بھی انہوں نے سالار کے لیے وہ پرانی توجہ نہیں دکھائی۔ ڈنر پر فرقان بھی تھا اور ڈاکٹر صاحب فرقان سے گفتگو میں مصروف رہے۔ سالار سے ہونے والی تھوڑی سی بات چیت آنٹی نے کی تھی۔ سالار سے زیادہ اس رات اس رویے کو امامہ نے محسوس کیا تھا۔ اس نے ڈاکٹر سبط علی کی کسی کے لیے ایسی خفگی پہلی بار دیکھی تھی۔ وہ خفگی اس کی وجہ سے اور اس کے لیے تھی اس کے باوجود امامہ کو ان کا رویہ سالار کو نظرانداز کرنا بری طرح چبھا تھا۔ واپس آتے ہوئے وہ پریشان تھی۔

اس رات وہ سونے کے لیے نہیں گئی تھی' ایک ناول لے کر وہ اسٹڈی روم میں آگئی تھی۔ وہ کام کرنے کے بجائے سگریٹ سلگائے بیٹھا تھا اسے دیکھ کر اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دیا۔

"کمرے میں اکیلے بیٹھی بور ہوتی اس لیے سوچا یہاں آجاؤں۔"

اس نے سگریٹ کو نظرانداز کرتے ہوئے سالار کو آفر دی۔

"تم ڈسٹرب تو نہیں ہو گے؟" اس نے سالار سے پوچھا۔

"نہیں بالکل نہیں۔" وہ کچھ حیرانی سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

وہ راکنگ چیئر پر جا کر بیٹھ گئی اور اس نے ناول کھول لیا۔ وہ سگریٹ پینا چاہتا تھا' لیکن وہ اس کے سامنے سگریٹ نہیں پیتا تھا۔ امامہ یہ جانتی تھی اور وہ اسی لیے وہاں آکر بیٹھی تھی۔

کچھ دیر وہ بے مقصد اسے دیکھتا رہا پھر اپنا لیپ ٹاپ نکال کر وہ نہ چاہتے ہوئے بھی کام کرنے لگا تھا۔ کافی دنوں کے بعد اس رات اس نے پریشان ہو کر سگریٹ پینے کے بجائے کام کیا تھا۔ بے حد ان کمفرٹیبل ہونے کے باوجود بھی وہ پچھلے ایک ہفتے میں صرف گھر آکر ہی نہیں' آفس میں بھی اسی طرح چین اسموکنگ کر رہا تھا اور اب اسے عادتاً" طلب ہو رہی تھی۔

ایک ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد اس نے بالآخر امامہ کو مخاطب کیا۔

"تم سو جاؤ۔ کافی رات ہو گئی ہے۔" امامہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

"تم فارغ ہو گئے ہو؟"

"نہیں' مجھے ابھی کافی کام ہے۔"

"تو پھر میں بیٹھی ہوں ابھی' تم کام ختم کر لو' میرا بھی ایک چیپٹر رہتا ہے۔"

سالار بے اختیار گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

یعنی وہ آج رات مزید کوئی سگریٹ نہیں پی سکتا تھا۔ اس نے ایش ٹرے میں سگریٹ کے ادھ جلے ٹکڑے کو دیکھتے ہوئے قدرے مایوسی سے سوچا۔

مزید ایک گھنٹے کے بعد جب وہ فارغ ہوا تو وہ تب تک اسی راکنگ چیئر پر سو چکی تھی۔ وہ اپنی کرسی پر بیٹھا بے مقصد اسے دیکھتا رہا۔

اگلے چند دن اسی طرح ہوتا رہا' وہ اس کے کام کے وقت آکر اسٹڈی روم میں بیٹھ جاتی اور وہ پھر مجبوراً" کام ہی کرتا رہتا۔ ان کے درمیان آہستہ آہستہ گفتگو ہونے لگی اور اس کا آغاز امامہ ہی کرتی تھی۔ سالار بے حد شرمندہ تھا اور اس کی خاموشی کی بنیادی وجہ یہی تھی۔ وہ اس پورے واقعے سے بری طرح ہرٹ ہونے کے باوجود اسے بھلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

ڈاکٹر سبط علی نے اگلے ہفتے بھی سالار کے ساتھ ویسا ہی سلوک کیا تھا۔ اس بار امامہ کو پہلے سے بھی زیادہ رنج ہوا۔

☼ ☼ ☼

"ابو! آپ سالار سے اچھی طرح بات کیوں نہیں کرتے؟"
امامہ اگلے دن سہ پہر کو ڈاکٹر سبط علی کے آفس سے آنے کے بعد ان کے گھر آئی تھی۔
"کیسے بات کرنی چاہیے؟" وہ بے حد سنجیدہ تھے۔
"جیسے آپ پہلے بات کرتے تھے۔"
"پہلے سالار نے یہ سب کچھ نہیں کیا تھا۔ اس کے بارے میں مجھے بڑی خوش گمانیاں تھیں۔" وہ مدھم آواز میں بولے۔
"ابو! وہ برا نہیں ہے' وہ بہت اچھا ہے۔ میری غلطی تھی ورنہ شاید بات اتنی نہ بڑھتی۔ وہ بہت عزت کرتا ہے میری' بہت خیال رکھتا ہے' لیکن اب یہ سب ہونے کے بعد وہ بہت پریشان ہے۔" وہ سر جھکائے وضاحتیں دے رہی تھی۔
"آپ جب اسے اس طرح اگنور کرتے ہیں تو مجھے بہت ہتک محسوس ہوتی ہے' وہ یہ سلوک تو ڈیزرو نہیں کرتا۔ فرقان بھائی کے سامنے کتنی بے عزتی محسوس ہوتی ہوگی اسے۔" وہ بے حد رنجیدہ تھی۔
ڈاکٹر سبط علی بے ساختہ ہنس پڑے۔ امامہ نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔
"میں جانتا ہوں سالار برا آدمی نہیں ہے' وہ پریشان اور نادم ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ قصور اس کا زیادہ نہیں ہے اور میرا اس کے ساتھ رویہ آپ کو برا لگتا ہوگا۔" وہ حیرانی سے ڈاکٹر سبط علی کا چہرہ دیکھنے لگی۔
"بیٹا! میں آپ کو اسی بات کا احساس دلانا چاہتا تھا۔ مرد جب غصے میں گھر چھوڑ کر جاتا ہے' تو وہ جیسے جاتا ہے' ویسے ہی آجاتا ہے۔ اس کے گھر سے جانے پر نہ اس کی اپنی عزت پر حرف آتا ہے نہ اس کی بیوی کی عزت پر حرف آتا ہے' لیکن عورت جب غصے میں گھر سے نکلتی ہے تو اپنی اور مرد دونوں کی عزت لے کر باہر آجاتی ہے۔ وہ واپس آجائے' تب بھی مرد کی اور عورت' دونوں کی عزت کم ہو جاتی ہے۔ جھگڑا ہوا تھا کوئی بات نہیں' اس نے غصے میں برا بھلا کہا' جانے کا کہہ دیا۔ آپ گھر کے کسی دوسرے کمرے میں چلی جاتیں وہ ہاتھ پکڑ کر تو نہیں نکال رہا تھا۔ صبح ہوتی اس کا غصہ ٹھنڈا ہو جاتا۔ ایک آدھ دن میں بات ختم ہو جاتی' اتنا بڑا مسئلہ نہ بنتا۔" وہ رسانیت سے اسے سمجھا رہے تھے۔
"مرد کے دل میں اس عورت کی عزت کبھی نہیں ہوتی' جسے چھوٹی چھوٹی بات پر گھر کی دہلیز پار کرنے کی عادت ہو اور یہ دوسری بار ہوا ہے۔" اس نے چونک کر ڈاکٹر صاحب کو دیکھا وہ مسکرا رہے تھے۔
"یاد ہے شادی کے دوسرے دن بھی آپ ناراض ہو کر سعیدہ اماں کے پاس رہ گئی تھیں۔"
امامہ نے نادم ہو کر سر جھکا لیا۔ اسے یہ واقعہ یاد نہیں رہا تھا۔
"مرد کے ساتھ انا کا مقابلہ کرنے والی عورت بے وقوف ہوتی ہے۔ وہ اسے اپنا دشمن بنا لیتی ہے۔ اکڑ پن اور ضد کر کے مرد سے بات منوائی جاسکتی ہے' اس کے دل میں اپنی محبت اور عزت نہیں بڑھائی جاسکتی۔ اللہ نے آپ کو بہت محبت کرنے والا اور بہت سی خوبیوں والا شوہر دیا ہے۔ اس نے آپ کی عیب جوئی نہیں کی' بلکہ معذرت کر کے آپ کو ساتھ لے گیا۔ بہت کم مردوں میں یہ صفت ہوتی ہے' تو اگر کبھی کوئی کوتاہی ہو جائے اس سے یا کوئی گلہ ہو تو اس کی مہربانیاں یاد کر لیا کریں۔" وہ سر جھکائے خاموشی سے ان کی باتیں سنتی رہی۔
"اگر میں یہ سب باتیں اس وقت آپ کو سمجھاتا جب آپ یہاں آئی تھیں تو آپ میری بات کبھی نہ سمجھتیں۔ آپ کو لگتا آپ کے اپنے والدین ہوتے تو وہ اس سچویشن میں آپ کو سمجھاتے نہیں صرف سپورٹ کرتے۔ اس

لیے یہ باتیں تب نہیں سمجھائیں میں نے۔"

وہ ٹھیک کہہ رہے تھے۔ وہ اسے اس وقت یہ سب کچھ کہتے تو وہ بُری طرح دل برداشتہ ہوتی۔ اس نے کچھ کہے بغیر وہ پیپرز نکال کر انہیں دیے جو سالار نے اسے دیے تھے۔

"یہ سالار نے دیے ہیں مجھے، لیکن مجھے ضرورت نہیں ہے ان کی، آپ اسے بتادیں۔"

ڈاکٹر سبط علی بے حد گہری مسکراہٹ کے ساتھ وہ پیپرز پڑھتے رہے، پھر ہنس پڑے۔

"اس نے یہ بہت مناسب اور حکمت والا کام کیا ہے۔ اپنے پاس آنے والے اکثر مردوں کو میں ان معاملات کے حوالے سے، اسی طرح کے تصفیے کا کہتا ہوں اور کئی مردوں نے کیا بھی ہے۔ سالار کے ذہن میں بھی وہی چیز ہے، لیکن اس نے آپ کے لیے کچھ زیادہ کردیا ہے۔"

وہ پیپرز پر نظر ڈالتے ہوئے مسکرا رہے تھے۔

"لیکن میں ..." وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ جب ڈاکٹر صاحب نے اس کی بات کاٹ دی۔

"آپ بھی اس کا کچھ زیادہ خیال رکھا کریں۔"

وہ اسے پیپرز لوٹا رہے تھے، یہ جیسے گفتگو ختم کرنے کا اشارہ تھا۔

☼ ☼ ☼

اس دن وہ پورا راستہ ڈاکٹر صاحب کی باتوں کے بارے میں سوچتی رہی۔ انہوں نے اسے کبھی نصیحتیں نہیں کی تھیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس طرح کی باتیں کی تھیں۔ کوئی نہ کوئی غلطی انہوں نے اس کی بھی محسوس کی تھی کہ اس طرح اسے سمجھانے لگے تھے۔ وہ کھانا پکاتے ہوئے بھی ان کی باتوں کے بارے میں سوچتی رہی۔

"تم ڈاکٹر صاحب کے پاس گئی تھیں؟" سالار نے شام کو گھر آتے ہی اس سے سوال کیا۔

"ہاں۔ تمہیں کیسے پتا چلا؟" وہ کھانے کے برتن ٹیبل پر لگا رہی تھی۔

"انہوں نے مجھے فون کیا تھا۔" وہ گردن سے ٹائی نکالتے ہوئے بولا۔

"اوہ۔ کچھ کہا انہوں نے تم سے؟" اس نے سالار کا چہرہ غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ بس ویسے ہی کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔"

امامہ کو محسوس ہوا وہ اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ ہمیشہ کی طرح کپڑے تبدیل کرنے کے لیے بیڈروم میں جانے کے بجائے، ٹائی نکال کر بے مقصد کچن کاؤنٹر کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا ڈش میں پڑا سلاد کھانے میں مصروف تھا۔

"آج کیا ہے کھانے میں؟" شادی کے اتنے مہینوں میں، آج پہلی دفعہ اس نے یہ سوال کیا تھا۔

امامہ نے اسے بتایا لیکن وہ حیران ہوئی تھی۔

"اور سویٹ ڈش؟" یہ سوال پہلے سے بھی زیادہ اچنبھے کر آیا تھا۔ وہ میٹھے کا شوقین نہیں تھا۔

"کل چائنیز بنانا۔" وہ ایک بار پھر اس کا چہرہ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ کھانے کے معاملے میں فرمائشیں کرنے کا کہاں عادی تھا۔

"کل بھی چائنیز تھا۔" فریج سے پانی کی بوتل نکالتے ہوئے اس نے سادہ لہجے میں سالار کو یاد دلایا۔ وہ گڑبڑا گیا۔

"ہاں، کل بھی چائنیز تھا کوئی بات نہیں، کل پھر چائنیز سہی۔

آئی مین۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔" امامہ نے صرف سرہلا دیا۔

وہ اب فریج سے چپاتیاں بنانے کے لیے آٹا نکال رہی تھی۔

"Aqua Blue کلر تم پر اچھا لگتا ہے۔" وہ فریج کا دروازہ کھولے جیسے کرنٹ کھا کر پلٹی تھی۔ اس نے بے حد

حیرت سے سالار کو دیکھا۔

"آ۔ آ۔ ایکوا بلیو نہیں ہے یہ؟" اس کی آنکھوں کے تاثر نے اسے گڑبڑا دیا تھا۔

"سالار! تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟" امامہ نے کہا۔

"کیوں کیا ہوا؟ مجھے لگا یہ Aquabluc ہے۔"

"یہ ایکوا بلیو ہی ہے۔ اسی لیے تو پوچھ رہی ہوں کہ مسئلہ کیا ہے؟"

وہ اس کی بات پر بے اختیار ہنس پڑا۔ پھر کچھ کہے بغیر وہ آگے بڑھا اور اسے ساتھ لگا لیا۔

"Just Wanted to thank you" (صرف تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا) امامہ نے اسے کہتے سنا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کس چیز کے لیے شکریہ ادا کر رہا تھا۔

"And I am realy realy sorry I mean it"

(اور آئی ایم ریئلی سوری۔ آئی مین اٹ)

وہ اب دوبارہ معذرت کر رہا تھا۔

"آئی نو۔" اس نے مدھم آواز میں کہا۔

"I Love You" امامہ کا دل بھر آیا۔

ان کی شادی شدہ زندگی میں صرف پچھلے دس دن ایسے تھے جس میں اس نے ایک بار بھی سالار سے یہ جملہ نہیں سنا تھا۔ پہلے ڈاکٹر سبط علی کے گھر پر ہونے کی وجہ سے دونوں کے درمیان رابطہ نہیں تھا اور بعد میں شاید سالار اس سے یہ کہنے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ اگر اس سے فون پر یہ نہیں کہہ پاتا تھا تو پھر ایس ایم ایس پر کچھ نہ کچھ لکھ کر بھیجتا رہتا تھا۔

"Wife""Woman""Sweetheart""Darling""Honey""Dear"

"Mine""Yours""You""Best""Waiting""Missing""Betterhalf"

-"Hoping""Thinking""Mrs""Partner""Friend""Beauty"

ڈیئر، ڈارلنگ، سویٹ ہارٹ، ویٹنگ، مسنگ، بیٹر ہاف، وائف، وومن، تھنکنگ، مسز، پارٹنر، فرینڈ، ہوپنگ۔

وہ ایک لفظی ایس ایم ایس شروع میں اسے بری طرح جھنجلا دیتے تھے۔

"مجھے کیا پتا تم کیا کہنا چاہتے ہو۔؟ پورا جملہ کیوں نہیں لکھ سکتے تم؟ یقیناً کوئی کلائنٹ ہوتا ہوگا تمہارے پاس اور تم وقت بچانے کے لیے ایسے میسجز بھیجتے ہو۔"

"اگر کلائنٹ کے سامنے بیٹھ کر مسنگ لکھ سکتا ہوں تو مسنگ یو بھی لکھ سکتا ہوں۔" اس نے کہا تھا۔ "تو پھر کیوں نہیں لکھتے؟"

"اس طرح تم میرے ایس ایم ایس کو کچھ زیادہ دھیان سے پڑھتی ہوگی۔" اس نے لوجک دی۔ اس نے دل میں اعتراف کیا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر اس ایک لفظ کے بارے میں ضرور سوچتی تھی۔ صرف ایک جملہ تھا جو وہ ہمیشہ پورا لکھتا تھا۔

"آئی لو یو۔"

"خالی لو کیوں نہیں لکھ دیتے تم؟ یہ کیوں پورا لکھتے ہو؟" امامہ نے نوٹس کیا تھا۔

"بتاؤں گا تمہیں کبھی۔" سالار نے اسے ٹالا تھا وہ اسے بتا نہیں سکا کہ وہ لو کے لفظ پر خائف تھا۔ اس کے ذہن میں اگر امامہ ابھرتی تھی تو امامہ کے ذہن میں "کون" ابھرتا ہوگا۔

اور اب وہ one-word riddles غائب ہو گئی تھیں تو اسے ان کی قدر و قیمت کا احساس ہوا تھا۔ لاشعوری طور پر وہ اس سے اس ستائش اور اظہار محبت کی توقع رکھنے لگی تھی اور جب وہ سب کچھ غائب ہوا تو وہ فقرے اور بے تکی باتیں اس کے لیے بہت سنجیدہ ایشو ہو گئی تھیں۔

وہ اس سے الگ ہو گیا تھا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ یہ Aqua Blue ہے؟"

اپنی پوروں سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے امامہ نے بات بدلنے کی کوشش کی تھی۔

"تم ہمیشہ عجیب نام لیتی ہو کلرز کے۔ Aqua Blue واحد عجیب نام تھا جو مجھے Blue کلر کے لیے اس وقت یاد آیا۔" اس نے سادہ لہجے میں کہا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی، وہ کلر بلائنڈ تھا اسے اب اندازہ ہو چکا تھا۔

"Very Smart!" اس نے جیسے اسے داد دی۔

"You thing so" وہ ہنسا۔

"Yes I do"

"Thank You Then" ______ وہ کہتا ہوا کچن سے نکل گیا تھا۔

کچن کے وسط میں کھڑی وہ اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ وہ دنیا کا سب سے عجیب رشتہ تھا۔ دور ہوں تو دیواروں کا جنگل اُگ آئے، پاس ہوں تو کاغذ جیسی دیوار بھی نہ رہ پائے۔ ناراض ہوں تو گلوں کے لیے سمندر بھی کم پڑ جائے اور محبت ہو تو گلہ، کی چیز صحرا میں پانی بن جائے۔ غصہ ہو تو ایک دوسرے کی شکل دیکھنا بھی گوارا نہ ہو اور غصہ ختم ہو تو ایک دوسرے کے بغیر قرار مشکل ہو جائے۔ وہ بھی شوہر اور بیوی کے رشتے میں منسلک ہو جانے کے بعد اس تعلق کے سارے نشیب و فراز سے گزر رہے تھے اور پچھلے دس دن اس کی زندگی کا پہلا نشیب تھا۔

☆ ☆ ☆

"کیا لو گی تم؟" سالار نے مینیو کارڈ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"میں تو Shrimps کی ڈشز میں سے کوئی ٹرائی کروں گی۔ تم دیکھ لو۔ تم کو کیا چاہیے؟" وہ اسلام آباد میں دوسری بار باہر کھانا کھانے نکلے تھے اور احتیاطاً انہوں نے ایک نئے بنے ہوئے چائنیز ریسٹورنٹ کا انتخاب کیا۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ ان کی تمام احتیاط کم از کم آج ان کے کام نہیں آئے گی۔

پندرہ منٹ بعد کھانا سرو ہو گیا اور وہ کھانا کھانے لگے تھے۔ کھانا کھانے کے دوران ویٹر نے ایک چٹ لا کر سالار کو دی۔ اس نے کچھ حیرانی سے اس چٹ پر نظر ڈالتے ہوئے اس پر لکھی تحریر پڑھی۔

"آپ یہ جگہ فوراً چھوڑ دیں۔"

سالار نے کچھ حیرانی سے سر اٹھا کر ویٹر کو دیکھا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے ویٹر سے پوچھا۔ اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتا، ایک کرنٹ جیسے اسے چھو کر گزرا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ وہ کیا تھا۔

بے حد برق رفتاری سے چند کرنسی نوٹ والٹ سے نکال کر ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس نے ویٹر کو بل کلیئر کرنے کا کہا۔ امامہ حیرانی سے اس کی شکل دیکھنے لگی۔

"کھانا چھوڑ دو۔ ہمیں جانا ہے۔" اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"لیکن کیوں؟" وہ کچھ نہ سمجھی تھی کیونکہ انہیں کھانا شروع کیے ابھی چند منٹ ہی ہوئے تھے۔

"امامہ! یہ تمہیں باہر جا کر بتاتا ہوں بیگ لے لو اپنا۔" وہ کرسی دھکیلتا ہوا پلٹا اور پھر ساکت ہو گیا۔ انہیں نکلنے

میں دیر ہوگئی تھی۔ اس نے کچھ فاصلے پر ہاشم مبین کے ساتھ وسیم اور امامہ کے بڑے بھائی کو دیکھا اور وہ ان ہی کی طرف آرہے تھے۔

وہ برق رفتاری سے امامہ کی کرسی کی طرف آیا۔ امامہ ٹیبل کے نیچے اپنے قدموں کے قریب رکھا ہوا اپنا بیگ اٹھا رہی تھی۔ اس نے ابھی انہیں آتے نہیں دیکھا تھا۔ سالار کے اپنے قریب آنے پر بیگ اٹھاتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور کھڑا ہونے پر اس نے بھی اپنی فیملی کے افراد کو اپنی طرف آتے دیکھ لیا۔ ایک لمحہ میں اس کا خون خشک ہوگیا۔ سالار نے کچھ کہنے کے بجائے اسے اپنی اوٹ میں کیا تھا۔ ان کی ٹیبل کھڑکی کے پاس تھی اور امامہ کے عقب میں اب کھڑکیاں تھیں۔

"سامنے سے ہٹو!" ہاشم مبین نے پاس آتے ہی بلند آواز میں اس سے کہا تھا۔

آس پاس ٹیبلز پر بیٹھے لوگ یک دم ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ نہ صرف کسٹمرز بلکہ دوسری ٹیبلز پر سرو کرنے والے ویٹرز بھی۔

آخری چیز جو سالار وہاں توقع کرسکتا تھا وہ ایک پبلک پلیس پر ایسا ہی سین تھا۔

"آپ ہمارے ساتھ گھر چلیں، وہاں بیٹھ کر بات کرلیتے ہیں۔"

سالار نے بے حد تحمل کے ساتھ ہاشم سے کہا تھا۔

اس نے جواباً ایک گالی دیتے ہوئے اسے گریبان سے پکڑا اور کھینچ کر ایک طرف ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے وسیم اور عظیم سے امامہ کو وہاں سے لے جانے کے لیے کہا۔ ہاشم کے برعکس وسیم اور عظیم دونوں کچھ متامل تھے۔ وہ جانتے تھے اس طرح زبردستی اس ریسٹورنٹ سے کسی کو ہال سے باہر نہیں لے جاسکتے کیونکہ سیکیورٹی کا سامنا کیے بغیر امامہ کو بحفاظت وہاں سے لے جانا مشکل تھا۔

وہ سالار کے عقب میں اس کی شرٹ پکڑے تھر تھر کانپتی ہوئی تقریباً اس سے چپکی ہوئی تھی، جب ہاشم نے سالار کا گریبان پکڑتے ہوئے اسے کھینچا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

عنبرین اعجاز

حضرت آدم اور حضرت حوا اس لحاظ سے ایک دوسرے کے بہترین شریکِ حیات تھے کہ حضرت آدم کو کبھی حضرت حوا کی طرف سے یہ بات سننے کو نہیں ملی ہوگی کہ "تم سے پہلے میرے بہت اچھے اچھے رشتے آتے تھے۔" جبکہ حضرت حوا کو حضرت آدم سے بھی نہیں سننا پڑا ہوگا کہ "میری ماں تم سے زیادہ اچھا کھانا پکاتی تھی۔"

دس ماہ قبل بڑی آپا کے اکلوتے بیٹے کا نکاح بڑی دھوم دھام سے ہوا تھا۔ وسیع پیمانے پر اسپیشل آرڈر پہ تیار کردہ مٹھائی بھی اس شان و شوکت کا حصہ تھی۔ دل کے ارمان پورے کرنے کو بڑی آپا نے اپنے بہن بھائیوں اور دیور نندوں کو مٹھائی کے اضافی ٹوکرے بھجوائے تھے کہ اپنے محلے میں 'اڑوس پڑوس میں بھی بانٹ دیں کہ خوشیاں بانٹنے سے مزید بڑھتی ہیں اور دعائیہ کلمات میٹھا کھانے والوں کی شیریں زبان سے خود بخود ادا ہونے لگتے ہیں۔ بس اسی نیک مقصد کے پیش نظر بانیہ نے بھی اپنی گلی کے پانچ چھ گھروں میں شگون کی مٹھائی بھجوائی تھی جو آج پورے دس ماہ بعد فریزر کی یخ بستگی میں "گزربسر" کے بعد واپس گھر آگئی تھی۔

خالہ شکیلہ جب بھی سال دو سال بعد فریزر صاف کرنے کی غلطی کر بیٹھتیں تو بچے کھچے کھانے "حلال" کرنے کے لیے اہلِ محلہ کے معدوں کا بڑا سخت امتحان لیتیں۔ آج تو حد ہی ہو گئی۔ وہ بھول گئی تھیں کہ دل کی شکل والی 'میووں سے بھرپور یہ "ڈیزائنر" مٹھائی بانیہ کے گھر سے ہی آئی تھی 'جو بچ گئی' وہ انہوں نے پڑیا باندھ کے فریزر میں رکھ چھوڑی۔

بانیہ نے جو گلابی ٹشو کاغذ میں جس پہ شہر کے مشہور حلوائی اور بیکری کا نام درج تھا 'میں ملائی جیسی برفی کا کریچ بنا دیکھا تو منہ ناقابلِ یقین حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ خالہ شکیلہ کو چاہیے تھا کہ ایک عدد ہتھوڑی بھی ساتھ بھجوا دیتیں کیونکہ یہ دانتوں کا معاملہ تھا' ڈینٹسٹ کی فیس کو مدنظر رکھا جائے تو یہ برفی خاصی مہنگی پڑتی۔ لیکن سمیر کی ہمت کی داد دینا چاہیے کہ وہ بڑے شوق سے برفی کی ریوڑیوں کو منہ

کے حدود اربع کی سیر کرا رہے تھے 'جیسے میٹھی گولیوں کا مزہ لے رہے ہوں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وسیع القلب سے بانیہ کے سامنے خالہ شکیلہ کے گھر سے آئی برفی کی شان میں رطب اللسان تھے۔ بس اپنی بیوی کے ہاتھ کی بنی کسی چیز کی تعریف کرنا ان پر حرام تھا۔

"کچھ نہ پوچھیے آپو جانی! سمیر کس طرح خالہ شکیلہ کے ہاں سے ابھی آنے والی بچی کھچی جمی ہوئی برفی کی ٹھیکریوں کی چوس چوس کے تعریف کر رہے تھے۔ ایک میں ہوں ان کی بیوی جو اگر تر و تازہ سونا بھی بنا کے گرما گرم پیش کرے تو مجال ہے کہ ان کی زبان سے دو حرف شکریے کی ہی ٹپک پڑیں۔"

بانیہ نے فون پہ بڑی آپا سے دکھڑا رویا۔ اسے باسی برفی بھیجنے کا اتنا غصہ نہیں تھا جتنا کہ سمیر کے منہ سے خالہ شکیلہ کے گھر کے بساند بھرے کھانوں کی تعریف سننے کا دکھ تھا۔

"ہاں! کتنی بار تجھے سمجھایا ہے کہ سمیر اگر تیرے کھانوں کی تعریف نہیں کرتا تو برائی بھی تو نہیں کرتا

ناں۔ تو نے خود بتایا تھا کہ چپ چاپ خاموشی سے بغیر ناک بھوں چڑھائے کھا تو لیتا ہے۔" بڑی آپا نے سمجھایا۔

"یہی تو رونا ہے آپا جان! کہ چپ چاپ اور خاموشی سے کیوں' عورت آخر ستائش تو چاہتی ہے ناں۔ اتنی محنت کے بعد صلے میں دو بول حوصلہ افزائی کے بھی نہ ملیں تو کیا بات ہوئی بھلا؟ سراہے جانا تو ہم عورتوں کا فطری حق ہے آپا جان۔" ہانیہ اپنے موقف پہ ڈٹی ہوئی تھی۔

"میرا یقین جانیے آپا! یہ تعریف کے معاملے میں کنجوس نہیں' صرف میرے معاملے میں کنجوس ہیں۔ اگر کسی کے گھر سے کولڈ اسٹور یج کے کینو اور سنڈی زدہ امرود بھی آئیں تو یہ اس رغبت و عقیدت سے کھاتے ہیں گویا سعودی عرب کے شاہی خاندان نے انہیں تحفتاً" عنایت کیے ہیں اور تعریف میں وہ مبالغہ آرائی کہ جیسے یہ پھل فروٹ بھی ہمسائے نے اپنے ہاتھ سے بنائے 'پکائے ہوں۔" ہانیہ کی آنکھوں میں

آنسو آ گئے۔

"آپا! آپ کو پتا ہے ناکہ رانی بھابی کیسا آزمائشی کھانا بناتی ہیں لیکن بڑے بھیا ان کی کتنی تعریفیں کرتے ہیں۔ لیکن سمیر...." ہانیہ نے دوپٹے کے کونے سے آنسو پونچھے۔

"بس کر ہانیہ! بس کر! کبھی تُو نے خود اپنے کانوں سے بھیا کے منہ سے رانی بھابی کی تعریف سنی ہے؟ ایسا صرف رانی بھابی کہتی ہیں۔ آخر عورت کو اپنا بھرم بھی تو رکھنا ہوتا ہے۔ یاد رکھو ہانیہ! جس انسان کو خود اپنے منہ سے اپنی تعریف کرنا پڑے یا وہ خود اپنی کسی بات کی پبلسٹی کرے تو سمجھ جاؤ کہ اسی بات کی کمی ہے یا یہ بات جس کی تشہیر کی جارہی ہے' یہ دراصل ہے ہی نہیں۔ بلا ناغہ بڑے بھیا نے اپنی فیس بک پہ رنگ برنگے ریسٹورنٹ اور ہوٹلوں کی ڈشز کی تصویریں اور اسٹیٹس اپ لوڈ کیا ہوتا ہے۔ آج فلاں جگہ تو کبھی فلاں ڈش۔ میں پوچھتی ہوں کہ آخر یہ شخص گھر میں کھانا کب کھاتا ہے۔ الٹا ہمارے بچے اپنے ماموں کی فیس بک دیکھ کے ہم سے آئے دن مہنگی مہنگی جگہوں پہ لنچ' ڈنر کی ضدیں کرتے رہتے ہیں۔ رہی بات تمہارے سمیر کی' تو بعض مرد اپنی بیوی کو کسی پہلو میں خود سے بہتر یا برتر محسوس کرتے ہیں تو احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ انہیں لگتا ہے کہ انہیں نظرانداز کرکے بیوی کو زیادہ اہمیت دی جارہی ہے۔ اب ہر کوئی تمہاری کوکنگ بیکنگ کی تعریفیں کرتا ہے۔ فیس بک پہ تمہارا پیج ——— 'تمہارا کوکنگ گروپ اور تمہارا بلاگ ہے۔ ہزاروں لوگوں نے جوائن کر رکھا ہے۔ لاتعداد لائکس اور شیئرز۔ سمیر جان بوجھ کے تمہیں اسی معاملے میں نظرانداز کرتا ہوگا' شاید تمہاری امید بھری نظریں دیکھ کے' پھر تمہیں اس حوالے سے تڑپتا' سسکتا منتظر اور مایوس دیکھ کر اس کی انا کی تسکین ہوتی ہو' کچھ مرد ایسے ہوتے ہیں جن کے اپنے لاشعور میں عدم تحفظ کا یہ احساس چھپا ہوتا ہے۔ بہتر ہے کہ اس بات کو تم ایشو نہ بناؤ' اس معاملے کو تم بھی نظرانداز کر دو' چیلنج نہ بناؤ۔ ورنہ تمہیں خبر بھی نہ ہوگی کہ کب سراہے جانے کی یہ تمہاری خواہش کب ٹھاٹھیں مارتے سمندر کی سرکش لہروں میں بدل جائے گی۔"

بڑی آپا نے ہانیہ کی ٹھیک ٹھاک کلاس لے لی۔ لیکن ہانیہ کب ہار ماننے والی تھی' پھٹ پڑی۔

"دنیا بھر کی تعریفوں سے مجھے کیا لینا؟ میرے لیے تو میرا شوہر ہی کُل کائنات ہے۔ بات ایک جملے کی نہیں ہے' اہمیت "بات کہنے والے" کی ہے۔ آپ سمجھ نہیں رہیں۔"

ہانیہ نے ناک رگڑتے ہوئے کہا تو جواب میں آپا نے جھٹ سے فون بند کر دیا۔

☼ ☼ ☼

گُل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی

دنیا بھر کے کوکنگ چینلز دیکھ دیکھ کے اپنی عینک کا نمبر بڑھوا لیا۔ لیپ ٹاپ پہ گوگل سرچ کر کر کے سر کھپا لیا۔ اپنی پاکٹ منی سے مہنگی مہنگی ریسپی بکس خریدیں' کوکنگ بیکنگ کے ماہانہ میگزین کا ذخیرہ کر لیا۔ گویا گھر کے اندر ہی ریسٹورنٹ کھل گیا تھا۔ پڑوسی تہواروں کا انتظار للچا للچا کے کرتے کہ اب ہانیہ کے ہاں سے کون سی ڈش آئے گی۔ ہاتھوں میں پلیٹ تھامے ہانیہ کے بچوں پہ نظر پڑتے ہی ہمسائیوں کے دل باغ باغ ہو جاتے کہ ہانیہ سمیر کے بچے جب بھی آتے ہیں خالی ہاتھ نہیں آتے' کوئی نہ کوئی بہت ہی مزے دار چیز لے کر آتے ہیں۔ دوست احباب کیٹرنگ کے بزنس کا مشورہ دیتے' رشتے دار عزیز و اقارب چھوٹے پیمانے پہ ہی سہی' ریسٹورنٹ یا ہوٹل کھولنے کی تجویز دیتے۔ بچوں کی بھی خواہش تھی کہ کسی طرح ان کی ماما فوڈ انڈسٹری کو باقاعدہ پروفیشن کے طور پر جوائن کر لیں' تاکہ مستقبل میں جب ہم اپنی عملی زندگی میں قدم رکھیں تو ہمارے ہاتھوں میں جما جمایا کاروبار ہو۔ لیکن کوکنگ بیکنگ ہانیہ کا شوق تھا۔

اسے بچپن سے ہی اچھا کھانے کا ہی نہیں بلکہ اچھا پکانے کا بھی شوق تھا۔ جو عمر کے مراحل طے کرتے

کرتے جنون کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ ہانیہ خالصتاً "گھریلو عورت" تھی وہ کاروباری سوچ یا ذہن کی حامل نہ تھی البتہ بچے خاصے دور اندیش واقع ہوئے تھے۔ اور سمیر کے لیے "گھر کی مرغی دال برابر" والا کیس تھا' نہ تعریف تھی نہ تنقید۔ بس ایک چپ کا بسیرا تھا۔

☼ ☼ ☼
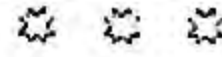
شمسہ آنٹی کو ساس بنے پورے چھ ماہ گزر چکے تھے۔ لڑکی اب دلہن سے بہو بن چکی تھی' لیکن ابھی تک کھیر پکائی کی رسم ادا نہیں ہوئی تھی۔ ہوتی بھی کیسے 'بہو ڈاکٹر جو تھی۔ صبح آٹھ بجے گھر سے نکلی اور شام چھ بجے گھر واپس آتی تھی۔ گھر کے کاموں کا اسے نہ تجربہ تھا' نہ ہی اسے یہ کام سیکھنے کا وقت یا موقع ملا تھا۔ شمسہ آنٹی کی گوہر شناس آنکھوں نے ہانیہ پہ نشانہ باندھا اور ان کی محبت بھری التجا' منت سماجت' محلے بھر میں عزت یا پھر ذلت و رسوائی کے خوف نے ہانیہ کو ہامی بھرنے پر مجبور کر ہی دیا۔

ہانیہ بچوں کو اسکول اور سمیر کو آفس روانہ کرنے کے بعد کاموں میں جت گئی' گھر کی صفائی ستھرائی اور دوپہر کے کھانے کی تیاری کے بعد اس نے طے کردہ وقت پر شمسہ آنٹی کے گھر کا رخ کیا۔ ہانیہ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ شمسہ آنٹی کی ڈاکٹر بہو رانیہ کو چائے بنانا تو درکنار انڈا ابالنا یا تلنا بھی صحیح طریقے سے نہ آتا تھا۔ اس نے اپنے میکے میں بھی کبھی باورچی خانے کا رخ نہیں کیا تھا۔ سارا کام کک اور دیگر ملازم ہی سرانجام دیتے تھے۔ چھری' چمچ اور کانٹے کے علاوہ وہ کچن سے متعلق دیگر کٹلری کی اشیاء سے قطعی نابلد تھی۔ البتہ سرجری کے آلات یعنی آلات جراحی کے ماہرانہ استعمال سے بخوبی واقف تھی۔ لہٰذا چولہے میں آگ جلانے سے لے کر کھیر پیالوں میں انڈیلنے تک سارا کام ہانیہ نے ہی کیا۔ ڈاکٹر بہو رانی سارا وقت ہانیہ کے برابر رسماً کھڑی رہی اور ہانیہ نے رسمی طور پر دوبار اس کے ہاتھ میں کفگیر تھما کے اسے گھمانے کا کہا تاکہ دلہن کا ہاتھ تو لگ جائے۔ کھیر کو ٹھنڈا ہونے میں کافی وقت درکار تھا اس لیے ہانیہ اپنے گھر واپس چلی آئی۔

شام میں چائے کی میز پر تمام اہل خانہ ایک ساتھ بیٹھے کسی ٹیلی ویژن پروگرام پر تبصرہ فرما رہے تھے کہ ڈور بیل بجی چھوٹا بیٹا لپک کے باہر بھاگا۔ جب وہ اندر لوٹا تو ہاتھ میں چھوٹی سی سلور طشتری تھامے ہوئے تھا جس پہ سرپوش ڈھکا ہوا تھا۔

"شمسہ آنٹی کے گھر سے کھیر آئی ہے۔ دلہن کی "کھیر پکائی" کی رسم ادا ہوئی ہے۔"

بیٹے نے ٹرے ڈائننگ ٹیبل پہ رکھتے ہوئے لفظ بہ لفظ اطلاع دی۔ ہانیہ نے سرپوش ہٹایا۔ سلور کی خوب صورت سی روایتی کٹوری میں ٹھنڈی ٹھنڈی کھیر جمی تھی۔ کام سارا ہانیہ کا اور نام دلہن رانیہ کا۔ سمیر جو حقیقت سے یکسر بے خبر تھے' کھیر دیکھتے ہی چمچ سنبھال کے حملے کے لیے تیار ہو گئے۔ منہ میں چمچ رکھتے ہی لمحہ بھر کو ٹھٹکے' آنکھیں پھٹ پہ نکالے کچھ سوچا پھر چونکے۔ یہ "دلہن کے ہاتھ" کی کھیر تھی' سو مطمئن ہو گئے۔ جیسے جیسے چمچ سمیر کے منہ میں جاتا' ویسے ویسے تعریفوں کے پھول باہر جھڑتے۔ ہانیہ حیرت سے ٹکٹکی باندھے یہ منظر ملاحظہ کر رہی تھی۔ سمیر کی ہر "واہ" پہ اس کے دل کی دھڑکن خوشی کے مارے تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔

ترسا دیا ہے ابر گریزاں نے اس قدر
برسے جو بوند بھی تو سمندر لگے مجھے

اب چپ رہنے کی باری ہانیہ کی تھی۔ وہ خوشگواری اور کامیابی کے ملے جلے جذبے سے سرشار چپ چاپ خاموشی سے سمیر کو محبت بھری نظروں سے دیکھے جا رہی تھی۔

فاخرہ جبیں

مرے چاند واسطے تو سج ہارا

ناولٹ

پورے پانچ سال' چھ مہینے اور ستائیس دن کی بیماری کے بعد اس کی اماں اپنے نازک سے وجود اور سپید چہرے کے ساتھ اس دار فانی سے کوچ کر گئیں۔

اور وہ ۔۔۔ جو کتابوں' سہیلیوں اور خوابوں سے ہاتھ چھڑا کر اپنی ماں کی پٹی سے کئی سالوں لگی رہی' تو اب بالکل خالی ہاتھ ہو کر ٹکر ٹکر اماں کی خالی چارپائی کو دیکھا کرتی یا پھر بولائی بولائی سی اس پانچ مرلے کے مکان میں گھومتی پھرتی۔ اس کمرے سے اس کمرے' باورچی خانے سے برآمدوں تک اور صحن سے ڈیوڑھی تک کا راستہ' وہ دن میں نہ جانے کتنی بار ناپتی' پھر تھک جاتی تو سبز ستون سے لگ کر صحن میں پھیلی دھوپ کو سمٹتے اور شام کے سائے اترتے دیکھتی۔

پہاڑ ساون سرکتا تو یہ لمبی سی رات آن پڑتی' جسے اپنی بے خواب آنکھوں سے کاٹتے کاٹتے وہ پہلی اذان کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوتی۔

"کیا ساری مصروفیات اماں کے ساتھ ہی تھیں۔ اتنے کام تھے ان کے؟" صفائی' ستھرائی' جھاڑ پونچھ کے بعد کلاک کی سوئیاں دیکھتی۔

ابا بھی اس سے کوئی خاص ہم کلام تو نہ ہوتے تھے۔ بس گنی بندھی باتیں۔

"تم نے کھانا کھالیا؟"

"میرے لیے ایک کپ چائے۔"

"صبح کے لیے کپڑے تیار کر دینا وغیرہ وغیرہ۔"

لیکن وہ پہلے سے مصروف رہنے لگے تھے۔ اب گھر دیر سے آتے تھے۔ شیو روزانہ بنانے لگے تھے۔ جوتوں کی پالش اور کپڑوں کی استری کا خاص خیال رکھتے تھے۔

"پتا نہیں کیوں؟ شاید اماں کی بیماری نے انہیں خود پر توجہ دینا بھلا ہی دیا تھا۔" اس نے دل ہی دل میں سوچا تھا۔

اور پھر ایک دن کم گو سے ابا نے اس سے خاصی طویل گفتگو کی۔

اس نے بے حد سنجیدگی اور مدبرانہ انداز میں بیٹھ کر ابا کی ایک ایک بات کو بہت توجہ سے سنا' لیکن وہ ان کی باتوں کو کوئی خاص سمجھ نہیں پائی تھی۔ خبر نہیں' ابا کی باتیں مشکل تھیں یا انہیں سمجھنے کے لیے اس کی عمر ناکافی تھی۔ تاہم وہ چپ ۔۔۔ چاپ بنا کوئی سوال کیے سر ہلاتی رہی۔

"ایک اکلوتی بیٹی ہو تم میری۔۔۔ نہ کوئی بہن، نہ بھائی۔۔۔ کل کلاں مجھے کچھ ہو گیا تو تمہارا میکہ ہی سمجھو تباہ ہو گیا۔ کوئی بھائی ہی ہوتا تمہارا تو۔۔۔ اب دیکھنا لوگ تو میرے مکان اور جائیداد پر قبضہ کرنے کا ابھی سے سوچنے لگیں گے اور پھر تمہاری شادی کر دی تو مجھ رنڈوے کو یہاں ٹکیہ پکا کر دینے والا کوئی نہ ہوگا۔ کاش تمہارا کوئی بھائی ہوتا تو۔۔۔"

ابا کی ٹھنڈی آہوں، مایوسی و ناامیدی سے متاثر ہو کر وہ ٹپاٹپ آنسو بہانے لگی تھی۔

"مت رو میری بیٹی۔۔۔ مت رو۔۔۔ اللہ بہتر سبب بنائے گا۔" ابا نے اس کا سر تھپکا اور اللہ نے جو سبب بنایا، وہ بنا سنورا۔۔۔ ہنستا کھلکھلاتا اگلے روز ہی ان کے آنگن میں موجود تھا، اور تب سے گزشتہ روز ابا کی کہی گئی سب باتوں کی سمجھ آ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ چھت پر سے سوکھے کپڑوں کا ڈھیر لیے اتر رہی تھی۔ جب ابا زرد رنگ کے شوخ سے لباس میں سجی سنوری عورت کے ساتھ گھر میں داخل ہوئے۔

"بیٹا! یہ تمہاری نئی ماں ہے۔" فوری تعارف۔

"ہاں۔۔۔ رشتہ تو ماں کا ہی بنتا ہے، لیکن تم مجھے آپا کہہ لیا کرنا۔ عمر میں تو مجھ سے چند سال ہی چھوٹی لگتی ہے یہ۔"

آپا نے فوراً ہی عمروں کا تعین کرنا شروع کر دیا تو ابا کھلکھلا کر ہنس دیے۔ (خلافِ عادت)

"آؤ۔۔۔ میں تمہیں گھر دکھاتا ہوں۔" ابا ایک نئے جوش و جذبے سے اس کی نئی ماں عرف آپا کو گھر کا کونا کونا دکھانے لگے تھے۔

وہ کتنی دیر وہیں صحن میں کھڑی رہی۔۔۔ وہ اکیلی نہ کھڑی تھی۔۔۔ اماں اس کی اپنی اماں اس کے ساتھ کھڑی تھیں۔ اس کا کندھا تھپک رہی تھیں۔ دلاسا دے رہی تھیں۔ لیکن اس کے وجود میں ناتوانی سی اتری چلی آ رہی تھی۔

اپنے کمرے میں آ کر اس نے کپڑوں کا ڈھیر بیڈ پہ الٹا اور پھر بیڈ پہ گر کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔

"ثانیہ۔۔۔ ثانیہ۔۔۔" ابا پکار رہے تھے۔

"کہاں چلی گئی۔۔۔ ثانیہ۔۔۔"

"آپ کی بیٹی کو ہمارا یہاں آنا غالباً اچھا نہیں لگا۔" نئی ماں کا باآوازِ بلند اپنے خیالات کا اظہار۔

"نن۔۔۔ نہیں۔۔۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔" ابا کی شرمندہ سی آواز۔

وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ابا۔۔۔ میرے ابا۔" اسے ابا سے کس قدر محبت تھی۔ اب اپنے پیارے ابا کو اپنی وجہ سے شرمندہ ہوتے دیکھتی کیا؟

وہ جھٹ پٹ باہر نکل آئی۔

بال جو ذرا دیر لیٹنے سے تھوڑے سے الجھ گئے۔۔۔ اور زرد پڑتا چہرہ۔ جسے کوئی بھی نظر بھر کر دیکھ لیتا تو اس کی اندرونی کیفیت کو سمجھ لیتا۔۔۔ مگر وہاں دیکھنے کی فرصت کسے تھی؟

"میں آپ کے لیے چائے بناتی ہوں۔" وہ لپک کر باورچی خانے میں گھس گئی تھی۔

ذرا سی دیر میں باورچی خانے کی سلیب پر مختلف شاپر رنج گئے تھے۔ ابا بیکری سے ہو آئے تھے اور اب وہ کمرے میں تھے۔

وہ کپکپاتے ہاتھوں سے ٹرے سجانے لگی۔۔۔ چپلی کباب، پیسٹری، رول، پزا، چولہے پہ رکھی چائے پک پک کر کڑوی ہونے لگی تب ابا نے پکارا۔

"ثانیہ! چائے میں کتنی دیر ہے؟"

وہ خود بھی چلے آئے تھے۔ ٹرالی ان کے حوالے کر کے وہ باورچی خانے میں ہی ٹھہر گئی۔

"ماں کو مرے ہوئے آج۔۔۔ آج۔۔۔" اس نے دنوں مہینوں کا حساب لگانا چاہا، مگر سب کچھ غلط ملط ہو رہا تھا۔ تاریخیں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔

"ہم لوگ کچھ دیر تک آتے ہیں۔ دروازہ اندر سے بند کر لو اور کھانے کا انتظام کر لینا۔ رات میں ہم سب

اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھائیں گے۔" ابا اسے خود سے لپٹائے کہہ رہے تھے۔ ابا کے ملبوس سے اٹھتی مہک قطعی نامانوس تھی۔

"شاید ابا نے کوئی نیا پرفیوم..."

ابا کی قمیص کے بٹن سے الجھا ایک لمبا بال اس کی نظروں کے سامنے لہرایا، تو وہ لاشعوری طور پر ان سے الگ ہو گئی۔

ابا ہنس رہے تھے، خوش ہو رہے تھے۔

وہ باورچی خانے کی جالی دار کھڑکی سے لگی ان کی چوڑی، مضبوط پشت کو دیکھ رہی تھی۔ تب ہی وہ دونوں صحن کے بیچوں بیچ رک گئے۔

آپا نے ہاتھ بڑھا کر ابا کی قمیص پہ لہراتا وہ بال کھینچ کر پرے پھینکا۔۔۔ اور شاید کوئی ہلکی سی سرگوشی بھی کی، جواباً کچھ آس پاس گری تو ان کی مردانہ ہنسی شام کے اس پہر دیر تک آنگن میں گونجتی رہی۔

اس کی نظریں اس بال پر تھیں، جو ہوا کے ساتھ لہراتا اب صحن کے سرمئی فرش پہ چپک گیا تھا۔

"گھر کتنا گندا گندا سا لگ رہا ہے، جلدی جلدی صفائی کرلوں۔ رات تک آپا بھی آئے گی ابا کے ساتھ... کیا سوچے گی؟" اس کی نظریں بھٹک بھٹک کر اس لمبے بال کا طواف کرتی رہیں تو تنگ آکر اس نے سب کام چھوڑ چھاڑ کر صحن میں خوب پانی بہایا۔ اتنا پانی کہ وہ لمبا بال پانی کے ساتھ بہتا ہوا نالی کے جالی دار ڈھکن کے اندر کہیں بہہ گیا۔

"شام کے وقت جھاڑو... اونہوں۔" اماں اس کی اپنی اماں تنبیہہ کرتی رہیں، وہیں برآمدے میں کھڑی۔۔۔ لیکن وہ سنی ان سنی کرتی شڑاپ... شڑاپ جھاڑو چلاتی رہی۔

☆ ☆ ☆
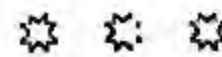
بہار آگئی تھی۔۔۔ آنگن کی پرلی دیوار کے ساتھ لگے شہتوت کے سارے درخت بور سے لد گئے تھے۔ ایسی ہی بہار اسے لگتا تھا، ابا پر بھی اتر آئی ہے۔ وہ پہلے سے

تومند ہو گئے تھے اور سفید رنگت والے چہرے سے خون چھلکنے لگا تھا۔ بہت عرصے بعد ان کا باورچی خانہ انواع و اقسام کھانوں کی خوشبو اور کلائی میں پہنی چوڑیوں کی کھنک سے آباد ہوا تھا۔ آپا کے ہاتھ میں ذائقہ بلاشبہ کمال کا تھا۔ بریانی، کباب، کڑھی، کوفتے بنانا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔۔۔ اور یہ سب چیزیں بنانے، کھلانے میں آپا نے اس کے ہاتھ سے "ڈوئی" بھی بڑی آسانی سے ہتھیالی تھی۔

"جس کے ہاتھ میں ڈوئی ہوتی ہے گھر اور خاندان پہ راج بھی اسی کا ہوتا ہے۔ اب اس گھر پہ وہی حکمرانی کرے گی۔ تمہیں کوئی تنگی، ترشی محسوس ہوتی تو بھائی جان سے کہہ کر میری طرف چلی آنا۔۔۔ خالہ بھی تو ماں برابر ہوتی ہے۔" خالہ نے فون پر سمجھایا تھا۔

"نہیں۔۔۔ مجھے بھلا کیا تنگی، ترشی ہوگی۔" اس نے بہت سبھاؤ سے انہیں اور خود کو بہلایا تھا۔ وہ تو بڑے آرام اور آسانی سے آنے والی کو سب کچھ سونپتی جارہی تھی۔

"سب کچھ اسی کا تو ہے۔" وہ دن میں کئی بار خود کو تسلی دیتی۔ جب آپا اسے کھانا خود نکال کر دیتیں۔۔۔ جب باورچی خانے کی بیشتر کیبنٹس کو تالا لگاتیں۔۔۔ جب ماچس، برتن دھونے کا صابن، سرف، شیمپو اور چینی جلدی ختم ہونے پر اس سے استفسار کرتیں۔ جب چائے بنانے کے لیے پتیلی میں دودھ خود ڈال کر دیتیں۔ تب۔۔۔ تب بھی وہ یہی سوچتی۔

"سب کچھ اسی کا تو ہے۔"

☼ ☼ ☼

تانیہ باورچی خانے میں تھی۔

آپا اس کے کمرے میں آکر کہہ گئی تھیں۔

"تم سبزی اور پیاز وغیرہ کاٹ دو۔۔۔ پکاؤں گی میں خود۔"

اگلا پیغام تب ملا جب وہ باورچی خانے میں آکر سبزی دھو رہی تھی۔

"نہسن۔۔۔ ادرک بھی چوپ کرلینا۔۔۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

اور اب وہ باورچی خانے میں تھی۔۔۔ سبزی، پیاز، ادرک، لہسن، ٹماٹر۔۔۔ ذرا دھنیا ہی تو صاف کرنے والا رہ گیا تھا۔

وہ سبز سبز پتے چننے لگی۔

اماں! اس کی اپنی اماں نے ہولے سے میز بجائی۔ تانیہ نے نظریں اٹھائیں تو وہ دھنیے کی سبز ڈنڈیوں کی طرف اشارہ کرنے لگیں۔

"آپا کو پسند نہیں۔۔۔ وہ کہتی ہیں صرف پتے چن دیا کرو۔"

اور مسعود جو اس کی کھوج میں باورچی خانے میں چلا آیا تھا۔ پہلے حیران ہوا اور پھر بے اختیار ہی ہنس دیا۔

"ارے تم اکیلے میں بھی باتیں کرتی ہو؟"

وہ اس کے سامنے بیٹھ کر پوچھنے لگا۔ تانیہ نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

اور عموماً" ایسا ہی ہوتا تھا۔۔۔ وہ جواب میں کچھ نہیں بولتی تھی۔ صرف مسعود بولتا تھا اور تانیہ کو وہ لڑکا عجیب لگتا تھا جو ہر چھوٹی سے چھوٹی بات پر قہقہہ لگاتا تھا۔ اسے گہری آنکھوں سے دیکھتا تھا۔ وہ آپا کا کزن تھا، جو اس کے آنے پر یوں ہی ادھر سے ادھر کھسک جایا کرتی تھیں۔ کبھی کمرے میں گھس جاتیں تو کبھی کسی پڑوسن کا حال دریافت کرنے نکل جاتیں اور وہ بھی ایسی ہی ایک تنہا سی شام تھی، جب مسعود آیا اور آپا کسی کام سے چھت پر چلی گئیں۔ مسعود اپنی ہی کسی بات پر ہنسا اور اسی ہنسی میں وہ تانیہ کے اس قدر قریب چلا آیا کہ تانیہ کو اس سے خوف آنے لگا۔ وہ اتنا لمبا، چوڑا تو کبھی بھی نہ تھا، پھر بھی اس لمحے تانیہ کو اپنے چہار جانب پھیلا ہوا محسوس ہوا۔ وہ زرد روی اس سے بچنے کی کوشش میں بھاگی تو ابا سامنے کھڑے تھے۔ عین تانیہ کے سامنے۔۔۔ اور وہ بھاگ کر ان کے سینے میں سما گئی۔

ابا اسے بازوؤں میں بھینچے مسعود کو خوں خوار نظروں سے گھورتے رہے، یہاں تک کہ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا گھر کا بیرونی دروازہ پار کر گیا۔۔۔ اور وہ مرے مرے قدم

اٹھاتی اپنے کمرے میں آ گئی۔
اس رات اس نے پہلی بار ابا کے کمرے سے ہنسنے اور باتیں کرنے کے سوا کچھ اور آوازوں کو سنا۔ یہ ابا کے دھاڑنے کی آواز تھی اور آپا کی سسکیوں کی اور اس نے رات کی تاریکی میں دو ناموں کو بار بار سنا تھا۔
مسعود اور تانیہ۔
وہ اپنے بخار زدہ، رعشہ اترتے بدن پہ کمبل لپیٹے، کانوں پہ ہتھیلیاں جمائے لیٹی تو پھر اگلے کئی روز تک اٹھ نہ سکی تھی۔ مسعود بھی اگلے کئی دن تک گھر میں نظر نہ آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

نیلے آسمان پر سفید، مہین سے بادل ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ چیل اپنے لمبے پر ساکت کیے فضا میں گول دائرے بنا رہی تھی۔ وہ کتنی دیر آنگن میں چارپائی پہ لیٹی خالی ذہن، خالی آنکھوں سے آسمان کو دیکھتی رہی، حتیٰ کہ دروازے پر دوسری بار دستک ہوئی۔ وہ نا چاہتے ہوئے اٹھ کر دروازے تک گئی۔
"کون۔"
"میں۔ خاور۔"
"آپا بازار گئی ہیں۔" اس نے کہا۔ پھر آنے والے کا جواب نہیں سنا۔ یوں ہی الٹے قدموں لوٹ آئی۔ اور یہ ہی بات رات کے ہنگامے کا سبب بن گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ کچھ دیر پہلے ہی کھانے کی ٹرے ابا کے کمرے میں پہنچا کر آئی تھی۔ آپا کی طبیعت ناساز تھی۔ بظاہر تو ہٹی کٹی نظر آتی تھیں۔ خدا جانے کیا مسئلہ تھا؟
"سارا دن بازار میں گھومتی رہیں۔ تھک گئی ہوں گی۔" اس نے وہیں تک سوچا۔ جہاں تک وہ سوچ سکتی تھی۔ اور پھر جیسے دھواں اٹھتا ہے۔ بہت ہولے، آہستگی سے اور پھر بلند ہوتا چلا جاتا ہے۔ اسی طرح ابا کے کمرے سے اٹھنے والی دھیمی آوازیں، شور اور شور سے ہنگامے میں بدل گئی تھیں۔
وہ بھاگ کر اپنے کمرے سے نکلی اور تھر تھر کانپتی ابا کے دروازے سے لگ گئی۔
"میرا ماں جایا تھا وہ۔ جسے دروازے سے ہی الٹے پاؤں لوٹا دیا گیا۔ کیا ہوں میں اس گھر میں۔ کیا حیثیت ہے میری؟ اپنی بیٹی کے کرتوت چھپانے کو مسعود کا داخلہ بند کر دیا۔ خاور کو دروازے سے اندر نہیں آنے دیا۔ میرا سارا میکہ یوں ہی چھڑوا دو گے تم۔ کل کوئی اور آئے گا تو اس پہ کوئی نیا الزام لگ جائے گا۔ ارے دو بول نکاح کے پڑھوا کے تانیہ کو رخصت کیوں نہیں کر دیتے۔ اس دو چھٹانک کی لڑکی کے پیچھے میں تو اپنے سارے رشتے کھو دوں گی۔"
وہ ابا کی بات سننے کی منتظر تھی۔ لیکن ابا شاید تھک گئے تھے۔ خاموش رہے اتنی دیر تک کہ وہ تھک ہار کر آنگن میں آ بیٹھی۔ چاندنی دیواروں کو اجلا کر رہی تھی مگر وہ اندھیرے میں گویا چھپی بیٹھی تھی۔ اماں اس کی اپنی اماں بانہیں پھیلائے دور کھڑی اسے بلاتی رہیں لیکن اس نے ناراضی سے منہ پھیر لیا۔
"بہت چالاک ہیں۔ ہمیشہ دھوکا دینے آ جاتی ہیں۔"

☼ ☼ ☼

"خاور۔ رفیعہ کا بھائی ہے، سگا بھائی۔ تمہیں چاہیے تھا، اسے گھر میں بلا لیتیں۔" صبح ناشتا کرتے وقت ابا نے اسے کہا تھا۔
"آپا گھر پہ نہیں تھیں۔ تب بھی۔" اس نے بس ایک سوال ہی کیا تھا۔
ابا کو جانے کیا ہوا کہ ہاتھ میں پکڑا سلائس پلیٹ میں پٹخ کر ناشتا مکمل کیے بنا ہی اٹھ گئے۔ اور اسی روز خاور دوبارہ آیا تھا یا شاید بلوایا گیا تھا۔ آپا نے دروازہ کھولا، قفل پر دو تو کول دیا۔ چائے تانیہ سے بنوائی، پیش بھی اسی نے کی اور پھر اپنے کاموں سے لگ گئی۔ خاور سارا دن وہاں رہا اور پھر شام کو ابا کے آنے سے پہلے ہی چلا گیا۔ سارے دن میں یہ پہلا لمحہ تھا، جب تانیہ نے کھل کر سانس لی تھی۔
اور پھر خاور اکثر ہی آنے لگا تھا۔ کبھی آپا کو پھل

دینے، کبھی دوائیاں پہنچانے، کبھی اس کا بلڈ پریشر چیک کرنے۔ ایک روز اسے بھی آفر کردی۔

"آؤ، تمہارا بلڈ پریشر بھی چیک کردوں۔"

وہ جو آپا کو پانی کا گلاس دینے آئی تھی، گھبرا کر پلٹ گئی۔

آپا نے کھلکھلا کر قہقہہ لگایا، خود وہ جوں کا توں سنجیدہ بیٹھا تھا۔

وہ ایسا ہی تھا۔ مسعود کی طرح بار بار قہقہہ نہیں لگاتا تھا، بس دھیمے سے مسکراتا تھا۔ بس اس کی آنکھیں... سرخ ڈوروں والی زرد سی آنکھیں... ثانیہ کو بے حد بری لگتی تھیں۔ وہ جو بھی کام کرتی، جس زاویے سے بھی اٹھتی، بیٹھتی، وہ آنکھیں اس کے آرپار ہوتیں... جس طرح جوتے کے نرم تلوے میں کوئی کنکر پیوست ہوجائے، تکلیف دے نہ دے... محسوس ہوتا رہتا ہے۔ اسی طرح وہ دو آنکھیں... جو باریک کنکر بن کر اس کے آگے پیچھے ہر قدم چبھتی رہتی تھیں۔

☆ ☆ ☆

آپا کمر پہ ہاتھ رکھے ہائے، وائے کرتی اس کے قریب سے گزر کر کمرے میں غائب ہوگئی تھیں۔

"آج کل تو کوئی کام نہیں کرتیں... بس کھا کھا کر موٹی ہوئی جارہی ہیں۔" اس نے پتا نہیں کس لے میں خالہ سے کہہ دیا تھا۔

"تو... تم سا معصوم بھی کوئی ہوگا بنو... تمہارے باپ کا نیا بچہ پیدا کرنے والی ہے، وہ... میری مانو... تو یہاں آجاؤ... میرے پاس... اسے تو بچے کا بہانا مل جائے گا، تمہیں خوب ہی رگڑا لگے گا۔ ان دونوں کی چاکری کے ساتھ ساتھ بچے کی دیکھ بھال بھی تمہارے سر آجائے گی۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا بھائی جان اب تمہارے بارے میں کچھ سوچتے کیوں نہیں؟"

اس نے آہستگی سے فون رکھ دیا۔

خالہ کے چار بیٹے تھے۔ وہ اسے بہو بنانے کی خواہش مند بھی تھیں... لیکن ابا کہتے تھے۔

"تمہاری خالہ بے حد لالچی اور حریص عورت ہے۔ پہلے تمہیں اور دو لڑکوں کا جہیز ہتھیائے گی۔ بعد میں جائیداد بٹورنے کے منصوبے بنانے لگے گی۔"

"اور میں بھی کتنی نادان ہوں۔ خالہ کہیں تو وہ سچی لگتی ہیں۔ ابا کی سنوں تو وہ بھی درست، پتا نہیں لوگوں کی پہچان کیسے کرتے ہیں؟"

وہ رات کی تاریکی میں بیٹھ کر انسانوں کی پہچان کے پیمانے تیار کرتی، لیکن وقت آنے پر سارے کے سارے معیار بوگس ثابت ہوتے۔

تم جو ہوتے تو زندگی ہم سے
تلخ لہجے میں بات کرتی کیوں

زرد رو سی شام تھی۔ وہ کیاری کے قریب بیٹھی چاول چن رہی تھی۔ پلٹ کر دیکھا، خاور تھا۔ یوں بیٹھا تھا جیسے بہت فرصت میں ہو۔ سر کرسی کی پشت سے ٹکا رکھا تھا۔ دائیں ہاتھ میں سگریٹ سلگ رہا تھا جس سے مدھم سا دھواں اٹھتا تھا اور فضا میں سگریٹ کی مخصوص سی مہک بن کر پھیل رہا تھا۔ پاؤں سلیپرز سے آزاد سامنے کی میز پہ ٹکا رکھے تھے۔ وہ زیر لب دہرا رہا تھا۔

تم جو ہوتے تو زندگی ہم سے
تلخ لہجے میں بات کرتی کیوں

چہرے پہ مسکراہٹ تھی۔ ہلکے سے درد میں لپٹی مسکراہٹ... وہ جانے کیوں اسے دیکھتی چلی گئی۔ خاور کی نظروں نے زاویہ بدلا... ثانیہ نے محسوس بھی کرلیا۔ لیکن جانے کیا ہوا کہ اپنی نظروں کا زاویہ بدل ہی نہ پائی۔ وہ جہاں تھیں، ٹکی رہیں۔ یہاں تک کہ خاور کی نظروں میں سوال اتر آیا۔ تب جیسے وہ کسی گیان سے جاگی ہو، گھبرا کر کھڑی ہوئی تو ذرا سے چاول گرے اور دور تک بکھرتے چلے گئے۔ وہ شرمسار سی باورچی خانے میں آن کھڑی ہوئی۔

"کیا ضرورت تھی؟ ایک غیر مرد کو اتنی گہری نگاہ سے دیکھنے کی۔" اماں نے گھرکا تھا۔

"ایک تو یہ... ہر وقت پہرے دار بنی پھرتی ہیں میری۔" پتا نہیں اماں پہ غصہ تھا یا خود پہ... بڑبڑاتی

ہوئی چولہے کی تیز آنچ پہ پیاز بھوننے لگی۔
باہر بیٹھا خاور نیم وا آنکھوں سے چڑیوں کو آنگن میں اترتے' چاول چگتے دیکھتا رہا۔ سگریٹ جل کر بجھ گیا تھا' لیکن مسکراہٹ تھی کہ اس کے ہونٹوں پہ سلگے جا رہی تھی۔

✲ ✲ ✲

ڈھیر سارا کام تھا۔ سارا نپٹا لیا۔ خود کو خوب تھکایا کہ بستر پہ جاتے ہی نیند آجائے' دل جو سوچنا چاہ رہا ہے' نہ سوچے' نہ دہرائے' لیکن کمرے میں آکر نرم بستر پہ کئی کروٹیں بدلنے کے بعد بھی نیند نے نہیں آنا تھا' نہ آئی' یہاں تک کہ اس نے بے بس ہو کر خود کو آزاد چھوڑ دیا۔
آنکھوں نے جو دیکھا تھا' کئی بار سوچا۔
دل ویسے دھڑکا جیسے شام کو دھڑکا تھا۔ اس پل' اس لمحے جب اس کے وجود کو خاور نے اپنی نظروں کے حصار میں لیا تھا۔ جب دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ جب خاور کی پر خیال' سرخی مائل آنکھوں میں اس کے لیے سوال ابھرا تھا۔ جب اس نے خاور کے چہرے کے ایک ایک نقش کو گھڑی بھر کے لیے بہت وضاحت سے دیکھا تھا اور جب سے اس کی آواز کانوں میں بار بار گونجی تھی۔
"بعض مردوں کی آواز کتنی خوب صورت ہوتی ہے؟"
پتا نہیں اس زرد رو شام کا فسوں تھا یا اس کی کچی عمر کا۔
اس رات بہرحال اس نے خاور کو بارہا سوچا تھا۔

✲ ✲ ✲

اور پھر اس نے خاور سے بھاگنا چھوڑ دیا۔ اس کا دیکھنا بھی اب برا نہ لگتا تھا۔ بس گھبراتی اور شرماتی تھی۔ اس کی طرف دیکھنے سے کتراتی تھی اور کبھی وہ براہ راست اسے دیکھتا' اس سے بات کرتا تو اس کی جان پہ بن آتی تھی۔ اس روز آپا کے کہنے پر وہ خاور کے لیے چائے بنا کر لائی تو خاور نے ہاتھ میں پکڑا سگریٹ ایک لمبا کش لینے کے بعد ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے اسے پکارا۔
"تانیہ!"
وہ چونک کر مڑی۔
"آؤ۔ تمہارا ہاتھ دیکھوں۔"
"آپ کو ہاتھ دیکھنا آتا ہے۔" یہ پہلا جملہ تھا شاید جو اس نے خاور سے بولا تھا۔
"ٹھیک ٹھاک دیکھنا آتا ہے۔ آؤ یہاں بیٹھو۔" خاور نے کرسی گھسیٹ کر اپنے مقابل رکھی۔ وہ قدرے جھجکتے ہوئے بیٹھ گئی۔
اپنی ہتھیلیاں اس کے سامنے پھیلا دیں۔
کوری' بے داغ' نرم گداز گلابی ہتھیلیاں۔
جنہیں خاور نے کئی لمحے نظروں کے حصار میں رکھا۔ پھر ایک دم ہی خاور کا مضبوط' سانولا' کھردری ہتھیلی والا ہاتھ اس کے ہاتھ کے نیچے آٹھہرا۔ وہ ذرا سا کپکپائی' چونک کر نگاہ اٹھائی۔
خاور کے دل میں کیا ہے' اس کے چہرے سے اندازہ نہ کر پائی تھی۔ خاور نے انگوٹھے سے اس کی ہتھیلی پہ بکھری مہین سی لکیروں کو چھوا تو تانیہ کا دل پگھل کر پورے وجود میں دھڑکنے لگا تھا۔ تب ہی ہلکی سی آہٹ ہوئی۔
ان دونوں نے سر اٹھایا۔ ابا چند قدم کے فاصلے پر کھڑے تھے۔ ان کے چہرے اور آنکھوں میں کیا تھا۔ ان دونوں کو سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ تانیہ نے فوراً" چاہا کہ ابا پر واضح کر دے۔
"ابا! خاور میرا ہاتھ دیکھ رہے ہیں۔ مستقبل کی باتیں بتائیں گے۔" لیکن خاور نے یوں بدک کر اس کا ہاتھ چھوڑا کہ وہ جہاں کی تہاں بیٹھی رہ گئی۔
اصولاً" خاور کو ابا کو سلام کرنا چاہیے تھا' لیکن اس کے حلق سے آواز نہ نکلی تھی۔ نظریں چرا کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا بیرونی دروازہ پار کر گیا۔
وہ ہکا بکا سی بیٹھی اپنے سامنے رکھی خالی کرسی اور اپنے پھیلے ہوئے ہاتھ کو دیکھتی رہ گئی۔
"تم اس قدر نادان اور بے وقوف ہو سکتی ہو' میں

سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔" ابا اس کے ساتھ اس کے کمرے میں آئے تھے۔ ان کا لہجہ درشت اور آنکھیں سرخ تھیں۔

"یہ ابا کو کیا ہو گیا ہے؟" وہ پہلوؤں میں لٹکتے ہاتھوں میں بیڈ شیٹ دبوچے ہراساں سی بیٹھی تھی۔

"یہ سب کے سب کم ظرف 'گھٹیا' کمینے لوگ ہیں۔ تمہارے قابل ہونا تو دور کی بات... تمہارے معیار کو بھی نہیں چھو سکتے۔ آئندہ تم ان کے قریب بھٹکیں تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔"

ابا کہہ کر پلٹے تو پھر قدم آگے نہ بڑھا سکے۔

آپا دروازے میں کھڑی تھیں۔ نہ صرف کھڑی تھیں بلکہ حرف بہ حرف سن بھی چکی تھیں۔

تانیہ نے ابا کے چہرے پہ ایک رنگ آتے اور ایک رنگ جاتے دیکھا تھا۔ آپا نے کچھ کہا نہیں۔ یوں ہی پلٹ گئیں۔

لیکن... رات ہونے سے قبل وہ گھر چھوڑ کر جا چکی تھیں۔

کئی مہینوں بعد تانیہ نے ابا کو ایک بار پھر رات بھر جاگتے اور خود سے باتیں کرتے سنا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ہم تو گھٹیا' کم ظرف اور کمینے لوگ ہیں۔ آپ آسمان سے اتری ہوئی اعلیٰ وارفع مخلوق... ہم آپ کے قابل کہاں؟ آپ کے معیار کو تو چھو بھی نہیں سکتے۔ جائیے محترم! اپنے ہم پلہ لوگوں کو ڈھونڈیں اور ان ہی سے رشتہ جوڑیں۔"

آپا... بتنگڑ پیدا کرنے والی تھیں۔ انہیں پتا تھا ترپ کا پتا ان کے ہاتھ میں ہے۔ سو نخرہ دکھانا تو بنتا تھا نا۔

ابا روز جاتے آپا کو لینے... پھر ان ہی قدموں واپس بھی آجاتے۔ آخر ابا معافی تلافی پر اتر آئے اس بار آپا نے نرمی دکھائی۔

"ٹھیک ہے' چلوں گی آپ کے ساتھ... لیکن میری ایک شرط ہے۔ آپ تانیہ کے بول خاور کے ساتھ پڑھوا دیجئے... دیکھئے میاں! ہمارے درمیان

جب بھی جھگڑا ہوا۔ اسی تانیہ کی وجہ سے۔ جب تک وہ اس گھر میں ہے۔ یہ مسئلے مسائل نکلتے ہی رہیں گے۔ وہ اپنے گھر کی ہو جائے گی تو آپ بھی سکون سے ہم ماں' بیٹے کی دیکھ بھال کر سکیں گے اور ویسے بھی... تانیہ 'خاور سے محبت کرتی ہے۔ خاور بھی اسے نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا۔"

آپا کے چہرے پہ بڑی خوب صورت مسکراہٹ تھی۔ ابا چپ چاپ اٹھ کر چلے آئے۔

☼ ☼ ☼

اس نے تیسری بار کمرے میں جھانکا تھا۔

ابا ایک ہی زاویے میں بیٹھے تھے۔ چائے کا کپ ٹھنڈا ہو گیا تھا اور اس پر بالائی کی تہ جم چکی تھی۔

"کون سی سوچ ہے جو ختم ہونے میں نہیں آرہی۔" وہ فکر مندی آگے بڑھ آئی۔

ابا آہٹ پر چونکے' پھر سیدھے ہو بیٹھے' ٹانگیں سمیٹ کر گویا اسے بیٹھنے کا اشارہ دیا تھا۔ وہ چپ چاپ بیٹھی انہیں دیکھے گئی۔

"آپ نے چائے نہیں پی ابا۔" دیر بعد وہ ان سے مخاطب ہوئی۔ ابا نے طویل سانس لے کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بولے تو یوں گویا اس کی بات سنی ہی نہ ہو۔

"یہ بہت عجیب سا خاندان ہے۔ عورتیں گھر کا خرچ چلاتی ہیں اور مرد گھروں میں ہاتھ پہ ہاتھ رکھے مفت کی روٹیاں توڑتے ہیں۔ میری مجبوری تھی۔ میں پھنس گیا۔ اس عمر میں کوئی مناسب رشتہ مل جانا کوئی ایسی آسان بات نہیں تھی اور تمہارا رشتہ اس خاندان سے جوڑنا... اونہوں..." انہوں نے قطعی انداز میں سر جھٹکا۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تمہارے سامنے کوئی مجبوری نہیں... کہ تم اپنے سے دگنی عمر کے مرد کو اپنے لیے منتخب کرو۔" ابا پھر خاموش ہو گئے۔

اس کا دل چاہا کہہ دے۔ "میں نے کب کسی کو منتخب کیا ہے؟" لیکن وہ ہی کم ہمتی' کم حوصلگی' ہونٹوں پہ آئی بات بھی کہہ نہ پائی۔

"تم ایسا کرو۔ اپنا سامان باندھ لو۔"

"جی۔۔۔" اس نے چونک کر ابا کو دیکھا۔

"بلکہ سامان کیا؟ ایک بیگ میں چند جوڑے رکھ لو۔۔۔ میں چاہتا ہوں تم ان لوگوں کے سائے سے بھی دور رہو۔۔۔ ثریا کو میں لائن پر لے آؤں گا۔ اس کے نام نہاد رشتہ داروں سے بھی جان چھڑا لوں گا۔ بس ذرا بچہ پیدا ہو جائے۔ بچہ باندھ لیتا ہے عورت کو۔۔۔ اور پھر بیٹا ہو تو ماں کو ہلنے بھی نہیں دیتا۔" ابا اس سے کہتے کہتے خود سے کہنے لگے تو وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

"چند جوڑے کیوں رکھ لوں؟ ابا مجھے کہاں لے جائیں گے۔

کسی دارالامان میں۔۔۔ گرلز ہاسٹل میں۔۔۔ ایدھی ہوم۔۔۔ یا ہو سکتا ہے۔ سامان سمیت کسی نہر میں دھکا دے آئیں۔۔۔ یا کسی ریل کی پٹڑی پر۔۔۔"

آنسو ٹپ ٹپ بہنے لگے۔ اماں کے مرنے کے بعد وہ پہلی بار یوں بے بس ہو کر روئی تھی۔

"جو ابھی اس دنیا میں آیا بھی نہیں۔ اس کے لیے اتنی چاہت کہ مجھے اس گھر سے نکال رہے ہیں۔ نہیں آئی آپا تو نہ آئے۔ میری بلا سے۔۔۔ میں کیوں سامان باندھوں۔۔۔ پر ابا کو تو اب ان ہی کی پروا ہے۔ میں کون ہوں ان کی۔" وہ بلک بلک کر روتی رہی۔ اماں پائنتی کی طرف آ بیٹھیں۔ اس نے ان کی کوئی تسلی، کوئی دلاسا نہ سنا۔ الٹا شکوہ کرتی رہی۔

"کیا ضرورت تھی اتنی جلدی مرنے کی؟ میرا خیال بھی نہ کیا؟ اب دیکھ لیں۔ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ۔۔۔ مائیں زندہ نہ رہیں تو باپ بھی باپ نہیں رہتے۔" اسے ابا سے شدید نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ ان ہی ابا سے جنہیں وہ ہمیشہ "پیارے ابا" کہا کرتی تھی۔

یوں ہی سسکتے، بلکتے رات گزر گئی۔ صبح گھڑی بھر کے لیے آنکھ لگی کہ ابا سر پہ آ کھڑے ہوئے۔ بیگ کھلا پڑا تھا، ایک دم خالی۔۔۔

"اُفوہ۔ کہا بھی تھا۔۔۔ خیر چلو اب۔۔۔ گاڑی نکل جائے گی۔" جھٹپٹے کا وقت تھا جب وہ ابا کے ساتھ گھر سے نکل آئی۔

اتنی عجلت میں کہ پلٹ کر تسلی سے اپنے گھر کو ایک نظر دیکھ بھی نہ سکی۔ کوئی یاد نہ سمیٹی۔۔۔ کوئی احساس نہ چرایا۔۔۔ یوں ہی نکل آئی، خالی ہاتھ۔۔۔

اس زرد رو شام کا فسوں بھی وہیں کہیں طاق پہ دھر آئی۔ خاور اور اس کی مدھر آواز کا جادو۔۔۔ اس کی کھردری ہتھیلی کا لمس۔۔۔ سب کچھ پیچھے رہ گیا۔

تم جو ہوتے تو زندگی ہم سے
تلخ لہجے میں بات کرتی کیوں

اماں دروازے کی چوکھٹ پر بیٹھی تھیں۔ شاید وہیں رہ گئیں۔

اس نے آس پاس نظر دوڑائی۔ اونگھتے، جاگتے مسافروں میں کہیں دکھائی نہ دیں۔ اس نے تھک کر کھڑکی سے سر ٹکا دیا۔ باہر بھاگتے دوڑتے مناظر کو دیکھ کر اس کی آنکھیں تھکنے لگیں تو خاموشی سے آنکھیں بند کر لیں۔

اس کے برابر بیٹھے ابا اس سے الگ تھلگ، خاموش، بت بنے بیٹھے تھے۔

☆ ☆ ☆

بہت ہی خوب صورت بنگلوں کی ایک طویل قطار تھی جن میں سے ایک بنگلے میں ابا اسے لے کر داخل ہوئے تھے۔ یہاں کل رات غالباً خوب ہی بارش ہوئی تھی۔ ہر چیز نم آلود تھی۔ درخت، پھول، پودے، پتے، دیواریں، زمین بالکل بھیگی ہوئی۔ وہ گویا کسی حیرت کدے میں کھڑی تھی۔

باہر سے نظر آنے والا خوب صورت بنگلہ اپنے بھیتر میں ایک جنگل چھپائے بیٹھا تھا۔ یہ لمبی لمبی گھاس، خود رو جنگلی بیلیں، درختوں، پودوں کی بے ترتیب بڑھی ہوئی شاخیں۔۔۔ گھاس تھی کہ پختہ روش کو بڑے کروفر سے چھپائے کھڑی تھی۔ برآمدے کی ڈھلوانی چھت کو سبز بیلوں نے پوری طرح چھپا دیا تھا۔ نازک شاخیں نیچے تک لٹک رہی تھیں اور ان ہی شاخوں سے پرے ایک خاتون اپنے سامنے کھڑے ملازم پہ گرج برس رہی

تھیں۔
"چھ سالوں سے ہر کسی کی غمی، خوشی، شادی، موت کا خیال رکھا۔ مہینہ ختم ہونے سے پہلے روپے ٹرانسفر کرادیتی تھی کہ تنخواہ میں دیر نہ ہو اور تم لوگوں نے یہ حال کیا۔ میرے گھر کا۔" وہ چلا رہی تھیں۔
اور ملازم مؤدب سن رہے تھے۔
"ہر چیز کا خیال رکھا ہے۔ صرف مالی چھٹی پر تھا' اسی لیے۔۔"
"کب سے چھٹی پر تھا؟ میرے خیال میں تو وہ ان چھ سالوں میں چھ بار بھی یہاں نہیں آیا ہوگا۔ اس کی مستقل چھٹی کرو۔ نیا مالی بلاؤ۔۔ اور مجھے ایک ہفتے کے اندر اندر۔۔"
"پتا نہیں کون ہیں؟"
ابا ایک طرف خاموشی سے کھڑے تھے۔ تانیہ ان کی باتوں سے دھیان ہٹا کر ایک بار پھر بنگلے کا جائزہ لینے لگی تھی۔
"ارے۔۔ تم؟" ان خاتون کی حیرت بھری آواز پر وہ چونک کر مڑی۔ "آؤ اندر آؤ" وہ۔۔ بے حد حیرت سے بے اختیار ہی ان لوگوں تک آئیں۔ ایک دم سے پلٹیں اور کسی دروازے سے اندر غائب ہوگئیں۔
ملازم تتر بتر ہوگئے۔
ابا چند لمحے وہیں کھڑے اپنے ہاتھ مسلتے رہے۔ پھر ہولے سے کھنکارتے ہوئے کمرے میں چلے گئے۔
اس نے اپنے وجود میں تھکاوٹ اترتی محسوس کی تو وہیں رکھی ایک کرسی پہ ڈھے سی گئی۔
چھ گھنٹوں کے طویل سفر نے اسے اس قدر تھکا دیا تھا کہ ذہن کچھ بھی سوچنے سے قاصر لگ رہا تھا۔ وہ کرسی کی پشت پہ سر گرائے لان نما جنگل میں پھدکتی گلہریوں اور اڑتی ہوئی تتلیوں کو دیکھتی رہی۔
ایک لمبا سا کیچوا برآمدے کی سیڑھی کے پاس بہت آہستہ آہستہ رینگ رہا تھا۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی، پھر کراہت سے نظریں پھیر لیں۔ بارش کے باسی پانی کی خوشبو اس کے آس پاس چکراتی پھر رہی تھی۔
ابا اندر جاکر جانے کہاں غائب ہوگئے تھے۔ اس نے بمشکل اپنے وجود کو کرسی سے اٹھایا۔ اندرونی دروازہ کھولنے سے پہلے ہی اس نے سن لیا تھا۔
"ہوں۔۔ تو شادی کرلی تم نے؟" خاتون پوچھ رہی تھیں۔
"مجبوری بن گئی تھی۔" ابا کا جواب۔
تانیہ نے ذرا سا دروازہ کھول کر جھری سے اندر جھانکا۔ ابا سر جھکائے بیٹھے تھے۔
خاتون بڑے مغرور سے انداز میں انہیں دیکھ رہی تھیں۔
"مرد بہت جلدی مجبور ہوجاتا ہے۔"
ابا کچھ نہ بولے تھے۔ بس پھیکی سی ہنسی کو لبوں پہ پھیلتے دیکھ کر اس نے دروازہ دوبارہ بند کردیا۔
"میں تانیہ کو آپ کے پاس چھوڑنے آیا ہوں۔ ہوسکے تو دنیاداری کا کچھ سبق اسے بھی پڑھا دیں۔۔ صاف سلیٹ کی مانند ہے' سیکھنے کی عمر آئی تو اسما بستر سے جا لگی تھی۔"
"تنی ماں کو دنیاداری کا سبق نہیں آتا۔۔ وہ پڑھا دیتی۔" خاتون کا کروفر۔۔ تانیہ کا دل چڑیا کے بچے کی طرح سہم گیا تھا۔
"وہ ضرورت سے زیادہ پڑھی ہوئی ہے۔" ابا ناویلیں گھڑ رہے تھے۔ وہ پلٹی اور دوبارہ سے کرسی پہ ڈھے گئی۔ تھوڑی دیر بعد ابا برآمد ہوئے۔ وہ چاپ چاپ بیٹھی ان کے چہرے پہ پھیلی سرخی کو دیکھتی رہی جو کسی ضبط کا نتیجہ لگ رہی تھی۔
"یہ عنایا خاتون ہیں۔۔ میری سگی پھپھی کی بیٹی ہیں۔۔ بڑے سالوں بعد انگلینڈ سے واپسی ہوئی ہے۔ مستقل قیام کے لیے۔۔ تمہارا خیال رکھیں گی یہ۔۔"
ٹھنڈی پھوار برف گرنے لگی تھی اس کے وجود پر۔
"میں یہاں رہوں گی ابا۔" نئے شہر کی نئی فضاؤں میں اس نے ابا سے پہلی بات کی تھی۔ لہجے میں ویسا ہی ڈر خوف تھا جیسا پہلے روز اسکول جاتے ہوئے بچے کے چہرے پہ ہوتا ہے۔
"ہوں۔۔" ابا نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا۔
"کب تک۔۔"

جیسے بچہ پوچھتا ہے اسکول کے اندر قدم رکھتے ہی کہ "چھٹی کب ہوگی؟"

ابا نے بے اختیار اسے سینے سے لگایا۔۔۔ ماتھے پہ چوما۔

"میں تم سے رابطے میں رہوں گا' فون کرتا رہوں گا' خود بھی آؤں گا ملنے۔" عنایا خاتون باہر آگئی تھیں۔

"چلتا ہوں اب۔۔۔" ابا ان دونوں کو چھوڑ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتے بیرونی گیٹ سے نکل گئے۔

وہ دونوں چند لمحے اس روش کو دیکھتی رہیں جہاں ابا کے قدموں سے دبی گھاس اب آہستہ آہستہ دوبارہ سر اٹھا رہی تھی اور جسے دیکھ کر عنایا خاتون کو ایک بار پھر ملازموں کی ہڈحرامی یاد آنے لگی تھی۔

تانیہ نے اپنے کپکپاتے بدن کو کمزور پڑتے دیکھا تو کرسی کا سہارا لے کر بیٹھ گئی۔ عنایا خاتون نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر تیز تیز قدموں سے چلتی اندر چلی گئیں۔

☼ ☼ ☼
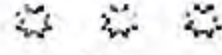
پتا نہیں۔۔۔ وہ کتنی دیر اونگھتی رہی۔۔۔ آنکھ کھلی تو ملازمہ اس کے سر پہ کھڑی تھی۔

"عنایا خاتون بلا رہی ہیں۔۔۔ کھانا تیار ہے کھا لیجیے۔"

تانیہ چپ چاپ اس کی رہنمائی میں پہلے واش روم اور پھر کھانے کی میز تک جا پہنچی۔ روٹی' سالن' چاول اور کباب۔۔۔

"میرے دسترخوان پہ ایک وقت میں ایک ہی ڈش بنتی ہے۔ تمہارا پہلا کھانا تھا آج۔۔۔ اس لیے کچھ اہتمام کرلیا ہے۔"

تانیہ نے بڑی توجہ سے انہیں سنا۔ ان کے لہجے سے کچھ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ کس ٹون میں بول رہی ہیں۔

ملازمہ رائتہ اور سلاد بھی رکھ گئی۔

اسی دوران اسے محسوس ہوا جیسے عنایا خاتون بڑے دھیان سے اسے دیکھ رہی ہیں۔ اپنی پلیٹ میں چاول ڈالتے ہوئے اس کا ہاتھ کپکپایا اور کچھ چاول میز پہ گر گئے۔ تانیہ نے فوراً نگاہ اٹھا کر دیکھا' وہ واقعی اپنی نظریں اس پہ گاڑے بیٹھی تھیں۔

"قد اپنے باپ کا لیا ہے تم نے اور رنگ روپ اپنی ماں کا۔ اچھی بھلی خاتون تھیں وہ۔ ایک آدھ بار ملی تھی میں ان سے۔۔۔" اور اس کے بعد ایک لمبی' سرد آہ۔

کھانا کھانے کے بعد وہ کسی سے فون پر مصروف ہوگئیں۔۔۔ وہ بھی وہیں ایک صوفے پر ٹک گئی۔۔۔ یہ پہلا موقع تھا کہ تانیہ نے عنایا خاتون پر توجہ کی تھی۔

وہ خوب صورت تھیں۔۔۔ بلکہ تھیں۔۔۔ وہ بہت خوب صورت تھیں۔

لانبا سا قد تھا۔ بے حد سڈول جسم' ہاتھ' پاؤں نازک' چہرے کے نقوش متناسب اور جاذب نظر' بال بھورے رنگ میں رنگے ہوئے۔ سب ٹھیک تھا۔ بس وہ چڑچڑے پن اور بدمزاجی کا تاثر تھا جو ان کی شخصیت کی ساری خوب صورتی پر حاوی تھا۔ کم عمر لگ سکتی تھیں' مگر سوٹ کی ہم رنگ شال یوں بکل مار کر اوڑھ رکھی تھی کہ اپنی اصل عمر سے چار' پانچ سال بڑی ہی دکھتی تھیں۔

وہ انہیں دیکھنے میں یوں محو ہوئی کہ پھر ادھر ادھر کی سدھ بدھ نہ رہی۔ خیال ہی نہ رہا کب ٹانگیں سمیٹ کر صوفے پہ رکھیں۔۔۔ کب بازو اپنے گال تلے رکھا اور کب گہری نیند میں کھو گئی۔

پچھلی رات کی جاگی ہوئی اور پھر سفر کی تھکان۔

"ارے۔۔۔ یہ لڑکی تو بہت ہی لاپروا اور کاہل لگتی ہے' دیکھو ذرا۔۔۔ بیٹھے بیٹھے ہی خراٹے لینے لگی۔" کسی نے اسے چادر اوڑھائی۔

عنایا خاتون کے چبھتے ہوئے لہجے میں اظہار خیال کو بھی اس نے کہیں دور سے سنا' پر آنکھیں تھیں کہ کھلنے پہ راضی ہی نہ تھیں۔ وہیں پڑے گہری نیند سوتی رہی یہاں تک کہ سارا بنگلہ رات کی تاریکی میں ڈوب کر پہلے سے زیادہ وحشت ناک لگنے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

ڈنر کے بعد ملازمہ اسے اس کمرے میں لے آئی تھی' جو اس کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔

"سنو! ایک کپ چائے مل سکتی ہے؟" اس نے قدرے جھجک کر کہا تھا۔

"چائے بھی مل سکتی ہے' کافی بھی۔۔۔ آپ کیا لینا پسند کریں گی؟"

"بس چائے۔ میں ابھی لے آتی ہوں۔"

اور پھر وہ چائے لائی تو ساتھ میں ہدایات کا ایک پلندہ بھی تھا۔

"نو بجے کے بعد بنگلے کی بتیاں بجھا دی جاتی ہیں۔۔۔ یہ عنایا خاتون کے سونے کا وقت ہوتا ہے' اس لیے وہ کسی قسم کا شور اور ہنگامہ پسند نہیں کرتیں۔

رات کے وقت آپ ٹی وی نہیں دیکھ سکیں گی' کیونکہ آپ کا کمرہ عنایا خاتون کے برابر میں ہے۔ وہ آوازوں سے ڈسٹرب ہو سکتی ہیں۔ عنایا خاتون کے کمرے میں ان کی اجازت کے بغیر جانا منع ہے' بلکہ یوں سمجھیں وہ اپنے کمرے میں دوسروں کی آمدورفت کو بالکل پسند نہیں کرتیں۔" رٹے رٹائے جملے ایک ایک کر کے اس کی طرف اچھالنے کے بعد ملازمہ چلی گئی تھی۔

وہ اس لگژری روم میں اکیلی تھی۔۔۔ بالکل اکیلی۔۔۔ اور اداس بھی۔۔۔ آنکھیں بالکل خشک تھیں۔۔۔ دل' دماغ بالکل خالی' ویران۔۔۔ اس نے بدقت خود کو کچھ سوچنے پر آمادہ کیا۔

"ابا گھر پہنچ گئے ہوں گے۔ بلکہ شاید آپا کو بھی لے ہی آئے ہوں گے۔"

بہت آہستگی سے کھڑکی کھول کر وہ چوکھٹ پہ جم گئی۔ رات کے اس پہر چلنے والی ہوا خنک تھی۔۔۔ دوپٹا اچھی طرح اپنے گرد لپیٹتے ہوئے اس نے پھر دانستہ سوچا۔

"ابا کو میرے بغیر گھر کیسا لگ رہا ہو گا؟ کیا آج بھی رات بھر جاگتے۔۔۔ خود سے باتیں کرتے رہیں گے۔"

ابا کی اداسی کو محسوس کر کے اس کی پلکیں بھیگنے لگی تھیں۔ کھڑکی بند کر کے وہ بستر پہ آلیٹی۔۔۔ اجنبی چھت' نامانوس دیواریں' وہ چت لیٹی پلکیں جھپکتی رہی۔

شام میں طویل نیند لے لی تھی۔ اب رات بھر نیند نہیں آنی تھی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا۔

☼ ☼ ☼

"صبح اٹھ کر وقت پہ ناشتا کر لیا کرو۔ مڈل کلاس لوگوں کی طرح سارا دن گھر میں چولہا جلتا رہے' مجھے اچھا نہیں لگتا۔" رات بھر جاگنے کے بعد آخری پہر آنکھ لگی تھی' تو صبح کھلتی کیسے؟ دیر سے جاگی تھی۔ سو ناشتے میں بھی دیر ہوئی۔

ابھی تو پہلا نوالہ ہی منہ میں ڈالا تھا کہ عنایا خاتون کی سرد اور سپاٹ سی آواز کانوں میں پڑی۔۔۔ جیسے ہموار سڑک پہ ننھے ننھے پتھر دور تک لڑھکتے ہوئے چلے جائیں۔ نوالہ اس کے حلق میں پھنسنے لگا تھا۔ جھٹ سے پانی کا گلاس منہ کو لگا لیا۔ کن اکھیوں سے انہیں دیکھا۔

وہ بغور صفائی ستھرائی کا جائزہ لے رہی تھیں۔

دیواریں' دروازے' کھڑکیاں' کرسیاں' میز' مصنوعی آرائشی پودے' تصاویر' ایک ایک چیز کو چھو رہی تھیں۔ یوں ہی دیکھتے دیکھتے وہ باہر نکل گئیں۔

پانی کا گلاس منہ سے ہٹایا' تو ناشتے کی پلیٹ بھی پرے کھسکا دی۔ ملازمہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ جواباً مسکرا بھی نہ سکی۔

"ابا نے کہا تھا' فون کروں گا' رابطے میں رہوں گا' پتا نہیں کب کریں گے فون' کہیں بھول ہی نہ گئے ہوں۔" وہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھی تھی۔ جب عنایا خاتون اندر آئیں اور اسے یوں بیٹھے دیکھ کر چڑ سی گئیں۔

"دیکھو لڑکی! آں کیا نام ہے تمہارا؟" اپنے ماتھے پہ انگلی بجاتے ہوئے انہوں نے اپنی یادداشت کو کھنگالا۔

"تانیہ!" وہ ہولے سے بولی۔

"ہاں تانیہ! دیکھو بچی! میں تمہیں بہت زیادہ وقت نہیں دے پاؤں گی۔ بڑے عرصے بعد یہاں آئی ہوں' بہت کام کرنا ہیں مجھے' پرانے دوستوں سے ملنا ہے'

آرٹ کا کچھ کام ہے' کچھ کولیگز کے ساتھ ڈسکشنز' ایک بوتیک اسٹارٹ کرنے کا ارادہ ہے۔ پھر گھر کا بکھیڑا' تم اپنے لیے خود ایکٹیویٹیز تلاش کرو' گھر کے اندر' گھر سے باہر۔ ککنگ میں دلچسپی ہے تو اس کی کلاسز لے لو' فلاور میکنگ' سیلف گرومنگ سب تم پر ہے۔ میں صرف اتنا کر سکتی ہوں کہ گاڑی اور ڈرائیور تمہارے حوالے کر دوں' وزٹ کرو' پسند کروں' جہاں ایڈمیشن لینا ہو بتادو' میں تمہارے ساتھ چلی جاؤں گی۔"

"میں کب تک یہاں رہوں گی؟" اتنی لمبی گفتگو کے جواب میں اس کا یہ سوال۔

عنایا خاتون کے چہرے پہ برہمی دیکھ کر اسے اپنی غلطی کا بے تحاشا احساس ہوا تھا۔

"میرا مطلب ہے۔۔۔"

"تمہارے باپ نے تمہیں بتایا نہیں۔"

"نہیں۔۔۔ انہوں نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔" وقت قریب تھا کہ وہ رو دیتی۔ عنایا خاتون طویل سانس لے کر سیدھی ہو بیٹھیں اور بغور اسے دیکھنے لگیں۔

"بہت کم عمر ہو تم۔ تمہارے ابا کہہ رہے تھے تمہیں دنیاداری کا کچھ طریقہ سلیقہ سمجھاؤں۔ دریا کے پانی میں اتریں' تو ہی اس کی گہرائی کا اندازہ ہوپاتا ہے۔ تم دنیا میں نکلو گی' تو دنیاداری بھی سیکھ جاؤ گی۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر پڑھائے گئے سبق وقت آنے پر ناکارہ ثابت ہوتے ہیں۔"

٭ ٭ ٭

بہار کا موسم قریب تھا۔

لالیوں کا نیا جوڑا اترا تھا۔

بنگلے کی آخری دیوار کے ساتھ سرونٹ کوارٹر کے روشن دان کی جالیوں میں گھستے' نکلتے ان پرندوں کو دیکھ کر اسے بار بار اپنا گھر یاد آیا تھا۔

برآمدے کے جالی دار روشن دانوں میں چڑیوں نے کئی گھونسلے بنا رکھے تھے۔ اس موسم میں کیسی ہلچل اور شور مچ جایا کرتا تھا۔ وہ لالیوں کو گھونسلہ بناتے دیکھتی اور ان تنکوں کو یاد کرتی جو برآمدے میں جابجا بکھرا کرتے تھے۔

"عجیب کاہل اور سست لڑکی ہے یہ۔ منہ اٹھائے پرندوں کو دیکھتی رہتی ہے اور جہاں دل چاہے پڑ کر سوئے رہتی ہے۔"

عنایا خاتون بڑی ناگواری سے ملازمہ کے سامنے اظہار کر رہی تھیں۔

محض اتفاق کہ اسی وقت وہ بھی اندر داخل ہوئی اور ان کے زریں خیالات سے فیض یاب ہوگئی۔ ایسے وقت میں اس کی سانسیں سینے کے اندر ہی الجھنے لگتی تھیں۔ وہ بتا ہی نہ پائی کہ ان کے لگژری روم میں اسے رات رات بھر نیند نہیں آتی۔ آنکھیں تھک جاتی ہیں۔ کروٹیں بدل بدل کر جسم چور ہو جاتا ہے اور بے تحاشا سوچیں دماغ کو بے سکون کیے رکھتی ہیں۔ ایسے میں دن کے کسی پل میں چند لمحوں کی جھپکی جو اسے غنیمت محسوس ہوتی تھی۔ عنایا خاتون کو اس پر بھی اعتراض تھا۔

٭ ٭ ٭

"ابا نے مجھے یہاں چھوڑ کر گویا اپنے سر سے بلا ٹال ہے۔" ابھی ابھی ابا کا فون آیا تھا۔ وہ جو بھاگی بھاگی ننگے پاؤں' بے تابی سی فون تک آئی تھی' تو ابا کا نپا تلا لہجہ اور لیا دیا سا انداز سن کر بجھ سی گئی۔

"ابا! میں واپس کب آؤں گی۔" اس نے بڑی ہمت سے پوچھا تھا۔ جواباً کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد لائن کٹ گئی تھی۔

اس نے بھی اسی خاموشی سے ریسیور رکھ دیا اور چپل پیروں میں اڑس کر باہر نکل آئی۔

"بی بی! زیادہ دور مت جایئے گا۔" چوکیدار کی واضح ہدایت کے باوجود وہ سیدھی سڑک پہ چلتی رہی تھی۔

سنسان سڑک پہ اس کے سوا ایک ہی نو عمر لڑکا تھا جو ایک تواتر سے کسی بنگلے کی بیل بجا رہا تھا سڑک آگے سے مڑ رہی تھی۔ وہ وہیں سے واپسی کے لیے پلٹی۔

تب ہی اس بنگلے کا گیٹ کھلا۔ اس نے بے دھیانی

میں اس بنگلے سے کسی کو نکلتے اور پھر خونخوار انداز میں اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔

"اینی پرابلم ود یو۔" سرخ آنکھیں 'بکھرے بال' ملگجا لباس 'شرٹ کے اوپری بٹن کھلے۔ وہ جو کوئی بھی تھا' یقیناً" ۔ گہری نیند سے جاگا تھا۔ لیکن وہ اس سے کیوں مخاطب تھا۔ تانیہ سمجھ نہیں پائی تھی۔

"جی۔"

"بدتمیزی کی کوئی حد ہوتی ہے۔ میں پوچھ سکتا ہوں۔ اس حرکت کا مقصد کیا ہے؟"

"کس حرکت کا؟" اس کی جان پہ بن آئی۔

"گھنٹے بھر سے بیل دے رہی تھیں۔ آپ۔ کیوں۔ اگر کوئی گھر سے نہیں نکل رہا تو اس کا مطلب کیا ہوا؟"

"اوہ۔" اسے صورت حال کا ادراک ہوا۔

"دیکھیں میں۔" اس نے فوراً" وضاحت دینی چاہی۔ لیکن سامنے کھڑا شخص اس کی بات سننے کے لیے راضی ہی نہ ہوا تھا۔

اتنی درشتی' اتنی سفاکی سے گرجا کہ ضبط کا یارا نہ رہا۔ دونوں ہاتھ چہرے پہ رکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تو مقابل کو ایک دم چپ لگ گئی۔

"اب اس طرح رونے کا کیا مطلب؟" چند ثانیے بعد وہ تہذیب سے عاری لہجے میں دوبارہ گرجا تھا۔ اب کون مطلب سمجھاتا اسے۔ وہ سائیڈ سے ہو کر نکل بھاگی تھی۔

"ارے رکو۔ سنو۔ ایکسکیوز می۔" وہ چند قدم اس کے پیچھے لپکا تھا۔ پر وہ تھمی' نہ اس کے آنسو۔ یہاں تک کہ بہتے آنسوؤں کو اپنے پلو میں سموتی وہ اپنے کمرے میں آ بند ہوئی۔ اتنا غم' اتنا غصہ اتنے آنسو۔ پس پردہ کون سی بات تھی۔ کون تھا جس کا دیا ہوا زخم گہرا تھا۔ وہ اجنبی شخص یا اس کا اپنا باپ۔

یہ سوچنے کی فرصت کسے تھی۔ وہ اگلے تین دن تیز بخار میں پھنکتی رہی۔ عنایا خاتون مصروف سے مصروف تر۔

ان سے سامنا نہ ہوتا تو انہیں یاد بھی نہ رہتا کہ اس گھر میں ان کے علاوہ کوئی اور بھی بستا ہے۔

ملازمہ نے اطلاع کی۔ "تانیہ بی بی کو بخار ہے۔"

"ہوں۔ میڈیسن دو اس کو۔ ضرورت ہوئی تو ڈاکٹر کے پاس لے جانا۔"

ملازمہ نے یہی کیا۔ دوا دے دی' اس نے کھالی۔ ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہا تو راضی نہ ہوئی۔ اسے ضرورت نہ تھی۔ جانتی تھی۔ ڈاکٹر کے پاس ہر مرض کا علاج نہیں ہوتا۔

چوتھے روز اپنے پاؤں پہ کھڑی ہونے کے قابل ہوئی تو عنایا خاتون سے آمنا سامنا بھی ہو گیا۔ اسے دیکھ کر وہ ایک پل کے لیے چونک سی گئیں۔

"ارے۔ یہ تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے؟"

"میں واپس جانا چاہتی ہوں۔" چند قدم چلنے سے ہی سانس پھولنے لگی تھی۔ صوفے پہ بیٹھ کر اس نے ملتجی انداز میں کہا تھا۔

ہمیشہ کی طرح خلاف توقع بات کہہ کر اس نے انہیں چڑا دیا تھا۔

"میں لے کر آئی تھی تمہیں۔ جس کے ساتھ آئی تھیں' اس سے کہو' آکر تمہیں لے جائے۔"

بہت بڑے بنگلے میں رہنے والی عنایا خاتون بات بہت چھوٹی کرتی تھیں۔

تانیہ صوفے پہ بیٹھی فضا سے آکسیجن کشید کرتی رہی اور عنایا خاتون اس لڑکی کو اپنے ناپسندیدہ افراد کی فہرست میں شامل کرتی باہر نکل گئی تھیں۔

اس نے سوچا اور پھر اسی آن فون کا نمبر ملا کر کہہ بھی دیا۔

"مجھے آکر لے جائیں ابا۔ میرا دل نہیں لگتا آپ کے بغیر۔"

اسے اسی فیصد یقین تھا کہ ابا اسے ٹال دیں گے۔ کوئی نہ کوئی بہانہ گھڑ لیں گے۔ لیکن جو ابا نے کہا اسے سننے کی ایک فیصد امید بھی نہیں تھی اسے۔

"دل نہیں لگتا۔ میرے بغیر یا خاور کے بغیر؟" وہ تھرا کر رہ گئی تھی۔

"ابا۔۔۔" لفظ اس کے ہونٹوں سے ادا ہونے بھی نہ پائے تھے کہ ابا نے دوبارہ چابک لہرایا تھا۔
"تم یہاں آنا چاہتی ہو۔۔۔ ان بے غیرت لوگوں کے ہاتھوں کھلونا بننا چاہتی ہو۔۔۔ تاکہ تنہائی میں بیٹھ کر۔۔۔"
پدرانہ غیرت کا تقاضہ تھا کہ وہ اس سے آگے کچھ نہ کہتے۔ لیکن اس کی غیرت نے بہت آگے کی بات سمجھ لی تھی۔
ریسیور ہی ہاتھوں سے نہ چھوٹا تھا۔ اسے پتا چلا کہ باپ کا اعتبار' محبت' شفقت سب کچھ چھوٹ گیا ہے۔
سانسیں بے طرح الجھ گئی تھیں۔ اس سے قبل کہ وہیں گر جاتی' وہ بھاگ کر باہر نکل آئی تھی۔
دونوں ہتھیلیوں پہ اپنا سر گرائے وہ انتظار میں تھی۔ کون سی سانس آخری ہوگی۔ تب ہی کوئی قریب آکر جان دار آواز میں پکارا تھا۔
"عنایا خاتون ہوں گی گھر پہ۔"
اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اور ایسا دیکھا کہ سامنے والے پہ گویا کوئی طلسم پھونک دیا۔
ایسا چہرہ۔ ایسی آنکھیں۔ ایسی نظر۔ وہ پتھر تھا جو بھربھری ریت بن کر ڈھے گیا۔ ذرہ ذرہ ہو گیا۔ یہ چہرہ آج سے پہلے کائنات میں کہیں نہ دیکھا تھا۔۔۔ نہ یہ آنکھیں' نہ ان آنکھوں میں تا حزن۔۔۔ لیکن تلاش اسی کی تھی۔
وہ اس کے وجود کا کوئی گمشدہ حصہ تھی۔۔۔ جسے پاکر ہی اس کی روح کی تکمیل ہونا تھی۔
وہ اس کے سامنے نہیں تھی' بلا پہنچی تھی۔
بس وہ رہ گیا تھا۔ حیران۔۔۔ بے یقین۔۔۔ یہاں تک کہ شام کا سورج اس کے سامنے ڈوب کر چاروں اور تاریکی پھیلا گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ابا۔۔۔" اسی تاریکی میں اس کے ہونٹوں سے سسکی بن کر ابھرا تھا۔
"کیا ہو گیا آپ کو ابا۔۔۔ آپ نے یہ سب میرے لیے سوچا' میرے لیے کہا۔۔۔ کون سا خاور۔۔۔ کہاں ہے؟ نہ کبھی سوچا۔۔۔ نہ یاد آیا۔۔۔ وہ تو وہیں کہیں رہ گیا تھا۔ اسی شام کی دہلیز پہ۔۔۔ ابا کیا سمجھے تھے' کیا کرتی تھی میں تنہائی میں۔۔۔ کس کے ہاتھوں کھلونا بنی تھی۔ یا اللہ! یہ سب کیسے سوچا ابا نے۔۔۔ سوچا۔۔۔ یا ان کے دماغ میں انڈیلا گیا۔"
سردی محسوس ہونے لگی تھی۔۔۔ اس نے کمبل کھینچ کر اپنے اوپر ڈال لیا۔۔۔ پورا بدن کپکپا رہا تھا۔۔۔ وہ کمبل لپیٹے پڑی رہی۔ سردی بڑھتی رہی۔ بستر پہ کانٹے اگ آئے تھے۔ پھر نیند کس کافر کو آتی۔

☼ ☼ ☼

"ریان جہانگیر آپ سے ملنے آئے ہیں۔" ملازمہ نے کھڑکی کا پردہ ہٹاتے ہوئے اطلاع دی۔
جلتی آنکھوں میں روشنی سی بھر گئی تھی۔
"میں کسی ریان جہانگیر کو نہیں جانتی۔"
"عنایا خاتون کے سگے بھتیجے ہیں۔ آپ کا تو نام بھی نہیں جانتے۔ پھر بھی بضد ہیں کہ آپ سے ملیں گے۔۔۔ کہتے ہیں کل لان میں بیٹھی تھیں۔ کوئی مہمان ہیں کیا۔۔۔ نام بھی میں نے انہیں بتایا۔۔۔ تانیہ۔۔۔"
تانیہ نے بہت دھیان سے سوچا۔ کل لان میں جو سامنے آیا تھا۔ اسے اور پھر اس سے پہلی ملاقات کو۔۔۔
"مجھے نہیں ملنا۔۔۔ کہہ دو ان سے۔۔۔" اور ملازمہ نے باہر جاکر کہہ بھی دیا۔
"وہ نہیں آئیں گی تو میں چلا جاؤں گا' ان کے کمرے میں۔۔۔ لیکن ملے بغیر نہیں جاؤں گا۔ بتا دو انہیں۔" عجب وحونس بھرا انداز تھا۔
"ہاں۔۔۔ عنایا خاتون کا سگا بھتیجا ہے' بول سکتا ہے اس طرح۔۔۔" کمبل سے باہر نکلتے ہی بدن پہ لرزہ طاری ہو گیا تھا۔
"یا اللہ۔۔۔" وہ شال اوڑھتی باہر نکلی۔
"کیا کہے گا۔۔۔ مجھ سے۔۔۔" بدقت چلتی ہوئی ڈرائنگ روم تک آئی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

دھندلا سا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں مسلیں۔۔۔ قدم ذرا سا ڈگمگائے تھے۔

"وہ۔ میں معذرت کرنے آیا تھا۔ آئم سوری۔۔۔ اس دن۔۔۔ میں بہت بدتمیزی سے بولا۔ ان فیکٹ۔۔۔ میری طبیعت بہت خراب تھی۔۔۔ آپ نے اتنے تواتر سے بیل دی تو۔۔۔"

"ہمیشہ وہ غلطیاں میرے کھاتے میں کیوں ڈال دی جاتی ہیں' جو میں نہیں کرتی۔" وہ کہنا چاہتی تھی' لیکن کہا نہ گیا۔ ٹانگیں کمزور پڑ گئی تھیں۔

بڑے زور کا چکر آیا۔

آنکھیں بند ہونے سے ایک لمحہ قبل اس نے ریان جہانگیر کو تیزی سے اپنی طرف لپکتے دیکھا۔ لاکھ چاہا اس نے کہ خود کو سنبھال لے۔۔۔ لیکن تاریکی تھی کہ بڑھتی ہی چلی گئی۔ حواس کھونے سے پہلے اس نے دو مضبوط ہاتھوں کا لمس اپنے کندھوں پہ شدت سے محسوس کیا تھا۔

☼ ☼ ☼
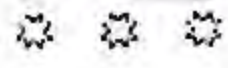
"تم میرے گھریلو معاملات میں حد سے زیادہ دخل دے رہے ہو۔"

"گھریلو معاملات۔۔۔ یہ انسانی جان کا معاملہ تھا۔۔۔ جو گھریلو سے زیادہ وریڈیلوس کا معاملہ بن گیا تھا۔"

"کیا ضرورت تھی تمہیں ایک چھوٹیشن کری ایٹ کرنے کی۔۔۔ ڈاکٹر زیدی کو فون کردیا' اتنی امپورٹنٹ میٹنگ سے مجھے اٹھا کر لائے۔ گھر بھر کو ہلا کر رکھ دیا اور وہ بھی بلاوجہ۔۔۔"

"نہیں۔۔۔ وجہ تو تھی پھپھو! جان کا معاملہ تھا۔"

عنایا خاتون جتنا ہائپر ہو رہی تھیں' وہ اتنا ہی کول تھا۔ تانیہ نے ہوش و بے ہوشی کے عالم میں دونوں کی باتیں سنیں' پھر گہری نیند میں ڈوب گئی۔

☼ ☼ ☼

"عنایا خاتون نے بڑی بے عزتی کی بے چارے ریان صاحب کی۔۔۔ پر ہم کیا کر سکتے تھے۔ پھپھی' بھتیجے کا آپس کا معاملہ تھا۔ ویسے ایک بات بتاؤں۔۔۔" ملازمہ اسے دوا کھلانے کے بعد اب اس کے بال سلجھا رہی تھی۔

"عنایا خاتون ریان صاحب کو رتی برابر پسند نہیں کرتیں۔۔۔ دل چاہے تو کھڑے کھڑے گھر سے نکال دیتی ہیں۔ یہ تو بس ریان صاحب کا دل اچھا ہے' جو تعلق کو جوڑے ہوئے ہیں۔ خبرگیری کرتے رہتے ہیں۔"

"ایسا کیوں ہے سلطانہ۔۔۔؟" وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

"زیادہ تو معلوم نہیں۔۔۔ بس اتنا پتا ہے کہ عنایا خاتون اور ان کے بھائی جہانگیر کی منگنی وٹے سٹے میں ہوئی تھی۔ جہانگیر صاحب نے تو اپنی منگیتر کو اپنالیا' لیکن عنایا خاتون کے منگیتر نے اس رشتے سے انکار کردیا۔ پھر بی عنایا خاتون نے بڑا زور لگایا کہ جہانگیر اپنی بیوی کو طلاق دے کر ان کی بے عزتی کا بدلہ لیں۔ لیکن جہانگیر کو اپنی بیوی منزہ سے سچی محبت تھی۔ سو انہوں نے بیوی کو ساتھ لیا اور بیرون ملک جا بسے' وہیں ریان جہانگیر کی پیدائش ہوئی۔ بس جی اس کے بعد سے دونوں بہن' بھائیوں میں کبھی تعلقات استوار ہی نہ ہو سکے۔ سچ کہوں تو عنایا خاتون ہی انہیں معافی دینے پر راضی نہیں۔۔۔ ورنہ وہ بے چارے تو آج تک سر ٹکرا رہے ہیں کہ کسی طرح یہ رنجش ان کے دل سے نکل جائے۔ پر نہ جی عنایا خاتون کا دل۔۔۔ کسی زمانے میں ہوگا خون کا لوتھڑا۔۔۔ پر اب تو پتھر ہے پتھر۔۔۔"

وہ چپ چاپ سنے گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ریان جہانگیر کا اس گھر میں پہلے بھی آنا جانا تھا' لیکن اس باقاعدگی سے نہیں' جس تواتر سے اب آنے لگا تھا۔

عنایا خاتون اپنے کاموں میں مگن' ریان جہانگیر کی روزانہ حاضری سے بے خبر تھیں۔ ملازم سب جانتے تھے۔ کان اور آنکھیں کھلی تھیں' لیکن زبانوں پہ قفل ڈال رکھے تھے اور بتاتے بھی تو کیا۔۔۔

وہ یوں ہی تو آتا تھا' سرسری سا۔

عنایا خاتون کا پوچھتا۔ یہ جانتے بوجھتے بھی کہ وہ اس وقت گھر پہ نہیں ہوتیں۔ وہ پوچھتا تھا۔ لیکن نگاہیں کھوجتی رہتیں۔ کبھی وہ دکھائی دے جاتی' کبھی نامراد لوٹ جاتا۔

☆ ☆ ☆

"یہ آپ ہروقت کھوئی کھوئی' اداس اور غمگین سی کیوں رہتی ہیں؟" وہ بہت دنوں بعد چہل قدمی کے لیے نکلی تھی۔ جب ریان جہانگیر لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کے قریب آگیا تھا اور اب اس کے قدم سے قدم ملا کر چلتا کم' دیکھتا زیادہ تھا۔

"کوئی وجہ بھی تو ہو۔" دوسری جانب خاموشی تھی۔

"میرا مطلب ہے کبھی کبھی خوش ہولینے میں آخر حرج ہی کیا ہے۔ بندے کو ہنستا مسکراتا نظر آنا چاہیے۔"

"کوئی وجہ بھی تو ہو۔" وہ بہت دھیمے لہجے میں بولی تھی۔

"ارے۔ خوش ہونے' مسکرانے کے لیے کسی وجہ کی ضرورت ہے؟" ریان جہانگیر نے ازحد حیرت کا اظہار کیا تھا۔

"ارے ہم ہاتھ' پاؤں' ناک' کان' آنکھوں والی صحت مند مخلوق ہیں۔ میرے خیال میں تو خوش رہنے کے لیے یہ ہی وجہ کافی ہے۔" وہ اب الٹے قدموں اس کے سامنے چلنے لگا تھا۔

"یہ ہی کیا کم ہے کہ جسے چاہتے ہیں دیکھ لیتے ہیں۔ جدھر دل چاہتا ہے' چل دیتے ہیں۔ جو منہ میں آتا ہے بول دیتے ہیں' اور چار روزہ زندگی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا لوگ ذرا' ذرا سی بات کو لے کر رنجیدہ کیوں ہوجاتے ہیں آخر۔" وہ اپنا فلسفہ بول رہا تھا' اس تواتر سے کہ اسے بریک دینے کے لیے تانیہ کو اپنے قدم روکنے پڑے تھے۔

"کیا ہوا؟ میرے خیالات پسند نہیں آئے کیا؟"

"نہیں۔ مجھے گھر سے نکلے ہوئے کافی دیر ہوگئی ہے۔" وہ واپسی کے لیے پلٹی۔

"ایسے کیسے جاسکتی ہیں' آیئے میں آپ کو اپنا گھر دکھاتا ہوں۔" اس نے ایک دم اس کا ہاتھ تھاما تھا اور اس نے یوں چھڑایا تھا گویا کسی بچھو نے کاٹ لیا ہو۔

"اوہ آئم سوری۔ میں تو صرف۔" اور وہ اپنی زرد رنگت سمیت یوں وہاں سے بھاگی تھی کہ ریان جہانگیر کے الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے تھے۔

وہ تیز قدموں سے چلتی رہی۔ جانتی تھی کسی کی نظروں کے حصار میں ہے اور وہی ہوا تھا گیٹ سے اندر جاتے ہوئے پل بھر کے لیے پلٹ کر دیکھا' وہ وہیں کھڑا تھا جہاں تانیہ اسے چھوڑ کر آئی تھی۔

ڈوبتے سورج کی لالی میں ایستادہ' ایک ہیولے کی مانند۔

☆ ☆ ☆

"نہیں اب کوئی غلطی نہیں۔ بالکل بھی نہیں۔" یہ ایک اور شام تھی جو اس کے حواس پہ چھانے کو تیار کھڑی تھی۔ وہ بلند قامت ہیولا ایک اور شام اس کے پلو سے باندھ رہا تھا۔

وہ خوف زدہ تھی' ڈری ہوئی' دل میں کئی عہد باندھ لیے۔

"نہ آواز سنوں گی' نہ چہرہ دیکھوں گی' بات تو بالکل بھی نہیں' لیکن اس نے ہاتھ کیوں پکڑا میرا؟" وہ دل ہی دل میں لڑتی جھگڑتی رہی۔

☆ ☆ ☆

"تمہارے پاس کوئی ڈھنگ کا جوڑا ہے؟"

"ڈھنگ کا جوڑا۔" اس نے ناشتا چھوڑ کر سوالیہ نظروں سے عنایا خاتون کو دیکھا۔ پتا نہیں ڈھنگ کے جوڑے سے ان کی مراد کیا تھی۔

"کہاں ہوگا تمہارے پاس۔ اچھا۔ چلو۔ میں دیکھتی ہوں۔" بات کا کوئی سرا اس کے ہاتھ نہ لگا۔ انہوں نے خود ہی بات شروع کی' خود ہی لپیٹ دی۔ شام کو البتہ ایک نہایت خوب صورت لباس اس کے

سامنے رکھ دیا۔

"منزہ اور جہانگیر آگئے ہیں دبئی سے۔ آتے ہی محفل بھی جمالی۔ تمہارے ابا کو جانتے ہیں۔ اصرار کررہے تھے کہ تمہیں بھی ساتھ لے کر آؤں۔ حالانکہ میں تو خود بھی جانا نہیں چاہ رہی تھی۔ پتا نہیں ان میاں' بیوی کے پاس اتنا فالتو وقت کہاں سے آجاتا ہے۔ پورے خاندان کو بلا رکھا ہے۔ اب میں نہ جاؤں تو باتیں کرنے کے لیے ایک نیا ٹاپک آجائے گا سب کے ہاتھ میں۔ رات کو چلیں گے تیار رہنا تم۔"

اور اس کی کیا مجال؟ کیا تیار نہ رہتی۔ نہا' دھو کر لباس تبدیل کیا اور بال سنوار لیے۔

"میری آئے تو اسے کہنا' پہلے اسے کچھ وقت دے دے۔ میں تھوڑی دیر ریسٹ کرلوں۔" قدرے نخوت سے انہوں نے اپنی بیوٹیشن کا نام لیا تھا۔

اور میری نے جو چند منٹ اس پر لگائے تھے۔ وہ عنایا خاتون پر لگائے گئے پیتالیس منٹ پر حاوی ہوگئے تھے۔

وہ چند لمحے آنکھیں کھولے اسے دیکھتی رہ گئی تھیں۔

"بعض لوگ اپنے حسن سے خود بھی واقف نہیں ہوتے۔" میری کا خیال تھا' عنایا خاتون اس کارکردگی پہ اسے سراہیں گی۔

"یہ کیا بنا رہا ہے تم نے اسے؟"

"میرے خیال میں تو تمہیں نئے سرے سے ٹریننگ لے لینی چاہیے۔" انہوں نے کڑی نظروں سے میری کو دیکھا اور آگے بڑھ گئیں۔

"کیا میں اچھی نہیں لگ رہی؟" وہ روہانسی ہوگئی۔

"وہاں اتنے سارے لوگ ہوں گے۔"

میری نے خاموشی سے اس کا ہاتھ دبا کر اشارہ کیا۔

"آئینہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔"

میری نے اس کا رخ بدل کر کوریڈور میں لگے آئینے کے سامنے کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

یہ دنیا کیسی دنیا تھی۔

انوکھی' انجان' روشن' خوشبو سے لبریز' خوشیوں سے آراستہ۔

"کیا ان میں سے کسی نے بے اعتباری' بے زبانی اور دربدری کا دکھ نہیں سہا۔" وہ گویا کسی حیرت کدے میں کھڑی تھی۔

عنایا خاتون اسے بھلا کر کسی مجسمے کی طرح ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے بیٹھی تھیں۔

وہ ان سے چند قدم کے فاصلے پہ کھڑی انگلیاں چٹخاتی رہی' جب منزہ اس تک آپہنچیں۔ دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر بہت محبت سے دیکھا تھا انہوں نے۔

"بہت پیاری لگ رہی ہو۔ بالکل اپنی ماں کی طرح... بہت اعلیٰ خاتون تھیں وہ۔ جب بھی ملتیں دل پر نقش چھوڑ جاتی تھیں۔ شاید اسی لیے اللہ نے انہیں..."

بھری محفل میں یہ کوئی وقت نہیں تھا پرسہ دینے کا۔ اس کا احساس انہیں شدت سے تب ہوا جب تانیہ کی آنکھیں تیزی سے لبریز ہونے لگیں۔

"اوہ آئی ایم سوری۔ رئیلی ویری سوری۔ بس تمہیں دیکھا تو فوراً" ہی کہہ ڈالا۔ آؤ میرے ساتھ... اندر آؤ۔" وہ اسے بازوؤں میں گھیرے اندر کسی کمرے میں لے گئیں۔

آنسو پونچھے' پانی پلایا۔

"تمہاری آنکھوں کا رنگ بہت یونیک ہے۔" نیلے کانچ سی آنکھیں تھیں۔ آنسو بہہ جانے کے بعد اور بھی خوب صورت دکھنے لگی تھیں۔ وہ کہے بغیر نہ رہ سکیں۔

تب کسی نے انہیں باہر پکار لیا۔

وہ تنہا بیٹھی خود سے لڑتی جھگڑتی رہی۔ ان آنسوؤں کو کوستی رہی' جو ماں کے ذکر پر وقت' مقام کا کچھ خیال ہی نہ کرتے تھے۔

اور گلاس وال کے پرے کھڑا ریان جہانگیر اس کی ایک ایک ادا کو دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ خود کو سمجھا بجھا کر اس وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں پھیلی

آرائش کو دیکھنے لگی تھی۔ تب وہ اس کے قریب چلا آیا تھا۔

"آپ کا گھر بہت خوب صورت ہے۔" اسے دیکھتے ہی وہ فوراً بولی۔ یہ گریز تھا۔

وہ خود کو کسی بھی سوال سے بچانا چاہتی تھی۔

ڈرائنگ روم میں اس کی موجودگی کا سوال یا نم آنکھوں پر سوال۔۔۔ وہ کچھ بھی پوچھ سکتا تھا۔

وہ کچھ بھی بتا نہ پاتی۔۔۔ اور سامنے ریان جہانگیر تھا' جو کہتا تھا۔

"محبت دوسرے کے دل میں اتر جانے کا نام ہے۔"

اور دل میں تو وہ اتر ہی چکا تھا' پھر سوال۔۔۔

"آؤ' تمہیں اپنا گھر دکھاتا ہوں۔" وہ اسے بہلانا چاہتا تھا۔

اس بار ریان جہانگیر نے اس کا ہاتھ نہیں تھاما تھا۔

"اس قدر ایمبیرسمنٹ ہو رہی تھی مجھے کہ بتا نہیں سکتی اور تم اس قدر بے وقوف ہو کہ سارا وقت اس بے کار لڑکے کے ساتھ اس کے گھر میں گھومتی رہیں۔ سب لوگ تمہیں دیکھ رہے تھے۔" کچھ لوگ کس قدر ظالم اور سفاک ہوتے ہیں۔ بڑے آرام سے ہونٹوں سے مسکراہٹ نوچ لیتے ہیں۔ "عنایا خاتون آج کے دن یہ نشر نہ لگاتیں تو میری سزا کیسے پوری ہوتی۔"

اتنے دنوں میں یہ تو ہوا تھا کہ دکھ اور تکلیف کو سہنے کا سلیقہ آنے لگا تھا۔ اب دل پہ نشتر لگتا تھا تو آنسو باہر نہیں' اپنے اندر اتار لیتی تھی۔ قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اس نے مہین دوپٹے کو اتار کر احتیاط سے رکھا۔ پھر کانوں سے ٹاپس اتار کر سنبھالنے لگی۔

"پتا نہیں کب یہاں سے جانا پڑے۔" وہ سب چیزوں کے استعمال میں احتیاط برتتی تھی۔

"تو آج سب لوگ مجھے دیکھتے رہے' کیوں؟" وہ آئینے میں اپنا آپ دیکھتی رہی بہت دیر تک۔

"میری ٹھیک کہتی تھی' آئینہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا' اور وہ بھی۔۔۔"

اس کی آنکھوں میں جگنو سے اتر آئے۔ کمبل لپیٹ کر تکیے پر سر رکھ کر اس نے خاصی فرصت سے سوچا۔

زیادہ وقت تو نہیں گزارا تھا اس کے ساتھ۔۔۔ بس کچھ پل تھے۔ جنہیں مٹھی میں چھپا کر لے آئی تھی اور اب۔۔۔ وہ یوں دمک رہے تھے جیسے اندھیری رات میں ستارے ٹمٹماتے ہیں۔

"تم بہت اچھی ہو نا نیہ!" ریان جہانگیر کے خاص لہجے میں کہا گیا عام سا جملہ اسے نیند میں بھی یاد آ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

بہت چمکیلا سا دن تھا۔ لان کے سبز پودے کھلی کھلی دھوپ میں لشک رہے تھے۔ وہ ابھی ابھی نہا کر نکلی تھی۔ جوانی اور بہار دونوں جوبن پر تھے۔

دھوپ اس کے گورے بدن کو چھو کر سونا بنتی اور پگھل کر دھرتی پہ پھیل رہی تھی۔۔۔ پھولوں پہ اڑتی رنگ برنگ تتلیوں اور گھاس پہ چگتی چڑیوں کو دیکھ رہی تھی۔ جب کوئی چپکے سے اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا۔

"عنایا خاتون کے گھر میں ایک ہی اچھی چیز ہے۔ اسے بھی ہم لے جائیں گے۔" جب تک بات کا مطلب سمجھ کر وہ پلٹی' ریان جہانگیر لان کی کیاری پھلانگ کر اندرونی سمت کی طرف جا رہا تھا۔

وہ لان میں رکھی کرسی پر بیٹھی' اور اس کا کہا گیا جملہ دہرانے لگی۔ دل خوش گوار سے انداز میں دھڑ کا تھا۔

"ریان صاحب کے ممی' ڈیڈ بھی ساتھ آئے ہیں' کہتے ہیں کھانا کھا کر ہی جائیں گے۔۔۔ لیکن عنایا خاتون کا موڈ نہیں لگتا تھا انہیں کھانا کھلانے کا۔۔۔ مصروفیت کا بہانہ بنائے جا رہی ہیں۔" سلطانہ اسے چائے کا کپ لان میں ہی دے گئی تھی۔ ساتھ ساتھ بتاتی گئی۔

کچھ دیر بعد وہ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ بھاگی آئی تھی۔

"وہ جی آپ کو مانگ رہے ہیں۔"

"سچ کہہ رہی ہوں۔ میں نے خود سنا جائے کے برتن اٹھاتے ہوئے۔ وہ ریان صاحب کے لیے آپ کو مانگ رہے ہیں۔"

"عنایا خاتون نے کیا کہا۔"

"انہوں نے کہا آپ کے والد صاحب ہی آخری فیصلہ کریں گے۔"

خبر اچھی تھی' لیکن وہ جانے کیوں ٹھنڈی ٹھار سی ہو کر بیٹھی رہی۔

اس کا دل کہتا تھا۔ "یہ نہیں ہوگا۔"

"کیوں نہیں ہوگا؟ کیا رکاوٹ ہے؟" اس نے سوچا' تب ہی عنایا خاتون اس کے سامنے آکھڑی ہوئی تھیں۔

دونوں ہاتھ سینے پہ باندھے استہزائیہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے سورج ان کے عقب میں تھا۔

تانیہ نے سر اٹھا کر انہیں دیکھنا چاہا' لیکن آنکھیں چندھیا گئیں۔

وہ چند لمحے کھڑی اسے دیکھتی رہیں۔ پھر شاید وہ مسکرائی تھیں اور پلٹ کر مالی سے بات کرنے لگی تھیں۔

وہ قدرے الجھن میں ڈوبی وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

✲ ✲ ✲

انتظار طویل ہو گیا تھا۔

عنایا خاتون کیا سوچ رہی تھیں۔ ان میں سے کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ پورے بنگلے میں چکراتی رہتی۔ تھک جاتی تو لاؤنج میں پڑے خاموش ٹیلی فون کو دیکھا کرتی۔

"شاید کبھی ابا کو احساس ہو جائے۔ انہوں نے میرے لیے کیا کہا تھا؟ کیا سوچا تھا؟" وہ منتظر رہتی۔

"شاید آج ابا کو میری یاد آجائے۔"

موسم کئی دنوں سے خراب تھا۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا رہتا۔ سردی جاتے جاتے اپنا آپ دکھا رہی تھی۔ بہار کے موسم میں ایک بار پھر سوئیٹر' جرسیاں نظر آنے لگے تھے۔ وہ صبح سے بے کل پھر رہی تھی۔

نہ کھانے میں جی لگا' نہ سلطانہ کی باتیں اچھی لگیں۔ بس گلاس وال سے چپکی باہر برستی کر... دیکھتی رہی۔ کتنا دل چاہ رہا تھا۔ وہ بھی یوں ہی برسے۔ خشک آنکھیں تر ہو جائیں۔ دل کا سارا بوجھ ہلکا ہو جائے۔ لیکن اب اتنی جلدی رونا بھی نہیں آتا تھا۔

رات دھیرے دھیرے اتر رہی تھی۔ جب عنایا خاتون کی گاڑی پورچ میں آکر رکی۔

"تم نے بتایا ہی نہیں۔ آج تمہاری ماں کی برسی تھی۔ تمہارے ابا کا فون آیا تو مجھے پتا چلا۔ سارا دن تو یوں ہی گزر گیا' ورنہ گھر میں قرآن خوانی ہی رکھ لیتے۔ خیر میں نے ایک مدرسے میں پیسے بھجوا دیے تھے۔ قرآن خوانی کا بھی کہہ دیا تھا' دیگوں کا بھی۔"

"تو ابا مجھ سے اس قدر خفا ہو گئے ہیں کہ آج کے دن بھی انہوں نے میرے لیے تسلی اور دلاسے کا ایک فون کرنا گوارا نہیں کیا۔"

وہ تھک کر صوفے پہ بیٹھ گئی۔ شکایت بھری نظروں سے فون کے سیٹ کو دیکھا۔

بہت ہی اچھے ابا اس وقت بہت ہی برے لگ رہے تھے۔ دل میں وحشت کا ابال سا اٹھا تھا۔ وہ اٹھی اور دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

ابھی سات بھی نہ بجے تھے۔

"میں منزہ آنٹی کی طرف جا رہی ہوں۔ آتی ہوں کچھ دیر میں۔" چند منٹ کا ہی تو فاصلہ تھا۔ اس نے چوکیدار کو بتایا۔

اور پانی میں چھپاک چھپاک قدم رکھتی سیدھی سڑک پہ چل دی۔

"منزہ آنٹی اچھی ہیں' بہت اچھی ہیں۔ وہ مجھ سے ملتی ہیں تو ماں کی خوشبو آتی ہے ان کے وجود سے۔ آج ان کے پاس بیٹھ کر ساری باتیں کروں گی۔ اور پوچھوں گی جن بیٹیوں کی مائیں مرجاتی ہیں کیا انہیں گھروں سے دربدر کر دیا جاتا ہے۔ کیا ماں کے بعد دنیا میں کوئی ایسا نہیں ہوتا جو غم کی روٹی بانٹ کر کھالے۔ جو چہرہ دیکھ کر جان لے کہ آج دل ٹوٹا ہے۔ آج جذبات کو ٹھیس پہنچی ہے' آج اداسی روح سے لپٹی جا رہی ہے۔ کون جان سکتا ہے؟ کوئی بھی نہیں۔ اگر

ایسا ہو سکتا تو مرنے والی ماں کے لیے کون روتا؟ کون یاد کرتا؟" اس کے آنسوؤں کا نمکین پانی بارش کے پانی میں گھلا جا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کاش! نادانی اور جوانی کے بیچ میں کہیں کوئی پڑاؤ یا کوئی منزل ہوتی۔"

یہ بات اس نے تب سوچی تھی جب عنایا خاتون ان دونوں کے سر پہ آکھڑی ہوئی تھیں۔ ان کا چہرہ' ان کی آنکھیں' عنایا خاتون کی نہیں تھیں' ابا کی تھیں' ان کی آنکھوں میں کیا تھا؟ ثانیہ اپنی جگہ پر کپکپا کر رہ گئی تھی۔ گیٹ پہ چوکیدار نہیں تھا۔ وہ سیدھی اندر چلی آئی تھی۔ سارا بنگلہ روشن تھا۔ لاؤنج میں ٹی وی فل والیوم میں چل رہا تھا۔ لیکن کوئی ذی روح موجود نہیں تھا۔ بادل اتنے زور سے گرجا کہ وہ جی جان سے لرزتی وہیں صوفے میں سما گئی تھی۔

"منزہ آنٹی... منزہ آنٹی!"

وہ پوری قوت سے چلائی تھی۔ پتا نہیں شور زیادہ تھا یا آواز حلق میں پھنس گئی تھی۔ منزہ آنٹی نہیں آئی تھیں۔

وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے با آواز بلند رونے لگی تھی۔

تب ہی کسی کی آمد کا احساس ہوا۔ وہ ریان جہانگیر تھا۔ صرف جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس... جس میں اس کے بازوؤں کی مچھلیاں ہر آن تڑپتی اور مچلتی دکھائی دیتی تھیں۔

وہ لاؤنج کا دروازہ اندر سے لاک کر کے پلٹا تھا اور اسے اپنے سامنے دیکھ کر ششدر رہ گیا تھا۔

اس کی حیرت بجا تھی۔ وہ لاؤنج خالی چھوڑ کر گیا تھا۔

"تم اس وقت یہاں... ؟ خیریت تو ہے نا... تم رو رہی ہو؟ کب سے بیٹھی ہو یہاں؟ بارش میں بھیگتی ہوئی آئی ہو... کون چھوڑ کر گیا ہے تمہیں؟" اتنے سارے سوال... وہ ایک کا بھی جواب نہ دے پائی تھی۔ جب اس نے ریان جہانگیر کے عقب میں لاؤنج کے گلاس ڈور کو دونوں ہاتھوں سے بجاتی عنایا خاتون کو دیکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

کہانی بن گئی تھی۔

کہیں کوئی جھول' کوئی کمی' کجی یا خامی نہ تھی۔

منزہ اور جہانگیر دونوں گھر پر نہیں تھے۔ چوکیدار چھٹی پہ... خانساماں کوارٹر میں... اور لاؤنج میں دروازے' کھڑکیاں بند کیے ریان جہانگیر اور ثانیہ سلمان' بنت کار عنایا خاتون تھیں تو پھر کوئی کسر کیسے رہتی۔

ثانیہ' روتی گڑگڑاتی رہی' چلاتی رہی' کہیں کوئی کھوٹ نہ تھا۔

نفس بے لگام تھا' نہ دل و دماغ میں کوئی خناس سمایا تھا۔ پھر بھی یہ سب ہو گیا... کیسے ہوا... اور کیوں؟ یہ سب اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔

"یہ کیا' کیا تم نے میرے ساتھ... بڈھا چھوڑ گئے تھے تو اس کے کرتوت اور کردار کی تفصیل بھی بتا جاتے اور کچھ نہیں تو میں کسی کو اس کی رکھوالی کے لیے ہی رکھ چھوڑتی... کیا بتاؤں میں تمہیں... جوانی منہ زور ہوتی ہے۔ برستی بارش میں نکل گئی تھی گھر سے... اتنے بڑے بنگلے میں وہ اور اس کا عاشق اکیلے... اگر میں وقت پر نہ پہنچ گئی ہوتی تو بتاؤ... میں کس کس کو جواب دیتی... منہ دکھانے لائق نہیں چھوڑا اس نے مجھے... صبح ہی آؤ اور لے کر جاؤ اس گندگی کی پوٹ کو..."

ثانیہ سامنے بیٹھی تھی۔ دھڑکتے دل اور کھلی آنکھوں کے ساتھ مر چکی تھی۔ سانسوں کی آمدورفت کو لوگ زندگی کا نام دیتے تھے۔ تو ہاں وہ زندہ تھی۔

اس قدر زرد رنگت تھی اس کی کہ عنایا خاتون کے ریسیور پکڑتے ہاتھ ایک لمحے کے لیے کپکپا سے گئے۔

"خیر مجھے کیا؟ اپنا کیا ہی بھگت رہی ہے۔ کسی نے تھوڑی کہا تھا۔ آدھی رات کو برسات منانے اپنے عاشق کے پاس جا پہنچے۔"

وہ اسے ساکت وصامت بیٹھے چھوڑ گئی تھیں۔ بنگلے کی ساری بتیاں بجھ گئیں۔ آج گھر میں کسی نے کھانا نہیں کھایا تھا۔

☼ ☼ ☼

"یہ عجیب بات ہے عنایا۔ یعنی تمہیں اپنے خون پر بھروسا نہیں۔ ریان جہانگیر ہمیں ساری بات بتا چکا ہے اور ہمیں اپنے بیٹے پہ پورا اعتماد اور یقین ہے۔ ان دونوں کی نیت میں کسی قسم کا کوئی فتور کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ وہ دونوں اس وقت اکیلے تھے اور ظاہر ہے تانیہ بے چاری بھی ہماری غیر موجودگی سے واقف نہیں ہوگی۔ جب ہی تو...."

"جب ہی تو برستی بارش میں.... بغیر مجھے بتائے وہ محترمہ کچے دھاگے سے بندھی تمہارے بیٹے کے پاس پہنچ گئی۔" عنایا خاتون نے بھرپور طنز کرتے ہوئے جہانگیر کی بات کاٹ دی تھی۔

"ہاں یہ غلطی اس کی ہے، میں مانتا ہوں۔ تم بلاؤ تانیہ کو... وہ ابھی تم سے معافی مانگ لے گی۔"

"مجھے کسی معافی، تلافی کی ضرورت نہیں ہے۔ بلوایا ہے اس کے باپ کو... آکر لے جائے گا۔ میرے اپنے بہتیرے معاملات ہیں... مزید بکھیڑے نہیں پال سکتی۔"

"اتنی سی بات کو لے کر تم نے اس کے باپ کو بلوالیا۔" منزہ نے حیرت کی انتہا کو چھوتے ہوئے پہلے عنایا خاتون اور پھر جہانگیر کو دیکھا۔

"جی ہاں! فی الحال اس کی سرپرستی اس کے باپ کے پاس ہی ہے۔"

"تو ٹھیک ہے، پھر اگلی بات اس کے سرپرست سے ہی ہوگی۔" منزہ اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"ہم نے ناحق ان سے رشتے کی بات چھیڑی... یہ تو لگتا ہے کچھ پرانے بدلے چکانے کے چکروں میں ہیں۔" منزہ نے دبے لہجے میں ہی کہا تھا، لیکن آواز اتنی بہرحال تھی کہ عنایا خاتون کی سماعتیں بھی فیض یاب ہوگئی تھیں۔

"پرانے بدلے ہی سمجھو، منزہ خاتون! ریان جہانگیر نامراد ہو کر میری طرح تڑپے گا، سسکے گا تب تمہارے کلیجے پہ ہاتھ پڑے گا اور تب ہی میں سکون سے مسکراؤں گی۔ تمہارے بیٹے کی آنکھوں میں محبت کی ویسی ہی جوت جلتی ہے، جیسی کبھی میری آنکھوں میں جلتی تھی منزہ جہانگیر! اور جسے تمہارا بھائی نفرت کے ایک ہی جھونکے سے اندھیروں میں بدل گیا تھا۔"

منزہ اور جہانگیر جا چکے تھے۔ وہ ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے بیٹھی تھیں۔ سوگوار سی خاموشی پورے کمرے میں ان کے اطراف میں چکراتی پھر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تانیہ کو بلاؤ... اسے کہو... اس کے ابا آئے ہیں۔"

سلمان حفیظ کسی مجرم کی طرح عنایا خاتون کے سامنے سر جھکائے بیٹھے تھے۔

"میں نے آپ سے کہا تھا، کہیں چھوٹا موٹا رشتہ دیکھ کر اس کی بات پکی کر دیں۔ وہاں وہ بیٹھی ہے۔ اس کی سوتیلی ماں، کہتی ہے جوان لڑکی کی بڑی ذمہ داری ہوتی ہے۔ میں نہیں نبھا سکتی، ننھیال، ددھیال میں کون ہے، جو اس مصیبت کو گلے سے لگائے، میں صبح سے شام تک روزی، روزگار سے بندھا ہوا انسان ہوں۔ اس کو ساتھ، ساتھ لیے پھروں کیا؟"

"وہ اس کی خالہ۔ جوان جہان چار لڑکوں کی ماں... کسی سے بھی دو بول نکاح کے پڑھوا دو۔" تاک کر حملہ کیا تھا عنایا خاتون نے۔

"صرف بیٹی نہیں لے گی، زر اور زمین بھی مانگے گی ساتھ ہی۔ پانچ مرلے کے مکان میں بیٹھا ہوں۔ تانیہ اور اس کی ماں کا حصہ نکل گیا تو مجھے سر چھپانے کو جگہ کہاں ملے گی؟" ان سا مجبور کوئی روئے زمیں پہ نہ تھا شاید۔

"تانیہ بی بی! کمرے میں نہیں ہیں جی۔" ملازمہ کی آمد پریشان کن انداز میں ہوئی تھی۔

"کیا مطلب؟" عنایا خاتون فوراً سیدھی ہوئیں۔

"ہاں جی! نہیں ہیں' نہ کمرے میں' نہ لان' میں' نہ کسی اور جگہ' میں نے سارا گھر چھان مارا ہے' پتا نہیں کہاں گئیں؟"

* * *

"مگر تانیہ نہ ملی تو یاد رکھیں' آپ مجھے بھی کھو دیں گی۔" وہ ان کے عین سامنے کھڑا تھا۔

ہونی سی سرخ آنکھیں تھیں۔ لب کپکپاتے ہوئے' سانسیں بے ترتیب جیسے کوئی قیمتی متاع چھن جانے پر جان کنی کی اذیت سے گزر رہا ہو۔ انہوں نے آنکھیں چرائیں اور اپنے کندھوں پہ رکھے اس کے ہاتھ جھٹک کر دور جا بیٹھیں۔

"وہ بے قصور ہے' اس نے کوئی گناہ نہیں کیا۔" وہ اب سلمان حفیظ کے سامنے دوزانو بیٹھا تھا۔

"گناہ نہیں کیا تو پھر کہاں جا چھپی ہے؟" ان کے لہجے سے نفرت بول رہی تھی۔

"نہیں جانتا۔ اگر جانتا ہوتا تو لے آتا اسے اور کہتا سب کچھ ایک بھیانک خواب تھا' صرف خواب۔" وہ ہارے ہوئے انداز میں کارپٹ پہ بیٹھا تھا۔

"ہاں۔ وہ اس روز آئی تھی' بارش میں بھیگتی' روتی ہوئی' اس نے کہا تھا۔ آج میری ماں کی برسی ہے' ابا نے مجھے ایک فون تک نہیں کیا۔ اور۔ بس اتنا ہی کہا تھا جب عنایا پھپھو نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ہاں دروازہ بند تھا۔ کیونکہ میں تانیہ کی وہاں موجودگی سے لاعلم تھا۔ اور میں اب بھی لاعلم ہوں۔ چھ گھنٹے گزر گئے۔ لیکن میں نہیں جانتا! وہ کہاں ہے؟ جانتا ہوتا تو لے آتا اسے۔" وہ اٹھ کر باہر نکل گیا تھا۔

* * *

چوبیس گھنٹے گزر گئے تھے۔ انہوں نے ہر ممکن جگہ اسے تلاشا تھا' کھوجا تھا۔

"تھانے میں خبر کردیں۔ یا کسی اسپتال میں ڈھونڈیں۔ کہیں جان ہی نہ دے دی ہو۔" عجب جاہل عورت تھی یہ سلطانہ بھی۔

عنایا خاتون نے جن نظروں سے اسے دیکھا تھا' وہ چادر کی بکل مار کر کمرے سے نکل گئی تھی لیکن سلمان حفیظ کے سامنے جاکر اس کے قدم بھاری پڑ گئے تھے' وہ باہر لان میں بیٹھے تھے۔ دونوں ہاتھوں سے سر جکڑے۔

"آپ کی بچی بڑی غیرت والی تھی۔ منہ سے کچھ نہ بولتی تھی۔ لیکن آنکھیں سب کہہ دیتی تھیں۔ میں تو کہتی ہوں کسی اسپتال میں دیکھیں جاکر۔ ہو نہ ہو۔" انہوں نے دہل کر سر اٹھایا۔

"اچھا بھلا رشتہ ڈال گئے تھے جہانگیر صاحب! پتا نہیں عنایا خاتون نے دیری کیوں کی۔؟ بن ماں کی بچی تھی۔ منہ پہ قفل ڈالے رکھتی تھی۔ دل کی باتیں کہنے سننے کو ایک اور بی مل جاتا۔ تو کسی کا کیا جاتا بھلا۔؟" سلطانہ نے خوف خدا سے عاری ہوکر اپنی پوری کوشش کرڈالی تھی' سلمان حفیظ کی آنکھیں کھولنے کی' اب آگے ان کا شعور تھا' تھپکی دے کر سلا دیتا یا جھنکا دے کر جگا دیتا۔

* * *
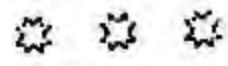
بنے ہوے کر زمیں مٹی کے پتلے
ابھی تک۔ ہاتھ اپنے مل رہی ہے

"کیا بگاڑا تھا میں نے آپ کا۔؟ مجھ سے کس چیز کا بدلہ لیا ہے آپ نے۔" وہ اپنے سینے میں چھرا گھونپے عین ان کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔ بھل بھل بہتا لہو۔ وہ ایک دم وحشت زدہ ہو کر چلائیں۔

"کیا ہوا۔؟ عنایا۔؟ عنایا کیا ہوا۔؟" سب لوگ ان کے گرد جمع تھے۔ وہ ٹکر ٹکر سب کو دیکھتی رہیں۔

کچھ سمجھ میں نہ آرہا تھا' کیا ہوا ہے۔؟

وہ سوئیں تو نہ تھیں۔ یہیں بیٹھی تھیں سب کے درمیان۔ پھر۔ شاید جھپکی سی آگئی تھی۔ لمحہ بھر کی غفلت۔

وہ بری طرح چونکیں۔

لمحہ بھر کی غفلت کسی کی جان بھی لے سکتی ہے۔ یہ کیا کیا تھا انہوں نے۔؟ ایک معمولی سی بات کو کیا

رنگ دے دیا۔ رشتوں سے ' جذبات سے ' فرائض سے غفلت ہی تو برتی تھی۔ انہوں نے نظریں چرا کر ذرا سا پہلو بدلا۔

"پتا نہیں کہاں ہو گی۔ اگر سچ مچ مر مرا گئی' تو کیا میں خود کو معاف کر سکوں گی۔" انہوں نے بری طرح جھرجھری لے کر خوف زدہ نگاہوں سے سب کو دیکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

تمہاری چاہ میں ہم' اور ہوا!
اندھیرے جنگلوں میں چل رہی ہے

وہ اپنے تھکے ہوئے' بخار زدہ جسم کو بمشکل گھسیٹتے ہوئے چل رہا تھا۔ کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا تھا اسے۔ ایسا ناراض ہوئی تھی کہ کہیں کوئی پتا' کوئی نشان نہ چھوڑا تھا' کسی نے باہر آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ کسی سڑک پر۔ کسی جانے انجانے گھر میں۔

"کہاں چلی گئیں تم۔؟ مجھ پر بھی اعتبار نہیں کیا۔ میں تمہیں پاک دامن ثابت کر کے رہتا' سارے الزام دھو ڈالتا' جب اپنا آپ شیشے کی طرح ہو۔ شفاف اور چکنا پھر ایسی میل اور ایسے داغ کہاں باقی رہ جاتے ہیں' تم نے بہت جلدی حوصلہ ہار دیا۔"

لالیوں کے جوڑے نے شور مچا رکھا تھا' چمکدار نیلے انڈوں کا خول نیچے فرش پر پڑا تھا۔ اور ان کا نوزائیدہ بچہ خوراک کے لیے ذرا سی چونچ کھولے بے تابی سے چلا رہا تھا۔

"اور وہ یہاں کھڑی ہوتی تھی۔ اکثر ہی۔ سر اٹھا کر ان لالیوں کو دیکھتی تھی۔ اور اپنے گھر کے برآمدے میں شور مچاتی چڑیوں کو یاد کیا کرتی تھی۔" اس نے اپنے قریب آتے سلمان حفیظ کو دیکھ کر کہا تھا۔

"چڑیاں۔؟ کون سی چڑیاں۔ جو اس کے آنے کے بعد خشک آنجوروں اور بھوک سے ہار کر کسی اور دیس میں جا بسیں۔ گھر آنگن سونا کر گئیں۔" وہ دونوں ہاتھوں میں سر دیے سسک رہے تھے۔

"میں ایک ناکام اور خود غرض باپ تھا' میں اس کی ماں کے بعد اس کی حفاظت نہیں کر سکا۔ میں ان لالیوں کی طرح اپنی بیٹی کے لیے وفا شعار نہ ہو سکا۔"

سلمان حفیظ کو پچھتاوے کا جو سانپ ڈستا تھا وہ دو مونہا تھا جو ایک طرف سے ان کی غفلت اور کوتاہی پر ڈستا تھا اور دوسری طرف سے اس ظلم پر ڈستا تھا' جو لوگوں نے اس پر کیے تھے۔

تب ہی کوئی کاغذ ہوا کے زور سے اڑتا ہوا۔ ریان جہانگیر کے قدموں سے آن لپٹا تھا۔ یہ رائٹنگ پیڈ کا صفحہ تھا۔ ریان جہانگیر نے جھک کر صفحہ اٹھایا۔

تم جو ہوتے تو زندگی ہم سے
تلخ لہجے میں بات کرتی کیوں

بارش کے پانی میں بھیگا۔ پھیلی ہوئی روشنائی میں لکھا شعر۔ اس نے کاغذ موڑ کر پرے پھینکا۔ اور زیر لب شعر دہرانے لگا۔

تم جو ہوتے تو زندگی ہم سے
تلخ لہجے

چند قدم کے فاصلے پہ ایک اور کاغذ تھا' دہرا مڑا ہوا یوں جیسے ہوا چلی اور پھر بارش کا جھونکا آگیا۔ اس نے بس یونہی بے اختیاری میں ہی کاغذ احتیاط سے اٹھایا تھا۔

"یہ دنیا اچھی نہیں ہے۔ مجھے اپنے پاس بلالیں اماں۔ آ!"

یہ کیسی تحریر تھی۔ وہ بری طرح چونکا۔ سر اٹھا کر دیکھا۔

کسی کمرے کی کھڑکی نہیں کھلی تھی۔ جو وہ سمجھتا کہ یہ کاغذات کسی پلندے کی صورت گرے اور یہاں وہاں بکھر گئے تھے۔

اور یہ تحریر۔ ثانیہ کے سوا کس کی ہو سکتی ہے؟ کب لکھا اس نے یہ۔ اور لکھ کر اڑا دیا کیوں۔؟

وہ بے اختیار کئی قدم چلا تھا۔

یہاں مزید ایک کاغذ موجود تھا' لیکن اب کے وہ رکا نہیں۔

اس کی چھٹی حس اسے کچھ بتا رہی تھی۔ وہ بھاگ کر سرونٹ کوارٹر کے ساتھ بنے اسٹور روم تک پہنچا

تھا۔ سرونٹ کوارٹر میں فی الحال کوئی ملازم نہ رہ رہا تھا' اور اسٹور روم۔ وہ چاروں اطراف دیکھتا ہوا لپکا اور پھر ٹھٹھک کر رک گیا۔ یہاں بے شمار کاغذات بکھرے ہوئے تھے۔ وہ ایک کے بعد دوسرا کھولتا چلا گیا۔

"میں ایسی نہیں ہوں ابا!" ہر کاغذ پر ایک ہی جملہ۔

اس نے سر اٹھایا۔ اسٹور کے آخری کونے میں گلابی رنگ کی ہلکی سی جھلک دکھائی دی تھی۔

"تانیہ! تانیہ!" وہ حلق کے بل چیختا' سامان پر سے گرتا پڑتا آخری کونے تک پہنچا تھا۔

"تانیہ!" اس نے اپنے دل کو بے قابو ہوتے محسوس کیا تھا۔

سفید چہرہ' بند آنکھیں' نیلے ہونٹ۔

وہ ... وہ زندہ تھی یا مردہ۔ ریان جہانگیر تخصیص نہیں کر سکا تھا۔

✡ ✡ ✡

کچھ لوگ بہت ناپ تول کر قدم رکھتے ہیں' سوچ سمجھ کر بولتے ہیں' نظروں سے فاصلہ ناپ لیتے ہیں۔ تاثرات سے ارادے بھانپ لیتے ہیں' ایسے لوگ زندگی کو نہایت خود اعتمادی سے جیتے ہیں۔

اور کچھ لوگ' تانیہ جیسے ہوتے ہیں۔ جو تتلیوں کے پر جمع کرتے کرتے ہاتھوں میں کانٹے چبھو لیتے ہیں۔ جگنو کے پیچھے بھاگتے بھاگتے دیکھتے ہی نہیں کہ پاؤں کسی کھائی میں جا پڑا ہے۔ اور بادلوں کے ساتھ اڑان بھرنے کی چاہ میں قدم' زمین بھی چھوڑ دیتے ہیں۔ اور یہ ہی وہ لوگ ہوتے ہیں جن پر زندگی تو ترس کھا لیتی ہے' انسان ترس نہیں کھاتے۔

✡ ✡ ✡
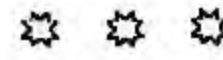
"میں اپنی بیٹی کو واپس لے جا رہا ہوں۔ جو کوتاہی مجھ سے سرزد ہوئی' اس کی معافی خدا جانے ملے گی یا نہیں۔ لیکن میری بیٹی کو دوبارہ زندگی ملی ہے' اور میں نہیں چاہتا کہ دوسری زندگی میں یہ دکھوں کی فصل کاٹے' اب یہ میرے ساتھ رہے گی' جب تک اس کے نصیب میں اگلے گھر جانا نہیں لکھا۔ میرے گھر میں میری بچی اپنے تمام تر حقوق کے ساتھ زندگی گزارے گی۔"

سلمان حفیظ' تانیہ کو بازو کے حلقے میں لیے سینے سے لگائے بیٹھے تھے۔

"ہوں۔ یہ ہی مناسب ہے۔" عنایا خاتون مجبوراً بیٹھی تھیں ورنہ سچ تو یہ تھا کہ وہ ان باپ بیٹی کو آنکھ بھر کر دیکھنا بھی نہیں چاہ رہی تھیں۔ دل میں غم و غصہ تھا' تانیہ کے لیے۔

"وہ چھٹانک کی لڑکی رات بھر اسٹور روم میں چھپ کر سب کے سامنے مظلوم بنی جا رہی ہے' جو کرتوت دکھا رہی تھی' وہ تو کسی کو یاد تک نہیں۔"

"ہمارے لیے کیا حکم ہے۔ کب تک آئیں اپنی امانت کو لینے۔" جہانگیر صاحب نے ماحول خوشگوار بنانے کی پوری کوشش کی تھی۔

"ابھی کیا کہہ سکتا ہوں۔ آپ ہمارے غریب خانے پر آیے۔ چاہت ہے تو سوال ڈالیے' پھر دیکھتے ہیں جو اللہ کی رضا۔"

✡ ✡ ✡

عنایا خاتون نے ابا کو فون کر دیا تھا۔

"میں کیا کہوں گی۔؟ کیسے بتاؤں گی کہ ان کی بیٹی ایسی نہیں ہے۔" وہ کانٹے کی نوک پر کھڑی تھی اس رات۔ اور کچھ سجھائی نہ دیا تو رائٹنگ پیڈ اور قلم لے کر باہر نکل آئی۔

"ابا بہت غصے میں آئیں گے' آتے ہی گلا دبا دیں گے۔ میری بات سننے کا حوصلہ کہاں ہو گا ان میں۔" اسے اپنے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔

"خط لکھتی ہوں۔ سب بتا دوں گی انہیں۔ خود سامنے نہیں آؤں گی۔"

وہ ڈری سہمی سرونٹ کوارٹر کی سیڑھیوں پر آ بیٹھی تھی۔ بلب کے عین نیچے۔ جہاں پتنگے جل جل مرتے اور اس پہ برس رہے تھے۔

اس نے قلم کی نوک کاغذ پر رکھی۔ مگر ان سے بے

سلیقہ، بے طریقہ لوگوں کو قلم سنبھالنے کا ہنر بھی کہاں آتا ہے۔؟

"کہاں سے شروع کروں۔ کیا لکھوں۔؟ کیسے کہوں۔؟" وہ تھک کر رو دی تھی۔

کتنے صفحے پھاڑ دیئے۔

ایک سے زیادہ جملہ لکھا ہی نہ گیا۔

"ابا میں ایسی نہیں۔ جیسی آپ نے سمجھا، جیسی عنایا خاتون نے سمجھا، میں بالکل بھی ویسی نہیں ہوں۔" وہ جو سوچتی تھی، آنکھوں کے راستے بہہ نکلتا تھا، پھر کاغذ پہ کیا ٹھہرتا۔ اس نے کاغذ، قلم سب پھینک دیا۔

چھپنے کے لیے اسٹور روم سے بہتر جگہ اور کوئی نہ لگی تھی۔

"ابا واپس چلے جائیں گے۔ تب باہر نکلوں گی۔" اپنی دانست میں بہت سمجھداری کا فیصلہ کیا تھا۔

اور پھر وہ رات اسٹور روم میں گزری۔

اس قدر بھیانک رات۔ جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

اس رات اسٹور روم کے باہر اماں تھیں۔ منیبہ کفن اوڑھے۔ ان سے پرے خاور تھا، سرخ آنکھوں کے ساتھ، ابا تھے جن کی آنکھوں کا تاثر بارش میں بھیگی کٹیلی ہوا سے زیادہ سرد تھا۔ اسٹور روم کے دروازے پر چمکتی دو آنکھیں تھیں۔ جو اسے بے طرح گھور رہی تھیں۔ کیا تھا وہ۔؟ کوئی خونخوار بلی۔ کوئی کتا۔ اسے اپنی نبض ڈوبتی ہوئی خود بھی محسوس ہوئی تھیں۔ اور جب اس نے اسپتال کے اس کمرے میں آنکھیں کھولیں۔ تو منظر بدل چکا تھا۔ ابا اس کا ہاتھ تھامے ہچکیوں سے رو رہے تھے، وہ ٹکر ٹکر انہیں دیکھے گئی۔

"اعتبار مٹی یا ریت کا گھروندا ہوتا تو جتنی بار بھی گرتا، میں روز تعمیر کر لیتی۔ پر اعتبار تو کانچ کا کھلونا نکلا۔ اسے دوبارہ جوڑنے میں میری تو انگلیاں فگار ہو گئیں ابا۔!"

وہ ابا کے سامنے یوں پہلی بار پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔

عنایا خاتون سر جھکائے کھڑی تھیں اور ریان جہانگیر کے چہرے پہ جو تفکرات کے بادل تھے ان میں سے قطرہ قطرہ برستا دکھ صرف اور صرف ثانیہ سلمان کے لیے تھا۔

✡ ✡ ✡

"یہ لڑکی بہت کمزور اور معصوم ہے، زندگی کے پرخار راستوں میں اسے ساتھ لے کر چلنا ہوگا، ورنہ پتا نہیں کب اور کہاں کانٹوں میں دامن الجھا لے۔"

وہ دھوپ میں پاؤں پسارے بیٹھا تھا یوں جیسے بہت فرصت میں ہو۔ اس نے ثانیہ سلمان کو گھر سے نکلتے اور پھر گاڑی میں بیٹھتے دیکھ کر سوچا تھا۔

"بہت مضبوط لوگ اگر کمزور لوگوں کا ہاتھ تھام لیں تو زندگی میں توازن آجاتا ہے۔ اور یہ زندگی تو بچائی ہی میں نے ہے، سو میری ہی امانت ہے۔" وہ کھل کر مسکرایا تھا۔

بادل چھٹ گئے تھے۔ بہار کا ہر رنگ دھوپ میں پہلے سے زیادہ گہرا اور چمکدار تھا۔ وہ گنگناتے ہوئے اٹھ گیا۔ اسے یہ سارے رنگ چرانے تھے۔ اس لڑکی کے لیے جس کی زندگی سے ریان جہانگیر کی ساری خوشیاں جڑی تھیں۔ اور جس کے پرخار شب و روز پہ بہار آنے کو تھی۔

"صد شکر کہ اللہ تعالیٰ نے تقدیر لکھنے کا کام کسی انسان کے سپرد نہیں کیا۔" اس نے عنایا خاتون کے کمرے کی کھڑکی کو بند ہوتے دیکھ کر سوچا اور پھر سیٹی بجاتا اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

"صائمہ...! جلدی سے ناشتا لگادو' دیر ہو رہی ہے۔" دائم نے آواز لگائی۔ ٹیبل پر دونوں بچے بلال اور حسین بھی اسکول جانے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔

"جی ابھی لائی' ناشتا تیار ہے۔" صائمہ نے جلدی جلدی ناشتا لگایا۔ بچوں کو ناشتہ کروا کر اسکول روانہ کیا اور میاں کو دفتر۔ پھر آرام سے اپنی چائے کا کپ لے کر صوفے پر آ بیٹھی اور ٹی وی آن کرلیا۔ اس کا چھوٹا سا پر سکون گھرانا تھا۔ میاں کی تنخواہ بہت زیادہ نہیں تو کم بھی نہ تھی' پھر صائمہ بھی بہت قناعت پسند تھی۔ بے جا فرمائشیں اور فضول خرچیاں اس کا شیوہ نہ تھا۔ زندگی پرسکون انداز میں رواں دواں تھی۔

"ٹن ٹون... ٹن ٹون۔" دروازے پر گھنٹی بجی۔

صائمہ نے دروازہ کھولا تو ایک نیا چہرہ سامنے آیا۔

"السلام علیکم! میرا نام عظمٰی ہے اور میں آپ کے ساتھ والے گھر میں دو دن پہلے شفٹ ہوئی ہوں۔"

"وعلیکم السلام! اندر آیئے۔" صائمہ نے خوش اخلاقی سے کہا۔ پھر عظمٰی کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اس کے لیے چائے بنانے چل دی۔

یہ نئے کرایہ دار تھے۔ ان کے ساتھ والا گھر کافی عرصے سے خالی پڑا تھا۔

عظمٰی سے گپ شپ کے دوران پتا چلا کہ اس کے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ اور میاں ملازمت پیشہ۔ وہی تقریباً "مڈل کلاس طبقہ ہی تھا۔ چائے پی کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ان شاء اللہ پھر ملاقات ہوتی رہے گی۔ آج کی ملاقات تعارفی تھی۔ کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو بلا جھجک بتایے گا۔" صائمہ نے پرخلوص انداز میں کہا۔

"جی ضرور! بہت شکریہ' اللہ حافظ۔"

وقت دیکھا تو کافی گزر چکا تھا۔ صائمہ بھی جلد از جلد کام نپٹانے لگی کہ عظمٰی سے گپ شپ میں کافی دیر ہو چکی تھی۔ کھانا پکانا' صفائی' کپڑے سب کچھ ہی رہتا تھا۔ بچے تو جلدی آجاتے تھے لیکن دائم شام پانچ بجے تک آتے تھے۔

"دائم! آپ کو پتا ہے ہمارے نئے پڑوسی آئے ہیں۔ آج وہ مجھ سے ملنے بھی آئی تھیں۔ بہت فرینڈلی سی طبیعت ہے ان کی۔ کافی دیر گپ شپ رہی۔" شام کی چائے پر اس نے اپنے شوہر کو مطلع کیا۔

"چلو اچھا ہے' تمہاری بھی کمپنی رہے گی' ویسے بھی ہماری بیگم صاحبہ دن میں اکیلی اداس ہو جاتی ہیں۔" دائم نے چھیڑا۔

"چھوڑیں نا آپ تو ہر بات مذاق میں لے لیتے ہیں۔" بلال اور حسین بھی لڑتے جھگڑتے پاس آ بیٹھے یوں خوش گوار ماحول میں چائے پی گئی۔

☼ ☼ ☼

"ہیلو! کیا ہو رہا ہے۔" یہ عظمٰی تھی۔

"بس یار! کھانا بنا رہی تھی... آؤ۔" صائمہ نے دعوت دی۔

"تم کھانا بناؤ۔ میں کچن میں ہی آجاتی ہوں۔" عظمٰی بولی۔

"آج کیا بنا رہی ہو؟"

"ماش کی دال بنا رہی ہوں۔"

"ماش کی دال! ارے ہمارے گھر میں ماش کی دال کوئی بھی نہیں کھاتا۔ میرے میاں اور بچے تو بس چکن، مٹن ہی کھانے کے شوقین ہیں۔ اگر کوئی سبزی بناؤں تو اس میں بھی چکن یا مٹن ڈال کر ہی بناتی ہوں۔" عظمیٰ نے تفصیل سے بتایا۔

"ہم تو ہر چیز کھاتے ہیں۔ سبزی، دال، گوشت سب باری باری ہفتہ بھر بنتے ہیں۔ ویسے بھی کسی بھی چیز کی زیادتی یا کمی صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔" صائمہ نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ "ویسے بھی آج کل کی مہنگائی کے دور میں مٹن یا چکن ہر روز کون افورڈ کر سکتا ہے۔" اس نے دل میں سوچا۔

"اچھا یار! چائے تو پلاؤ۔ قسم سے سر دکھ رہا ہے میرا۔" عظمیٰ بے تکلفی سے بولی۔

"ہاں۔ ہاں۔ کیوں نہیں۔ بس چائے رکھنے ہی والی تھی۔"

"پتا ہے کل میں شاپنگ پر گئی تھی۔ نئی مارکیٹس

دیکھیں۔ اپنے اور بچوں کے کپڑے لیے۔ میرے میاں تو کہتے ہیں 'بس ہر وقت تم تیار ہو کر رہا کرو' چاہے کپڑوں پر کتنا ہی خرچ کر لوں۔ کبھی ٹوکا نہیں۔ شادی کو دس سال ہونے کو آئے ہیں، لیکن ابھی بھی میرے دیوانے ہیں۔

"تم نے گرمیوں کی شاپنگ کر لی؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں عظمیٰ! میرے کپڑے کچھ پڑے ہیں۔ پچھلے سال والے۔ ابھی سیل کا انتظار کر رہی تھی۔ ذرا مناسب مل جاتے ہیں۔ اگر ایک کی جگہ دو مل جائیں تو کیا برائی ہے۔"

"کہاں یار! سارے فریش ڈیزائن تو نکل جاتے ہیں سیل تک۔ بندہ کپڑا پہنے تو پتا تو چلے کہ کچھ پہنا ہے۔"

عظمیٰ کی بات صائمہ خاموشی سے سنتی رہی۔

"میرا خیال ہے آج میں بھی تھوڑی سی دال چکھ ہی لوں، عرصہ ہی ہوا کھائے ہوئے۔" عظمیٰ نے جاتے ہوئے خواہش ظاہر کی۔

"ہاں ٹھہرو... میں نکال دیتی ہوں۔" صائمہ نے جواب دیا۔

عظمیٰ کے جانے کے بعد صائمہ کام میں لگ گئی، لیکن لاشعوری طور پر اس کی باتیں سوچے گئی۔ آج کل کی مہنگائی میں اس قدر عیاشیاں کہاں ممکن ہیں۔ اگر میں اس طرح سے چلوں تو سارا بجٹ گڑبڑ ہو جائے۔ چلو ہر کسی کے اپنے حالات ہیں، مجھے کیا۔

صائمہ بہت سادہ طبیعت تھی۔ گھر منظم طریقے سے چلا رہی تھی۔ وہ کوشش کرتی کہ دائم کی محدود تنخواہ میں گھر کی تمام ضروریات بقدر احسن پوری ہو سکیں۔ کھانے پینے کا مینیو اس طرح ترتیب دیا ہوا تھا کہ سبزی، دال، گوشت، چاول ہر چیز باری باری بن جائے۔ گھر کی ڈیکوریشن بھی اچھی تھی۔ باری باری ایک ایک چیز خرید کر گھر کو خوب صورتی سے سیٹ کیا ہوا تھا۔ کپڑے، جوتے بھی تھوڑا سا صبر کر کے موسم کے شروع نہیں بلکہ آخر میں لے لیتی، تاکہ سب کے کپڑے آ جائیں اور اگلا موسم آنے پر وہ نکال کر پہن لیتے، پھر تھوڑا سا صبر کر لیا۔ اس طرح کبھی بھی وہ لوگ مقروض نہ ہوئے تھے، بلکہ چھوٹی چھوٹی سی بچتیں اور سمجھ داری سے ایک بڑی چیز خرید لیتے یا بچت کی مد میں ڈال دیتے، سو زندگی کی گاڑی بطریق احسن چل رہی تھی، لیکن عظمیٰ کی باتیں اس پرسکون جھیل میں ایک پتھر ثابت ہوئیں۔

٭ ٭ ٭

"صائمہ... صائمہ!" عظمیٰ حسب معمول گیارہ بجے دن میں چلی آئی۔ اب اس وقت اس کا آنا معمول بن چکا تھا۔ گپ شپ ہوتی، دونوں چائے پیتیں، پھر وہ گھر جاتی۔

شروع میں صائمہ کو اس کی باتیں تھوڑی ناگوار بھی گزریں، لیکن اب شاید عادت ہی پڑ گئی تھی، پھر عظمیٰ بھی بلا جھجک ہر روز ہی چلی آتی۔ صائمہ کو اب تک اس کے گھر جانے کا موقع نہ ملا تھا۔ کسی دن وہ غیر حاضر ہوتی تو شاید وہ چکر بھی لگاتی۔ اس کا آنا تو روز کا معمول تھا۔ پھر صائمہ خود بھی کہیں آنے جانے کی چور تھی۔ گھر سے نکلے تو دس کام رہ جاتے تو وہ نکلتی نہ تھی۔

گپ شپ کے بعد جب وہ جانے لگی تو بولی۔

"ہاں یار! یاد آیا مجھے ذرا بلینڈر چاہیے تھا۔ شام کو ملک شیک بنانا ہوتا ہے۔ ویسے تو میرے پاس دبئی کا بلینڈر تھا، لیکن بچوں نے توڑ دیا۔"

صائمہ نے بلینڈر نکال کر دے دیا تو عظمیٰ بولی۔

"اچھا یہ ہے تمہارے پاس۔ یہ تو عام سا ہے۔ میرا بہت جدید قسم کا تھا، مگر..."

صائمہ اس کی بات سن کر خفیف سی ہو گئی۔

بعض اوقات عظمیٰ کے جتانے والے انداز پر اسے غصہ بھی آ جاتا، پھر وہ سوچتی کہ شاید وہ ویسے ہی اس سے اپنی چیزوں کا تبصرہ کرتی ہے۔ اس کا مقصد جتانا ہرگز نہیں ہوتا۔

اب اس کا بلینڈر ہر وقت عظمیٰ کے گھر ہی رہتا تھا۔

زندگی اسی طرح رواں دواں تھی، لیکن صائمہ کا انداز فکر تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ وہ صائمہ جس نے کبھی

اپنی زندگی سے شکوہ نہ کیا تھا۔ عظمیٰ کی باتوں نے اسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ لوگ کتنی عیش کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ حالانکہ صائمہ کے حالات تنگ کبھی نہ رہے تھے۔ دائم حسب طاقت گھر اور بچوں کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا تھا اور صائمہ سمجھ داری سے اپنے گھر کا خرچ چلا رہی تھی۔ مہنگائی کے اس دور میں یہ کہاں ممکن تھا کہ کھلم کھلا پیسہ اڑایا جائے۔

☼ ☼ ☼

صائمہ شام کی چائے پی رہی تھی۔ دائم کے ساتھ کہ پھر عظمیٰ چلی آئی۔

"السلام علیکم بھائی!"

"وعلیکم السلام! کیسی ہیں آپ؟" دائم نے سرسری سا حال پوچھا۔

عموماً اس وقت عظمیٰ آتی نہیں تھی۔ صائمہ کو حیرت ہوئی۔ دائم اٹھ کر باہر چلا گیا تو۔ عظمیٰ نے حسب عادت اپنا مدعا بیان کیا، جس میں بدتمیزی کا عنصر نمایاں تھا۔

"صائمہ! تمہارے پاس پرپل کلر کا جوتا ہوگا۔ دراصل یار! آج میرے بڑے بیٹے کی سالگرہ ہے اور بچے کے ایف سی جانے کی ضد کر رہے ہیں اور میاں صاحب کی فرمائش ہے کہ میں پرپل کلر کی ساڑھی پہنوں تو میرے پاس میچنگ جوتا نہیں تھا۔ سوچا تم سے پتا کرلوں۔"

صائمہ کے پاس جوتا موجود تھا۔ اس نے نکال کر دے دیا۔ عظمیٰ نے الٹ پلٹ کر دیکھا اور بولی۔

"ارے یہ تو شاید تم نے سیل سے لیا ہے۔ دو سال پرانا ڈیزائن ہے اور ہے بھی بہت معمولی سا، لیکن چلو مجبوری ہے تو یہ ہی پہن لیتی ہوں۔" اس نے احسان جتاتے ہوئے کہا۔ صائمہ حسب معمول چپ سی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼
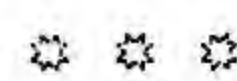
"دائم! مجھے کچھ کپڑے خریدنے ہیں۔" صائمہ نے دائم سے کہا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ کیوں نہیں۔ کسی وقت چلیں گے مارکیٹ اور لے لینا اپنی پسند کے۔"

دائم نے جواب دیا۔ صائمہ نے سوچا اس دفعہ جی بھر کے شاپنگ کروں گی۔ ساری بچت اور سمجھ داری کا ٹھیکہ میں نے ہی لے رکھا ہے۔

پھر اتوار کے دن دائم اور بچوں کے ساتھ مارکیٹ روانہ ہوئی۔ اس دفعہ صائمہ نے خوب مہنگے کپڑوں پر ہاتھ رکھا اور دائم نے خاموشی سے قیمت چکا دی۔ تین جوڑے خرید کر دو جوتے بھی لے لیے۔ دائم نے ہنسی خوشی شاپنگ کرا دی کہ صائمہ نے کبھی بھی بے جا فرمائشیں نہ کی تھیں، لیکن خرچا تھوڑا زیادہ ہو گیا تھا۔

آج صائمہ خوش تھی کہ ابھی عظمیٰ آئے گی تو وہ بھی اسے اپنی شاپنگ دکھائے گی، تاکہ وہ یہ تو نہ سمجھے کہ مجھے کچھ پتا نہیں ہے۔

عظمیٰ آئی تو صائمہ نے خوشی خوشی اپنی شاپنگ کا بتایا اور کپڑے لینے چلی گئی کہ اس کو دکھا سکے۔

"یہ دیکھو میں نے تین جوڑے خریدے ہیں، دائم نے بلا اعتراض مجھے جی بھر کے شاپنگ کروائی۔ یہ دیکھو یہ گرین رنگ کا سوٹ کتنا خوب صورت ہے۔ یہ پرپل اور یہ میرون۔" صائمہ سوٹ اسے دکھانے لگی وہ سرسری انداز میں دیکھ کر بولی۔

"صائمہ! تم برانڈڈ کپڑے نہیں لیتیں؟ ان کے تو ایک دو دھلائی میں ہی رنگ پھیکے پڑ جائیں گے۔ دیکھو میں نے یہ گل احمد سے لیا ہے۔ چار ہزار کا سوٹ ہے۔ دس دفعہ دھل چکا ہے، لیکن ابھی تک نئے کا نیا ہے۔" صائمہ کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور ساری خوشی ہوا ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

آج کل وہ بہت اداس اور غمگین رہنے لگی تھی۔ لاشعوری طور پر اس کے دماغ میں ہر وقت عظمیٰ کی باتیں گونجتی رہتیں۔ پھر اپنے اور اس کے حالات کا موازنہ کرتے ہوئے اسے عظمیٰ پر رشک سا آجاتا۔ پھر عظمیٰ کی ایک اور بات یاد آئی کہ اس کے میاں نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ اگلے ماہ اسے سونے کے کڑے بنوا

کروں گی۔

"میری شادی کو تیرہ سال ہونے کو آئے ہیں' لیکن میرے میاں نے تو آج تک ایک چھوٹا سا چھلا بھی بنوا کر نہ دیا۔" صائمہ نے سوچا۔

"نہ جانے عظمیٰ کا میاں کہاں سے لاتا ہے اتنا پیسہ۔ یا شاید دل کی بات ہے' جو وہ اتنا سخی ہے۔" اسی اداسی اور غم کی کیفیت میں اس نے دائم سے بھی کوئی بات نہ کی۔ اسے یہ لگنے لگا تھا کہ دائم کو اس سے کوئی محبت نہیں ہے' جبھی اس نے کبھی عظمیٰ کے میاں کی طرح اس کا خیال نہیں کیا تھا۔

صائمہ گھر کے کام کاج میں مصروف تھی۔ پھر دوپہر میں اب عظمیٰ سے گپ شپ کرنا بھی اس کا معمول بن چکا تھا۔ سو جلدی جلدی کام نپٹا رہی تھی۔ لیکن آج خلاف توقع دن کا ایک بج گیا' لیکن عظمیٰ غائب۔

"کہیں بیمار نہ ہو۔ ایسا تو ہو نہیں سکتا تھا کہ اس کا چکر' بلکہ کبھی کبھی تو دو سے تین چکر اس کے گھر کے نہ لگے ہوں۔ چلو آج میں ہی عظمیٰ کی طرف چلتی ہوں۔ اسی بہانے اس کے گھر کی سجاوٹ بھی دیکھ لوں گی۔ شاید اس کے میاں کی تنخواہ بہت زیادہ تھی کہ وہ ہر وقت شاپنگ میں مصروف رہتی تھی۔ اس کی طرف صائمہ کا چکر اول تو لگ ہی نہ سکا کہ عظمیٰ نے کبھی موقع ہی نہ دیا' ہر وقت وہ ہی آن موجود ہوتی' ایک آدھ دفعہ وہ گئی بھی تو اس نے باہر سے ہی بھگتا دیا۔

صائمہ نے دروازے پر دستک دینے کے لیے ہاتھ رکھا تو دروازہ کھل گیا۔ سو وہ آہستہ آہستہ اندر کی طرف چل دی۔ ایک آدھ دفعہ آواز بھی دی۔

"عظمیٰ کہاں ہو؟" لیکن جواب ندارد۔ ابھی وہ واپسی کا ارادہ کر ہی رہی تھی کہ اندر سے آتی آوازوں نے اس کے قدم روک لیے۔

"تم ہو ہی اس قدر بے وقوف اور جاہل عورت۔" شاید یہ عظمیٰ کا شوہر تھا۔

"نہ جانے تمہیں کون سا احساس کمتری ہے۔ نہ تمہیں گھر کی فکر ہے' نہ بچوں کی۔ ہر وقت ادھر ادھر گھومنا یا پھر شاپنگ۔ کنگال کر دیا ہے تم نے مجھے۔ قرض لے لے کر پاگل ہو گیا ہوں میں۔ اب تو ہر ایک سے نظریں جھکا کر ملتا ہوں کہ کہیں وہ قرض واپس نہ مانگ لے۔ نہ جانے کب فرمائشیں ختم ہوں گی تمہاری۔"

"ہاں تو کیا غضب کر دیا تم نے۔ تم ہو ہی کنگلے آدمی ساری زندگی میں ترس ترس کر نہیں گزار سکتی۔ قرضہ لو چاہے' بھیک مانگو میں تو اسی طرح ہی رہوں گی' میں کیوں اپنی خواہشات کا گلا گھونٹوں۔" عظمیٰ نے جاہلانہ انداز میں چیختے ہوئے کہا۔

"تنگ آگیا ہوں میں تمہاری ان حرکتوں سے۔ تمہیں دنیا دکھاوے کا شوق ہے کہ لوگ تمہیں امیر اور خوش حال سمجھیں اور اس جھوٹے فخر کی خاطر تمہیں اپنے گھر کے سکون کا بھی ذرا خیال نہیں ہے' لیکن اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ تم اگر نہ سدھریں تو میں تمہیں طلاق دے دوں گا' پھر کرنا اپنے شوق پورے۔"

صائمہ کا تو جیسے "کاٹو تو بدن میں لہو نہیں" والی حالت تھی۔ جس طرح اپنے میاں کے محبت بھرے قصے عظمیٰ اس سے بیان کرتی تھی اور جس طرح اپنی ہر چیز کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا اس کی عادت تھی۔ یہ سب کچھ تو اس سے بالکل مختلف تھا اور وہ جو عظمیٰ کی باتوں میں آکر اپنے گھر کا سکون برباد کرنے چلی تھی۔ ان باتوں نے اس کی آنکھیں کھول دیں۔ کیا یہ تھی اس کی حقیقت۔ صائمہ جلدی سے گھر کی طرف چل دی۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ عظمیٰ کا پردہ فاش ہو گیا تھا' لیکن ساتھ ہی اسے خود پر بھی افسوس ہو رہا تھا کہ اللہ نے اسے بھی عقل و شعور سے نوازا تھا۔ کیا اس کو اتنی جلدی دوسروں کی باتوں میں آنا چاہیے تھا؟ یہ تو اللہ کا کرم تھا کہ جلد اسے حقیقت کا علم ہو گیا' ورنہ شاید آج عظمیٰ اور اس کے شوہر کی لڑائی کا منظر کل اس کے اپنے گھر میں چل رہا ہوتا۔

"یا اللہ تو مجھے معاف کر اور میرے گھر کے سکون و اطمینان کو سلامت رکھ (آمین) اور مجھے ناشکری سے بچا۔"

اب آگے راستہ شفاف اور سیدھا تھا۔

☆

گھر کے اندر گھستے ہی جانی پہچانی آوازوں نے اس کا استقبال کیا تھا۔

"لو جی اب کر لو ایگزام کی تیاری۔" اپنے چہرے پہ مصنوعی خوش اخلاقی کا بورڈ سجا کر اس نے مہمانوں سے سلام دعا کی اور کمرے میں چلی گئی یونی فارم تبدیل کر کے فریش ہو کر وہ سیدھی کچن میں آئی' جہاں فریحہ آپا کھانا نہیں بلکہ کھانے پکانے میں معروف تھیں۔

"مبارک ہو آپا! مہمان پھر آگئے' کم سے کم ایک ماہ کے لیے۔" شیبا نے دیگچیوں کے ڈھکن اٹھا اٹھا کر چیک کرنا شروع کر دیے۔

"بہت مذاق سوجھ رہا ہے تمہیں' کچھ کرنا جو نہیں پڑتا۔ دو چار دن بھی مہمان داریاں بھگتانی پڑ گئیں نا تو

مکمل ناول

ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔" فریحہ آپا کا موڈ خراب تھا۔ گھر کے باقی لوگوں کی طرح۔

"مہمان داری اور میں؟ مجھے تو معاف ہی رکھیں۔" شیبا نے ان کے آگے ہاتھ جوڑے۔

"میں اپنے لیے نوڈلز بنالوں، بہت ہے۔"

"اللہ جانے کتنے دنوں بلکہ ہفتوں کے لیے آئے ہیں؟" فریحہ آپا تشویش سے بڑبڑائیں۔

"ویسے یہ لوگ بھی خوب ہیں ہم تو اتنی جلدی جلدی اپنے سگے رشتے داروں کے گھر ایک ہی شہر میں نہیں جاپاتے اور یہ لوگ پاکستان کے ایک کونے سے دوسرے کونے یعنی شہر کراچی میں تشریف لے آتے ہیں، بڑے فارغ لوگ ہیں بھئی۔" شیبا نے سلاد میں سے کھیرے کا ٹکڑا اٹھا کر منہ میں رکھا۔

"ہاں تو انہیں کرنا ہی کیا ہے آخر، نہ تعلیم کا جھنجھٹ نہ نوکریوں کی فکر، فرصت ہی فرصت ہے جس دن مزدوری کرلی اس دن کی روزی کمائی اور کھائی باقی اللہ اللہ خیر صلا، جب دل چاہا گٹھڑی باندھی ٹرین کا ٹکٹ کٹایا اور یہاں پہنچ گئے، دونوں طرف کے کرائے سمیت سفر کے سارے اخراجات تو ابو دے ہی دیتے ہیں، واپسی پر تحفے تحائف الگ، ایسی پکنک بھلا کس کو بری لگے گی۔"

فریحہ آپا نے اپنی بھڑاس نکالی، وہ بے چاری بھی بھلا

کیا کرتیں دو چار دن بلکہ ہفتے بھر کے مہمان کو بھی خوش اسلوبی سے نمٹا دیتیں 'اتنی بد اخلاق اور کام چور تو نہیں تھیں 'مگر یہ انوکھے مہمان مہینے ڈیڑھ مہینے سے پہلے ٹلنے والے ہی نہیں تھے۔ شیبا اور اریبہ ویسے تو اکثر کالج کا ناغہ کر لیتیں 'مگر مہمانوں کے قیام کے دوران دونوں پابندی سے کالج جاتیں 'کوئی چھٹی 'کوئی ناغہ نہیں 'بلکہ اریبہ کا تو بس نہیں چلتا تھا 'اتوار کے دن بھی کالج چلی جاتی اور گیٹ کے باہر آدھا دن گزار کر واپس آجاتی 'کیونکہ اتوار کو دن بھر کے برتن دھونا اس کی ذمہ داری تھی اور عام دنوں میں برتن دھونا اس کے لیے جوئے شیر لانے کے مترادف تھا تو اب تو برتنوں کا ایک جم غفیر اس کا منتظر ہوتا تھا 'مگر اتوار کے برتنوں کے علاوہ ہفتہ بھر بہت کام ہوتے تھے۔

فریحہ آپا کی ہی شامت آئی تھی 'ناشتے سے فارغ ہوتیں تو دوپہر کی فکر 'اور دوپہر کے کھانے پکانے سے برتن دھونے سے فارغ ہوتیں تو رات کے کھانے کی فکر 'وہ سارا دن گھن چکر بنی رہتیں 'حالانکہ امینہ پھپھو اپنے جن پانچ بچوں کے ساتھ آئی تھیں 'ان میں دو بدو لڑکیاں بھی تھیں 'سمعیہ چھوٹی تھی دس سال کی اور تسمیہ بھی کوئی پندرہ سولہ سال کی 'امینہ پھپھو نے بھی کہا اور خود تسمیہ نے بھی کہ برتن دھونے کی ذمہ داری اسے دے دی جائے 'مگر برا ہو فریحہ آپا کے مزاج اور طبیعت کا 'کچھ انوکھا ہی تھا۔ ویسے تو وہ بہت ملنسار اور خوش اخلاق قسم کی آپا تھیں 'مگر کچن جو ان کی راجدھانی تھا جسے بڑی محبت اور محنت سے انہوں نے سجایا سنوارا تھا۔

اس سلطنت میں دوسرے کے عمل دخل پر وہ تب ہی مطمئن ہوتیں جب کام ان کی مرضی کے عین مطابق ہو 'ورنہ تھک کر چور ہو جاتیں 'مگر اکیلے ہی کام میں لگی رہتیں۔ امینہ پھپھو اور تسمیہ کے اصرار پر انہوں نے بدقت دھلوا تو لیے 'مگر پھر دھلے ہوئے برتنوں کو دوبارہ خود دھویا اور تسمیہ کو نرمی سے منع کر دیا۔

گھر والے صاف صاف تو نہیں کہتے تھے مگر سمجھتے تھے کہ معاملہ صفائی ستھرائی کے اعلا معیار سے بڑھ کر ایک نفسیاتی معاملہ بن گیا ہے 'اور دبے دبے لفظوں میں انہیں ٹوکنے پر ہی اکتفا کیا گیا تھا۔ خیر خود محترمہ کو بھی اس بات کا احساس تھا اور اپنے تئیں اپنی اس عادت پر قابو پانے کی کوشش کرتی تو تھیں 'مگر فی الحال ناکامی کا منہ ہی دیکھنا پڑ رہا تھا۔

اچھا تو مہمان آگئے اور قیام پذیر ہو گئے 'ابو کی وجہ سے سب کو خوش اخلاقی کا جبری اور جھوٹا مظاہرہ کرنا پڑ رہا تھا۔ ابو جان کی یہ واحد کزن تھیں 'ان کی اکلوتی خالہ کی اکلوتی بیٹی 'باقی رشتے دار کچھ اللہ کو پیارے ہو گئے کچھ دنیا اور دنیاداری کو 'ایسے پیارے ہوئے کہ دوسرے پیارے رشتے داروں کو بھول ہی گئے۔ سگے بھائی اور ایک بہن ملک سے باہر تھے 'سو جب امینہ پھپھو بے انتہا محبت اور رگاوٹ کا مظاہرہ کرکے اتنی دور سے اتنا لمبا سفر کرکے آتیں تو ابو کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ ہوتا 'وہ سیدھے سادے پر خلوص سے بندے تھے 'رشتوں اور رشتے داروں سے محبت کرنے والے 'ان کی قدر کرنے والے 'عزت و اکرام کرنے والے 'بیوی اور بچے ذرا اور دماغوں کے تھے 'اپنے معیار سے کم اگر کوئی ہوتا تو توجہ کے قابل نہ گردانتے 'چاہے سگے رشتے دار ہی کیوں نہ ہوں۔

تو پھر بس جتنا عرصہ امینہ پھپھو اینڈ فیملی یہاں رہی 'ان سب کی باتوں اور مذاق کا نشانہ بنتی رہی 'ان کے سامنے نہیں بلکہ پیچھے 'ان کا اٹھنا بیٹھنا کھانا پینا 'پہننا اوڑھنا بول چال سبھی کچھ قابل تنقید تھا۔

☼ ☼ ☼

معمول کے مطابق واثق شام کے وقت وارد ہو گیا۔ ہفتے میں دو تین چکر تو اس کے لازما" لگتے تھے 'بڑے ماموں کا سب سے چھوٹا بیٹا 'ایم بی اے مکمل کرکے حال ہی میں جاب پر لگا تھا۔ پہلی تنخواہ پر مٹھائی کے ڈبے کے ساتھ آیا تھا۔ گھر والے سب پتا نہیں کہاں کہاں تھے 'اسے سامنے کچن میں شیبا کھڑی نظر آئی وہیں پہنچ گیا 'ویسے آج کل شیبا اسے کچھ زیادہ ہی نظر

آنے لگی تھی یعنی اس وقت بھی جب وہ سامنے نہیں بھی ہوتی تھی، بند آنکھوں میں، کھلی آنکھوں میں ایک ہی سراپا لہرانے لگا تھا آج کل، واثق میاں حیران پریشان کم تھے اور خوش زیادہ۔

"یہ لو۔" بڑے فخریہ انداز میں مٹھائی کا ڈبا شیبا کی طرف بڑھایا۔

"خیریت؟ کس خوشی میں اتنا خرچا کرلیا؟" شیبا نے بھنویں اچکائیں۔

"میرا رشتہ طے ہو گیا ہے۔" واثق نے اس کے چہرے پہ کچھ کھوجنے کی کوشش کی۔

"واقعی؟ کس کی قسمت پھوٹی؟" شیبا نے مٹھائی کا ڈبا کھول کر جائزہ لیا۔

"میرے جیسے لڑکے کا ساتھ نصیب والوں کو ملتا ہے بد تمیز لڑکی۔" واثق نے گلا کھنکھار کر کالر کھڑا کیا۔

"اس نصیب سے پہلے بد لگا ہوا ہو گا۔" شیبا نے مکس مٹھائی میں سے گلاب جامن منتخب کر کے اٹھائی۔

"بد نہیں، خوش نصیب۔" واثق نے اس کی تصحیح کی "اور بائی دا وے اس ڈبے کو آدھا کرنے سے پہلے پھپھو جان تک پہنچا دینا۔" واثق کو خوب معلوم تھا کہ وہ مٹھائی کی کتنی شوقین تھی، کچھ بعید نہ تھا یونہی کھڑے کھڑے باتیں کرتے وہ آدھا تو کیا پورا ڈبہ ختم کر جاتی۔

"کنجوس، مکھی چوس، کم سے کم دو چار پانچ کلو مٹھائی تو لاتے، یہ تو میں یونہی چکھنے چکھنے میں ہی کھا لوں گی۔"

"فکر نہ کرو، پانچ کلو تو کیا میں من دو من مٹھائی لانے کو تیار ہوں اگر تم کہو تو۔" واثق نے اس کی بات پکڑ لی اور اپنے دل کی بات جھٹ بیان کر دی۔

"منہ دھو رکھو، نہ مجھے مٹھائی کی دکان کھولنی ہے نہ ہی من دو من مٹھائی کھا کر بارہ من کی دھوبن بننا ہے۔" شیبا نے سنک میں ہاتھ دھوتے ہوئے تجاہل عارفانہ اختیار کیا۔

اف اس کی قاتلانہ بے نیازی، واثق کے دل پر چھریاں سی چل گئیں، یہی ادا تو تھی اس کی جو دل سینے کا پنجرہ توڑ کر نکل بھاگا تھا۔

"ویسے سب ہیں کہاں؟ نہ کوئی نظر آرہا ہے نہ کوئی آواز؟" واثق نے شرافت کے جامے میں واپس آکر بڑی حلاوت سے پوچھا۔

"امی اور فریحہ آپا اوپر ہیں اریبہ کوچنگ میں۔ ابو نماز پڑھنے گئے ہیں اور بھائی لوگ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ رات میں ہی گھر میں گھستے ہیں۔"

"اور وہ مہمان چلے گئے کیا؟"

"کیوں؟ ہمارے مہمانوں سے تمہیں کیا؟" شیبا تیکھی نظریں اس پر ڈال کر سبز مرچ بن گئی۔

"ویسے ہی پوچھ رہا ہوں۔" واثق بھی اپنے نام کا ایک ہی تھا، اس تیکھے پن سے نہ خائف ہوا نہ مرعوب۔

"ایک ہی پیس تو ڈھنگ کا ہے ان میں۔" واثق کا اشارہ تسمیہ کی طرف تھا۔ وہ ٹھیک ٹھاک خوب صورت قسم کی لڑکی اپنے گھر والوں سے واقعی کچھ الگ ہی نظر آتی تھی۔

"اپنی نظریں اور زبان قابو میں رکھو۔" شیبا اس کا اشارہ سمجھ کر غرائی۔

"بس یہی چاہتا تھا میں۔" واثق نے اطمینان سے بولتے ہوئے مٹھائی کا ڈبا واپس اٹھایا اور سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔

"بدتمیز!" شیبا نے اس ناہنجار کو فقط ایک ہی لقب دینے پر اکتفا کیا۔

کچھ دیر بعد چائے لے کر اوپر پہنچی تو حسب توقع امی جان اپنے پیارے بھتیجے کو امینہ پھپھو کی باتیں ہی بتا رہی تھیں، داستان طولانی تھی مگر انہوں نے خاصے اختصار سے کام لیا تھا۔

"اب بھلا بتاؤ، آئے دن ہم سے فرمائشیں کرتی رہتی ہے "آج فلاں رشتے دار کے گھر چلیں" آج فلاں رشتے دار کے گھر چلیں۔ ارے بھئی ہم یہاں ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے مہینوں ایک دوسرے کے گھر میں نہیں جھانکتے، تمہیں ساتھ لے کر چل دیں اور برے بنیں، سب کو اعتراض ہوتا ہے کہ اتنے بڑے ٹبر کو

لے کر آگئیں۔ "ارے میاں! اس مہنگائی کے دور میں کھانا تو دور کی بات' چائے پانی کرنا بھی بڑا مہنگا پڑ جاتا ہے۔"

"جی' ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔" بھتیجے صاحب' پھپھو کی ہاں میں ہاں ملانے میں مصروف تھے۔

"ویسے میں نے دیکھا ہے کہ ملک کے کسی کونے کھانچے سے بھی کوئی کراچی میں آتا ہے تو بہت جلد پر پرزے نکال لیتا ہے۔" فریحہ آپا نے بھی تائید کی۔

"ہمارے شہر کی شان ہی نرالی ہے۔" واثق میاں جھوم جھوم گئے۔

"کچھ زیادہ ہی نرالی ہے' جن مہنگے فیشن ایبل بازاروں میں ہم بھی کبھی کبھار ہی جاتے ہیں' وہاں سے شاپنگ ہو رہی ہے جو فیشن ہم سوچ سوچ کر ہی رہ جاتے ہیں یہ لوگ بڑے دھڑلے اور شان سے کرلیتی ہیں۔" ان کا اشارہ امینہ پھوپھو اور بسمہ کی طرف تھا۔

"اپنے اپنے شوق اور مزاج کی بات ہے۔" واثق میاں پھپھو کی ہاں میں ہاں تو ملا رہے تھے مگر بڑے محتاط انداز میں۔

"کچھ زیادہ ہی شوقین ہیں بھئی' اتنی باتیں ایسے ویسے فیشن ہمیں بھی نہیں آتے جتنے ان چھوٹے شہروں میں رہنے والے جانتے ہیں۔" شیبا کے لب و لہجے میں تضحیک کا رنگ غالب تھا۔

"آپ گھر نہیں آئیں پھپھو بہت دن ہو گئے۔" واثق نے موضوع بدلنے کی سعی کی۔

"ہاں بیٹا! آؤں گی' روز سوچتی ہوں مگر نکلنا ہی نہیں ہوتا' ارے پورے پورے ٹبر کی مہمان داری سے فارغ ہوں تو نہیں آنا جانا کریں' اب دیکھو' کب واپسی ہوگی ان لوگوں کی' یہ لوگ جائیں گے' تب ہی ہم گھر سے نکل سکتے ہیں یا نہیں جا سکتے ہیں۔" امی نے بھتیجے کے استفسار پر ایک چھوٹی سی تقریر جھاڑ دی۔ جس پر دونوں بیٹیاں بھی ان کی ہمنوا نظر آرہی تھیں گویا کہ جو کچھ امی نے کہا ان کے بھی دل کی آواز ہے۔

واثق تو چائے پی کر کچھ دیر بیٹھ کر رخصت ہو گیا مگر ان لوگوں کی باتیں ختم نہیں ہوئیں تینوں ایک دوسرے کے ساتھ جلے دل کے پھپھولے پھوڑتی رہیں' امینہ پھپھو اور فیملی کے متعلق ان کی طنزیہ گفتگو اس وقت ختم ہوئی جب وہ لوگ واپس آئے۔

"ارے بھئی میں تو بری طرح تھک گئی' یہاں کا ٹریفک توبہ توبہ' بندہ گڈی وچ بیٹھے بیٹھے ہی ساری حیاتی گزار لیتا ہے۔" امینہ پھوپھو آتے ہی ڈھیر ہو گئیں اور اپنے مخصوص انداز میں شروع ہو گئیں۔

"تو کس نے مشورہ دیا تھا کراچی آنے کے لیے یہاں رہنے کے لیے اور یہاں کا ٹریفک برداشت کرنے کے لیے۔" شیبا نے دل ہی دل میں بولتے ہوئے منہ بنایا۔

"شیبا پتر' تیری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" اچانک امینہ پھوپھو نے اسے بغور دیکھا۔

"ہاں' کیوں؟ کیا ہوا میری طبیعت کو؟" وہ یوں اچانک موضوع سخن بننے پر گڑبڑا گئی۔

"تیری شکل کا نقشہ ایسا عجیب و غریب ہوا تھا ابھی تے میں سمجھی تیرے پیٹ میں درد ہے۔" وہ اپنے مخصوص بے تکلفانہ انداز میں محبت سے بولیں۔

"کچھ نہیں ہوا مجھے ٹھیک ہوں۔" شیبا جز بز سی ہو گئی۔

"چنگی گل ہے پتر!" وہ مطمئن ہو کر امی کو وہاں کا حال احوال سنانے لگیں جہاں کی مہمان داری کے مزے لوٹ کر آئی تھیں۔

"سوٹ دیا ہے بڑی بھابھی نے۔" امینہ پھوپھو نے بڑی خوشی سے انہیں بتایا اور اک جوڑا نکال کر دکھانے لگیں۔

اسی لیے تو گئی تھیں امی نے جوڑے کا معائنہ کیا۔ سستا سا بھڑک دار سوٹ "تمہیں کیا ملا؟" شیبا نے تمسخر سے تسمیہ کو دیکھا۔

"جیولری سیٹ دیا ہے ثانیہ آپی نے۔" تسمیہ نے سیٹ دکھایا' موتی سے نگوں کا بھدا سا سیٹ شیبا کے ساتھ ساتھ فریحہ آپا نے بھی معائنہ کیا اور تبصرہ محفوظ رکھا' مگر صرف اسی وقت' رات میں سونے بیٹھیں تو

اچانک فریحہ آپا کو خیال آیا۔

"شانیہ لوگوں نے جوڑا اور جیولری کتنی بے کار دی ہے پھوپھو کو۔ اس سے تو بہتر تھا کچھ دیتیں ہی نہیں۔"

"ان لوگوں کی اوقات کے مطابق ٹھیک ہی ہے۔" شیبا نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"شرمین کی شادی پہ آئے ہوئے سارے بے کار بے کار جوڑے انہوں نے ایسے ہی ٹھکانے لگائے ہیں بڑے ماموں کی عروہ کی سالگرہ میں بھی اس کے لیے جوڑا لائی تھیں ممانی نے اپنی ماسی کو دے دیا تھا۔"

"کسی کو اچھی چیز دینے کے لیے بہت بڑا دل چاہیے ہر ایک کا اتنا ظرف نہیں ہوتا کہ جو کچھ اپنے لیے پسند کرتے ہیں وہی دوسروں کے لیے بھی کریں۔" فریحہ آپا نے کلینزنگ کر کے چہرہ ٹشو پیپر سے صاف کیا۔

"ایسے تو ہم بھی ہیں' امی بھی امینہ پھوپھو کو وہی کپڑے دے کر رخصت کرتی ہیں جو ہم سب نے ریجیکٹ کر دیے ہوتے ہیں۔" شیبا نے حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سچ اگلا۔

"وہ کپڑے ہمارے ریجیکٹ کیے ہوئے ہوتے ہیں' لیکن ان کو تو پسند آتے ہیں نا کوئی زبردستی تھوڑی ہے پسند نہیں تو نہ لیں۔" فریحہ آپا نے ٹشو ڈسٹ بن میں پھینکا اور اپنے بیڈ پر آ گئیں۔

"پسند۔ کی چیز کسے ناپسند ہوتی ہے' ان لوگوں کے لیے تو یہ بھی بہت ہے۔ پتا ہے پچھلی سے پچھلی بار ہم لوگوں کے ذریعہ جو پھوپھو کو دیے تھے امی نے' اپیا کی شادی میں جو بنائے تھے وہ پہنے ہوئے کپڑے' امینہ پھوپھو نے اپنی بیٹی کے جہیز میں رکھ دیے تھے' خود ہی بتا رہی تھیں کہ عظمیٰ کی سسرال والوں کو وہ جوڑے بہت پسند آئے تھے۔" شیبا کو پرانی بات یاد آئی تو آنکھیں پھیلا پھیلا کر بہن کو بتانے لگی۔

"ہاں معلوم ہے مجھے' میرے سامنے ہی تو بتا رہی تھیں۔" فریحہ آپا نے لاپروائی سے جتایا اور آنکھیں بند کیں۔

"آپا!" شیبا نے فریحہ مخاطب کیا۔

"ہوں۔"

"ایک بات بتاؤں؟"

"اب بول بھی دو" کیا پریشان لے کر سوتا ہوگی۔" فریحہ آپا نے اکتا کر اسے دیکھا۔ نیند سے ان کی آنکھیں بوجھل ہونے کو تھیں مگر شیبا کی باتیں ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔

"تسمیہ بی بی کے رنگ ڈھنگ کچھ ٹھیک نہیں لگ رہے' اونچی ہواؤں میں اڑنے کی کوشش کر رہی ہیں محترمہ!" شیبا نے اپنا مخصوص تمسخرانہ لہجہ اپنایا۔

"عباد کی طرف اشارہ ہے تمہارا؟"

"ارے واہ' آپ تو ہم سے بھی زیادہ اور پہلے سے باخبر نکلیں۔"

"اندھی نہیں ہوں' نہ ہی بے وقوف' سب دیکھ رہی ہوں روز کے ڈرامے' عباد آتا ہے تو جھٹ پٹ چائے بنا کر لے آتی ہیں اس دن وہ اپنی چیک کی شرٹ دھونے کو کہہ رہا تھا مجھ سے' محترمہ نے فورا" دھو کر استری کر کے اسے تھما دی۔ بہانے بہانے سے اس کے آس پاس منڈلاتی رہتی ہے۔ اور تو اور کل مجھ سے کہہ رہی تھی کہ مجھے مٹر پلاؤ بنانا سکھا دیں۔ اچھا سا جیسا آپ پکاتی ہیں عباد کو بہت پسند ہے نا' میں نے کہا کہ "کیا کرو گی سیکھ کر۔" تو ہی ہی کرنے لگی بے وقوف۔" فریحہ آپا شروع ہو گئیں' نیند سے بوجھل آنکھیں پوری کھل گئی تھیں۔

"بے وقوف نہیں ہے' چالاک ہے چالاک' گنوں کی پوری' عمر دیکھو اور حرکتیں دیکھو' جس تھالی میں کھاؤ اس میں چھید۔"

"رومانٹک فلمیں اور ڈرامے دیکھ دیکھ کر کچھ زیادہ ہی دماغ خراب ہو رہا ہے۔" فریحہ آپا نے کروٹ بدلی۔

"مجھے تو دیکھ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے' تیار ہو کر بھائی کے آگے پیچھے منڈلاتی رہتی ہے' امینہ پھوپھو کو نظر نہیں آتا کچھ؟ یا پھر ان ہی کی ڈھیل ہے۔" شیبا کو نہ جانے کیوں اتنا غصہ آرہا تھا۔

"چھوڑو' کچھ دنوں کی بات ہے' واپس چلی جائے گی ختم معاملہ۔"

"اور اگر عباد بھائی انٹرسٹڈ ہو گئے تو؟" شیبا نے خدشہ ظاہر کیا۔

"وہ بھی ہمارا ہی بھائی ہے اتنا برا ٹیسٹ نہیں ہے اس کا۔" فریحہ آپا مسکرائیں۔

"ٹیسٹ اچھا ہو یا برا' دماغ خراب ہوتے کیا دیر لگتی ہے پھر ہے بھی تو اتنی خوب صورت الگ ہی نظر آتی ہے' لگتا ہی نہیں کہ امینہ پھوپھو کی فیملی کی ہے۔" شیبا مسلسل بولنے کے موڈ میں تھی۔

"بات سنو' وہ جو ہمارے گھر پہلے عارفہ ماسی آتی تھی اس کی بیٹی کتنی خوب صورت تھی' لگتی تھی کہ وہ ماسی کی بیٹی ہے؟ اگر وہ عباد کو لائن دینے لگتی تو کیا ہم اسے اپنی بھابھی بنا لیتے؟ ہمارے گھر کی بہو بننے کے لیے محض خوب صورت ہونا کافی نہیں' فیملی' ایجوکیشن مینرز' بہت کچھ دیکھا جاتا ہے' اور اب پلیز میرا دماغ اور نیند خراب مت کرو' خود بھی سو جاؤ مجھے بھی سونے دو۔"

فریحہ آپا نے ڈانٹنے والے انداز میں کہہ کر آنکھیں موندلیں اور ان کی تقلید میں شیبا نے بھی شرافت سے آنکھیں تو بند کر لیں مگر وہ یہ سوچنے سے باز نہیں آئی کہ اگر عباد بھائی واقعی؟

☆ ☆ ☆

گلاب کے تازہ پھول گلدان میں سجا کر اس نے شیشے کی میز پر رکھا اور تھوڑی دور سے کھڑے ہو کر اسے دیکھا۔

"بیوٹی فل!" اپنی ہی کاوش کو ستائش بخشتے ہوئے وہ مسکرا دی۔

ڈرائنگ روم سے نکل کر وہ کمرے میں آگئی' جہاں ممانی جان امی سے مصروف گفتگو تھیں۔

"کر آئیں پھولوں کا قتل عام؟" یہ ممانی کی بیٹی ہانیہ تھی' تقریبا" شیبا کی ہی ہم عمر۔

"سجا کر آئی ہوں۔" شیبا نے اسے گھورا۔

"شاخ پر سجے برے لگ رہے تھے کیا؟" واثق نے بھی لقمہ دیا۔

"اُفوہ بھئی بور مت کرو، چینج دی ٹاپک پلیز۔" شیبا جیسے اکتا کر بولی۔

دونوں بہن بھائیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور مسکرا دیے۔

"شیبا اپنی مرضی اور مزاج کے خلاف کچھ سننا گوارا نہیں کرتی۔" ہانیہ نے اسے چھیڑا۔

"شیبا تو ایسی ہی ہے، برداشت کرنا ہے تو کرو۔" اس نے اپنے مخصوص انداز میں کندھے اچکائے اور ساتھ ساتھ بھنویں بھی۔

"اِدھر آؤ تم دونوں کو ایک چیز دکھاؤں۔" شیبا دونوں بہن بھائیوں کو دوسرے کمرے میں لے گئی جو اس کا اور فریحہ آپا کا مشترکہ کمرہ تھا۔

"دیکھو میں نے اپنی آئی ڈی بنائی ہے۔ اب بابدولت بھی فیس بک پر دستیاب ہیں۔" شیبا نے فخریہ نظروں سے ان دونوں کو دیکھا۔

"ہاں بس ایک تمہاری کمی تھی، باقی تو پوری دنیا اس جامِ جم میں موجود ہے۔" لائبہ کے ساتھ ساتھ واثق بھی جھک کر دیکھنے لگا۔

"اچھا، تمہارا تو پورا خاندان فیس بک پر موجود ہے۔" شیبا نے چمک کر فوراً کہا۔

"تم یکایک خاندان تک کیوں پہنچ جاتی ہو؟" واثق اس کی آئی ڈی چیک کرتے کرتے بولا۔

"خاندانی جو ٹھہرے۔" ہانیہ نے فقرہ کسا۔

"بالکل ہم ہیں خاندانی کوئی شک؟" شیبا کا فخریہ لہجہ ان دونوں کے لیے نیا نہیں تھا۔

"کس کی مجال کہ آپ کی بات پہ شک کرے اور یہ تو ویسے بھی شک کی نہیں فخر کی بات ہے۔" واثق کمپیوٹر کے سامنے سے ہٹ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"مہمان چلے گئے؟"

"ہاں شکر خدا کا، بلا ٹلی سر سے۔" شیبا نے تیزی سے کی بورڈ پر ہاتھ چلایا۔

"اور ایک خبر اور سنو۔" شیبا نے ہانیہ کو مخاطب کیا۔

"ہوں!" اس کی نظریں مانیٹر پر تھیں۔

"امینہ پھپھو کو جاتے جاتے کیا سوجھی، ابو سے کہنے لگیں کہ بھائی صاب شیبا کو میری دھی بنا دیں تے۔ تسمیہ تو ہے ہی آپ کی بیٹی۔" شیبا نے پھپھو کی نقل اتاری۔

"پھر؟" ہانیہ کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"پھر کیا۔ ابو نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ سوچ کر جواب دیں گے، مگر ہم سب کا تو غصہ کے مارے برا حال تھا۔ اوقات دیکھو اور بات دیکھو۔"

"تسمیہ کے لیے بھی خود ہی کہہ دیا؟"

"ہاں جرات تو دیکھو، عبلو بھائی تو اتنا ہنس رہے تھے بعد میں، کہنے لگے میری کس بات سے انہیں یہ خوش فہمی ہو گئی کہ میں ان کا داماد بننے کی آرزو رکھتا ہوں۔"

"ذرا سی عزت کیا دے دی، فوراً آپے سے باہر ہو گئیں۔" شیبا کو سوچ سوچ کر غصہ آ رہا تھا۔

"ڈیر ہانی ذرا لانا تو ایک گلاس پانی۔" واثق نے ہانیہ کو مخاطب کیا۔

"بات سنو محترمہ!" ہانیہ کے جانے کے بعد وہ شیبا کی طرف متوجہ ہوا۔

"بولیے محترم!" شیبا فیس بک کا جہان کھولے بیٹھی تھی۔

"یہ تو امینہ پھپھو تھیں، اچھا ہوا کہ انکار ہو گیا لیکن اگر کسی اور نے بھی یہ جرات دکھائی تو اسے بھی سیدھا کرنا اسی طرح۔"

"کیا مطلب؟" شیبا نے پوری طرح آنکھیں کھول کر اس ناصح کو دیکھا۔

"اب مطلب بھی سمجھانا پڑے گا اتنی ڈفر تو نہیں ہو خود ہی سمجھ جاؤ۔" واثق نے سر کھجایا۔

"ہاں میں ہوں ڈفر پھر۔" شیبا نے اپنی مسکراہٹ دبائی۔

"اوکے، آئی ٹرائی ٹو ایکسپلین۔" واثق نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔

"میرا مطلب ہے کہ۔۔۔"

"بھائی، پانی!" ہانیہ نے پانی کا گلاس اس کے آگے بڑھایا۔

"اونہوں' ٹھنڈا لانے کو کہا تھا۔" واثق نے ایک گھونٹ لے کر گلاس واپس کیا۔

"بہت نخرے ہیں بھئی' کیسے گزارا کرو گی؟" شیبا سے معنی خیز انداز میں کہتے ہوئے وہ چھپاک سے باہر نکل گئی۔

شیبا اور واثق دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا شیبا کی آنکھوں میں تحیر تھا اور واثق کی آنکھوں میں شرارت۔

"تم دونوں بہن بھائی کن ہواؤں میں ہو؟" شیبا نے سنبھلتے ہوئے سوال کیا۔

"بہت اونچی ہواؤں میں۔" جواب آیا۔

"گر پڑے تو؟"

"تم میرا ہاتھ تھام لو گی تو نہیں گروں گا۔" واثق نے واضح اظہار کیا۔

شیبا نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ ہانیہ اندر آگئی۔

"یہ لیں ٹھنڈے پانی کی بوتل اور گلاس۔" ہانیہ نے بار بار آنے جانے کا قصہ ختم کیا اور ساتھ ساتھ واثق کے حال دل کہنے کا سلسلہ بھی منقطع ہوا۔

"تم اتنی الفی شنٹ کیوں ہو؟" واثق نے پانی گلاس میں ڈالا۔

"کیا مطلب...؟" ہانیہ نے بھنویں اچکائیں۔

"مطلب یہ کہ کبھی کبھار کی تھوڑی سی کاہلی' سستی اور بے وقوفی اچھی ہوتی ہے۔"

"پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہیں؟" ہانیہ بدمزہ ہونے لگی۔

"بوتل لانے کی کیا ضرورت تھی۔ مجھے ایک گلاس پانی پھر منگوانا تھا۔"

"میں ایک ایک گلاس کر کے پورا ٹینکر بھی لا دوں تا تب بھی آپ کی باتیں ختم نہیں ہوں گی۔" ہانیہ نے بھائی پر لطیف سا طنز کیا۔ وہ ہنس پڑا اور شیبا مسکرا دی۔

"تم دونوں بہن بھائی کس مٹی کے بنے ہو؟" اس نے باری باری دونوں کو دیکھا۔

"بنانے والے کو پتا ہو گا۔" ہانیہ نے کندھے اچکائے۔

"برداشت کرنے والوں کو بھی تھوڑا بہت اندازہ ہو ہی جاتا ہے۔" اب شیبا کو موقع ملا تھا انہیں زچ کرنے کا۔

"اچھی بات ہے ابھی سے عادت ڈال لو' ہمیں برداشت کرنے کی۔" ہانیہ نے برجستگی کا مظاہرہ کیا۔

"تم...!" شیبا نے اسے گھورتے ہوئے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ واثق نے اس کی بات کاٹ دی۔

"عمیو بھائی کی کیا خیر خبر ہے؟"

"بالکل ٹھیک' کل ہی تو بات ہوئی تھی ان سے' فیس بک پر ہیں تو وہ تم نے بھی کانٹیکٹ نہیں کیا؟"

"نہیں' کبھی اتفاق ہی نہیں ہوا زیادہ تر احمد اور حماد سے کانٹیکٹ رہتا ہے' شروع سے انہی دونوں سے زیادہ فرینڈ شپ رہی ہے' عمیو بھائی تو بچپن سے ہی ہم سب کے "بھائی" بن گئے تھے' پڑھائی کے معاملے میں کتنی سختی کرتے تھے' بہت ڈانٹ کھائی ہے ہم لوگوں نے ان سے۔" واثق یاد ماضی میں گم ہونے لگا۔

"اس لیے تم لوگ ذرا سدھرے ہوئے ہو احمد اور حماد انجینئر بن کر ملائشیا پہنچ گئے' تم نے بھی اللہ اللہ کر کے بی کام کر ہی لیا۔ عمیو بھائی اسپیشلائزیشن کے لیے امریکہ نہ گئے ہوتے تو تمہارے کان پکڑ کر ایم کام بھی کروا لیتے تم سے۔" شیبا نے تیز تیز بولتے ہوئے اپنی تراشیدہ زلفیں ایک جھٹکے سے پیچھے کیں۔

"فرسٹ ڈویژن میں پاس کر کے یہ ڈگری حاصل کی ہے۔" واثق نے فوراً جتایا۔ "اور رہی بات ایم کام کی تو وہ تو میں کر ہی لوں گا بھائی نہ سہی' بہن بھی کان پکڑ کے کروا سکتی ہے۔" وہ پھر پٹڑی سے اترنے لگا۔

"عمیو بھائی کیا مستقل وہیں سیٹل ہو جائیں گے؟" ہانیہ نے سوال کیا۔

"فی الحال تو پاکستان واپس آئیں گے' شادی وادی تو یہیں ہو گی ان کی' ویسے جاب تو وہیں کر رہے ہیں نیویارک میں' ہو سکتا ہے ان فیوچر باہر ہی سیٹل ہو جائیں۔"

"ان کے معیار کی لڑکی اور فیملی بھی مشکل سے ہی ملے گی اتنے تو پڑھے لکھے ہیں وہ اور اوپر سے اتنے ہینڈسم۔" ہانیہ نے خیال آرائی کی' وہ عمیر بھائی سے بہت متاثر تھی اور ایک وہی کیا' خاندان بھر کی لڑکیاں ان سے متاثر تھیں' ان کی قابلیت ذہانت اور وجاہت کے چرچے قریب دور کے سبھی رشتہ داروں میں تھے' ہر کوئی اس ہیرے کو پانے کا متمنی تھا اور یہ گوہر نایاب کس کی جھولی میں گرے گا کسی کو نہیں معلوم تھا۔

"پتا نہیں عمیر بھائی یہاں آکر کس کو پسند کریں گے۔" ہانیہ نے دل ہی دل میں سوچا۔

شیبا اور واثق اس کی سوچوں سے بے خبر فیس بک کی دنیا میں گم تھے اور ہانیہ کو خبر ہی نہیں تھی کہ عمیر یہاں آنے سے پہلے ہی کسی کو پسند کر کے اپنی زندگی میں شامل کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

احمد اور حماد نے فی الحال پاکستان آنے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔ چھ ماہ بعد عمیر بھائی کو آنا تھا' لہٰذا یہ دونوں بھی تبھی آنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔

عمیر بھائی کے لیے لائف پارٹنر کا انتخاب ایک بڑا اور کڑا مرحلہ تھا۔ امی اپنے طور پر کوشاں تھیں' کوئی اعلا خاندان' دولت مند بھی ہوں' تعلیم یافتہ بھی ہوں' اسٹیٹس بھی ہو' شریف بھی ہوں' مہذب اور معزز بھی باقی سب۔ بہن بھائی اپنے اپنے خیالات کے گھوڑے دوڑاتے اور قیاس آرائیاں کر رہے تھے' ان سب کا زیادہ زور لڑکی پر تھا' خوب صورت بلکہ بے تحاشا خوب صورت قابل' ذہین' ایجوکیٹڈ پھر ملنسار بھی ہو' خوش اخلاق ہو اور اور پتا نہیں کیا کیا کچھ۔

مگر عمیر نے آنے سے پہلے گھر والوں کی یہ مشکل آسان کر دی تھی۔

اس نے اسکائپ کے ذریعے انہیں فارہ سے متعارف کروایا تھا' وہ عمیر کی یونی ورسٹی فیلو تھی' خوب صورت' قابل اور ذہین تو وہ تھی ہی' خاندانی پس منظر بھی بہت متاثر کن تھا۔ بیورو کریٹ خاندان' جہاں دولت اور اعلا تعلیمی ڈگریوں کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے سرکاری عہدے بھی تھے۔ آدھی فیملی اسلام آباد میں' آدھی کراچی میں قیام پذیر تھی اور اسلام آباد والوں کی کراچی آمد اور کراچی والوں کی اسلام آباد روانگی معمول کی بات تھی۔ پوری فیملی صرف سن سن کر بغیر دیکھے اور ملے ہی فارہ کی فیملی سے مرعوب اور متاثر ہو گئی تھی۔

اتنے بڑے لوگ' خاندانی لوگ' عہدے اور مرتبے والے لوگ۔

اللہ کا کرم تھا کہ اس نے عمیر کو اس قابل بنایا ورنہ ایسی فیملی سے رشتہ جوڑنے کا تو وہ خواب میں بھی نہیں سوچ سکتے تھے۔

عمیر کے آنے میں دو ماہ باقی تھے کہ امینہ پھپھو اپنے بیٹے کے ساتھ پھر وارد ہو گئیں۔

"ابھی تو ہو کر گئی تھیں چھ مہینے بھی نہیں ہوئے' اب کیا کرنے آ گئیں۔" شیبا نے بھائی سے سرگوشی کی۔

"میرا خیال ہے تمہیں مانگنے آئی ہیں۔ دوبارہ۔" بظاہر بھائی نے نہایت سنجیدگی سے تجزیہ کیا تھا' مگر لہجہ سراسر چغلی کھا رہا تھا کہ وہ شرارت پر آمادہ ہے۔

شیبا نے پہلے تو اسے گھور کر دیکھا پھر بلا تکلف ایک زوردار دھپ اس کے کندھے پر لگائی۔

"فضول باتیں مت کرو۔" وہ غرائی۔

"کیا حرج ہے۔" بھائی ہنسا۔

"کہہ رہی تھیں کہ شہزادی بنا کر رکھوں گی' پلنگ سے پاؤں نیچے نہیں اتارے گی میری شیبا رانی' راج کرے گی راج۔" بھائی صاحب نے امینہ پھوپھو کی نقل اتاری۔

شیبا رانی غصے میں واک آؤٹ کر گئیں' امی کے پاس پہنچی بھائی کی شکایت کرنے مگر اسے دھیان ہی نہ رہا وہاں تو امینہ پھوپھو براجمان تھیں۔

"اف!" وہ پاؤں پٹخ کر وہاں سے بھی چل دی اور کمرے میں آ کر پڑ گئی۔

"آئیں یا جائیں مجھے کیا۔" اس نے خود کو ٹھنڈا کرنے کی سعی کی۔

اور یہ عقدہ بھی بہت جلد کھل گیا کہ وہ کیوں آئی

تھیں۔

امینہ پھوپھو فیملی سمیت کراچی شفٹ ہو رہی تھیں۔ ابو سے استدعا کی تھی کہ کرائے کا کوئی گھر ڈھونڈ دیں، جو وہ افورڈ کر سکیں۔

"ہائیں!" امی سمیت سبھی کے منہ حیرت سے کھل گئے اور پھر سوالات کا ایک لامتناہی سلسلہ۔

"ایڈوانس کون دے گا؟ کرایہ کہاں سے بھریں گی' بل کیسے ادا ہوں گے' کراچی جیسے شہر میں اپنے ذاتی گھر میں رہنا آسان نہیں رہا تو کرائے پہ رہنا تو ایک جنجال۔"

مگر امینہ پھوپھو تو ساری تیاری کر کے آئی تھیں' ایک بیٹے کی نوکری یہیں کسی کمپنی میں لگ گئی تھی اور جس بیٹے کے لیے شیبا کا رشتہ مانگا تھا وہ ایک مہینے پہلے دبئی چلا گیا تھا' تیسرا بیٹا درزی تھا بڑا اچھا کاریگر' رشتے داروں میں سے کسی نے اسے صدر میں ایک ٹیلرنگ شاپ میں رکھوا دیا تھا۔ تو اب برا بھلا ان کا گزارا ہو ہی جاتا۔

"کراچی شفٹ ہونے کی کیا سوجھی؟" لوگوں کو حیرت ہوئی۔

"بس سارے رشتے دار تو یہیں ہیں سوچا یہیں آ جائیں ہم بھی۔" امینہ پھوپھو نے نپا تلا سوچا سمجھا جواب دیا۔

"لو بھئی' اتنی دور تھیں تو سال میں دو تین چکر لگا لیتی تھیں۔ اب تو ہر وقت ہی سر پر سوار رہیں گی۔" امی سمیت سب کو کوفت ہوئی۔

"زیادہ لفٹ نہیں کرائیے گا۔ ویسے بھی کون سا خلوص سے ملتی ہیں ہم سے مطلب ہے ان کا' اپنے بیٹے اور بیٹی کو ہمارے گھر ٹھکانے لگانا چاہ رہی ہیں۔" بڑی آپا نے امی کو سمجھایا۔

"ہاں ہاں' میں کیا سمجھتی نہیں ان سب باتوں کو' مطلبی لوگوں سے تو دور کی سلام دعا ہی بھلی۔" امی نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

☆ ☆ ☆ ☆

امینہ پھپھو کو ابو کی کوشش اور سلامت سے گھر

مل گیا وہ وہاں شفٹ بھی ہو گئیں اور ان کی بقایا فیملی بھی یہیں کراچی آ گئی۔

عمیر بھائی کے آنے کے دن قریب تھے اور گھر کی تزئین و آرائش ہو چکی تھی۔ ڈھائی سو گز پر بنا ہوا ان کا گھر دو منزلہ تھا' مضبوط اور خوب صورت تمام تر سہولتوں' آسائشوں اور آرائش سے مزین' پھر بھی وائٹ واش کروا کر اوپری منزل کو خاص طور پر دوبارہ ڈیکوریٹ اور فرنشڈ کیا گیا۔

اللہ اللہ کر کے وہ مبارک اور خوش نصیب ساعت آ ہی گئی۔ اپنے پیارے کامیاب' قابل بیٹے اور بھائی کو اتنے سالوں بعد اپنے درمیان پا کر سب کی آنکھیں خوشی سے چھلک پڑیں' خود عمیر بھی خاص طور پر امی ابو سے مل کر بہت جذباتی ہو گیا تھا۔

ایک مہینہ تو رشتے داروں کی آمد و رفت اور ملنے ملانے میں ہی گزر گیا۔ جب ذرا فراغت ہوئی تو فارہ کا ذکر چھیڑا گیا۔

"بس اب تو شادی کر کے ہی بھیجوں گی تمہیں۔" امی نے بڑے پیار اور ناز سے اپنے خوبرو بیٹے کو دیکھا۔

"شادی بھی ہو ہی جائے گی فارہ کی فیملی سے تو ملوا دوں آپ کو۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں' کب جانا ہے' کب انہیں بلانا ہے' ابھی بیٹھ کر بات کر لیتے ہیں۔"

امی کی بات پر بہن بھائیوں نے تائیدی انداز میں سر ہلائے' پچھلے ہفتے ہی تو احمد اور حماد بھی چھٹیوں پر آ گئے تھے' دونوں امی کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھے تھے اور سب سے زیادہ امی کی تائید میں اپنے سر ہلا رہے تھے۔ عمیر بھائی کی شادی ہو تو ان دونوں کی باری آئے گی نا۔ عمیر بھائی امی سے کچھ کہہ رہے تھے۔

"گھر کرائے پر لینا ہے کیوں؟" بہن بھائی کم' امی زیادہ حیران ہوئیں۔

"امی! ان لوگوں کا اسٹیٹس اور لونگ اسٹائل بہت ہائی فائی ہے' ہم ان کے برابر نہیں' مگر کچھ قریب ترین لائف اسٹائل تو اپنا سکتے ہیں نا۔" عمیر نے انہیں سمجھایا۔

"اتنا لائق فائق داماد مل رہا ہے' انہیں باہر سے پڑھا ہوا پھر تمہیں یا تمہاری بیوی کو کون سا یہاں رہنا ہے' شادی کے بعد دونوں باہر ہی چلے جاؤ گے۔ پھر ان سب کی کیا ضرورت ہے' بلاوجہ میں نیا خرچا!" امی نے اعتراض اٹھایا۔ ابھی تو اس گھر میں تقریباً" چار پانچ لاکھ روپے لگ گئے تھے' وائٹ واش ہی اتنا مہنگا ہوا تھا پھر نئے ٹائلز' نئی فٹنگ' اتنا قیمتی فرنیچر مانو پیسہ پانی کی طرح بہہ گیا' پتا ہی نہیں چلا اور اب یہ نیا شوشہ۔

"ضروری ہے امی! میں شادی کے بعد چاہے دو دن یہاں رہوں یا دو گھنٹے' وہ لوگ اس گھر میں رخصتی نہیں کریں گے' وہ لوگ ہزار دو ہزار گز کے بنگلوں میں رہنے کے عادی ہیں۔ ہمارے گھر جتنے بڑے تو ان کے لاؤنج و ڈرائنگ روم ہیں اور رہی بات میرے لائق فائق ہونے کی تو فارہ کے تین کزن میرے جیسے ہی قابل ہیں' ذہین ہیں' ہینڈسم ہیں اور باہر کی یونی ورسٹیز میں پڑھ رہے ہیں' تینوں فیملیز وہیں سیٹلڈ ہیں' کوئی فرانس میں' برطانیہ میں' امریکہ میں' میرے لیے اس نے اپنی فیملی کو بہت فورس کیا ہے اب ہمیں خود کو ایسا تو دکھانا ہے کہ اسے کوئی لیٹ ڈاؤن نہ کرے۔"

عمیر نے تفصیل سے انہیں سمجھایا' ان کی سمجھ میں بات آگئی' مگر پھر بھی انہیں پانچ لاکھ روپوں کا غم کھائے جا رہا تھا۔

"یہ سب پہلے ہی بتا دیتے' آنے سے پہلے تو اتنی رقم تو خرچ نہیں کرتی میں' اور پھر اتنی جلدی کوئی بنگلہ کہاں ملے گا؟ کیسے ملے گا؟" ان کی پریشانی اب نئے سرے سے شروع ہوئی۔

"اس کی فکر مت کریں میں آنے سے پہلے انتظام کر کے آیا ہوں میرے ایک فرینڈ کی فیملی امریکہ شفٹ ہوگئی ہے' ڈیفنس میں ان کا بنگلہ ہے' رینٹ پہ لینے کی بات کرلی ہے میں نے' گاڑی کا البتہ کچھ کرنا پڑے گا۔" عمیر نے تفصیل بتاتے بتاتے خود کلامی کی۔

"کار ہے تو سہی' دو سال پہلے تو خریدی تھی' آج بھی نئی کی نئی ہے۔" امی نے جھٹ سے پھر نکتہ اعتراض داغا۔

"مائی ڈیر مام!" عمیر نے انہیں یوں مسکرا کر مخاطب کیا جیسے انہوں نے کوئی بچکانہ بات کی ہو۔ "جیسی کار ہمارے پاس ہے' نا فارہ کے گھر میں ایسی گاڑی ان کے ملازم استعمال کرتے ہیں۔"

"اچھا۔" امی کا لہجہ کچھ بے یقین سا تھا۔

"تو پھر نئی فورو ہیل کہاں سے آئے گی؟ کب آئے گی؟" شیبا نے بے چینی اور تجسس ملا کر سوال کیا۔

"آجائے گی' بس دیکھتی جاؤ۔"

"ڈیفنس میں بنگلہ لیں گے تو اسی حساب سے پھر ڈیکوریٹ بھی ہوگا۔" فریحہ نے ایک نیا نکتہ نکالا۔

"بینگلو فرنشڈ ہے۔" عمیر نے بتایا۔

"بھائی تو تیاری کمپلیٹ کر کے آئے ہیں۔" حماد ہنسا۔

"شکر ادا کریں امی جان' نہ لڑکی تلاش کرنے کی زحمت' نہ کوئی اور جھنجھٹ' آپ کی گاڑی کے ٹائر گھسنے سے بچ گئے۔" عباد نے مزے سے کہا اور سب کی بتیسی باہر۔

❊ ❊ ❊

شفٹنگ میں زیادہ وقت نہیں لگا' فی الحال یہ گھر خالی کر دیا تھا لیکن اچھے کرائے دار مل جاتے تو اسے کرائے پر چڑھانا تھا۔ ٹھیک ہے کہ پیسے کی ماشاء اللہ ریل پیل تھی' مگر ڈیفنس جا کر بہت سے اخراجات خود بخود بڑھ گئے تھے' پھر ابھی عمیر کی شادی کے لیے ٹھیک ٹھاک رقم چاہیے تھی' حالانکہ عمیر بھی مالی معاملات میں ٹھیک ٹھاک معاونت کر رہا تھا' مگر شادی کے خرچے بے انت' بے حساب پھر اخراجات کی کوئی حد تھوڑی تھی یہ تو شادی سے پہلے بھی شادی کے بعد بھی جاری و ساری رہنے تھے۔

رشتہ طے ہونے میں کوئی رکاوٹ' کوئی خاص مشکل نہیں آئی' فارہ کی فیملی بہت ڈیسنٹ' بہت مہذب اور دولت مند تھی۔ ان کا پرشکوہ محل نما گھر' رہن سہن' طور طریقے دیکھ کر امی کا تو منہ کھلا کا کھلا رہ

گیا۔ انہوں نے فوراً" ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ بس اپنے بچوں کو لے جا کر رسم کر آئیں گی۔

"رشتہ داروں میں سے کسی کو بلانے کی ضرورت نہیں ہے۔" انہوں نے قطعی فیصلہ صادر کیا۔

"کیوں؟" ابو نے سوال اٹھایا' بچے تو سب امی سے متفق تھے۔

"شادی کون سا دور ہے' دو مہینے بعد تو ہے' تب ہی سب کو بلا لیں گے۔" امی نے اطمینان سے جواز پیش کیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر ابھی رسم کرنے جائیں گے تو قریبی دو چار لوگوں کو تو لے کر جانا پڑے گا۔"

"اُفوہ!" وہ جھنجلا گئیں۔

"عمیر کے قریبی لوگ تو اس کے ماں باپ اور بہن بھائی ہیں' اب رہ گئی میری اور آپ کی فیملی تو ماشاءاللہ تین بھائی اور چار بہنیں میری ہیں اور آپ کی بہن اور بھائی باہر ہیں' وہ تو شادی پر ہی آئیں گے پھر کوئی اس قابل بھی تو ہو جو وہاں لے جائیں۔" امی نے سب سے آخر میں اصل وجہ بتائی تھی کسی کو بھی نہ لے جانے کی۔

"یہ بھی کوئی بات ہے بھلا۔" ابو ان کی بات پر جز بز ہو گئے۔

"جی ہاں' یہی بات ہے صاف اور سیدھی' بس شادی پر ہی سب کا تعارف ہو جائے گا۔" امی نے قطعیت سے کہتے ہوئے فیصلہ صادر کر دیا۔

اور وہی ہوا وہ لوگ خود ہی جا کر رسم کر آئے اور خاندان بھر میں مٹھائی کے ڈبے بانٹ دیے' یوں اکیلے چپ چپاتے رشتہ طے کرنے پر باتیں سب نے ہی بنائیں' کسی نے منہ پر اور کسی نے پیٹھ پیچھے اعتراضات ضرور کیے۔

"اسٹیٹس بدل لیا تو کیا رشتے داری بھی ختم کر لی' سگی خالہ کو بھی نہ پوچھا۔ ارے میری گودوں میں کھیلا ہے عمیر' اب اس کا خوشی کا وقت آیا' تو ہمیں پیچھے دھکیل دیا' اے لو' بتاؤ بھلا بیٹھے بٹھائے ہم غیر ہو گئے۔"

یہ تھیں امی کی بڑی بہن' صاف گو کہو یا منہ پھٹ' وہ بہر حال لگی لپٹی رکھنے کی قائل نہیں تھیں۔

امی کو کسی کے کہے کی کوئی خاص پروانہ تھی انہیں جو کرنا تھا وہ کر لیا اب کوئی کچھ بھی کہتا رہے' ان کی بلا سے۔

☼ ☼ ☼

امینہ پھپھو مبارکباد دینے پہنچ گئیں' بمعہ اپنی آل اولاد۔

"یہ ہمیشہ اپنا سارا لشکر ساتھ لے کر کیوں چلتی ہیں؟ ایک دو افراد نہیں لا سکتیں؟" سوائے ابو کے' سب ہی فرداً ان کی آمد پر منہ بنا رہے تھے۔

"اب ایسا نہ ہو کہ یہ آئے دن یہاں بھی ٹپک پڑیں۔" شیبا نے فریحہ آپا سے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

"میں کیا کہہ سکتی ہوں' امی ہی کچھ علاج کر سکتی ہیں تمہاری اس فکر کا۔" فری آپا نے کندھے اچکائے۔

"بات سنو فری!" معاذ بھی ان دونوں کے پاس آ گیا۔

"بھئی مہمانوں کی کچھ خاطر مدارات کر کے چلتا کرو انہیں۔"

"کیوں بھئی' آپ کو کیا ہوا؟"

"وہ سعدیہ بی بڑی میٹھی میٹھی نظروں سے گھورے جا رہی ہیں کب سے' کہیں نظر نہ لگ جائے مجھے۔" معاذ کمینگی سے ہنسا۔

شیبا ہنس پڑی' فری آپا نے البتہ اسے گھور کے دیکھا۔

"ہونہہ' چھچھورا!" وہ زیر لب بڑبڑائیں۔

"کیا فرما رہی ہیں؟"

"کچھ نہیں۔" وہ وہاں سے ہٹ گئیں۔

"عمر بھائی کی شادی پہ میں تو دو ہفتے پہلے سے رہنے آ جاؤں گی۔" بسمہ سب کے درمیان بیٹھی چہک رہی تھی۔

"ابھی سے آ جاؤ۔" شیبا نے طنز کیا تھا مگر وہ مذاق جان کر کھلکھلا اٹھی۔

واثق بھی اپنی فیملی کے ساتھ آیا تھا مبارکباد بھی دی اور ساتھ ساتھ شکوہ بھی۔

"اکیلے اکیلے منگنی کرلی۔ ہمیں بھی نہیں بلایا۔" اس نے شیبا سے شکایت کی۔

"شادی پر بلائیں گے نا' تیاری کر کے رکھو' ڈیزائنر ویر کے لیے پیسے جمع کرلو کسی بی کلاس مال سے شاپنگ مت کرنا' بڑی ہائی فائی ہے عمیر بھائی کی سسرال' ناک مت کٹوا دینا۔" شیبا نے جلدی جلدی اسے لیکچر دیا۔

"ہم بھی کوئی ایسے ٹٹ پونجیے اور کنگلے نہیں ہیں' بے فکر رہو' کم از کم ہماری وجہ سے تمہیں ان ہائی فائی لوگوں کے سامنے شرمندگی نہیں ہوگی۔" واثق کے تو پتنگے لگ گئے تھے شیبا کی بات سن کر۔

"اتنی جلدی' اتنے ہائپر مت ہوا کرو' میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" واثق کی تندی اور تیزی دیکھ کر وہ کچھ نرم پڑی۔

"حد ہوگئی انسان کتنی جلدی اپنے ماضی کو اور اپنے آپ کو بھول جاتا ہے۔" واثق نے سر جھٹکا۔

"اب تم اوور مت ہو میں نے ایسا بھی کچھ نہیں کہا کہ اس طرح ری ایکٹ کرو۔" شیبا کے لہجے سے نرمی کچھ کم ہوئی۔

"اچھا خیر' چلو چھوڑو' تم اپنی سناؤ گریجویشن کے بعد کیا ارادہ ہے؟" واثق نے خود پر قابو پاتے ہوئے موضوع بدلا۔

"ماسٹرز۔" شیبا چہکی۔

"پتا ہے عمیر بھائی کی سسرال میں ایک سے بڑھ کر ایک ایجوکیٹڈ موجود ہیں یا تو باہر سے پڑھے ہوئے اور جو یہاں سے پڑھے ہیں وہ بھی ٹاپ کلاس انسٹی ٹیوٹس کے' اپنا آپ تو بالکل صفر لگتا ہے ان کے آگے' فارہ بھابھی ہیں نا' ان کے ایک بھائی تو آکسفورڈ سے پڑھ کر آئے ہیں' اتنی زبردست پرسنالٹی ہے ان کی' کیا بتاؤں۔" فارہ آنکھیں میچ کر شروع ہوگئی۔

"اف پھر وہی۔۔" واثق کی پیشانی پر بل پڑنے لگے۔

"آج کل کچھ اور نہیں سوجھ رہا تم لوگوں کو' عمیر بھائی کی سسرال کے علاوہ۔" واثق نے چبا چبا کر الفاظ منہ سے نکالے۔

"آپ کیوں جیلس ہو رہے ہیں محترم!" شیبا زور سے ہنس پڑی۔

"مجھے کیا ضرورت ہے جیلس ہونے کی' مگر تم لوگ تو کچھ زیادہ ہی امپریس ہو گئے ہو ان لوگوں سے بات انہی سے شروع ہوتی ہے انہی پر ختم ہوتی ہے۔" واثق تلملا ہی گیا تھا۔

"کوئی اس قابل ہوتا ہے' تبھی ہاٹ ٹاپک بنتا ہے' اب ہر وقت تمہیں تو موضوع گفتگو بنانے سے رہے ہم۔" شیبا نے اسے مزید چڑایا۔

"مجھے کوئی شوق بھی نہیں ہے اس چھچھورپن کا۔" واثق کا مزاج برہم ہوتا ہی جا رہا تھا۔

"واثق بیٹا یہاں تو آؤ۔" امی نے اپنے عزیز بھتیجے کو آواز لگائی۔

"جی۔" وہ اپنے چہرے کے تاثرات نارمل کرتا ان کے پاس پہنچا۔

عمیر اور فارہ کی تصاویر سے سجا بڑا سا البم کھلا ہوا تھا۔

"آؤ بھئی' تصویریں دیکھو اپنے عمیر بھائی کی۔"

یہاں بھی وہی سسرال نامہ چل رہا تھا۔

"در اصل فوٹو تو کمپیوٹر میں ڈالے ہوئے ہیں موبائل میں بھی ہیں وہ تو بچے ہی دکھائیں گے تمہیں۔"

"ہاں' میں تو جیسے مرا جا رہا ہوں تصویریں دیکھنے کے لیے۔" واثق کا منہ جانے کیوں حلق تک کڑوا ہو گیا۔

اسے کیا' کسی کو بھی توقع نہیں تھی کہ عمیر بھائی اتنا اونچا ہاتھ ماریں گے۔

لڑکی والوں نے بھی بس لڑکا دیکھ کر ہاں کردی' ورنہ باقی فیملی کی بھلا کیا اوقات ہے۔

واثق جی ہی جی میں کلستا ہوا تصویریں دیکھ رہا تھا۔ کچھ تو رنج اس بات کا تھا کہ انہیں ہانیہ کے لیے امید تھی' پھپھو اور ان کی فیملی سب سے زیادہ انہی

سے کلوز تھی، مگر یہ توقع ختم ہوگئی، پھر عمیر کا رشتہ طے ہوا اب بھی انہیں نہیں پوچھا گیا خیر انہیں ہی کیا کسی کو بھی نہیں پوچھا گیا، مزید ستم شیبا کی لن ترانیاں، بلکہ اترانیاں اور شیخیاں، وہ تو جل بھن کر خاک ہونے کو تھا، بے دلی سے البم کے صفحات پلٹتا رہا۔

"اچھی پکچرز ہیں۔" واثق نے تعریف کرنے کی رسم بھی نبھادی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

شیبا صوفے پہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے کسی فیشن میگزین کی ورق گردانی کررہی تھی۔

واثق اس کے سامنے صوفے پہ بیٹھ گیا۔

"تم تو ابھی سے بیگم صاحبہ بن گئی ہو۔" اس نے طنز کا تیر چلایا۔

"اللہ کا کرم ہے، غرور نہیں کرتی۔" شیبا نے اسے مزید چڑایا۔

"تمہیں تو میں بعد میں سیدھا کروں گا۔" واثق دانت پیس کر مسکرایا۔

"بعد میں؟" شیبا نے سوالیہ انداز میں بھنویں اچکائیں۔

"خرگوش کے کان ہیں تمہارے۔"

"خرگوش کے کیوں ہوتے، میرے اپنے ہیں ذاتی۔" ترنت جواب ملا۔

"ایک بات تو بتاؤ؟"

"پوچھو۔"

"فریحہ آپا کا کوئی پرپوزل وغیرہ؟" واثق نے مختصر ترین لفظوں میں سوال کرنے کی کوشش کی اور ساتھ ہی ادھر ادھر بھی دیکھا، کہیں فریحہ آپا نے سن لیا تو غضب ہوجائے گا۔

"یا فریحہ آپا؟" شیبا نے ایک گہری سانس لی۔

"ابھی تک کچھ نہیں ہوا... مگر" وہ جیسے بہت سوچ کر بولی تھی پھر اک دم خاموش ہوگئی۔

"مگر کیا؟" واثق نے بے چینی سے پوچھا۔

"ایک بات بتاؤں؟ کسی کو بتاؤ گے تو نہیں۔" شیبا نے دھیمی آواز میں کہا۔

"کیوں نہیں، ضرور بتاؤں گا، ایک ایک کو پکڑ پکڑ کر بتاؤں گا مسجد سے اعلانات کروں گا۔"

"افوہ تم بھی نا!" شیبا نے گھور کے دیکھا۔

"فارہ بھابھی کے سب سے بڑے بھائی ہیں نا بہت اچھے ہیں، بہت سوبر، بہت الفی شنٹ ان کی شادی ہوئی تھی مگر ختم ہوگئی، اولاد کوئی نہیں ہے، امی کو وہ بہت پسند آئے ہیں فریحہ آپا کے لیے۔"

"تو! صرف ان کی پسند سے کیا ہوتا ہے؟" واثق نے کھودا پہاڑ نکلا چوہا جیسے تاثرات چہرے پر سجائے۔

"امی نے عمیر بھائی سے بات کی تھی وہ کہہ رہے تھے کہ شادی کے بعد فارہ بھابھی سے بات کریں گے۔ ویسے وہ لوگ ہمارے گھر ڈنر پر آئے تھے نا تو فریحہ آپا کی کوکنگ کی بہت تعریف کر رہے تھے، حالانکہ خود ان کا کک ایک سے ایک کھانے پکاتا ہے۔"

"اچھا!" واثق نے یقین نہ آنے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

"چلو یہ سب باتیں تو ٹھیک ہیں مگر چانسز کتنے ہیں کہاں تک ہیں؟"

"تمہیں کیوں اچانک آپا کی اتنی فکر ہوگئی ہے؟" شیبا نے اکتا کر کہا۔

"وہ ہٹیں گی تو تمہاری فائل اوپر آئے گی نا۔"

"تو؟" اس نے ابرو اچکائے "تمہیں کیا مطلب میری فائل سے؟"

"مطلب تو ہے فائل سے بھی، فائل والی سے بھی۔" واثق کے اظہار پر وہ گنگ رہ گئی، ڈھکے چھپے وہ ذو معنی باتیں کرتا رہتا تھا جنہیں شیبا چٹکیوں میں اڑا دیتی تھی مگر آج اس کا لہجہ اور آنکھوں کے رنگ کچھ اور ہی تھے۔

"تم۔" شیبا نے کچھ کہنا چاہا۔

"اب پلیز اس مطلب کے معنی مت پوچھنا مجھ سے۔" ہاتھ اٹھا کر وہ شریر لہجے میں گویا ہوا۔

"تم خاموش زیادہ اچھے لگتے ہو۔"

"زہے نصیب، کسی طرح بھی سہی، تمہیں اچھا تو لگتا ہوں۔"

"کچھ زیادہ ہی اوور کانفیڈنس ہوتے جارہے ہو۔"

"سارا کانفیڈنس کیا امیروں کے لیے ہے؟ تھوڑے بہت سے ہم غریب بھی استفادہ کر سکتے ہیں۔" امی نے شیبا کو آواز لگائی تو وہ موقع غنیمت جان کر کھڑی ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

رات کو سونے کے لیے لیٹی 'پلکیں موندیں تو بند آنکھوں تلے ایک وجیہہ سراپا اپنی چھب دکھانے لگا' گریس فل پرسنالٹی کے ساتھ چمکدار ذہین آنکھیں' ایسی آنکھیں جنہیں دیکھ کر دل میں یہ خواہش ہو کہ یہ آنکھیں ہمیں ہی دیکھتی رہیں' اور آنکھوں کے مالک کا جو دل ہے وہ ہمیں ہی سوچتا رہے' شیبا کے دل میں انوکھی خواہشیں انگڑائی لے رہی تھیں' بند آنکھوں میں پلکوں کو چھکانے والے خواب سجنے لگے تھے۔

"آئی ایم سوری واتق' نو چانس فار یو۔" وہ دل ہی دل میں مسکائی اور اس جادوگر کو سوچتی ہوئی سو گئی جس نے چند ملاقاتوں میں ہی اسے اپنا اسیر کر لیا تھا۔

☼ ☼ ☼
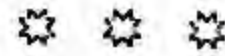
عید قرباں کے تیسرے روز حسب روایت بڑی بیٹی داماد کی دعوت تھی' ابو نے دوپہر کے کھانے پہ شوشا چھوڑ دیا۔

"امینہ کو بلا لیتے ہیں کل' اس کی بھی دعوت ہو جائے گی' اتنے سارے کھانے پکیں گے اس غریب کا کنبہ بھی کھا لے گا۔" ابو اتنے بڑے بنگلے میں آ کر بھی اپنے غریب رشتے داروں کو فراموش نہیں کر پائے تھے نہ ہی صلہ رحمی کے جذبے سے ان کا دل خالی ہوا تھا۔

"اتنا ڈھیروں ڈھیر گوشت بھجوایا ہے کل' جو پکانا ہو گا۔ گھر پر پکا کر کھا لیں گی' اب ضروری ہے ہمارے گھر جو بھی دعوت ہو' انہیں ضرور ہی بلائیں۔" امی نے رکھا سا جواب دے کر اپنے تقریباً" سبھی بچوں کی ترجمانی کی تھی۔

"آپ تو خود ہی ہر بات کا فیصلہ کر کے بیٹھی ہیں۔" مرنجان مرنج ابو کا موڈ آف ہونے لگا۔

"تو؟ آپ تو بس حکم چلا کر الگ ہو جاتے ہیں فلاں کو بلا لو' ڈھمکا کو بلا لو' باقی سب کچھ تو مجھے ہی کرنا ہوتا ہے' بلانے کا کیا ہے' میں بلا لوں وہ تو آ جائیں گی ٹیکسی کر کے' بھر بھرا کے' اس کا کرایہ بھی ہمیں دینا ہے۔ چلو دے دیں گے' پھر واپس کیسے جائیں گی! یہاں تو ٹیکسی پکڑنے کے لیے اتنی دور مین روڈ پہ جانا پڑتا ہے' وہ بھی مشکل سے ہی ملتی ہے' یہاں تو سب اپنی گاڑیوں والے ہیں' پچھلی بار بھی ڈرائیور سے گھر چھڑوا لیا تھا' ورنہ وہ تو یہیں ٹکنے کے موڈ میں تھیں' اب دو ہی تو گاڑیاں ہیں گھر میں' ایک عمیر کے استعمال میں رہتی ہے' باقی گھر والے ایک میں گزارہ کرتے ہیں' اب گاڑی کل کو گھر میں ہو نہ ہو' ان کو گھر پہنچانے کا بندوبست میں کہاں کرتی پھروں گی؟"

امی نے ایک لمبی چوڑی تقریر کے بعد ذرا رک کر سانس لی پھر آگے بڑھیں۔

"لیکن اگر آپ کہتے ہیں تو آپ کی بات رکھنے کے لیے اتنا کر سکتی ہوں کہ کل جو بھی کھانے پکیں گے انہیں پیک کروا کے ڈرائیور کے ہاتھ بھجوا دوں گی۔"

امی نے حاتم طائی کی قبر پر بھی لات ماری تھی اور شوہر کی بھی سات پشتوں پر گویا احسان کیا تھا۔

"آپ نے رمضان میں بھی یہی کیا تھا' میں نے روزہ کھلوانے کا کہا تو آپ نے افطاری اور کھانے کا سامان ان کے گھر بھجوا دیا۔" ابو کے لہجے میں ناراضی کے ساتھ تلخی بھی بول رہی تھی۔

"تو کیا ہوا' اتنا ڈھیر کا ڈھیر سامان بھیجا تھا' ایک روزے کے بجائے چار دن روزہ کھول لیں۔ ایک افطار ڈنر کی جگہ چھ دن کا راشن بھیجا تھا میں نے۔" امی نے فخریہ جواب دیا اور ساتھ ہی مزید گویا ہوئیں۔

"آپ کو برا لگے یا بھلا میں ان لوگوں کو یہاں بلا کر اپنا گھر خراب نہیں کرواؤں گی۔ ایک تو وہ اپنے پوتے پوتیاں' نواسے نواسیاں' سارے بچوں کا جم غفیر لے آتی ہیں اور پھر وہ شتر بے مہار پورے گھر میں لان میں تو ہر جگہ دندناتے پھرتے ہیں۔ پچھلی بار لان میں پودوں کا کیا حشر نشر کیا تھا؟ اللہ جانے وہ کون سا پودا تھا' عمیر نے بیس ہزار کا خرید اتھا' اس کی پتی پتی نوچ ڈالی' عمیر

لیے، مجھ پر غصہ کر رہا تھا' آپ کا کیا ہے۔ آپ تو باتوں یا اتنی مگن ہو کر بیٹھ جاتے ہیں' بھگتنا تو بعد میں مجھے پڑتا ہے۔"

"امی ٹھیک کہہ رہی ہیں ابو!" شیبا نے سنجیدہ نگاہوں سے ابو کو دیکھا۔

"ان لوگوں کو نہ اٹھنے بیٹھنے کی تمیز ہے نہ کھانے پینے کی' حتی کہ یہ تمیز تہذیب بھی نہیں کہ مہمان بن کر کسی کے گھر جاتے ہیں تو مہمان ہی رہتے ہیں' میزبان نہیں بنتے' کبھی کچن میں گھس رہی ہیں' کبھی کسی کے بیڈ روم میں بلا تکلف جا رہی ہیں۔ بچے پردوں سے لٹکیں یا صوفوں پر قلابازیاں کھائیں ان کی بلا سے۔"

"اچھا بھئی سب تو آپ کے ہم نوا ہیں۔ میری کون سنے گا۔" ابو نے چڑ کر خاموشی اختیار کرلی۔

اگلے دن دعوت ہوئی اور خوب ہوئی باربی کیو کے علاوہ کئی ایک پکوان پکے' میٹھے بنائے گئے' میزبان مہمان سب نے خوب ہی کھایا اور امی کوئی دل کی اتنی بری بھی نہیں تھیں' اچھی خاصی مقدار میں کھانا پیک کروا کر ڈرائیور کے ہاتھ امینہ پھپھو گھر بھجوایا۔

اگلے ہفتے عمیر بھائی کی سسرال میں سب کی دعوت تھی۔ عید کی دعوت' خوش تو سب ہی تھے مگر شیبا' اس کی خوشی کا عالم کچھ اور ہی تھا اور ساتھ ساتھ گھبراہٹ کا بھی۔

"کون سے کپڑے پہنوں' کیسا ہیر اسٹائل' کیسا میک اپ' جیولری' جوتی۔" ہر شے کے لیے سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی تھی۔

وہ ایسی نظر آنا چاہ رہی تھی کہ پھر اس کے علاوہ محفل میں کسی اور کا چراغ نہ جلے' اگر جلے بھی تو اس کے مقابلے میں بہت ہلکا' بہت مدہم۔

وہ اتنی خوب صورت' اتنی حسین لگنا چاہ رہی تھی کہ کسی کی نظروں میں اور دل میں فوراً ہی سما جائے' یا کم از کم نظر میں ہی سہی' جب کوئی نظر میں سما جاتا ہے تو دل تک پہنچنے میں زیادہ وقت تو نہیں لگتا نا تو شیبا ایسی لگنا چاہ رہی تھی کہ اسے اچھی لگے' جو شیبا کو اچھا لگنے لگا تھا۔ وہ ایسی ہی متاثر کن نظر آنے کے جتن کر رہی تھی جیسے وہ محفل میں چھا جاتا ہے' ایک ملاقات میں ہی چھا جاتا ہے' ایک بار بات کرتے ہی متاثر کرنے لگتا ہے' تو بس وہ بھی کچھ ایسی ہی بننا چاہ رہی تھی' لگنا چاہ رہی تھی۔

دعوت والے دن میزبانوں کے گھر شاید اتنی ہلچل اتنی گہما گہمی نہ ہو' جتنی مہمانوں کے گھر تھی' بڑی باجی ایک دن پہلے ہی میکے آچکی تھیں' تاکہ ان سب کے ساتھ ہی پارٹی میں جائیں۔

دوپہر کے کھانے سے فارغ ہوئے تو وہ سب سے پہلے کپڑے پریس کرنے بیٹھ گئیں۔

"سب کے نئے جوڑے ہیں۔ کیوں پریس کر رہی ہیں۔" فریحہ آپا نے اکتا کر انہیں دیکھا۔

"ہاں نئے تو ہیں پر میں نے سوچا پریس کرلیتی ہوں ذرا اور چمک جائیں گے۔"

"پہلے ہی اتنے چمک رہے ہیں ماشاء اللہ' کیا کریں گی اور چمکا کے؟" شیبا نے استہزائیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

"کیا مطلب؟" باجی بھی ان ہی کی بہن تھیں' چوکنا ہو کر اسے دیکھا۔

"کہاں سے شاپنگ کی تھی یہ؟" شیبا نے سوال کیا۔

"بہادر آباد سے لائی ہوں' اسپیشلی خریدے ہیں آج کی دعوت کے لیے۔" انہوں نے فخریہ بتایا۔

"لگ تو نہیں رہے' کیا سیل میں سے لیے تھے یا فٹ پاتھ پر سے؟"

"اچھا!" باجی نے برا مان جانے والی نظروں سے دونوں کو گھورا۔ "ان کی آدھی سیلری ان کپڑوں' جوتوں اور دوسری چیزوں پر خرچ ہوئی ہے۔"

"وہاں کے حساب سے پھر بھی ذرا ماٹھے لگ رہے ہیں۔" شیبا نے تبصرہ کیا۔

"ہاں تو لگنے دو' اب ہم ان کی طرح دبئی اور ہانگ کانگ سے تو شاپنگ کر نہیں سکتے۔" باجی نے اپنی شاپنگ کی ناقدری اور بے عزتی پر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"بچوں کو نہلانا بھی ہے' تیار بھی کرنا ہے' کتنا ٹائم لگ جائے گا۔" انہوں نے خود کلامی کی تھی مگر شیبا کو موقع مل گیا۔

"آپی' آپ ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ بچوں کو آج گھر پر چھوڑ جائیں۔"

"کیوں؟"

"آپ کے بچے جہاں جاتے ہیں پھر ہر جگہ یہی نظر آتے ہیں۔"

"تو بچے ہیں' باندھ کے تو رکھنے سے رہی' بچے بھی بڑوں کی طرح شرافت اور تمیز سے ایک جگہ بیٹھ جائیں تو انہیں بچہ کون کہے۔"

"بڑوں کی طرح نہ سہی' بچوں کی طرح ہی تھوڑی سی شرافت اور تمیز دکھادیں۔" اب کے فریحہ نے لب کشائی کی تھی۔

"میرے بچوں کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہو۔" وہ بری طرح چڑ گئیں۔ اس سے پہلے بھی ان سب نے ان کے بچوں کو لے کر باتیں بنائی تھیں' اب پھر۔ ہوا بنا کر رکھ دیا ہے عمیو کی سسرال کو' یہ نہ کرو' وہ نہ کرو' بچوں کو نہ لے جاؤ' میاں کو گھر پر بھول جاؤ' اپنی زبان گھر چھوڑ جاؤ۔ باجی کا موڈ بری طرح خراب ہو چکا تھا وہ بڑبڑانے لگیں۔

فریحہ نے شیبا کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا جو کچھ کہنے کے لیے منہ کھول رہی تھی۔ فریحہ کی آنکھوں کی گھوری دیکھ کر چپ ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

"تو آپ کی اسٹڈی کیسی جا رہی ہے شیبا؟" اپنے مخصوص ٹھہرے ٹھہرے نرم لہجے میں زوار اس سے مخاطب تھا اور اس کی ذرا سی توجہ' معمولی سے التفات سے ہی شیبا جیسے ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔

"ٹھیک ٹھاک۔" وہ مسکرائی۔

"صرف ٹھیک ٹھاک؟ ناٹ گڈ!"

"ہاں۔ اچھی جا رہی ہے۔" اب کے وہ گڑبڑائی۔

"ویل' آگے کیا ارادے ہیں؟" قیمتی ڈیزائنر کرتا شلوار میں زوار کی دراز قامتی اور وجاہت دونوں نمایاں تھیں۔

"ماسٹرز ہو جائے تو پھر سوچوں گی۔" شیبا نے گول مول جواب دیتے ہوئے چور نظروں سے اسے دیکھا۔ (اللہ کتنا ہینڈسم ہے)

"ہوں' فیوچر پلان' فیوچر میں ہی بنے گا۔" زوار مسکرایا۔

"جی؟" زوار کا تبصرہ اس کے سر پر سے گزر گیا ایک تو ویسے ہی اس کی قربت سے دل کی دھڑکن تیز ہوئی جا رہی تھی۔ وہ کچھ اور کنفیوز ہو گئی۔

"ایکسکیوزمی۔" زوار کو کوئی بلا رہا تھا وہ معذرت کر کے چلا گیا' مگر شیبا کتنی ہی دیر خود کو سنبھالتی رہی۔

"اف توبہ' دو جملوں اور پانچ منٹ میں ہی یہ شخص دوسرے کی جان نکال دیتا ہے۔" شیبا نے لان کے دوسرے سرے پہ کھڑے اس جادوگر کو دیکھا۔

"شیبا!" فریحہ اس کے پاس آئی۔

"تمہارا فون کب سے بج رہا ہے۔ اسے تو اٹینڈ کرو۔" انہوں نے شیبا کا سیل اس کی طرف بڑھایا۔

"کس کا ہے؟"

"واثق ہے۔"

"افوہ!" شیبا کے منہ کے زاویے بگڑنے لگے۔

"لائن کاٹ دیتیں۔"

"وہ پھر کر لے گا' تم خود ہی کہہ دو جو کہنا ہے۔" وہ وہاں سے چل دیں۔

"ہیلو' ہاں کیا بات ہے؟" دنیا جہاں کی بے زاری اور کوفت اس کے لہجے میں نمایاں تھی۔

"کہاں ہو' کب سے ٹرائی کر رہا ہوں' فون کیوں نہیں اٹینڈ کر رہیں تم؟"

"کر تو لیا اٹینڈ' اب بولو۔" وہ جھنجلائی۔

"کیا بات ہے تمہارا موڈ کیوں آف ہو رہا ہے۔"

"اف!" شیبا نے دانت پیسے۔

"ہم اس وقت عمیو بھائی کی سسرال میں ہیں دعوت میں۔" اس نے مختصراً بتایا۔

"اوہ ڈسٹرب کردیا میں نے۔"

"اب تو کردیا۔" شیبا نے اسے جتایا۔

"مجھے کچھ کہنا تھا تم سے۔" اس کے بے زار اور خشک لب و لہجے کو نظر انداز کر کے واثق نے تمہید باندھی۔

"آئی تھنک کہ کچھ نہ کہو تو اچھا ہوگا۔" شیبا کو اندازہ تھا وہ کیا کہنے جا رہا ہے' اس کی ذو معنی اور ادھوری باتیں' اس کے دل کا حال اور ارادوں کا پتا چکی تھیں۔

"میرے بغیر کہے میری فیلنگز سمجھتی ہو؟" واثق جذبوں سے بھرپور آواز میں چہکا۔

"یہ بات نہیں' میرا مطلب ہے کہ جن باتوں کے کہنے کا کوئی فائدہ نہ ہو' انہیں کہنے کی کیا ضرورت ہے۔" شیبا نے صاف صاف بات کی۔

"دل کے معاملات میں فائدہ نقصان کون دیکھتا ہے۔" واثق نے ایک گہری سانس لی۔

یہ کنگ آف رومانس۔ میرا موڈ اور پارٹی دونوں خراب کر کے ہی دم لے گا۔ شیبا نے ایک لمحے کو موبائل کان سے ہٹا کر سامنے لا کر گھورا' پھر دوبارہ کان سے لگایا۔

"کیا ہم بعد میں بات نہیں کر سکتے؟"

"ابھی کیا حرج ہے؟" واثق کی آواز بجھ سی گئی۔

"بتایا تو ہے اس وقت دعوت میں آئی ہوئی ہوں۔ میرے آس پاس لوگ موجود ہیں کتنا اوڈ لگ رہا ہے میں موبائل کانوں سے چپکا کر بیٹھ جاؤں' تم تو بات سے بات نکالنے میں ماہر ہو' صبح سے شام ہو جائے تمہاری باتیں نہ ختم ہوں۔"

"پھر کب فون کروں؟ کل کرلوں یا رات میں؟"

"نہ کل' نہ رات میں' دو چار دن میں کرلینا۔"

"دو چار دن میں تو میں خود ہی آجاؤں گا۔"

"اچھا بابا' خود آجانا' اب بس' خدا حافظ۔" شیبا نے جلدی جلدی بات ختم کی۔

"اچھا' خدا حافظ۔"

"اہلفی کہیں کا' چپک جائے تو جان ہی نہیں چھوڑتا۔" سیل آف کرتے ہوئے شیبا بڑبڑائی۔

پارٹی سے واپس آکر حسب روایت ان سب کے تبصرے شروع ہوگئے۔

"فارہ بھابھی کتنی پیاری لگ رہی تھیں نا آج۔" اریبہ میک اپ صاف کر کے چہرے پہ نائٹ کریم لگا رہی تھی۔

"وہ ہے ہی پیاری۔" بڑی باجی کے لہجے میں ستائش تھی۔

(سب سے پیارا تو بس ان کا بھائی ہے' دیکھتے جاؤ' آنکھیں نہ تھکیں' سنتے جاؤ سماعتیں متوجہ ہی رہیں' سوچتے جاؤ' دل کی دھڑکن لمحے بھر کے لیے بھی انکاری نہ ہو) شیبا ان سب کو دیکھتے ہوئے من ہی من میں مسکائی۔

"ویسے آج ہماری شبو بھی بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔" باجی نے بڑے دلار سے اپنی خوب صورت اور نک چڑھی بہن کو دیکھا اور شیبا جو آج کی دعوت میں باجی کے بچوں کی عظیم الشان حرکتوں پر ابھی ایک لیکچر دینے والی تھی' اک دم چپ ہوگئی' تعریف ہو رہی تھی لحاظ ضروری ہوگیا۔

"پارلر کا کمال۔" اریبہ نے نعرہ لگایا۔

"جلنے والے جلا کریں یہ نیچرل بیوٹی ہے' ہم غرور نہیں کرتے۔" شیبا نے ایک شان بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔

"مجھے تو شادی کی تیاریوں کی فکر ہو رہی ہے۔" باجی صاحبہ کو اچانک تشویش نے آن گھیرا۔

"خدا کے واسطے پاپوش یا لیاقت آباد مت پہنچ جانا شاپنگ کے لیے' ہمارے ساتھ چلنا' کسی اچھے سے مال لے چلیں گے تمہیں دولہا کی بڑی بہن ہو آخر' کسی سے کم نہیں لگنا چاہیے تمہیں۔" یہاں شفٹ ہو کر فریحہ کی بھی آنکھیں اور زبان دونوں کھل گئی تھیں۔

"پچاس ہزار کی کمیٹی ہے' منہ دکھائی بھی لینی ہے اس میں اور شادی کی تیاریاں بھی کرنی ہیں۔"

"باجی۔۔۔!" شیبا نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں "یہ آپ کے ٹٹ پونجیے سسرال کی کوئی شادی نہیں

ہے' یہ تو بہت کم رقم ہے' پھر اس میں منہ دکھائی بھی لیں گی؟"

"تو پھر؟ کیا کروں تم دے دو ادھار؟" انہوں نے موقع غنیمت جانا۔

"میں؟ لو بھلا میں کوئی کماتی ہوں کیا' امی' ابو سے یا بھائی سے بولیں۔" شیبا نے گڑبڑا کر دامن بچایا۔

"اچھا' پاگل ہو گیا؟" فریحہ نے اسے گھر کا۔ "شادی سر پر ہے' پانی کی طرح پیسہ جائے گا' امی کا ہاتھ ویسے ہی تنگ ہو رہا ہے' اس گھر میں آکر اخراجات ڈبل سے بھی زیادہ ہو گئے ہیں' اپنا پورا کریں گی یا آپ کو دیں گی۔"

"تم ہی دونوں اعتراض کر رہی تھیں' اس لیے کہہ دیا۔" باجی نے جوابا" کہا۔

☆ ☆ ☆

"وہ تمہاری شادی فریحہ آپا سے پہلے نہیں ہو سکتی؟" واثق نے پھر پوچھا۔ "نہیں' وہ بڑی ہیں' پہلے انہی کا رشتہ ہونا چاہیے۔" شیبا کے پاس پکا بہانہ موجود تھا۔

"آج کل تو ایسے رشتے عام ہیں' چھوٹوں کی پہلے ہو جاتی ہے' بڑوں کی بعد میں۔" واثق اس کے جواز کو خاطر میں نہ لایا۔

"ہاں عام ہیں مگر انسان اس سے ہرٹ ہوتا ہے خاص طور پر لڑکیاں' میں اپنی خوشیوں کا سامان کر کے اپنی بہن کو ہرٹ نہیں کروں گی۔"

"تو کب تک امید ہے ان کے رشتے وشتے کی۔"

"اللہ جانے' یہ سب تو اللہ کے ہاتھ میں ہے' جب اس کا حکم ہو گا تبھی کچھ کام بنے گا۔" شیبا نے ایک گہری سانس لی۔

"ان کا کیا ہوا' تمہاری فارہ بھابھی کے بھائی کا؟" واثق کو یاد آیا۔

"ان کا کیا ہونا ہے' یہ تو امی کا اور ہم لوگوں کا خیال ہے' اب عمیر بھائی نے یقین تو دلایا ہے کہ اپنی شادی کے بعد مناسب موقع محل دیکھ کر فارہ بھابھی سے بات کریں گے۔" شیبا نے پہلے کی بتائی ہوئی بات ایک بار پھر دہرائی۔

"عمیر بھائی کی شادی بھی بس قریب ہی ہے۔" واثق نے خیال آرائی کی۔

"ہاں' پہلے ان کی تو ہو جائے' تب ہی تو آگے کوئی اسٹیپ لے سکیں گے ـــــ اس سے پہلے کوئی چانس نہیں؟" واثق کے مایوس لہجے میں امید کی بھی ہلکی سی جھلک موجود تھی جیسے شیبا کوئی حوصلہ افزا بات کہہ دے' مگر یہ اس کی خام خیالی ہی تھی۔

شیبا کا دل چاہا کہ صاف صاف کہہ دے کہ چانس تو بعد میں بھی کوئی نہیں' مگر اسے کیا ضرورت تھی یہ کہہ کر واثق کو مزید اپنے پیچھے لگانے کی' وہ پھر ایسا پیچھے پڑتا کہ اس سے اگلوا کر ہی دم لیتا کہ وہ کہاں انٹرسٹڈ ہے' بہتر ہے کہ اسے ابھی ایسے ہی ٹہلایا اور بہلایا جائے۔

"وہ تمہیں پتا نہیں کیوں اتنی جلدی ہے' صبر بھی آخر کوئی چیز ہے۔"

"صبر؟ آہ کوئی میرے دل سے پوچھے یہ صبر بھی کتنا صبر آزما ہوتا ہے۔" واثق نے ایک آہ بھری اور محض آہ بھر کر ہی رہ گیا۔ شیبا نے جلدی سے خدا حافظ کر کے لائن کاٹ دی تھی۔

"اس ابلفی کا کیا کروں بری طرح چپک گیا ہے۔" شیبا نے واثق کے معاملے میں اریبہ کو اپنا رازدار بنایا تھا۔

"دیکھو نا ویسے تو واثق بھائی ٹھیک ٹھاک ہی ہیں پھر دل و جان سے تم پر فدا ہیں۔"

"بھلے سے وہ چمکتا ستارہ ہو' چاند ہو' چودھویں کا ـــــ مگر جب سورج طلوع ہوتا ہے نا تو ستارے کیا چاند بھی ماند پڑ جاتا ہے' کہیں نظر نہیں آتا' سورج کی روشنی ہی ہر طرف چھائی ہوتی ہے' مجھے بھی زوار کے سوا نہ کچھ دکھائی دیتا ہے نہ سجھائی دیتا ہے' کیا کروں؟" شیبا بے بسی کی تصویر بن گئی۔

"زوار بھائی کی طرف سے بھی کوئی بات ہے یا تم خود ہی پاگل ہو رہی ہو۔" اریبہ نے منہ پھٹ انداز میں سوال کیا۔

"وہ شخص زبان سے کچھ نہیں کہتا مگر اس کی آنکھیں بولتی ہیں۔" شیبا خیالوں میں کھو گئی۔

"اب یہ تو تمہیں ہی پتا ہوگا کہ ان کی آنکھیں کیا بولتی ہیں کیا نہیں، اور پھر ان کی فیملی؟ وہ لوگ اور زوار بھائی اس معاملے میں انٹرسٹڈ ہوئے اور بات آگے بڑھائی تو ان کی فیملی ایگری ہو جائے گی؟" اریبہ دور اندیشی سے ہر پہلو کو جانچ رہی تھی، پرکھ رہی تھی۔

"کیوں نہیں ہوں گے، جب وہ اس گھر میں بیٹی دے سکتے ہیں تو لے بھی سکتے ہیں۔" شیبا خوش فہمیوں کے پہاڑ کی سب سے بلند چوٹی پر بیٹھی تھی۔

"تم عمیر بھائی جتنی قابل اور باصلاحیت ہو؟" اریبہ نے اسے بغور دیکھا۔

"ان سے زیادہ خوب صورت ہوں، تعلیم میں بھی کسی سے پیچھے نہیں ہوں۔" شیبا کا فخر، غرور کے پردے میں بول رہا تھا۔

"ہاں مس ورلڈ ہو تم، مگر کیا یہ کافی ہے؟" اریبہ نے ٹھہر کر پوچھا۔

"بس یہی کافی ہے اور کیا چاہیے؟" شیبا نے کندھے اچکا کر بات ہی ختم کر دی۔

☼ ☼ ☼

عمیر بھائی کی شادی اتنی دھوم دھام اور شان و شوکت سے ہوئی تھی کہ سارا خاندان ہی دنگ رہ گیا تھا دلہن والوں کی شان تو دیکھنے کے قابل تھی ہی، مگر دولہا والوں نے بھی کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ عالی شان بری، شان دار تقریبات درجنوں کے حساب سے مہنگے سے مہنگے پکوان، یادگار شادی تھی جو مدتوں لوگوں کو یاد رہنی تھی۔

ولیمہ اور چوتھی کی رسومات سے فارغ ہو کر دولہا دلہن ہنی مون منانے ملائشیا پہنچ گئے۔

پیچھے امی اخراجات کا حساب لگا رہی تھیں اور سر پکڑ کر بیٹھ رہی تھیں ساری بچت، بیٹوں کی کمائیاں، بنک بیلنس صفر کے قریب تھا۔

"میری پیاری مما جانی، کیوں ٹینشن لے رہی ہیں، ہم لوگ ہیں نا پھر سے ریل پیل ہو جائے گی پیسوں کی، عمار کی جاب بھی لگنے والی ہے، سب کور ہو جائے گا پھر عمیر بھائی کے ڈالرز بھی آئیں گے، دیکھیے گا پہلے سے بھی زیادہ کھلا ہاتھ ہو جائے گا آپ کا۔"

احمد اور حماد دونوں ماں کو تسلیاں دے رہے تھے ان کی چھٹیاں بھی اختتام پذیر تھیں، اگلے ہفتے انہیں ملائشیا واپس لوٹ جانا تھا۔

"عمیر نے تو فی الحال صاف منع کر دیا ہے، اس کی طرف سے کوئی آسرا نہیں ہے وہ خود بے چارہ کنگال ہو رہا ہے، اس کے جانے کے بعد اس گھر کا کرایہ اور دوسرے خرچے بھی ہمیں ہی دیکھنے ہیں۔" امی کی پیشانی پہ تشویش کی لکیریں کم نہیں ہوئی تھیں۔

"سب ہو جائے گا امی! دو گھروں اور چار دکانوں کا کرایہ ٹھیک ٹھاک آتا ہے اور ابو کی سیلری بھی اچھی خاصی ہے، ہماری انکم ہے، آپ ریلیکس رہیں، زیادہ مت سوچیں۔"

"ہاں یہ تو سب ٹھیک ہے بیٹا! پر جتنی زیادہ آمدنی ہے اتنے ہی خرچے بھی ہیں چلو خیر اللہ مالک ہے۔" انہوں نے ایک گہری سانس لی۔

☼ ☼ ☼

بیٹا بہو ابھی ہنی مون سے نہیں لوٹے تھے مگر ایک خوش خبری پہلے ہی گھر آ گئی۔ دور پار کے رشتے داروں کی طرف سے فریحہ کا رشتہ آیا تھا۔ کاروباری لوگ تھے مین مارکیٹ میں سب بھائیوں کی الگ الگ دکانیں تھیں، لوگ شریف تھے، لڑکا سلجھا ہوا تھا، دیکھنے میں بھی اسمارٹ سا تھا۔ ابو راضی تھے امی متذبذب تھیں عمیر آتا تو اس کی رائے لے کر پھر کوئی فیصلہ کرتیں۔

باجی نے سنا تو دوڑی چلی آئیں۔

"اتنا اچھا رشتہ ہے فوراً "ہاں" کر دیں لاکھوں کا چلتا ہوا کاروبار ہے۔"

"ہاں ان کے حساب سے تو اچھا ہی ہے۔" شیبا نے تمسخر سے انہیں دیکھا۔

"تم کر لوگی دکان دار سے شادی؟" روئے سخن فریحہ

کی طرف ہوا۔

"کیوں' دکان دار میں کیا برائی ہے؟" فریحہ کا لہجہ تیکھا تھا۔

"برائی تو خیر کوئی نہیں بس ذرا کسی کو بتانے میں اوڈ سا لگے گا' لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے۔" شیبا نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔

"جس کو جو سوچنا ہے سوچے' کہنا ہے کہے' ہمیں تو حقیقت پسند بن کر اپنا فیصلہ کرنا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ میرے اب تک جتنے بھی پروپوزل آئے ہیں' ان میں سب سے بہتر یہی ہے اور آئندہ کے لیے میں بے کار کی کوئی امید کیوں باندھوں کہ اس سے بہتر کوئی آئے گا ہو سکتا ہے' آجائے اور ہو سکتا ہے کہ نہ آئے پھر؟" فریحہ نے ایک چھوٹی سی تقریر جھاڑ دی۔

"مرضی ہے تمہاری' ویسے خواب اونچے ہی دیکھنا چاہئیں' تعبیر مل ہی جاتی ہے۔"

"اڑان اتنی ہی اونچی بھرنی چاہیے' جتنا پروں میں دم ہو' اپنی اوقات سے زیادہ اڑنے میں انسان تھک ہار کر نیچے بھی آن گرتا ہے۔" فریحہ نے اس کی رائے سے اختلاف کیا۔

"اونچے خواب' اونچی اڑان کا حوصلہ بھی دیتے ہیں اور ہمت بھی' پہلے سے ہی سوچ لینا کہ ہمیں اس سے بہتر نہیں ملے گا اس سے اچھا نہیں ملے گا۔ بے وقوفی ہے۔" شیبا اپنی بات پر قائم تھی۔

"اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا بے وقوفی نہیں ہوتی۔" فریحہ نے آہستہ سے اسے سمجھایا تھا۔

"بس پاؤں سکیڑتے رہو چھوٹی چادر میں' اسے بڑا کرنے کی کوشش نہ کرو' بہت خوب۔" شیبا نے استہزائیہ انداز میں بولتے ہوئے اپنے بال جھٹکے' یہ نیا ہیر اسٹائل اس پر بہت جچ رہا تھا۔

"تمہارا ایسا کوئی رشتہ آئے تو بے شک انکار کر دینا' مجھے کیوں فورس کر رہی ہو۔" فریحہ نے اسے گھورا۔

"میرا رشتہ تو ایسا آئے گا کہ دیکھتی رہ جاؤ گی۔" شیبا نے کچھ کہے بغیر فقط مسکرانے پر ہی اکتفا کیا۔

"شکر ہے چپ تو ہوئی۔" فریحہ نے دزدیدہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

☆ ☆ ☆

عمیر بھائی کے آنے سے پہلے امینہ پھوپھو آ گئیں' مٹھائی لے کر' بڑے بیٹے کا رشتہ طے کر دیا تھا۔

"بہت بہت مبارک ہو تمہیں۔" امی نے مصنوعی گرم جوشی سے رسم دنیا نبھائی۔

"آپ کو بھی سلامت ہو بھابی بس بیٹی کی فکر ہے اللہ اس کو بھی اپنے گھر بار کا کر دے۔" امینہ پھپھو اپنی مخصوص سادگی سے گویا ہوئیں۔

"کوئی رشتہ وشتہ دیکھا اس کے لیے؟"

"ہاں' ہاں... ابھی تو نہیں پر ایک دو لوگوں سے کہا ہوا ہے' وہ جان پہچان ابھی زیادہ نہیں ہے نا' غیروں میں بیٹی دیتے ہوئے ڈر سا لگتا ہے۔" وہ جھجکتے ہوئے کچھ کہنا چاہ رہی تھیں شاید۔

"ارے اب تو زیادہ تر رشتے غیروں میں ہی ہو رہے ہیں ہم اپنے اریب قریب اپنے جوڑ کی کوئی فیملی دیکھ لو' اللہ بہتر کرے گا۔" امی کا نرم لہجہ تسلی دینے والا تھا کچھ دیر رک کر وہ پھر شروع ہوئیں۔

"رشتے ناتے برابر کے لوگوں میں کرنے چاہئیں' نہ اپنے سے بہت نیچا دیکھو نہ بہت اونچا' ایڈجسٹ ہونے میں پریشانی نہیں ہوتی پھر۔" امی نے انہیں جتایا۔

"ہاں یہ تو ہے۔" وہ پھیکی سی مسکراہٹ لبوں پہ لے آئیں۔

"چلو اچھا ہے' ایک بیٹے کے فرض سے فارغ ہونے جا رہی ہو' ہم بھی بہت جلد مٹھائی کھلائیں گے تمہیں' ہمارے بیٹوں کے رشتے تو گھر بیٹھے آ رہے ہیں' ڈیفنس' گلشن' کلفٹن بڑی اونچی اونچی فیملیز ہیں' پڑھی لکھی لڑکیاں' خوب صورت' دو تین لڑکیاں سمجھ میں آئی تو ہیں ان کو فائنل کر لیں گے ہم۔" امی نے آرام آرام سے بتاتے ہوئے انہیں بہت کچھ جتا دیا۔

امینہ پھپھو کی آنکھوں میں آس کی دھیمی سی شمع روشن تھی جو امی کے لفظوں کے ساتھ ساتھ بجھتی چلی

گئی۔

"اللہ سب کا نصیب اچھا کرے۔" وہ دھیرے سے بولتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"آمین۔" امی نے خضوع خشوع کے ساتھ کہا۔

"اچھا ہوا آپ نے ٹرخا دیا' زبردستی کسوڑہ بن رہی ہیں۔" امینہ پھوپھو کے جانے کے بعد شیبا نے تبصرہ کیا۔

"ہاں دیکھو ذرا' ایک بار منع کر دیا' پھر بھی باز نہیں آئیں' ابھی کل پرسوں تمہارے ابو نے پھر یہی ذکر چھیڑا ہوا تھا کہ سعد کو عباد کے لیے لے لو اچھی لڑکی ہے اپنے ہیں' فلانا ڈھماکا میں نے تو صاف کہہ دیا کہ اس معاملے میں بولنے کی ضرورت نہیں ہے' میں خود ہی لڑکیاں چھانٹ لوں گی اپنے بیٹوں کے لیے۔" امی ہاتھ چلا چلا کر جس غرور سے یہ سب کہہ رہی تھیں وہ قابل دید تھا۔

عمیر اور فارہ ہنی مون سے لوٹ آئے تو فریحہ کے پرپوزل پہ بات ہوئی۔

"ارے میں نے کہا عمیر بیٹا! ہو سکے ذرا اس گن تو لے اس کا بھائی کیسا رہے گا اپنی فریحہ کے لیے۔" امی نے لجاجت سے بیٹے کو مخاطب کیا۔

"مشکل ہے امی' میں نے گول مول انداز میں فارہ سے بات کی تھی' میرا نہیں خیال کہ وہ لوگ اس معاملے میں انٹرسٹڈ ہوں۔"

"اچھا!" امی نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ "میں تو سوچ رہی تھی کہ تمہاری ساس سے خود بات کر لوں' ارے ماڈرن سوسائٹی میں تو یہ سب چلتا ہے۔ پھر تیری ساس ہے بھی تو کتنی نرم مزاج کتنا میٹھا بولتی ہے' مانو شہد ٹپک رہا ہو لہجے میں' بڑے اچھے سبھاؤ ہیں ان کے۔" امی نے تعریفوں کے پل باندھے۔

"یہ سب ٹھیک ہے مگر امی پلیز! آپ اس ٹاپک کو اب یہیں ختم کریں۔" عمیر کا لہجہ کچھ بے زاری لیے ہوئے تھا۔

امی چپ ہو گئیں' پھر کچھ دیر بعد گویا مایوسی کے عالم میں بولیں۔

"پھر؟ اسی رشتے کو ہاں کر دوں؟"

"اگر آپ کو ٹھیک لگ رہا ہے تو ہاں کر دیں۔" عمیر نے نارمل انداز میں بولتے ہوئے کندھے اچکائے۔

فریحہ کا رشتہ طے ہو گیا' نہ نہ کرتے بھی منگنی کی چھوٹی سی تقریب منعقد ہو ہی گئی۔ عمیر اور فارہ کو اگلے ہفتے نیویارک چلے جانا تھا۔

"تمہاری آپا کی منگنی کی جتنی زیادہ خوشی مجھے ہوئی ہے' کسی کو نہیں ہوئی ہو گی' پتا ہے کتنی دعائیں مانگی تھیں ان کے لیے۔" منگنی کی مٹھائی کھاتے ہوئے واثق شیبا سے مخاطب تھا۔

"اتنے دل سے دعا اپنے لیے کرتے تو تمہیں بھی کوئی اچھی لڑکی مل جاتی۔"

"اچھی لڑکی' تو میں دیکھ چکا ہوں' بس اب ہماری باری ہے۔"

"خوابوں کی دنیا میں زیادہ نہ رہا کرو۔" شیبا نے مذاق اڑایا۔

"محبت میں انسان خوابوں کی دنیا میں ہی رہتا ہے' تم اپنی کہو' تم نے کہا تھا کہ فریحہ آپا کا رشتہ ہو جائے تو پھر اپنے بارے میں سوچو گی۔" وہ سنجیدہ ہوا۔

"ابھی تو مجھے اپنا ماسٹرز کمپلیٹ کرنا ہے' پھر اس کے بعد سوچوں گی کچھ۔" شیبا نے بھی سنجیدگی سے اسے جواب دیا۔

"تم ماسٹرز کرو پی ایچ ڈی کرو' مجھے کوئی اعتراض نہیں بس پہلے" "تم اعتراض کرنے والے ہوتے بھی کون ہو؟" شیبا نے درشت لہجے میں بولتے ہوئے اس کی بات کاٹی۔

"تمہاری نازک سی جان پر اتنا غصہ اچھا نہیں لگتا۔" اس کے لہجے پر حیران ہوتے ہوئے واثق نے خود کو سنبھالا۔

"ہر وقت چھچھورپن مت دکھایا کرو' مانا کہ زیادہ پڑھے لکھے نہیں ہو' مگر کوشش تو کر سکتے ہو اپنے اندر ـــ"

"میں چھچھورا ہوں؟" واثق نے تند لہجے میں اب

کے اس کی بات کاٹی۔
"ایسی باتیں کرو گے تو یہی کہا جائے گا۔"
"یہ جو چار دن کا نشہ چڑھا ہوا ہے نا' یہ اتر جائے تو پھر بات کرنا مجھ سے۔" واثق غصے میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چل دیا۔
"خس کم جہاں پاک۔" شیبا مطمئن ہو گئی۔ اب ناک کا معاملہ تھا۔
اب واثق خود سے کوئی رابطہ اس وقت تک نہیں کرے گا جب تک کہ شیبا اس سے سوری نہیں کرتی اور شیبا کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ زوار کے ساتھ فیس بک کے ذریعے رابطے میں رہتی تھی۔
کوئی خاص بات نہیں' بس کبھی کوئی اچھا شعر' کوئی خاص قول' حال احوال ہلکی پھلکی سی گپ شپ' شیبا بہت محتاط ہو کر چل رہی تھی۔
عمو اور فارہ کی روانگی سے قبل فارہ کی فیملی نے ان سب کی دعوت کی تھی۔
"یہ لوگ ہر دعوت ہوٹل میں کیوں کرنے لگے' ہر بار ٹیبلز ریزرو ہو جاتی ہیں اور گھر کے ایک دو افراد نمائندگی کے لیے پہنچ جاتے ہیں۔" اریبہ نے کوئی اعتراض تو نہیں کیا تھا بس یونہی تبصرہ کیا تھا مگر شیبا کو برا لگ گیا۔
"تم لوگ مڈل کلاس ذہنیت سے کبھی باہر نہیں آؤ گے' بھئی بڑے لوگوں کی بڑی باتیں' ہائی سوسائٹیز میں ایسی دعوتیں عام سی بات ہے۔"
"تم بڑی حمایتی بن رہی ہو۔" اریبہ نے اسے گھورا۔
"زوار نے میرے ذوق کی بڑی تعریف کی ہے۔" شیبا نے اس کے قریب ہو کر بتایا آواز دھیمی مگر پرجوش تھی۔
"ہائیں' کیا تم نے انہیں بتا دیا کہ تم انہیں لائیک کرتی ہو۔" اریبہ نے مسکرا کر اسے دیکھا۔
"جی نہیں' ویسے ہی تعریف کی ہے۔" شیبا جھینپ سی گئی۔
"خالی خولی تعریفوں سے کیا ہوتا ہے' کوئی ٹھوس' واضح بات ہونی چاہیے۔"
"تعریف سے ہی تو بات شروع ہوتی ہے' معاملے کا آغاز ہوتا ہے۔"
"فلرٹ کا آغاز بھی تعریف سے ہی ہوتا ہے۔"
"شکل اچھی نہ ہو تو بات تو اچھی کر لیا کرو۔" شیبا چڑ گئی۔
اریبہ کو ہنسی آ گئی۔
"خوش فہمیوں اور بے وقوفیوں کی اگر کوئی حد ہوتی ہے تو تم پر ختم ہے۔"
"ہاں' تم تو جیسے دماغ کی ارسطو اور عقل کی افلاطون ہو۔" شیبا نے احتجاجاً" واک آؤٹ کیا۔

☼ ☼ ☼

امی نے مٹر چھیلتے ہوئے جو اطلاع دی تھی اسے سن کر فریحہ اور اریبہ تو نارمل ہی تھیں مگر شیبا اچھل پڑی۔
"کیا کہہ رہی ہیں امی' میں نہیں جاؤں گی واپس۔" اس نے تقریباً" پیر پٹختے ہوئے کہا تھا۔
"جانا تو پڑے گا' بھئی اب اس ہاتھی کو پالنا میرے بس کی بات نہیں ہے' اخراجات قابو سے باہر ہوتے جا رہے ہیں' ابھی فریحہ کی شادی کی تیاریاں کرنی ہیں تم سب کی شادیاں کرنی ہیں' کہاں سے بچت کروں؟ بنگلے کا کرایہ' یوٹیلیٹی بلز' دوسرے الابلا خرچے' عمو کی شادی کی وجہ سے یہ سب کرنا پڑا' میری ہمت نہیں ہے اتنے بکھیڑے سمیٹنے کی۔"
"اچھی خاصی ارننگ ہے امی ہماری' آپ کو پھر بھی کم لگتی ہے۔" شیبا نے بدمزہ ہو کر تنقید کی۔
"خرچے بھی تو اچھے خاصے ہیں۔" امی نے اسے گھور کے دیکھا۔
"عمو کی شادی کر کے بالکل خالی ہو گئی ہوں۔ اب تم سب کے لیے جوڑنا ہے یا نہیں' ایک ایک شادی کے لیے کئی کئی لاکھ چاہئیں' یہاں کون سی ملیں'

فیکٹریاں چل رہی ہیں جو سب کچھ آرام سے ہو جائے گا۔" امی نے اسے جھاڑ کے رکھ دیا' شیبا کا موڈ اور بھی آف ہو گیا۔

"بتاؤ ذرا' اب پھر اسی پھٹیچر گھر اور علاقے میں جانا پڑے گا۔" عباد کے آگے وہ روہانسی سی ہو گئی۔

"جتھے دی کھوتی اتھے آن کھلوتی۔" وہ من موجی ہر حال میں مست رہنے والا تھا' قہقہہ لگانے لگا' شیبا کی رونی صورت دیکھ کر باقیوں کو بھی جانے کیوں ہنسی آ رہی تھی۔

"دو چار مہینے تو رک جائیں۔" اس نے آخری کوشش کے طور پر امی سے پھر کہا۔

"دو چار مہینے میں کیا انقلاب آئے گا؟"

"کیا پتا آ ہی جائے۔" وہ دبے لفظوں میں بڑبڑائی' آج کل اسکائپ کے ذریعے زوار سے اچھی خاصی قربت اور شناسائی ہو رہی تھی۔

"کرایہ دار اگلے ماہ ہمارا گھر خالی کر دیں گے' یہاں کا ایگری منٹ بھی تب تک ختم ہو جائے گا' میری تو جان چھوٹے۔ ہر ماہ مٹھی بھر کرایہ دینے سے میں تو عاجز آ گئی۔" امی تو ناک منہ تک بھری بیٹھی تھیں۔

شیبا نے مایوسی سے انہیں دیکھا اور ایک آہ بھر کر اٹھ گئی۔

"یونہی کیا؟"

"پتا نہیں کیوں آج اداسی نے اپنے گھیرے میں لیا ہوا ہے۔"

"اوہ تب ہی میں سوچ رہا تھا کہ آج موسم کیوں اتنا اداس اداس ہے۔"

شیبا پڑھ کر مسکرا دی۔

"اسمائلنگ فیس؟"

"یس.....!"

"گڈ' تم ہنستی اچھی لگتی ہو۔"

"اس کا مطلب ہے میں بغیر ہنسے اچھی نہیں لگتی۔" شیبا نے بات کو آگے بڑھایا۔

"تم ہر حال میں اچھی لگتی ہو۔"

"روتی ہوئی بھی؟"

"کبھی دیکھا نہیں روتے ہوئے اور خدا نہ کرے کہ دیکھوں' آنسوؤں سے ڈر لگتا ہے' بھئی اسپیشلی کسی لڑکی کی خوب صورت آنکھوں میں آئیں تو....."

"آنسو خوشی کے بھی تو ہوتے ہیں۔"

"ہم... م... دیٹس دا پوائنٹ۔"

"پھر ہار مانی۔"

"بالکل۔"

"ہاہاہا۔" ایک اسمائلنگ فیس اسکرین پر نمودار ہوا۔

☼ ☼ ☼

"آپ اداس ہوں تو کیا کرتے ہیں؟"

"اداس ہونے کا وقت ذرا کم ہی ملتا ہے' پھر بھی اگر ایسی کوئی سچویشن ہو تو میوزک سن لیتا ہوں۔"

"کس قسم کا؟"

"کوئی بھی اچھا لائٹ سا۔"

"کبھی کسی سے بات کر کے بھی اداسی ختم ہو سکتی ہے نا۔"

"ہاں۔ بالکل' کوئی جو ہم سے کلوز ہو' اس سے بات کر کے بھی انسان فریش ہو جاتا ہے' مگر خیریت تو ہے؟"

"ہاں بس یونہی۔"

گھر کی شفٹنگ اور سیٹنگ میں کافی ٹائم لگ گیا' ابو اور عباد خوش تھے' پرانی گیدرنگ میں آ کر' امی مطمئن ہو کہ بجٹ کافی ہلکا اور کم ہو گیا تھا' اریبہ کالج کی پڑھائی میں مگن ہو گئی' فریحہ اپنی شادی کی تیاریوں میں مصروف تھی' ایک شیبا تھی کہ چپ چپ پریشان سی ہو گئی تھی' سمسٹر قریب تھا اور پڑھائی میں دلچسپی ہنوز غائب' ان ہی اونگھتے اور روتے بسورتے دنوں میں ممانی' ماموں کے ساتھ ہانیہ آئی۔

امی نے بڑی گرم جوشی اور تپاک سے استقبال کیا وہ لوگ بھی تو بہت عرصے میں آئے تھے۔ فریحہ آپا فوراً کچن میں گھس گئیں۔

ہانیہ بلا تکلف سب سے باتیں بگھار رہی تھی' آخر اتنے دنوں کی کسر تھی جو آج ہی پوری ہوئی تھی۔

"ارے واثق نہیں آیا کافی دنوں سے۔۔۔ مصروف ہے کیا آج کل؟" امی کو بالآخر بھتیجے کا خیال آ ہی گیا۔

"باہر جانے کی کوشش میں ہے' کسی کمپنی میں اپلائی کیا ہے' امید تو ہے کہ کام ہو جائے گا۔" ماموں نے جواب دیا۔

"اچھا اچھا' چلو بھئی یہ تو بہت اچھی خبر سنائی آپ نے' اللہ کرے کہ بیٹے کا مستقبل بھی سنور جائے۔"

امی ابو سمیت سب نے ہی خوشی کا اظہار کیا' ایک شیبا تھی جو نفس سی بیٹھی تھی۔

"میری بلا سے باہر جائے یا اندر مجھے کیا۔" اس نے بے زاری سے سوچا۔

"بھائی آپ سے ناراض ہیں۔" ہانیہ نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"مرضی ہے آپ کے بھائی کی' میں کیا کر سکتی ہوں۔" شیبا نے کندھے اچکائے۔

"منا تو سکتی ہیں۔"

"مجھے کیا ضرورت ہے تمہارے بھائی کو آسمان پہ چڑھانے کی۔" شیبا نے اسے گھورا۔

"کسی کے جذبات کو یوں ٹھیس نہیں پہنچاتے۔" ہانیہ نے لب بھینچ لیے۔

"کسی کے پیچھے زبردستی لٹھ لے کر بھی نہیں پڑتے' اگلا بندہ سنے نہ سنے' آپ اپنی بین بجاتے جائیں۔"

"آپ خود کو بھینس کہہ رہی ہیں؟" ہانیہ کو اس کی مثال پر ہنسی آ گئی۔

"کیا؟" شیبا چڑ گئی۔ "تم دونوں بہن بھائی ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہو۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بھائی چاہتے ہیں کہ آپ بھی اسی تھیلی میں آ جائیں۔" ہانیہ اپنے بھائی کی ٹھیک ٹھاک وکالت کر رہی تھی۔

"تمہارے بھائی کا یہ خواب کبھی پورا نہیں ہو گا۔" شیبا تنتناتی ہوئی چل دی۔

"کیسی ہو گئی ہے زندگی' عجیب ادھوری ادھوری سی اندھیرا اجالا سی' کبھی کہیں پل بھر کو جیسے روشنی کا کوندا سا لپکتا ہے' یوں لگتا ہے کہ بس اب اجالا ہی اجالا ہر طرف ہو جائے گا' مگر پھر اک دم وہی تاریکی' وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی رہتی' سوچتی رہتی۔ زوار کے ساتھ رابطہ بھی تھا' باتیں بھی' مگر عجیب سی آنکھ مچولی تھی' اس کی عام سی باتیں بھی ذومعنی لگتیں' ان چھوٹے چھوٹے جملوں اور فقروں کو اپنے مطلب کے مطابق ڈھال کر گھنٹوں خوش ہوتی رہتی پھر یکدم اداس۔

"ٹھیک ہی تو کہتی ہے اریبہ' کوئی واضح بات تو ہو کہ کنارا ملے' یہ کیا کہ بس لہروں کے سنگ سنگ ڈولتے رہو۔"

روز رات کو کبھی خوب صورت خوابوں کے ہمراہ' کبھی منتشر خیالات کی ہمراہی میں وہ نیند کی وادی میں پہنچ جاتی۔

☼ ☼ ☼

عمیر بھائی اور فارہ بھابھی سے بڑے دنوں بعد بات ہوئی تھی' دونوں ہی بہت مصروف رہنے لگے تھے' مگر خیر۔

"اور سناؤ بیٹا' تمہاری سسرال میں تو سب خیریت ہے نا۔" امی نے کراچی والوں کی خیریت امریکہ والوں سے دریافت کی تھی۔

"جی ہاں خیریت ہی ہے' بس ذرا فارہ کی ممی پچھلے دنوں ہاسپٹلائزڈ تھیں۔"

"ہائیں کیوں؟"

"شوگر ہائی ہو گئی تھی' کچھ اور بھی پرابلمز ہیں انہیں' آپ فون کر کے پوچھ لیجئے گا۔"

"ارے فون سے کیا ہو گا' ہم گھر ہو آئیں گے۔ بیمار کی عیادت کرنا ثواب ہے۔ اور تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ اسپتال ہو آتے ہم۔"

"فون کر لیجئے گا امی' کافی ہے۔"

"اچھا!" امی نے ہاں میں ہاں ملا کر بات ختم کی مگر کرنا انہیں وہی تھا جو ان کے دل میں تھا۔

"فارہ کی ممی کو دیکھنے جانا ہے' کون چلے گا میرے

ساتھ؟"

"میں چلوں گی۔" شیبا کے تو دل کی مراد بر آئی تھی۔ عباد کو بھی ساتھ لے لیا گیا کہ گاڑی اسے ہی ڈرائیو کرنی تھی۔

شیبا نے چلنے سے پہلے زوار کو فون کر دیا تھا۔

"موسٹ ویلکم' اتفاق سے میں آج گھر پر ہی ہوں۔" زوار کی آواز سے بہت خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"تو' لکی ڈے ہے آج؟" شیبا نے اس کی بے پناہ خوشی کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"آف کورس' آج بہت لکی ڈے ہے میرا' آپ آئیں گی نا تو آپ کو تفصیل سے بتاؤں گا۔" زوار نے جلد آنے کی تاکید کرتے ہوئے فون آف کیا تھا۔

شیبا اپنی پوری زندگی میں اتنی خوش پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی' بہت دل اور ٹائم لگا کر تیار ہوئی تھی وہ۔

"اب بس بھی کر جاؤ لڑکی' جلدی باہر آجا' بیمار کو دیکھنے جا رہے ہیں' شادی نہیں ہے کسی کی' سنگھار ہی ختم ہونے میں نہیں آ رہے۔" امی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔

"آ رہی ہوں امی' بس پانچ منٹ۔" وہ اپنے گیسو سنوار رہی تھی' سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا اسٹائل دے' اوپر سے امی کے بلاوے۔ اب تو عباد بھی دو تین بار ہارن دے چکا تھا۔

"میں جا رہی ہوں' تم آتی رہنا بعد میں۔" امی کی زوردار آواز میں دھمکی پر وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکلی۔

"آ تو رہی ہوں۔" شیبا نے جلدی جلدی دوپٹا کندھوں پر برابر کیا اور امی کے ہمراہ باہر نکل کر کار میں بیٹھ گئی۔

"میں آپ دونوں کو وہاں چھوڑ کر زبیر کی طرف چلا جاؤں گا۔" عباد نے ڈرائیونگ کے دوران اطلاع دی۔

"اچھا۔" امی نے کوئی خاص نوٹس نہیں لیا۔ اس کی عادت تھی وہ کسی کے بھی گھر ذرا کم ہی جاتا تھا۔ بحالت مجبوری جانا پڑتا تو گھر والوں کو چھوڑ کر دوستوں کے پاس نکل جاتا اور پھر لینے آجاتا۔

"لینے کب آؤں' آپ دونوں کو؟"

"ابھی سے کیا بتاؤں' جب آنا ہو گا' شیبا میسج کر دے گی' کیا پتا عمیر کی ساس کھانے پہ روک لیں' ہیں تو بڑی خوش اخلاق اور ــــ سمدھیانہ ہے' کوئی مذاق تھوڑی ہے۔" امی کے لہجے میں بیٹے کی ماں ہونے کا تفاخر در آیا۔

عباد تو انہیں اتار کر باہر سے باہر ہی ہوا ہو گیا۔

"جب چلنے کا ارادہ ہو میسج کر دینا۔" ایک بار پھر تاکید کر کے اس نے گاڑی بھگائی' ملازمہ نے اندر بٹھا دیا تھا۔

"میں بیگم صاحبہ کو بتا کر آتی ہوں جی!" ملازمہ مڑی

ہی تھی کہ زوار اندر آگیا۔ شیبا کا دل انوکھی تال پر دھڑک اٹھا۔
معمول کی طرح وجیہہ اور پر اعتماد' وہ بہت خوش اخلاقی سے امی سے حال احوال پوچھ رہا تھا۔
"آپ بہت خوش لگ رہے ہیں آج؟"
زوار کے چہرے پہ I am so happy کا اتنا بڑا چمکتا دمکتا سا سائن بورڈ لگا تھا کہ شیبا پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔
"ارے... کیا واقعی؟" وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔
"آج میں واقعی بہت خوش ہوں۔"
"وجہ؟"
"وجہ... بتاؤں گا ابھی تھوڑی دیر میں۔" اس کی گہری نظریں بھی شیبا نے خود پر محسوس کیں۔
اس نے نظریں اٹھا کر زوار کو دیکھا کچھ کہنے کو اس کے لب تھرتھرائے' مگر پھر امی کی موجودگی کا سوچ کر وہ خاموش ہو گئی۔
"آپ لوگ پلیز بیٹھیں' میں ابھی آتا ہوں۔" زوار معذرت کر کے اٹھا۔
"کہاں چل دیے؟" شیبا نے بے چین ہو کر اسے دیکھا۔
شیبا کا موبائل بج رہا تھا اس نے بیگ سے نکالا۔
"اف!" اس نے ایک نظر موبائل اسکرین پر اور ایک نظر امی پر ڈالی۔

"آج تو اس واثق کے بچے کو کھری کھری سنا کر معاملہ ایک طرف کرنا ہے۔" اس نے دانت پیستے ہوئے مصمم ارادہ کیا' مگر امی کی موجودگی کا احساس ہوتے ہی سارا غصہ اور جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔
"خیر یہ بھی کوئی مسئلہ ہے۔" وہ موبائل ہاتھ میں لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔
"امی! میں ابھی آئی۔"
"کس کا فون ہے؟"
"سہیلی کا ہے۔ بند کمرے میں سگنل کم آتے ہیں۔" وہ جھپاک سے باہر نکل گئی۔

موبائل کان سے لگا کر ہیلو کرتے کرتے وہ لاؤنج کا دروازہ کھول کر باہر آگئی۔
"ہیلو' ہیلو' بھئی زور سے بولو' آواز بہت کم آرہی ہے تمہاری۔"
"اور کتنا اونچا بولوں؟" شیبا کا موڈ مزید آف ہونے لگا۔
"اچھا' میں دوبارہ کرتا ہوں اب تو بالکل آواز نہیں آرہی تمہاری۔" واثق نے لائن ڈسکنکٹ کر دی۔
شیبا کچھ دیر کھڑے ہو کر کچھ سوچتی رہی پھر اس نے موبائل آف کر دیا۔ کیا ضرورت ہے یہاں اپنا موڈ اور وقت خراب کرنے کی' واثق سے بات گھر پر بھی ہو سکتی ہے۔
وہ جانے کے لیے مڑی پھر ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔
ہرے بھرے لان میں خوب صورتی اور دلکشی پھولوں کی شکل میں بکھری پڑی تھی' پچھلی بار کے مقابلے میں بڑی خوب صورت تبدیلی آئی تھی لان میں' وہ مبہوت ہو کر آگے بڑھتی رہی جھومتے درخت مسکراتے پھول' مخملیں گھاس' لان کے بیچوں بیچ سرمستی میں اچھلتا ہوا فوارہ۔
وہ دلچسپی سے دیکھتے دیکھتے بے خیالی میں کافی آگے چلی گئی تھی۔
"پھر کیا کروں؟ بتائیں۔" زوار کی آواز سن کر وہ اک دم اچھل پڑی اور حیرانی سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔
"اوہ!" اس کے منہ سے ایک گہری سانس خارج

ہوئی اس کے عین پیچھے کھڑکی تھی کسی کمرے کی' پردہ پڑا ہوا تھا' مگر کھڑکی کھلی تھی تب ہی زوار کی واضح آواز اسے سنائی دی تھی' شیبا غیر ارادی طور پر کھڑکی کے اور قریب ہو گئی۔
"کرنا کیا ہے' میں تو نہیں ملوں گی ان لوگوں سے بہانہ چاہیے بس یہاں آنے کا فارہ کی ساس کی فضول باتیں سن سن کر میرے تو سر میں درد ہونے لگتا ہے اور وہ اس کی نند؟ کیا نام ہے؟ ہاں شیبا! اتنی چھچھوری لڑکی مجھے تو ایک آنکھ نہیں بھاتی وہ' بلاوجہ آگے پیچھے پھرتی

رہتی ہے۔ اچھا، تم ایسا کرو، میرا تو کہہ دینا کہ میڈیسن لے کر سو گئی ہیں۔ عارفہ سے کہہ دو کولڈ ڈرنک وغیرہ سرو کردے اور ذرا جلدی رخصت کردینا۔"

"یہ کہہ دوں کہ پلیز جلد از جلد تشریف لے جائیں۔ میری نازک مزاج منگیتر اور ان سے زیادہ مزاج دار ساس، سسر آرہے ہیں؟" زوار کا شگفتہ لب ولہجہ سن کر شیبا کا سناٹے میں آیا وجود جیسے پتھر کا بن گیا۔

"ہاں تو اور کیا، تم جانتے ہی ہو بھائی صاحب اور بھابھی بیگم کا مزاج کئی بار جتا چکے ہیں کہ کیا دیکھ کر لڑکی دے دی، نہ خاندان، نہ تعلیم، نہ اسٹیٹس، اب کیا کہتی، فارہ کی مرضی تھی، ورنہ میں تو خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی ایسی فیملی سے رشتہ جوڑنے کے بارے میں، مور کے پر لگا کر کوئی کوا مور نہیں بن جاتا، سنا ہے، ڈیفنس والا بنگلہ خالی کرکے واپس اپنے پرانے گھر چلے گئے ہیں؟"

"جی.....!"

"خیر کہیں بھی جائیں، ہمیں کون سے مراسم رکھنے ہیں زیادہ۔" فارہ کی ممی کی نخوت بھری آواز بڑی واضح تھی۔

اور شیبا کو جانے کیوں یہ انداز یہ باتیں جانی پہچانی سی لگ رہی تھیں، ایک جھٹکے سے وہ آسمان سے زمین پر منہ کے بل گری تھی، اٹھانے والا کوئی نہیں تھا، اسے خود ہی کھڑا ہونا تھا۔

اس نے ہاتھ میں پکڑے موبائل کو سیدھا کیا اور اپنی آنسوؤں سے بھری آنکھیں صاف کرکے عباد کو

میسج کرنے لگی کہ وہ لینے آجائے۔

قدم ساتھ نہیں دے رہے تھے مگر وہ پھر بھی وہاں سے چل دی۔

تو کبھی اس طرح بھی ہوتا ہے زندگی میں کہ انسان دوسروں کی نظروں سے زیادہ خود اپنی نظروں میں ذلیل ہوجاتا ہے۔ اس نے ایک بار پھر اپنے امڈتے آنسو روک کر خود کو سنبھالنے کی سعی کی۔

زبان سے نکلی فخر و غرور کی باتیں دراصل بازگشت کی مانند ہوتی ہیں گھوم پھر کر ہمارے کانوں سے ٹکراتی ہیں، بولتے وقت ہم دوسرے کو ذلیل کرتے ہیں اور سنتے وقت خود ذلیل ہوجاتے ہیں، ندامت اور پشیمانی کے احساس نے اسے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔

ندامت کے بعد اگلا مرحلہ کفارے کا ہوتا ہے، اسے کچھ لوگوں سے معافی مانگنی تھی، چلتے چلتے وہ اچانک رکی تھی۔ سامنے سے آتا زوار بھی اسے دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔

"آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟" سوال بے ساختہ تھا۔

"آئینہ..... دیکھ رہی تھی۔" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

"آئینہ؟ یہاں؟" زوار نے لان میں کھڑے حیرانی سے اسے دیکھا۔

"ہاں، کبھی دوسروں کے لفظوں میں بھی اپنا چہرہ بلکہ اپنا آپ نظر آنے لگتا ہے۔" شیبا آگے بڑھی پھر کچھ سوچ کر رک گئی اور مڑ کر کہنے لگی۔

"اگر مجھے پہلے علم ہوجاتا کہ ہمارے متعلق آپ کی امی کے خیالات کیا ہیں تو ہم کبھی یہاں آنے کی زحمت نہیں کرتے۔" سنجیدگی سے بولتی ہوئی وہ اندر چلی گئی امی کو بلانے کے لیے، زوار کو شاک لگا تھا اس کی بات سن کر۔

شیبا اپنی امی کے ساتھ اس کے قریب سے گزر کر چلی گئی، زوار کی ہمت ہی نہیں ہوئی، نہ روکنے کی، نہ کچھ کہنے کی، ہاں مگر اس کے چہرے پہ تاسف کی تحریر ضرور رقم تھی۔

گیٹ سے باہر آتے ہوئے شیبا وہ الفاظ سوچ رہی تھی جو اسے واثق کو میسج کرنے تھے۔

عفت سحر طاہر

بن مانگی دعا

امتیاز احمد اور سفینہ کے تین بچے ہیں۔ معیز، زارا اور ایزد۔ صالحہ، امتیاز احمد کی بچپن کی منگیتر تھی مگر اس سے شادی نہ ہو سکی تھی۔ صالحہ دراصل ایک شوخ، الہڑسی لڑکی تھی۔ وہ زندگی کو بھرپور انداز میں گزارنے کی خواہش مند تھی مگر اس کے خاندان کا روایتی ماحول امتیاز احمد سے اس کی بے تکلفی کی اجازت نہیں دیتا۔ امتیاز احمد بھی شرافت اور اقدار کی پاس داری کرتے ہیں مگر صالحہ ان کی مصلحت پسندی، نرم طبیعت اور احتیاط کو ان کی بزدلی سمجھتی تھی۔ نتیجتاً صالحہ نے امتیاز احمد سے محبت کے باوجود بدگمان ہو کر اپنی سہیلی شازیہ کے دور کے کزن مراد صدیقی کی طرف مائل ہو کر امتیاز احمد سے شادی سے انکار کر دیا۔ امتیاز احمد نے اس کے انکار پر دلبرداشتہ ہو کر سفینہ سے نکاح کر کے صالحہ کا راستہ صاف کر دیا تھا مگر سفینہ کو لگتا تھا جیسے ابھی بھی صالحہ، امتیاز احمد کے دل میں بستی ہے۔

شادی کے کچھ ہی عرصے بعد مراد صدیقی اپنی اصلیت دکھا دیتا ہے۔ وہ جواری ہوتا ہے اور صالحہ کو غلط کاموں پر مجبور کرتا ہے۔ صالحہ اپنی بیٹی ابیہا کی وجہ سے مجبور ہو جاتی ہے مگر ایک روز جوئے کے اڈے پر ہنگامے کی وجہ سے مراد کو پولیس پکڑ کر لے جاتی ہے۔ صالحہ شکر ادا کرتے ہوئے ایک فیکٹری میں جاب کر لیتی ہے۔ اس کی سہیلی زیادہ تنخواہ پر دوسری فیکٹری میں چلی جاتی ہے جو اتفاق سے امتیاز احمد کی ہوتی ہے۔ اس کی سہیلی صالحہ کو امتیاز احمد کا وزیٹنگ کارڈ لا کر دیتی ہے۔ جسے وہ اپنے پاس محفوظ کر لیتی ہے۔ ابیہا میٹرک میں ہوتی ہے۔ جب مراد رہا ہو کر آجاتا ہے اور پرانے دھندے شروع کر دیتا ہے۔ دس لاکھ کے بدلے جب وہ ابیہا کا سودا کرنے لگتا ہے تو صالحہ مجبور ہو کر امتیاز احمد کو فون کرتی ہے۔ وہ فوراً آتے ہیں اور ابیہا سے نکاح کر کے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ان کا بیٹا معیز احمد باپ کے اس راز میں شریک ہوتا ہے۔ صالحہ مر جاتی ہے۔ امتیاز احمد، ابیہا کو کالج میں داخلہ دلا کر ہاسٹل میں اس کی رہائش کا بندوبست کر دیتے ہیں۔ وہاں حنا سے اس کی

دوستی ہے جو اس کی روم میٹ بھی ہوتی ہے 'مگر وہ ایک خراب لڑکی ہوتی ہے۔

معیز احمد اپنے باپ سے ابیہا کے رشتے پر ناخوش ہوتا ہے۔ زارا اور سفیر احسن کے نکاح میں امتیاز احمد 'ابیہا کو بھی مدعو کرتے ہیں 'مگر معیز اسے بے عزت کرکے گیٹ سے ہی واپس بھیج دیتا ہے۔ زارا کی نند رباب 'ابیہا کی کالج فیلو ہے۔ وہ تفریح کی خاطر لڑکوں سے دوستیاں کرکے 'ان سے پیسے بٹور کر بلا گلا کرنے والا مزاج رکھتی ہے اور اپنی سہیلیوں کے مقابلے اپنی خوب صورتی کی وجہ سے زیادہ تر ٹارگیٹ جیت لیا کرتی ہے۔ رباب 'معیز احمد میں بھی دلچسپی لینے لگتی ہے۔

ابیہا کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے 'مگر وہ اس بات سے بے خبر ہوتی ہے کہ وہ معیز احمد کی گاڑی سے ٹکرائی تھی کیونکہ معیز اپنے دوست عون کو آگے کر دیتا ہے۔ ایکسیڈنٹ کے دوران ابیہا کا پرس کہیں گر جاتا ہے۔ وہ نہ تو ہاسٹل کے واجبات ادا کرپاتی ہے۔ نہ ایگزامز کی فیس۔ بہت مجبور ہو کر وہ امتیاز احمد کو فون کرتی ہے 'مگر وہ دل کا دورہ پڑنے پر اسپتال میں داخل ہوتے ہیں۔ ابیہا کو بحالت مجبوری ہاسٹل اور ایگزامز چھوڑ کر حنا کے گھر جانا پڑتا ہے۔ وہاں حنا کی اصلیت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ اس کی ماما جو کہ اصل میں "میم" ہوتی ہیں 'زور زبردستی کرکے ابیہا کو بھی غلط راستے پر چلانے پر مجبور کرتی ہیں۔ ابیہا بہت سر پٹختی ہے 'مگر میم پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ امتیاز احمد دوران بیماری معیز سے اصرار کرتے ہیں کہ ابیہا کو گھر لے آئے 'مگر سفینہ بھڑک اٹھتی ہیں۔ امتیاز احمد کا انتقال ہو جاتا ہے۔ مرنے سے قبل وہ ابیہا کے نام پچاس لاکھ گھر میں حصہ اور ماہانہ دس ہزار کر جاتے ہیں۔ اس بات پر سفینہ مزید تپ جاتی ہیں۔ معیز 'ابیہا کے ہاسٹل جاتا ہے۔ کالج میں معلوم کرتا ہے 'مگر ابیہا کا کچھ پتا نہیں ملتا۔ وہ چونکہ رباب کے کالج میں پڑھتی تھی۔ اس لیے معیز باتوں باتوں میں رباب سے پوچھتا ہے 'مگر وہ لاعلمی کا اظہار کرتی ہے۔

عون 'معیز احمد کا دوست ہے۔ ثانیہ اس کی منکوحہ ہے۔ مگر پہلی مرتبہ بہت عام سے گھریلو حلیے میں دیکھ کر وہ ناپسندیدگی کا اظہار کر دیتا ہے۔ جبکہ ثانیہ ایک پڑھی لکھی ذہین اور بااعتماد لڑکی ہوتی ہے۔ وہ عون کے اس طرح انکار کرنے پر شدید ناراض ہوتی ہے۔ پھر عون پر ثانیہ کی قابلیت کھلتی ہے تو وہ اس سے محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے 'مگر اب ثانیہ اس سے شادی سے انکار کر دیتی ہے۔ دونوں کے درمیان خوب تکرار چل رہی ہے۔

میم 'ابیہا کو سیفی کے حوالے کر دیتی ہیں جو ایک عیاش آدمی ہوتا ہے۔ ابیہا اس کے دفتر میں جاب کرنے پر مجبور کر دی جاتی ہے۔ سیفی اسے ایک پارٹی میں زبردستی لے کر جاتا ہے 'جہاں معیز اور عون بھی آئے ہوتے ہیں 'مگر وہ ابیہا کے یکسر مختلف انداز حلیے پر اسے پہچان نہیں پاتے تاہم اس کی گھبراہٹ کو محسوس ضرور کر لیتے ہیں۔ ابیہا پارٹی میں

ایک ادھیڑ عمر آدمی کو بلاوجہ بے تکلف ہونے پر تھپڑ مار دیتی ہے۔ جواباً "سیفی بھی اسی وقت ابیہا کو ایک زوردار تھپڑ جڑ دیتا ہے۔ عون اور معیز کو اس لڑکی کی تذلیل پر بہت افسوس ہوتا ہے۔ گھر آکر سیفی میم کی اجازت کے بعد ابیہا کو خوب تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ اسپتال پہنچ جاتی ہے۔ جہاں عون اسے دیکھ کر پہچان لیتا ہے کہ یہ وہی لڑکی ہے جس کا معیز کی گاڑی سے ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ عون کی زبانی یہ بات جان کر معیز سخت حیران اور بے چین ہوتا ہے۔ وہ پہلی فرصت میں سیفی سے میٹنگ کرتا ہے۔ مگر اس پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ ثانیہ کی مدد سے وہ ابیہا کو آفس میں موبائل بھجواتا ہے۔ ابیہا بمشکل موقع ملتے ہی باتھ روم میں بند ہو کر اس سے رابطہ کرتی ہے 'مگر اسی وقت دروازے پر کسی کی دستک ہوتی ہے۔ حنا کے آجانے سے اسے اپنی بات ادھوری چھوڑنی پڑتی ہے۔ پھر بہت مشکل سے ابیہا کا رابطہ ثانیہ اور معیز احمد سے ہو جاتا ہے۔ وہ انہیں بتاتی ہے کہ اس کے پاس وقت کم ہے۔ میم اس کا سودا کرنے والی ہیں لہٰذا اسے جلد از جلد یہاں سے نکال لیا جائے۔ معیز احمد 'ثانیہ اور عون کے ساتھ مل کر اسے وہاں سے نکالنے کی پلاننگ کرتا ہے اور یہیں اسے اپنا راز کھولنا پڑتا ہے۔

وہ بتا دیتا ہے کہ ابیہا اس کے نکاح میں ہے 'مگر وہ نہ پہلے اس نکاح پر راضی تھا نہ اب پھر ثانیہ کے آئیڈیا پر عمل کرتے ہوئے وہ اور عون میڈم رعنا کے گھر جاتے ہیں۔ میڈم ابیہا کا سودا معیز احمد سے طے کر دیتی ہے 'مگر معیز کی ابیہا سے ملاقات نہیں ہو پاتی کیونکہ وہ ڈرائیور کے ساتھ بیوٹی پارلر گئی ہوتی ہے۔ وہاں موقع ملنے پر ابیہا 'ثانیہ کو فون کر دیتی ہے۔ ثانیہ بیوٹی پارلر پہنچ جاتی ہے۔ دوسری طرف تاخیر ہونے پر میڈم 'حنا کو بیوٹی پارلر بھیج دیتی ہے 'مگر ثانیہ 'ابیہا کو وہاں سے

نکالنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ثانیہ کے گھر سے معیز اسے اپنے گھر انیکسی میں لے جاتا ہے۔ اسے دیکھ کر سفینہ بیگم بری طرح بھڑک اٹھتی ہیں مگر معیز سمیت زارا اور ایزد انہیں سنبھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ معیز احمد اپنے باپ کی وصیت کے مطابق ابیہا کو گھر لے تو آتا ہے مگر اس کی طرف سے غافل ہو جاتا ہے۔ وہ تنہائی سے گھبرا کر ثانیہ کو فون کرتی ہے۔ وہ اس سے ملنے چلی آتی ہے اور حیران رہ جاتی ہے۔ گھر میں کھانے پینے کو کچھ نہیں ہوتا۔ وہ عون کو فون کر کے شرمندہ کرتی ہے۔ عون نادم ہو کر کچھ اشیائے خورد ونوش لے آتا ہے۔ معیز احمد بزنس کے بعد اپنا زیادہ تر وقت رباب کے ساتھ گزارنے لگتا ہے۔

سفینہ بیگم اب تک یہی سمجھ رہی ہیں کہ ابیہا مرحوم امتیاز احمد کے نکاح میں تھی مگر جب انہیں پتا چلتا ہے کہ وہ معیز کی منکوحہ ہے تو ان کے غصے اور نفرت میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ اسے اٹھتے بیٹھتے بری طرح ٹارچر کرتی ہیں اور اسے بے عزت کرنے کے لیے اسے نذیراں کے ساتھ گھر کے کام کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ ابیہا ناچار گھر کے کام کرنے لگتی ہے۔ معیز کو برا لگتا ہے مگر وہ اس کی حمایت میں کچھ نہیں بولتا۔ یہ بات ابیہا کو مزید تکلیف میں مبتلا کرتی ہے۔ وہ اس پر تشدد بھی کرتی ہیں۔

پرانے شکوے شکایتیں دور کرنے کی خاطر عون کے ابا عون اور ثانیہ کو اسلام آباد نازیہ کی شادی میں شرکت کرنے کے لیے بھیجتے ہیں۔ جہاں ارم ان دونوں کے درمیان آنے کی کوششیں کرتی ہے اور ثانیہ اپنی بے وقوفی کے باعث عون سے شکوے اور ناراضیاں رکھ کر ارم کو موقع دیتی ہے۔ عون صورت حال کو سنبھالنے کی بہت کوشش کرتا ہے مگر ثانیہ اس کے ساتھ بھی زیادتی کر جاتی ہے۔ ارم کی بہن نیلم ایک اچھی لڑکی ہے وہ ثانیہ کو سمجھانے کی کوشش کرتی ہے کہ اگر عون نے پہلے شادی سے انکار کر کے اس کی عزت نفس کو ٹھیس پہنچائی تھی تو اب اپنی عزت نفس اور انا کو چھوڑ کر آپ کو منانے کے لیے جتن بھی کر رہا ہے۔ عزت کریں عون کی اور دوسروں کو اپنے درمیان آنے کا موقع نہ دیں۔ ثانیہ کچھ کچھ مان لیتی ہے۔ تاہم مہندی میں کی گئی ثانیہ کی بدتمیزی پر عون دل میں اس سے ناراض ہو جاتا ہے۔

رباب، سفینہ بیگم کے گھر آتی ہے تو ابیہا کو دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔ پھر سفینہ بیگم کی زبانی ساری تفصیل سن کر اس کی تضحیک کرتی ہے۔ ابیہا بہت برداشت کرتی ہے مگر دوسرے دن کام کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ سفینہ بیگم کو شدید غصہ آتا ہے۔ وہ انیکسی جا کر اس سے لڑتی ہیں۔ اسے تھپڑ مارتی ہیں جس سے وہ گر جاتی ہے۔ اس کا سر پھٹ جاتا ہے اور جب وہ اسے حرام خون کی گالی دیتی ہیں تو ابیہا پھٹ پڑتی ہے۔ معیز آ کر سفینہ کو لے جاتا ہے اور واپس آ کر اس کی بینڈیج کرتا ہے۔ ابیہا کہتی ہے کہ وہ پڑھنا چاہتی ہے۔ معیز کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ سفینہ بیگم ایک بار پھر معیز سے ابیہا کو طلاق دینے کا پوچھتی ہیں تو وہ صاف انکار کر دیتا ہے۔

اٹھائیسویں قسط

وہ اپنی مخصوص "سب کچھ جان لینے والی" مسکراہٹ کے ساتھ ابیہا سے اسی بدحواسی کی توقع رکھے ہوئے تھا۔

"کیسی ہو۔۔۔؟"

سن گلاسز بالوں پہ اٹکاتے عمر نے بڑے دوستانہ انداز میں پوچھا۔

ابیہا کی خوف سے پھیلی آنکھیں تو شاید اسے نظر ہی نہیں آ رہی تھیں۔

"آپ۔۔۔ آپ کیوں آئے ہیں؟ میں ڈرائیور کے ساتھ ہی جاؤں گی۔"

اپنی فائل کو دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے جکڑ کر سینے سے بھینچتی وہ ہراساں تھی۔

عمر محظوظ سا مسکرایا۔ پھر گویا بڑے صدمے سے پوچھا۔

"ویری بیڈ۔ کیا میں شکل سے تمہیں کڈنیپر (اغواکار) لگتا ہوں؟"
ایہا نے اپنے اعصاب پر قابو پانے کی کوشش یوں کی کہ عمر پر سے دھیان ہٹا کر اپنی گاڑی والے روٹ کی طرف دیکھا۔
"معیز نے آپ کو میرے متعلق بتا ہی دیا ہوگا۔"
وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ایہا نے بے چارگی سے اثبات میں سرہلایا۔ اب وہ کیا بتاتی کہ معیز نے کیا کیا بتایا تھا۔
"میں اس کا سب سے اچھا کزن ہوں اور بہترین دوست۔" وہ خود ہی تفاخر سے بتانے لگا اور ایہا دل ہی دل میں اپنی معلومات دہرانے لگی جو معیز نے مہیا کی تھیں۔ (چیکو اور باتوں کی مشین)
"ہر ایک سے فرینڈلی ملتا ہوں) (فلرٹی ہے ایک نمبر کا)
"جی... بڑی اچھی بات ہے۔"
ایہا نے اس کا عمر نامہ کاٹ کر بہ عجلت کہا۔ معیز نے اسے سختی سے ڈرائیور کے ساتھ آنے جانے کی ہدایت کی تھی۔ مگر یہ شیطان کا چیلا پھر سے آن موجود ہوا تھا۔
خیر اب اتنی تسلی تو تھی کہ وہ فیملی ہی کا بندہ ہے اور اسے نقصان نہیں پہنچائے گا۔
"میں ایکچوئیلی آپ سے سوری کرنے آیا ہوں۔" وہ نرمی سے بولا تو ایہا نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔ عمر کو احساس ہوا کہ اس کی سیاہ آنکھیں کتنی خوب صورت ہیں اور گھنی پلکوں کی سیاہی کاجل کو مات کرتی تھی۔ وہ بات بھولنے لگا۔
"آئی مین۔ جو میں نے کیا۔ زبردستی تمہارا ڈرائیور بن گیا۔" وہ جو حیران سی تھی۔ اس کے چہرے پر پل بھر میں خفگی چھا گئی۔
"آپ کی وجہ سے مجھے ڈانٹ پڑی تھی معیز سے۔"
"رئیلی سوری۔ ایکچوئیلی ڈرائیور کو چھٹی پہ جانا تھا مگر تمہاری ڈیوٹی کی وجہ سے وہ جا نہیں پا رہا تھا۔ تو میں چونکہ ایک نہایت رحم دل انسان واقع ہوا ہوں تو میں نے سوچا کہ اس ڈرائیور سے بھی بھلائی کروں اور ایک رحم دل پری سے بھی۔"
وہ بے ساختہ مسکرا دی۔
عمر نے اس کے چہرے کو چمکتے دیکھا۔
وہ بلاشبہ ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ بنا میک اپ کے خوب صورت لڑکی... ویری اسٹرینج۔ عمر کا ہلکی سی سیٹی بجانے کو دل چاہا۔

"اور معیز ایسا ہی ہے اکڑو اور سڑیل۔ تمہیں ہی نہیں مجھے بھی ڈانٹا ہے اس نے۔ مگر کیا فرق پڑتا ہے ہم کون سا اس کی ڈانٹ سے بدلنے والے ہیں... اور ہاں یہ..."
وہ واقعی نان اسٹاپ بولتا تھا۔ پھر یکایک کچھ یاد آیا تو پینٹ کی جیب میں سے والٹ نکال کر ایہا کا پانچ ہزار کا نوٹ لہرا کر مسکرایا۔
ایہا جھینپ سی گئی۔ پھر شرمندہ سی بولی۔
"آپ نے جھوٹ کیوں بولا تھا...؟"
"یونہی... تمہاری رحم دلی کا لیول چیک کرنے کے لیے۔"

وہ لاپروائی سے بولا پھر نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ زبردستی۔
ایبہا کو تو واپس لیتے شرم آ رہی تھی۔ پھر وہ بے اختیار ہنس دی۔
چمکتے موتیوں کی لڑی سے شفاف دانتوں کی قطار اور اس پر خون چھلکاتے رخسار۔
وہ عمر کے قریب کھڑی تھی اور عمر نے اس کا ہاتھ لمحہ بھر کو تھام کر چھوڑا تھا۔
لمحہ بہ لمحہ نزدیک آتی گاڑی میں بیٹھے معیز کو یہی منظر دکھائی دیا تھا۔
اسٹیئرنگ وہیل پر اس کے ہاتھوں کی گرفت سخت ہو گئی۔
اس نے ان کے بہت قریب لا کر گاڑی کو بریک لگائی تو عمر اچھل کر سڑک کے کنارے پر ہو گیا' جبکہ بنا شیشہ دیکھے بھی ایبہا کو اپنی فق ہوتی رنگت اچھی طرح محسوس ہوئی تھی۔
معیز کھا جانے والی نظروں سے ایبہا کو دیکھ رہا تھا۔ وہ جلدی سے آگے بڑھ کے گاڑی میں بیٹھ گئی۔
عمر کے ہونٹوں پر بڑی محظوظ سی مسکراہٹ تھی وہ کھڑکی میں جھکا۔ پھر اس نے معیز سے مسکراہٹ چھپالی۔
"میں بھی بیٹھ جاؤں۔ مجھے بھی ڈراپ کر دینا۔"
بڑی منت بھری التجا تھی۔ معیز نے سلگتی نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی۔ اور ہلکے سے دانت پیس کر بولا۔
"تمہیں تو میں کہیں بہت دور جا کے "ڈراپ" کروں گا۔"
اور ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھادی۔ وہ ہنستا ہوا پیچھے ہٹا۔ لمحہ بھر کھڑے ہو کر تیزی سے جاتی معیز کی گاڑی کو دیکھا اور پھر سر جھٹک کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

☼ ☼ ☼
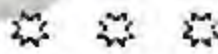
گاڑی کے چلتے ہی معیز بھی "اسٹارٹ" ہو گیا تھا۔
"میں نے تمہیں سمجھایا بھی تھا کہ آئندہ سے تم ڈرائیور کے ساتھ آیا جایا کرو گی پھر وہ کیا کر رہا تھا یہاں؟"
ایبہا کا دل لرزنے لگا۔
"وہ... مجھے لینے نہیں آئے تھے۔ معافی مانگنے آئے تھے۔" ہمت کر کے معاملہ کھولا۔
معیز کو "صدماتی" حیرت ہوئی۔
"معافی... اور عمر...؟"
"سوری کہہ رہے تھے۔ ڈرائیور بننے کی جو شرارت کی تھی اس کے لیے۔"
"شرارت... کمینگی کہو۔"
معیز نے دانت پیسے۔ جھٹکوں سے گیئر بدلتا وہ یقیناً" اپنا غصہ انہی پر اتار رہا تھا۔ عمر کی گردن تو فی الوقت میسر نہ تھی جو موڑ ڈالتا۔

اتنے صاف لفظوں میں دی جانے والی وارننگ کے باوجود وہ پھر سے ایبہا کی راہ میں آ کھڑا ہوا تھا۔
"ن' نہیں' بدتمیزی تو کبھی نہیں کی تھی انہوں نے۔" ایبہا کو خفت کا احساس ہوا۔
"بے ہودہ بے اول نمبر کا... ابھی بھی اتنے پاس کھڑا تھا تمہارے..."
بے اختیار ہی وہ غصے سے بولا' مگر پھر کہتے کہتے احساس ہوا کہ وہ کس "کھاتے" میں اتنا تپ رہا ہے تو یک لخت چپ ہو گیا۔
"وہ مجھے پانچ ہزار دے رہے تھے۔" ایبہا کے اگلے جملے نے معیز کا دماغ سنسنا دیا۔

"کس بات کے۔۔۔؟"

وہ محجوب سی ہوئی۔معیز کی تیز نگاہ بیک ویو مرر میں اسے وقتاً فوقتاً دیکھ رہی تھی۔اس کا گلابی پڑتا چہرہ دیکھ کر کسی عجیب سے احساس میں گھرتے ہوئے معیز نے بے اختیار ہی سڑک کے ایک طرف گاڑی روک دی۔ایہا نے چہرہ اٹھا کے حیرت سے دیکھا۔ابھی گھر سے کافی دور تھے وہ لوگ۔

"کس بات کے پیسے دے رہا تھا وہ۔۔۔اور تمہارے پاس کیا کمی ہے پیسوں کی؟"

وہ مڑ کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ایہا نروس نیس کا شکار ہونے لگی۔تیزی سے پلکیں جھپکا کر اسے دیکھا اور جلدی سے بولی۔

"وہ میرے ہی پیسے تھے۔ان کی بہن کی شادی کے لیے دیے تھے۔مدد کے خیال سے۔"

معیز کا دماغ پل بھر میں گھوما۔

"اس کمینے کی تو کوئی بہن ہی نہیں۔ایک یہ خبیث ہے اور دوسرا بھائی امریکہ میں ہوتا ہے۔"

وہ غصے سے اونچی آواز میں بولا تو ایہا ڈر کر دروازے کے ساتھ دبک سی گئی۔

"اور تم۔۔۔تمہارے اندر ذرا سی بھی عقل نہیں۔وہ پتا نہیں کیا فضولیات گھڑ کے تم سے پیسے ٹھگتا رہا ہے اور تم۔۔۔فیل ہو تم اس دنیا میں۔"

غصے کی زیادتی میں وہ پتا نہیں کیا کیا کہہ گیا۔ایہا کا تو مانو دل ہی بند ہونے لگا۔

ہاں البتہ رونا ضرور جاری ہو گیا۔آنسو بہے تو بہتے ہی چلے گئے۔

"مجھے کیا پتا تھا کہ وہ امیر آدمی ہیں۔مجھ سے تو یہی کہا کہ بہن کی شادی کی پریشانی ہے۔میرے پاس پانچ ہزار ہی تھے میں نے دے دیے۔باقی تو میں شادی پہ دیتی۔ابھی تو نہیں دیے تھے۔"

اللہ۔۔۔معصومیت اور بچوں کے سے انداز میں روتے ہوئے اتنی بچکانہ سی صفائیاں پیش کرنا۔معیز کا غصہ پل بھر میں تحلیل ہو گیا۔وہ سیدھا ہو کر بیٹھا آنکھوں پر سن گلاسز لگا لیے اور گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا تو اب لہجہ نرم تھا۔

"اللہ کی بندی بتایا تو ہے کہ اس کی کوئی بہن نہیں ہے جھوٹا ہے وہ اول درجے کا۔"

ایہا نے جلدی سے آنسو پونچھے اور مصمم ارادے سے بولی۔

"ہاں نا۔اب نہیں دوں گی۔مجھے پتا چل گیا ہے۔"

اس کا انداز ہی ایسا تھا کہ معیز سے ہنسی دبانا مشکل ہو گیا۔

اس کی مسکراہٹ ایہا نے بیک ویو مرر میں دیکھی تو اس کی نظر پرنس چارمنگ پر فدا سی ہو گئی۔

ابھی وہ غصے سے شعلے اگل رہا تھا۔اور اب اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقصاں تھی۔

وہ کتنے خوب صورت روپ چھپا کے رکھتا تھا اپنے اندر۔۔۔کھڑکی سے باہر جھانکتی وہ حیرت سے سوچ رہی تھی۔

اور معیز سنجیدگی سے عمر کی طبیعت صاف کرنے کا ارادہ باندھ رہا تھا۔گاڑی کا ٹائر برسٹ ہو جانے کی وجہ سے ڈرائیور نہیں پہنچ سکا تو اس نے بروقت معیز کو کال کر کے بتا دیا تاکہ وہ خود ایہا کو وقت پر پک کر لے۔مگر آتے ہی دکھائی دینے والے منظر نے معیز کو غصہ دلا دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس سے آفس کا کوئی بھی کام ٹھیک سے نہیں ہو پا رہا تھا۔ابھی ابھی وہ باس کی ڈانٹ کھا کے آئی تو دل چاہا کہ اپنی

ٹیبل پہ سر ٹکا کے خوب سارا روئے... اتنا کہ اندر کا سارا غبار نکل جائے۔ مگر فی الحال تو غصہ نکالنا ضروری تھا۔
اس نے ہاف لیو... کے چند الفاظ پیپر پہ گھسیٹے اور باس کی پی اے کے حوالے کر کے آفس سے نکل آئی۔
"نکالتے ہیں تو نکال دیں۔ میں بھی کون سا نوکری کرنا چاہ رہی ہوں۔"
وہ چنداں فکر مند نہ تھی۔ یوں بھی جاب ختم ہونے میں تھوڑا ہی عرصہ رہ گیا تھا۔ خود ہی نکال دیتے تو اچھا ہوتا۔
کوئی کنوینس لیے بغیر وہ یونہی پیدل ایک طرف کو چل دی۔ فی الحال تو اپنے ساتھ ہی کچھ دیر رہنے کو جی چاہ رہا تھا۔
بھاگتی دوڑتی ہنستی مسکراتی دنیا اس کے آس پاس رواں دواں تھی کتنی خوش ہے یہ ساری دنیا... اور ایک میں ... وہ خود ترسی کا شکار ہونے لگی۔
کیا زندگی کی ساری خوشی کسی ایک شخص کے پاس ہونے میں مقید ہے؟ ہر لحاظ سے آسودگی کے باوجود ایک عون عباس کی ناراضی نے دنیا کیوں "ختم" کر دی ہے؟
کیا میرے لیے اب خوشی کا مطلب "عون عباس" بن چکا ہے؟ اور اس کا نہ ملنا... "موت" سا کیوں لگتا ہے یہ سوالات تھے...؟ نہیں سوالات نہیں حقیقت تھی جو اس پر منکشف ہو رہی تھی۔
دھندلاتی آنکھوں کو ہاتھ سے رگڑتے ہوئے وہ سامنے سے آنے والی ٹیکسی روکنے لگی۔

تو کیا یہ طے ہے کہ اب عمر بھر نہیں ملنا
تو پھر یہ عمر بھی کیوں؟ تم سے گر نہیں ملنا

☼ ☼ ☼
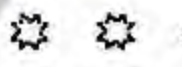
موبائل کی رنگ ٹون بجی تو معیز کا نمبر اسکرین پر جگمگاتا دیکھ کر رباب کے ہونٹوں پر استہزائیہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔
"ہیلو..." بنا کسی خوشی کے وہ نارمل سے انداز میں کال اٹینڈ کرتے ہوئے بولی۔
"کیسی ہو...؟"
"ٹھیک۔" وہ مختصراً بولی۔
"میں اس روز تمہیں کال بیک کرتا رہا مگر تم نے اٹینڈ ہی نہیں کی۔"
معیز کو اس کے انداز سے اس کی ناراضی کا احساس ہو رہا تھا۔ صفائی پیش کرتے ہوئے بولا۔
وہ کان اور شانے کے درمیان موبائل پھنسائے نیل پالش کی شیشی کھولتی کاؤچ پہ بیٹھ گئی۔
"ہاں۔ مجھے پتا چلا تھا۔ مگر اس وقت میں بزی تھی۔" وہ بے نیازی سے بولی مگر جسے جتایا گیا وہ اچھی طرح سمجھا۔
"آئم سوری رباب۔ میں اس وقت میٹنگ میں تھا۔ بہت نقصان ہو جاتا یو نو۔" معیز نے پھر سے کہا۔
"ہونہہ کیا نقصان ہو جاتا معیز احمد...؟ ایک طرف وہ میٹنگ تھی اور دوسری طرف رباب احسن... تم نے ایک چیز کو چننا اور دوسری کو کھونا تھا۔ اب یہ تم بہتر سمجھتے ہو کہ تم نے کیا چنا اور کیا کھویا۔" وہ بہت تند اور تیکھے لہجے میں بولتی معیز کو ہرٹ کر گئی۔
"میں نے تمہیں بہت پہلے چن لیا تھا رباب۔ بچوں کی طرح موازنے مت کرو۔"
معیز نے سنجیدگی سے کہا۔
"مجھے عادت ہے معیز..." وہ اس کی بات کاٹ کر درشتی سے بولی۔

"جب جب تم مجھ پر کسی اور کو فوقیت دو گے میں یہ موازنے کروں گی۔"
وہ اب اپنے لمبے ناخنوں پہ میرون کیو ٹکس کے خوب صورت شیڈ کا کوٹ کرنے لگی تھی۔
"تمہیں کوئی ضرورت نہیں ہے موازنے کی رباب۔"
معیز نے اسے ٹوکا۔ پھر محبت سے بولا۔
"تمہاری اپنی ایک اہمیت اور حیثیت ہے۔"
"ہاں۔" وہ ہلکا سا ہنسی اور ہاتھ سامنے پھیلا کر ناخنوں پر طائرانہ نظر دوڑاتے ہوئے بولی۔
"ہاں۔ مگر پچاس ساٹھ لاکھ سے تھوڑی کم۔"
"کیا مطلب۔۔۔؟"
وہ سمجھا نہیں تھا۔
"شاید اتنے ہی فائدے کے لیے تم نے مجھے اگنور کر کے اس میٹنگ کو چنا تھا معیز احمد۔"
وہ کہہ کر اب دوسرے ہاتھ کو سامنے پھیلائے کیو ٹکس کی تہہ جمانے لگی۔
معیز کو اس کی بات سن کر دھچکا لگا۔
"کیا فضول باتیں کر رہی ہو رباب۔ خود کو ان مادی چیزوں سے مت کمپیئر کرو۔"
"تم نے بھی تو یہی کیا تھا معیز! اور میرا پلڑا اوپر اٹھ گیا۔" وہ بے حد تلخی سے بولی تو معیز کو بھی اب کی بار غصہ آ گیا۔
"یہ بزنس فقط میرا نہیں میری ماں، بھائی اور بہن کا بھی ہے رباب۔ اور میں جان بوجھ کر اسے خسارے کا شکار نہیں کر سکتا۔"
اس نے کیو ٹکس کی شیشی اچھی طرح بند کر کے کاؤچ پہ رکھی اور موبائل دوسرے کان کے ساتھ لگا کر شانے سے دبایا اور اطمینان سے بولی۔
"چلو آج کچھ باتیں طے کر لیتے ہیں! معیز کہ ہمیں کیا کرنا ہو گا اور کیا نہیں کرنا ہو گا۔" ہاتھ سامنے پھیلا کر جائزہ لیا۔
"زندگی انسان کے طے شدہ اصولوں سے گزرتی تو تقدیر نامی چیز کا وجود نہ ہوتا رباب۔"
معیز نے سنجیدہ انداز میں کہا۔
"نو فلسفہ معیز۔" وہ بے زار کن لہجے میں بولی۔
"میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تمہاری زندگی کی ترجیحات میں میں کون سے نمبر پہ ہوں؟"
"تم میرے لیے بہت خاص ہو رباب۔"
معیز نے کہنا چاہا مگر وہ استہزائیہ لہجے میں اس کی بات کاٹ گئی۔
"وہ تو آنٹی اور زارا بھی ہیں تمہارے لیے۔"
"اچھا یار۔ سوری۔ کہو تو پنالٹی دے دیتا ہوں اپنی گستاخی کی، سامنے آ کے کان پکڑ لوں؟ جو سزا تم کہو۔"
معیز نے بار مان لی۔ وہ اسے اور ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ رباب کا بھی فوراً موڈ بدلا۔ اترا کر نخوت سے بولی۔
"تو یوں کہو نا۔ اب آئے ہو نا سیدھی لائن پہ۔" وہ ہنس دیا۔
"تم لڑکیاں بھی نا۔۔۔ مجال ہے، جو خود کو قصوروار سمجھ لیں۔"

پھر وہ چپ سا ہو گیا۔ اسے اپنی اس بات سے "ایہا" یاد آئی... وہ لڑکیوں کی کون سی قسم سے تھی، جو ہر قصور اپنے کھاتے میں درج کرنے کی عادی تھی؟

"ہوں... کیا کہا تم نے؟"

وہ چونکا تو رباب چلا اٹھی۔

"دیکھا۔ پھر وہی بات۔ میں بولے چلی جا رہی ہوں اور تمہارا دھیان اپنے بزنس اور اس کی بوگس میٹنگز میں لگا ہوا ہے۔"

"بے وقوف! میں تو تمہیں منانے کا کوئی شان دار سا طریقہ سوچ رہا تھا۔ کوئی سرپرائز۔"

معیز نے الٹا اسے ڈانٹا۔

"اچھا۔ کیا سرپرائز ہے...؟" اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

"سرپرائز بتایا نہیں کرتے، دیے جاتے ہیں۔" معیز نے خوشگوار انداز میں کہتے ہوئے اسے ٹالا تھا۔

"ہونہہ..." رباب نے سر جھٹکا۔

اسے سیفی اور اس کی "آپا" کے دیے گفٹس اور ان کی قیمت یاد آئی تھی۔ سیفی کی کمپنی رباب کو پسند نہیں تھی مگر ساری کشش تو اس کے پیسے میں تھی۔ جو وہ دونوں ہاتھوں سے لٹاتا تھا اس پر، اور معیز کی کمپنی پسند تھی مگر اس کی کنجوسی...

"اچھا... وہ ایہا مراد ابھی بھی تمہاری انیکسی میں رہ رہی ہے؟"

رباب نے اس قدر اچانک پوچھا کہ معیز گڑبڑا سا گیا۔

"کون...؟ ایہا... اچھا وہ..."

"زہر لگتی ہے مجھے وہ لڑکی۔ کالج میں بھی مجھے پسند نہیں تھی اور تم نے اسے گھر میں ہی گھسا لیا ہے۔ کب جائے گی وہ اپنے گھر؟ تمہارا دوست اتنا غریب تو نہیں لگتا کہ اسے اپنے گھر نہ رکھ سکتا ہو۔"

وہ تیز لہجے میں بولی۔ تو معیز نے لحہ بھر کچھ سوچا اور پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"یوں کرتے ہیں کہیں اچھی سی جگہ پہ ملتے ہیں۔ پھر میں تمہیں بتاتا ہوں کہ یہ ایہا مراد اصل میں ہے کون؟"

"واٹ...؟" رباب کا سر گھوما۔

"یعنی ہم محض اس تھرڈ کلاس لڑکی کو ڈسکس کرنے کی خاطر ملیں گے؟"

"یا اللہ..." معیز کراہا۔

"یہ لڑکیوں کی قوم آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ ہے تو کیوں ہے؟ وہ نہیں ہے تو کیوں نہیں ہے؟ یار ملنے کا کہہ رہا ہوں تو مل لو نا بس۔ پھر سب کچھ ڈسکس ہو جائے گا۔"

اور صد شکر وہ معیز کے بے چارے سے انداز پر ہنس دی تھی۔

"اوکے۔ کل لنچ ٹائم میں پک کرتا ہوں تمہیں... اور ہاں..."

فون رکھتے رکھتے اسے یاد آیا۔

"تمہارا رزلٹ آچکا ہے یار۔ کیا پوزیشن بنی؟"

معیز کے پوچھنے پر وہ بڑے غرور سے بولی۔

"بننا کیا ہے۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ فرسٹ پوزیشن ہے میری۔" بڑے اطمینان سے جھوٹ بول دیا۔

"بہت مبارک ہو۔ مجھے رول نمبر دیا ہوتا تو میں نیٹ سے خود سرچ کرتا اور تمہارے بتانے سے پہلے وش کرتا۔"
معیز کو تاسف تھا۔
رباب نے سر جھٹکا۔
"اٹس اوکے۔ میرے لیے اب فرسٹ آنا عام سی بات ہو گئی ہے۔ اینی ویز۔ کل ملتے ہیں پھر۔"
اس نے پول کھلنے کے ڈر سے بات مختصر کرتے ہوئے فون بند کر دیا تو گہری سانس بھرتے معیز کی پیشانی پر شکن ہو گئی۔
وہ ان نکات پر غور کر رہا تھا جو ابیہا کے متعلق کل رباب کو بتانے تھے۔

☼ ☼ ☼

"کلثوم کا فون آیا تھا آج۔"
امی دوپہر کو چائے لے کر کمرے میں آئیں تو ابا نے کتاب بند کر کے رکھتے ہوئے چائے کا کپ تھاما اور بتایا۔ وہ ان کے بیڈ پر پیروں کی طرف ٹک گئیں۔
"اچھا... کیا کہہ رہی تھی...؟"
امی نے ان کے تاثرات سے کچھ اندازہ لگانا چاہا۔ وہ کسی سوچ میں گم لگتے تھے۔
"وہ بھلی لوک کیا کہے گی پر اس کی ساس کی خواہش ہے کہ شادی کی رسمیں وہ اپنے گھر میں کریں گی۔"
ابا نے چائے کا گھونٹ بھرا۔
امی نے اچنبھے سے انہیں دیکھا۔
"تو اس میں فکر کیسی۔ مہندی مایوں تو وہیں ہوں گی ثانیہ کی۔ بارات کے لیے کوئی میرج ہال بک کروالیں بس۔"
ابا نے ہمیشہ کی طرح بڑے بڑے گھونٹ بھر کے گرما گرم چائے اندر انڈیلی اور خالی کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔
"ہاں تمہارے کہے پر عمل ہوتا تو کوئی فکر نہ تھی۔ مگر ان کا کہنا کچھ اور ہے نیک بخت۔"
"کتنی دفعہ کہا ہے۔ یہ پہیلیاں اپنے بیٹے کے سامنے ہی بوجھا کریں۔ مجھے تو سیدھی سیدھی بات بتایا کریں اور بس۔" امی تندرے چڑ کر بولیں۔
"ان کا کہنا ہے کہ چونکہ نکاح پہلے ہی ہو چکا ہے تو پھر مزید تکلفات میں پڑے بغیر ہم مایوں سے ایک روز پہلے گاؤں پہنچ جائیں۔ دو روز بعد دلہن رخصت کروا کے لے آئیں۔"
وہ اطمینان سے بولے تو وہ اچھلیں۔ جیسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔
"ہائیں ہائیں... ہوش میں تو ہیں آپ... یہ کیسی شادی اور کیسی رخصتی ہے بھئی؟"
"بھئی۔ دونوں کی مہندی مایوں ہو گی اور اگلے روز ہم دلہن لے کے آجائیں گے واپس اور دھوم دھام سے ولیمہ کریں گے۔"
ابا نے یوں کہا جیسے وہ تمام صورت حال پر اچھی طرح سوچ بچار کر چکے ہوں اور انہیں کسی قسم کا کوئی اعتراض نہ ہو۔
مگر امی کو تو یہ بات ہضم ہی نہیں ہو رہی تھی۔ بھلا ایسا بھی کبھی ہوا ہے؟

"اور ہمارا بارات لے کے جانے کا ارمان تو رہ گیا نا۔" امی روہانسی ہونے لگیں اور ابا خفا۔

"کم عقل عورت۔۔۔ ارمان کیوں رہے گا؟ ہم حویلی میں جائیں گے وہیں رہیں گے اور وہاں سے بارات جائے گی کلثوم کے گھر۔"

"اچھا۔۔۔" ان کی فکر ختم ہوئی۔ مگر وہ ابھی بھی متذبذب تھیں۔

"عجیب سا ہی لگے گا۔ رشتہ دار کیا سوچیں گے۔"

"جو سوچنا چاہتا ہے وہ نہ جائے ساتھ۔ یہیں بیٹھ کے سوچتا رہے۔"

ابا میں یہ بڑی خرابی تھی۔ لمبی بحث انہیں رفتہ رفتہ غصیل بنا دیتی تھی۔

"اوفوہ۔۔۔ کمال کرتے ہیں آپ بھی۔ اب ہر ایک تو ساتھ جا کے وہاں رات نہیں رہ سکتا نا۔" امی دھیمی پڑیں۔

"بس قریبی رشتہ دار ہوں گے اور گھر کے لوگ اور بس۔" ابا نے ہاتھ اٹھا دیا۔

گویا بات ختم' پیسہ ہضم۔

اب ایسا ہی ہونا تھا۔

امی گہری سانس بھرتی خالی کپ اٹھائے اس عجیب و غریب شادی پر غور کرتی کمرے سے باہر نکل گئیں۔

اور یہی بات جب بھابی کو پتا چلی تو وہ بڑی ایکسائیٹڈ ہوئیں۔ مگر عون۔۔۔

وہ پہلے تو صدمے کا شکار ہوا۔ پھر زبردستی مسکرایا۔

"مذاق کر رہی ہیں آپ۔۔۔؟"

امی نے معذرت خواہانہ انداز میں نفی میں سر ہلا دیا۔

"یہ سب طے شدہ ہے۔"

"کمال ہے۔ اب ہم وہاں جا کے لڑکی والوں کی چوکھٹ پکڑ کے چار دن پہلے ہی بیٹھ جائیں۔"

وہ جلتے توے پر جا بیٹھا تھا گویا۔

وہ تو بارات والے دن بھی جانے کو راضی نہ تھا کجا دو دن پہلے ہی۔۔۔ اف۔ اف۔

"اس کا بس نہ چلتا تھا زمین پہ پاؤں پٹختا۔۔۔ بلکہ سر بھی۔

"ثانیہ کی دادی کی خواہش ہے۔ بزرگوں کا دل رکھنا بہت بڑی نیکی ہے بیٹا۔ وہ اپنے گھر سے ثانیہ کو رخصت کرنا چاہتی ہیں۔"

امی نے نرمی سے کہا۔ اس ٹیڑھی کھیر کو (عون کو) آسانی سے تو کھایا نہیں جا سکتا تھا نا۔

"تو ہم بارات لے جائیں گے نا ان کے گھر۔۔۔ یہ مہندی والے روز وہاں جا کے رہنے کی کیا تک بنتی ہے؟" وہ بالکل بھی قائل نہ ہوا تھا۔

"مہندی کے فنکشن میں آدھی رات تو ویسے ہی ہو جاتی ہے۔ پھر وہاں کا راستہ غیر آباد سا ہے۔ تمہیں پتا ہے رات گئے ادھر کا سفر خطرناک ہے۔۔۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ تمہیں کیا پریشانی ہے؟ نہ ایسی کون سی غلط فرمائش کر دی انہوں نے جو تم یوں وضاحتیں مانگ رہے ہو؟"

تو جی۔۔۔ امی صفائیاں پیش کرتے کرتے تب اکتائیں تو عون کو ٹھنڈا ہونا پڑا۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر کیا ضروری ہے کہ ہر عجیب بات میری ہی شادی میں ہو؟"

وہ بے چارگی سے بولا تو کھانے کی میز لگاتی بھابی کی ہنسی چھوٹ گئی۔

وہ سر تھام کے بیٹھا ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

"دادی... کیا ضرورت ہے اس طرح کے شوشے چھوڑنے کی؟ ایسی شادی کبھی پہلے ہوئی ہے ہمارے خاندان میں۔"

ثانیہ کے تو تن کے دل کو پتنگے لگ گئے۔ خفگی سے دادی کے ساتھ الجھنے لگی۔ بلکہ خوب ہی الجھی۔

ادھر دولہا شادی کی راہ میں روڑے اٹکا رہا تھا تو ادھر دلہن کی دادی بھی کم نہ تھیں۔ بے چاری بے خبری ہی میں "روڑا" بن رہی تھیں۔

"اے لو۔ تمہاری شادی ہی کسی معجزے سے کم ہے کیا... ؟ ایسی تیز طرار زبان... قینچی کی دھار بھی شرمندہ ہو جس کے آگے۔" دادی چمکیں۔

غصے میں وہ سارے لاڈ نخرے بھول جاتی تھیں۔

امی نے اسے خوب آنکھیں دکھائیں۔ مگر ثانیہ جھنجلاہٹ میں تھی۔ اسے عون کے متوقع ردعمل سے خوف آ رہا تھا۔ (اب اسی "فرمائش" کو بنیاد بنا کر ہی انکار نہ کر دے)

"دادی۔ کیا آپ چاہتی ہیں کہ میری رخصتی کبھی نہ ہو۔ میں ساری عمر یہیں بیٹھی رہوں؟"

لو جی۔ جذباتیت کی انتہا تھی۔ دادی نے تو کلیجہ تھام لیا۔ امی نے بھی زور سے استغفار پڑھی۔

"کمبخت کیسے منہ بھر کے بات کرتی ہے۔" دادی آنکھوں میں ایک آدھ آنسو بھی بھر لائیں اور شکوے سے بھرپور انداز میں بولیں۔

"اب بندہ پوچھے۔ تیری شادی میں میرے کوئی ارمان نہیں ہیں کیا۔"

"اچھی فلم ہے۔ شادی تیری ارمان میرے" ہنہ۔" ثانیہ تلملائی۔ تو دادی نے امی کو بیچ میں گھسیٹا۔

"دیکھ لے کلثوم۔ جانتی ہے نا ایسے جگر کے ٹکڑے کی طرح پالا ہے میں نے اسے اور آج دادی بے چاری نے ساری عمر پیچھے ایک فرمائش کر دی تو اسے وہ بھی بری لگ گئی۔ اور ایک وہ بچہ ہے... اس نے مجال ہے ایک لفظ بھی انکار کا بولا ہو۔ تمہاری بھالی کا فون آیا تو میٹھے لہجے میں بولیں کہ جیسی آپ کی مرضی 'سر آنکھوں پہ'۔"

دادی تو جذباتیت میں صبیحہ خانم کو بھی مات دیتی تھیں اب بھی چندھی آنکھوں سے سیل رواں کرنے کا پورا ارادہ تھا۔ مگر ثانیہ کا سارا غصہ اور جھنجلاہٹ تو دادی کے لفظوں نے ہی بھک سے اڑا دی۔

"کیا...؟" وہ چھلانگ لگا کر اسپائیڈر مین کی طرح دادی کے پلنگ پر کودی تو وہ ہراساں سی 'ہائے ہائے' کرنے لگیں۔

"عون مان گیا... اسے کوئی اعتراض نہیں ہوا یہاں آ کے رہنے پر... ؟"

دادی کو شانوں سے تھام کر وہ فرط مسرت سے پوچھ رہی تھی۔ دادی تو اس کے جھٹکوں ہی سے بید مجنوں کی طرح کانپ گئیں۔

"نہیں۔ ادھر سے تو مثبت ہی جواب ملا ہے۔ بھالی کا فون آگیا تھا۔" جواب امی نے دیا۔

ثانیہ کے ہونٹوں پر بہت دنوں کے بعد پیاری سی مسکراہٹ چمکی۔

اس نے دادی کو چھوڑا اور دونوں ہاتھ جھاڑے۔

"لو جی... تو پھر ہمیں کاہے کا اعتراض۔"

دادی نے حواس میں آتے ہوئے اس کے شانے پر دو ہتڑ مارے۔ اور جھک کر جوتی اٹھانے کی سعی کی۔

"مر جھے... کمبخت۔ کیسے جوڑ جوڑ ہلا ڈالا مجھ بڑھیا کا۔ ٹھہر تو ذرا..."

دادی نے نیچے کھے دانت کچکچائے تو وہ ایک ہی چھلانگ میں دروازے کے پاس تھی۔

"دادی زندہ باد۔ اب دادی کے سارے ارمان جو کہ ان کی اپنی شادی میں پورے نہیں ہوئے وہ ان کی پوتی کی

شادی میں پورے ہوں گے۔"

وہ ہنستی ہوئی کہہ کر بھاگ لی۔ دادی پوپلا منہ کھولے حیران سی اس کے جملوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ جب سمجھیں تو بہو کی ہنسی پر جھینپ گئیں۔

"آ لے میرے ہاتھ۔ رخصتی سے پہلے جوتیاں کھائے گی مجھ سے۔" دادی مصمم ارادہ باندھتی لیٹ گئیں۔

☆ ☆ ☆
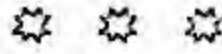
عون آج گھر آیا ہوا تھا۔

معیز اسے لیے لان میں ہی بیٹھ گیا۔ موسم کی ٹھنڈک اب رخصت ہو رہی تھی۔ کھلے میں بیٹھنا اچھا لگنے لگا تھا۔ عون نے جلے کٹے انداز میں اسے اپنی بپتا سنائی تو وہ ہنسنے لگا۔

"اسٹرینج۔ دوسرے صوبے میں شادی ہوتی تو بات اتنی عجیب نہ لگتی۔ تمہیں شاید نزدیک ہونے کی وجہ سے لگ رہا ہے۔"

"ہاں یار! یہاں سے اڑھائی تین گھنٹے کا سفر ہے بس۔" وہ تپ کر بولا۔

"چلو..... تمہیں کیا اعتراض۔ انجوائے کرو۔ تمہیں تو بس ثانیہ کی رخصتی چاہیے تھی۔" معیز نے مسکرا کر کہا۔

اب اس کے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ "اندرون خانہ" کیا حالات چل رہے ہیں۔

"ابا بھی نا..... ابا ہی ہیں بس۔" عون کا غصہ ابل ابل کر باہر نکلنے کی کوشش میں تھا۔ معیز کے سامنے کھلنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ سو عجیب باتیں کر رہا تھا۔

معیز نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"وہ تو ابا ہی ہوں گے۔ اماں ہونے سے تو رہے۔"

"اوفوہ یار۔" وہ جھنجلایا۔

"میری ہر بات پہ تو سلطان راہی والا گنڈاسہ اٹھا کے ظالم سماج بن کے آکھڑے ہوتے ہیں۔ ادھر سے آنے والی ہر فرمائش سر آنکھوں پہ ہے۔"

معیز نے حیرت سے پوچھا۔

"یو مین..... تمہارے ابا ثانیہ کی دادی کے چکر میں..... " مگر معیز کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی سمجھ کر عون نے اٹھ کر پاس پڑا گملا اٹھا لیا۔

معیز بدک کر اٹھا۔ دونوں ہاتھ سیز فائر کے انداز میں سر سے بلند کیے۔

"سوری۔ سوری....."

"سوری کے بچے۔ میں ادھر ٹینشن میں ہوں، تجھے نئے رشتے جوڑنے کی پڑی ہے۔"

وہ بکتا جھکتا گملا رکھ کے واپس کرسی پہ آبیٹھا۔

"تمہیں تو انجوائے کرنا چاہیے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آخر تمہیں اعتراض کس بات پر ہے؟ تم شادی کرنا چاہتے تھے وہ ہو رہی ہے۔"

معیز نے شرافت کے جامے میں آتے ہوئے پوچھ گچھ شروع کی۔

"مجھے شادی کے طریقہ کار پہ اعتراض ہے۔"

"تو صاف انکار کر دیتے۔" معیز نے آسان حل پیش کیا۔

"میرے ابا دس نمبر کا جوتا پہنتے ہیں۔" عون نے اسے طنزیہ یاد دلایا۔

"بھئی یا تو بندہ جوتوں سے ڈر لے یا عشق کر لے۔ ہم تو سیدھی سی حکایت جانتے ہیں۔"

معیز نے اطمینان سے کہتے بات ہی ختم کر دی۔ اور چائے کی ٹرالی لاتی نذیراں کو دیکھنے لگا۔ عون دل مسوس کر رہ گیا۔

اب کیا بتاتا۔ اس عشق کی ثانیہ نے کیا کیا درگت نہ بنائی تھی۔ اب تو "اُدھر" شاید انا کا مسئلہ تھا اور اِدھر بدلہ اور انتقام کی آگ۔

عون نے جھرجھری لی۔

(یا اللہ۔ بنکاک کے شعلے کا ری میک بن رہا ہے کیا) نذیراں ان کے آگے چائے اور ریفرشمنٹ کا سامان رکھ گئی تھی۔

معیز نے کپ اٹھاتے ہوئے عون کی شکل دیکھی۔ تو پھر بغور ہی دیکھی۔ اور سنجیدگی سے پوچھا۔

"کیا بات ہے۔ تمہیں اس موقع پر جتنا خوش ہونا چاہیے اتنا ہو نہیں۔ بڑی سوگ کی سی کیفیت طاری کی ہوئی ہے۔"

"شکریہ۔ بڑی جلدی اندازہ لگا لیا سرکار نے۔" وہ طنزاً بولا۔ تو معیز حیران ہوا۔

"کیا ہوا ہے؟ تم تو یہ شادی کرنے کے لیے زمین و آسمان ایک کیے دے رہے تھے۔"

"اور یہی کام وہ شادی رو کنے کے لیے کر رہی تھی۔" عون نے تنگ کر اسے یاد دلایا۔

"مگر اب تو یہ کام تم کرتے دکھائی دے رہے ہو۔" معیز نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ جواباً جذباتی ہو کر عون نے نازیہ کی شادی کا ہر ہر قصہ بنا کسی لاگ لپٹ کے اسے کہہ سنایا۔ معیز نے کوئی رسپانس نہیں دیا۔ ہاتھ ہلا کر بس مکھی سی اڑائی اور اس کی پلیٹ میں کباب رکھتے ہوئے اطمینان سے بولا۔

"لڑکیاں خوش ہوتی ہیں ناز نخرے دکھا کے۔ بس۔ یہ کباب کھا ذرا۔"

"ادھر میرا دل جل کے کباب ہو رہا ہے معیز۔ بس بہت سہہ لیں میں نے ثانی کی بدتمیزیاں۔"

عون نے دانت پیسے۔

"اولا لے۔ ابھی تو اگلے چالیس پچاس برس اور سہنی ہیں۔ پھر کیا فائدہ کڑھنے کا۔ اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کباب کھاؤ۔"

معیز نے مسکراہٹ دباتے ہوئے بظاہر ہمدردی سے ہی کہا مگر عون خوب ہی تپا۔

"اچھا۔ تیرا وقت بھی آئے گا۔ پھر پوچھوں گا تجھ سے۔" چڑ کر کہا تو وہ بے ساختہ بولا۔

"اور میں کون سا تجھے بتا بھی دوں گا۔"

پھر دونوں ہی بے اختیار ہنس دیے۔

"ٹیک اٹ ایزی یار۔ وہ صرف اپنی ریجیکشن کا بدلہ لے رہی تھی۔ اسے خود کش حملہ آور سمجھنا بند کر دے۔" واپسی پہ معیز نے اسے سمجھایا عون نے آدھی بات ہی میں کچھ کہنے کو منہ کھولا تو معیز نے اس کا شانہ دباتے ہوئے اپنی بات پہ زور دیتے ہوئے مزید کہا۔

"اور بالفرض وہ خود کش حملہ آور بن کے آ بھی رہی ہے تو ایسی شہادت دیکھ کے تو بندہ بصد شوق شہید ہو جاتا ہے یار۔"

اس کے انداز میں حد درجہ شرارت تھی۔ نا چاہتے ہوئے بھی عون ہنس دیا۔

☆ ☆ ☆

"تم کہاں جارہی ہو....؟"
ماما نے اسے نک سک سے تیار ہوکر کمرے سے نکلتے دیکھا تو دبے لفظوں سختی سے پوچھا۔
رباب نے تازہ تازہ سیٹ کیے بالوں کو نخوت سے جھٹکا۔
"پلیز ماما! فرینڈز کے ساتھ جارہی ہوں۔علیشہ نے پارٹی دی ہے۔"
"ہاں..." ان کے دل سے آہ نکلی تو تاسف چہرے پر سے بھی جھلکا۔
"اس نے تو سیکنڈ ڈویژن لے لی۔وہ تو پارٹی کرے گی ہی۔"
"آپ بھی نا۔بس منٹوں میں موڈ خراب کردیتی ہیں۔میں کون سا فیل ہوگئی ہوں۔" رباب کو غصہ آیا تھا۔
وہ پرس سنبھالتی باہر نکلنے کو تھی۔
انہوں نے سراپا جوان بیٹی کو دیکھا۔انہیں پتا تھا کہ اس کے گروپ میں سب ہی اونچے گھرانوں کی ماڈرن لڑکیاں ہیں اسی لیے رباب کے انداز اور لباس میں بھی ماڈرن ازم آرہا تھا۔اب بھی چُنا ہوا دوپٹہ بس تکلفاً اس نے بازو پہ ڈال رکھا تھا اور ایک طرف سے شانے پہ ٹکا تھا۔
"ڈرائیور کے ساتھ جانا اور کم از کم دوپٹہ تو بڑا لے لیتیں ساتھ..."
وہ رہ نہ سکی تھیں۔جواباً جس طرح وہ غصے سے ہیل بجاتی باہر نکلی اور جاتے ہوئے دھاڑ سے دروازہ بند کیا... وہ سر پکڑ کے بیٹھ گئیں۔
معیز نے اسے بس اسٹاپ سے پک کیا۔جوکہ ابھی رباب ہی نے اسے فون کرکے لوکیشن بتائی تھی۔
اسے اتنے ماڈرن حلیے میں آزادانہ سب کے ساتھ بس اسٹاپ پہ دیکھ کر معیز کا تو خون ہی کھول اٹھا۔رباب کے مسکراتے لہراتے ہوئے فرنٹ سیٹ سنبھالنے تک وہاں کھڑے لوگوں کی اس سے چپکی نظروں کا احساس کرکے معیز کی کنپٹیاں سلگ اٹھیں۔
"اف... توبہ۔کتنی گرمی ہوگئی ہے ایک دم سے۔" وہ بڑی نزاکت سے بولی۔معیز خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کررہا تھا۔
رباب نے گھور کے اسے دیکھا اور پھر اس کے بازو پہ ہلکی سی چپت لگائی۔
"تم کیا زبان گھر رکھ کے آئے ہو....؟"
"ہاں.... جیسے تم شرم۔" معیز نے ترنت کہا تو لہجہ سلگتا ہوا تھا۔رباب نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔
"مجھے کہتیں رباب۔میں تمہیں گھر سے پک کرتا۔یوں کتنا آکورڈ لگ رہا تھا تمہارا طرح طرح کے لوگوں میں بس.... اسٹاپ پہ کھڑے ہونا۔"
"میں نے گھر میں بتایا ہی کب ہے۔علیشہ کے ہاں پارٹی کا بہانہ کرکے آئی ہوں۔"
وہ اطمینان سے اب ڈیش بورڈ میں پڑی سی ڈیز چیک کررہی تھی۔معیز کو جھٹکا لگا۔
"کیا مطلب ہے....؟ تم نے آنٹی کو بتایا نہیں کہ تم میرے ساتھ باہر جارہی ہو؟"
اس نے بے یقینی بھری نگاہ اطمینان سے بیٹھی رباب پہ ڈالی۔
"ہنہ۔ویسے تو ضرور ہی مجھے آنے دیتیں وہ۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے سی ڈی لگانے لگی۔
معیز نے بے اختیار زور سے اسٹیئرنگ پہ ہاتھ مارے۔ "شٹ...."
"تمہیں کیا مسئلہ ہے بھئی۔آتو گئی ہوں نا میں۔" رباب نے خفگی سے کہا۔
"مجھے شرم آرہی ہے یہ سن کر کہ تم غلط بیانی کرکے آئی ہو گھر میں۔وہ سب سمجھیں گے کہ تم اپنی فرینڈ کے گھر پہ ہو اور اگر تمہیں یوں میرے ساتھ کوئی دیکھ لے تو نا صرف میری ریپوٹیشن پہ حرف آئے گا بلکہ ذرا کا رشتہ بھی

خراب ہو گا۔"

معیز کو واقعی غصہ تھا۔ وہ اونچی آواز میں بولا۔ تو رباب کو بھی غصہ آگیا۔ اس نے سی ڈی ڈیش بورڈ پر پھینکی تھی۔

"کیا بکواس ہے یہ۔ تم نے خود مجھے بلایا تھا۔"

"ہاں۔ لیکن میں خود تمہیں گھر آ کے آنٹی کی اجازت سے ساتھ لے کر جاتا۔" معیز نے قطعیت سے کہا۔

"کس رشتے سے؟" وہ چمکی۔

"جب میں بات کرتا تو وہ رشتہ بھی سمجھ جاتیں رباب۔ اگر کوئی اعتراض کرتیں تو میں وضاحت کر دیتا۔ ہم دونوں اچھے دوست ہیں۔"

معیز نے ٹھنڈے انداز میں جواب دیا تو وہ بڑبڑاتے ہوئے باہر دیکھنے لگی۔

"ایسے ڈریس میں تم وہاں اتنے لوگوں کے درمیان کھڑی تھیں اور شرم مجھے آرہی تھی۔"

معیز نے تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد تاسف سے کہا تو رباب کا دماغ گھوم گیا۔

"ایسا ڈریس۔۔۔؟ ایسے ڈریس سے کیا مطلب ہے تمہارا۔۔۔؟"

اس نے اپنے لباس کی طرف اشارہ کیا۔

"کم آن رباب۔ میں تمہاری ڈریسنگ پر نہیں بلکہ اس ڈریسنگ میں اجنبی لوگوں کے درمیان کھڑے ہونے پر اعتراض کر رہا ہوں۔"

معیز نے محتاط لفظوں کا سہارا لیا۔ وہ اسے ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔

رباب نے ناگواری سے کہا۔

"ساری دنیا ہمارے لیے اجنبی ہی ہوتی ہے معیز۔ اس کا مطلب ہے کہ تم کبھی مجھے دنیا میں نکلنے ہی نہیں دو گے؟"

"میرے ساتھ نکلو گی تو ضرور لے کے چلوں گا۔ مگر اس طرح تنہا غیر مردوں کے بیچ نہیں۔۔۔" وہ صاف گوئی سے بولا۔

"ربش۔۔۔"

رباب نے سر جھٹکا۔ وہ جو آئینے سے خوب صورتی کی سند لے کے آئی تھی۔ معیز کی باتوں سے جی بھر کے دل مکدر ہوا۔

"میرے خیال میں تم مجھے احتیاط کے ساتھ گھر ہی ڈراپ کر دو۔ کہیں تمہارا ایمان خراب نہ ہو جائے۔" ناراضی سے کہا۔

معیز نے گہری سانس بھری۔

"مجھے اچھا نہیں لگا یوں لوگوں کا تمہیں گھورنا رباب۔ عورت کا تو مطلب ہی پردہ ہے۔"

"واٹ۔۔۔" وہ بدکی۔

"تم مجھے پردہ کراؤ گے؟"

"ہمارے ہاں کون پردہ کرتا ہے مگر لباس اور رہن سہن میں ایک شرم و حیا کا احساس۔ دوپٹہ سر پہ نہ سہی مگر بدن کو تو ڈھانپے رکھے۔"

معیز نے اب کی بار نرم لفظوں میں اسے سمجھایا۔

"دیکھو معیز۔۔۔ ایک بار پھر سوچ لو۔ میں ایسی ہی ہوں۔ تم نے کون سا پہلی بار دیکھا ہے مجھے۔"

وہ تڑخ کر بولی۔
"ٹھیک ہے۔ مگر تم خود کو بدل تو سکتی ہو۔ میری خاطر؟" معیز نے مسکرا کر پوچھا۔
لوہے کو ہمیشہ نرم کر کے ہی اس پر چوٹ لگائی جاتی ہے۔ وہ چنچنی۔ تلخی سے کہا۔
"اور اگر یہی سوال میں تم سے پوچھوں تو۔۔۔؟"
"مرد نہیں، عورت خود کو بدلا کرتی ہے رباب۔ بلکہ جو جہاں غلط ہو اسے ہی خود کو بدلنا پڑتا ہے۔" معیز نے رسان سے کہا۔ رباب سلگ اٹھی۔
"تمہارا مطلب ہے کہ میں غلط ہوں۔۔۔" تیز لہجے میں اس نے کہا تھا۔
"کم آن رباب۔ کیا بچوں کا سا بی ہیو کر رہی ہو۔ ایک چیز مجھے ناپسند ہے سو کہہ دیا۔ مجھے عورت کا ڈھکا چھپا انداز پسند ہے۔"
معیز نے اسی نرمی سے کہا جو اس کے لب و لہجے کا خاصا تھی، رباب کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔
"ایمہا مراد جیسی۔۔۔"
وہ بے ساختہ بولی تو اس قدر غیر متوقع بات پر معیز کے ہاتھوں میں اسٹیرنگ۔ ڈول سا گیا۔
"ربش۔۔۔" وہ تپا "اس کا یہاں کیا ذکر؟" رباب سینے پہ بازو لپیٹتی اطمینان سے بولی۔
"وہ ایسی ہی ہے۔ پردے کی ایو۔ آج کل تو خوب ہی دکھائی دیتی ہوگی تمہیں گھر میں۔"
"اف۔۔۔" معیز کا دل چاہا اسٹیرنگ پہ سر دے مارے۔
"کیا فضول باتیں کر رہی ہو تم۔ میں تم سے تمہارے بارے میں بات کر رہا ہوں۔ اپنے دل کی بات۔ اپنی پسند کی بات۔"
"اور میں۔۔۔ میری پسند و ناپسند کچھ نہیں؟" رباب نے ناگواری سے کہا۔
"اوکے۔۔۔ لیو دس ٹاپک پلیز رباب۔" وہ تلخی بھرے اونچے لہجے میں بولا۔
"اس بحث کا رزلٹ لڑائی اور ناراضی کی صورت ہی نکلے گا۔ ختم کرو اسے۔"
"بات تم نے شروع کی تھی۔ میں تو تمہاری سوچ پہ حیران ہوں بلکہ افسوس ہو رہا ہے مجھے۔" رباب نے تاسف سے کہا۔ تو معیز کو غصہ آیا۔
"ہاں۔ عورت کو شرم و حیا کا سبق دینا تاسف ہی کی بات ہے نا۔"
"ہنہ۔۔۔" رباب نے سر جھٹکا۔
اس سے اچھا تھا وہ سیفی کے ساتھ اس کے بیچ والے اپارٹمنٹ ہی کو دیکھنے کی دعوت قبول کر لیتی۔
اسے اپنی "سادہ دلی" پہ تاؤ آیا۔ معیز ایسا ساحر تھا کہ نا چاہتے ہوئے بھی وہ اس کے بلاوے پر کھنچی چلی آتی تھی۔ اب دل کو کس اندھے کنوئیں میں پابہ زنجیر کرتی؟ وہ پچھتائی۔
اور پچھتا تو معیز بھی رہا تھا۔ رباب کو باہر ملنے کا کہہ کر۔ اگر واقعی رباب کی فیملی میں سے کوئی شخص اسے معیز کے ساتھ دیکھ لیتا تو ناگواری ہی جنم لیتی۔ ایک عجیب بے کیف لنچ کے فوراً ہی معیز نے اسے گھر ڈراپ کر دیا۔
"ایمہا مراد" دوبارہ ان کے درمیان موضوع گفتگو نہیں بنی تھی۔ معیز خاموش تھا اور رباب کا موڈ سخت خراب تھا۔

☆ ☆ ☆

تانیہ کی جاب ختم ہونے میں ایک ہفتہ رہ گیا تھا اور اس کے ایک ہفتے بعد کی شادی کی تاریخ طے تھی۔

ایمہا کے امتحان شروع ہو چکے تھے۔ ثانیہ جب اسے بذاتِ خود دعوت نامہ دینے پہنچی تو وہ آخری پیپر کی تیاری میں مگن تھی۔ ثانیہ کو دیکھ کر خوش ہو اٹھی۔

"کیا بات ہے نالائق اسٹوڈنٹ۔ گھر آکے بھی نوٹس سے چمٹی ہوئی ہو...؟"

ثانیہ نے اسے چھیڑا۔ صوفوں پر اس کے نوٹس بکھرے ہوئے تھے' جھینپتے ہوئے وہ اکٹھے کرنے لگی۔

"بس یونہی۔ تیاری تو مکمل تھی۔ سوچا ایک بار دہرا لوں۔" اس نے نوٹس فائل میں سمیٹ دیے تھے۔

"آپ سنائیں جا رہی ہیں واپس؟" ایمہا خوشی سے چمکتا چہرہ لیے اس کے پاس آ بیٹھی۔

"ہوں... یہ آخری ہفتہ ہے یہاں۔" ثانیہ نے سر ہلا کر کہا۔

"اوف..." ایمہا نے جوش سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھاما۔

"آپ کی شادی ہو گی ثانیہ۔ کتنا مزہ آئے گا نا۔"

"ہاں... دوسروں کو تو مزہ ہی آئے گا۔" وہ گہری سانس لے کر بڑبڑائی۔

"مجھے بھی انوائٹ کریں گی نا...؟"

ایمہا نے اسے یاد کرایا تو ثانیہ مسکراتے ہوئے بیگ میں سے شادی کا کارڈ نکالنے لگی۔

"دادی نے تو دو ہفتے پہلے ہی کارڈ چھپوا کے رکھ لیے ہیں۔ جو جو یاد آتا رہے گا آخری دن تک اسے کارڈ بھجواتی رہیں گی۔ تمہارا میں لے آئی تھی ساتھ۔"

ایمہا نے مبہوت ہو کر خوب صورت سا کارڈ ہاتھوں میں تھاما۔

"میں نے پہلی بار شادی کا کوئی کارڈ دیکھا ہے۔ اپنے ہاتھوں میں تھام کر۔"

وہ عجیب سی تشنگی اور معصومیت سے بولی تو اس کے ساتھ ساتھ ثانیہ کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

کتنی چھوٹی چھوٹی مگر بڑی محرومیاں سہی تھیں اس انیس بیس سالہ لڑکی نے "اور اب تم ایک شاندار شادی کا آنکھوں دیکھا حال بھی بیان کرنا مستقبل میں اپنے بچوں کے سامنے۔"

ثانیہ نے اسے ہنسانے کے لیے شرارت سے کہا تو وہ لال پڑ گئی۔

"دادی کی فرمائش ہے کہ دولہا والے مہندی والے روز گاؤں آ جائیں۔ حویلی میں ٹھہریں۔ وہاں سے میری مہندی لے کے آئیں۔ مایوں کی رسم ہو اور اگلے روز مجھے رخصت کروا کے پھر بارات واپس آئے۔"

ثانیہ نے ایک ہی سانس میں عجیب و غریب شادی کا نقشہ بیان کیا۔ مگر ایمہا بیچاری کو کیا خبر۔ اسے تو یہ پتا تھا کہ شادی ہو رہی ہے اور عون نے ثانیہ کو رخصت کروا کے لانا ہے اور بس... وہ تو اسی خوشی میں پاگل ہوئی جا رہی تھی کہ وہ اس شاندار شادی میں شرکت کرنے والی تھی۔

"کتنا مزہ آئے گا نا..." ایمہا کی تان مزے ہی پہ آ کے ٹوٹ رہی تھی۔ ثانیہ نے گہری سانس بھری۔

"بہت..." پھر مسکرا کے اسے دیکھا۔ "لاسٹ پیپر کب ہے تمہارا...؟"

"کل..." وہ فوراً بولی۔

"ٹھیک ہے۔ پھر میں پرسوں آ جاؤں گی۔ تمہیں شادی کی شاپنگ کروا دوں گی۔" ثانیہ نے پروگرام سیٹ کیا تو وہ بے طرح خوش ہو گئی۔ پھر فوراً ہی پریشان ہونے لگی۔

"لیکن... میں وہاں آؤں گی کیسے۔ آپ کے گاؤں میں؟"

"ڈونٹ وری۔ میں معیز بھائی کو خاص تلقین کر کے جاؤں گی۔ وہ ساتھ لائیں گے تمہیں۔"

ثانیہ نے اس کا ہاتھ تھپکا تو وہ کھل اٹھی۔

"اللہ..." ایمہا نے اوپر دیکھا پھر ہنستے ہوئے ثانیہ کو۔ جوش بھری خوشی سے اس کے گال گلابی ہو رہے تھے۔

"شادی آپ کی ہے اور نیند مجھے نہیں آئے گی اس دن کے انتظار میں۔"
ثانیہ کو ہنسی آگئی۔
"تو مجھے کون سا آرہی ہے۔" (خوف کے مارے)
"آپ کی تو شادی ہے اس لیے نا۔ مجھے تو اس خوشی میں نیند نہیں آئے گی کہ میں زندگی میں پہلی بار کوئی شادی اٹینڈ کروں گی۔"
ایبھا کا بس نہ چلتا تھا جھوم جھوم جائے۔ ثانیہ اسے دیکھ دیکھ کے ہنستی رہی اور ایبھا اسے کرید کرید کے شادی کی رسمیں پوچھ رہی تھی۔ پھر جیسے وہ آنکھیں پھیلا کے معصوم سی حیرت کے ساتھ تھوڑا سا منہ وا کرتی تو ثانیہ کو اس پہ پیار آئے جاتا۔
وہ خوش تھی۔۔۔ بے پناہ خوش۔

☆ ☆ ☆

وہ رباب کی وجہ سے خاصے برے موڈ میں گھر آیا تو شام گہری ہو رہی تھی۔
اور آتے ہی عمر سے ٹکراؤ۔
وہ لاؤنج میں سب کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہوئے معیز نے اونچی آواز میں سلام کیا۔
"بیا فائدہ بھئی۔۔۔ اتنی دور سے آنے کا۔ جب کوئی لفٹ ہی نہ کرائے۔"
عمر نے سلام کا جواب دیتے ہی رقت آمیز لہجے میں اپنی مظلومیت اور معیز کی "بے اعتنائی" کی دہائی دی۔
سفینہ بیگم نے تاسف سے معیز کو دیکھا۔ بلکہ ایاز کو عمر کی بات پر ہنسی آئی۔ وہ بولا۔
"ویسے اتنی کو کھینچ کر آپ امریکہ تک لے گئے ہیں کویت تو اتنی دور نہیں پڑتا۔"
معیز اس سے الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ خاموشی سے آ کے صوفے میں دھنس گیا۔
"جب امریکہ جتنی دوریاں دلوں میں آجائیں تو پھر کویت بھی دور لگنے لگتا ہے میرے بھائی۔" اس نے کسی دکھی ہیروئن شاندار نقالی کی تھی۔ زارا ہنسنے لگی۔ معیز کے ہونٹوں پر بھی نا چاہتے ہوئے مسکراہٹ پھیل گئی۔
"مسخرے ہو ابھی بھی تم پورے۔"
وہ کھڑے ہوئے کورنش بجالایا۔
"شکریہ۔۔۔ ذرہ نوازی ہے حضور کی ورنہ بندہ کس قابل ہے۔"
"ہاں۔۔۔ بندہ تو واقعی کسی قابل نہیں۔" معیز نے پرسوچ انداز میں تھوڑی کھجاتے ہوئے کہا پھر عمر کے تاثرات بگڑتے دیکھ کر ہنس دیا۔
"دیکھ لیں امی۔ آپ کا بیٹا آپ کو سابقہ حالت میں لوٹا دیا میں نے۔ یہی طے ہوا تھا نا۔"
عمر فی الفور سفینہ بیگم کی طرف متوجہ ہوا تو وہ سلگتے لہجے میں بولیں۔ تو نگاہ معیز پر تھی۔
"میں تو تب مانوں جب وہ گھٹیا عورت کی اولاد اس گھر کی اینکسی میں سے بھی دفع ہو جائے گی۔"
معیز کا دماغ تو گھوما ہی تھا۔ سفینہ بیگم کے انداز گفتگو نے عمر کو بھی بوکھلا دیا۔
ماحول کی رنگینی ایک دم ہی سنگینی میں بدل گئی تھی۔ عمر نے بڑے دنوں بعد معیز کو اپنے پہلے والے رنگ میں لوٹتے دیکھا مگر امی کے لب و لہجے کا زہر ماحول کو بدل گیا تھا۔
عمر نے سنجیدہ تاثرات اور بھینچے لبوں کے ساتھ معیز کو وہاں سے اٹھ کے جاتے دیکھا۔ تو اسے تاسف ہوا۔
"دیکھا۔۔۔ دیکھا تم نے۔ ایک لفظ بھی جو اس حرافہ کے خلاف سن لے تو۔"

سفینہ بیگم غصے سے تلملا کر بولیں۔

"ماما... آپ اپنے بیٹے کو اس معاملے میں ذہنی طور پر ٹارچر کر رہی ہیں۔ جس میں اس کا کوئی قصور ہی نہیں۔" ایراز نے سنجیدگی بھری خفگی سے ماں کو دیکھا۔ زارا چپ تھی مگر بے زار۔

کتنی ہی بار وہ ماں کو اس معاملے کو ٹھنڈے دل و دماغ سے حل کرنے کا مشورہ دے چکے تھے۔ مگر سفینہ بیگم تھیں کہ اپنے مشہور زمانہ جادو جلال کو چھوڑنے میں ہی نہ آتی تھیں۔

"جس کا قصور تھا وہ تو دنیا سے چلا گیا۔ پھر یہ کیوں اس کی غلطی کو گلے میں لٹکا کے پھر رہا ہے۔ نہیں ہوتا برداشت مجھ سے۔"

سفینہ بیگم جلبلا کر بولیں۔ تو خاموش بیٹھا عمر بول اٹھا۔

"اچھا پھپھو! یہ بتائیں آپ کو کیسی بہو چاہیے۔ آئی مین معیز کی بیوی۔"

"پڑھی لکھی ہو شریف اور با کردار، خاندانی لڑکی چاہیے مجھے۔ جو میرے بیٹے کے ساتھ جچتی ہو۔" سفینہ بیگم نے تنفر سے گویا ایمہا کو رد کیا۔

"آپ کو پتا ہے آپ کی "موجودہ بہو" گریجویشن کا ایگزام دے رہی ہے۔ اور رہی خاندان کی بات تو پھوپھا کے خاندان سے ہے وہ۔ ایک ہی خون ہے اس کا اور ان لوگوں کا۔"

عمر اس قدر آرام سے ممانات پیش کر رہا تھا کہ سفینہ بیگم شدر سی اسے دیکھے گئیں۔

گویا وکیل ان کا تھا اور ساتھ مخالف کا دے رہا تھا۔

"سادگی، معصومیت اور خوب صورتی ایکسٹرا کوالٹی ہے اس کی اور رہی بات معیز کے ساتھ جچنے کی تو معاف کیجئے گا وہ زیادہ نمبر لے جائے گی معیز سے۔"

عمر نے مسکراتے ہوئے اطمینان سے بات مکمل کی۔ اس کے انداز سے کہیں بھی نہیں لگا کہ وہ مذاق کر رہا ہے۔ زارا تو دھک سی ماں کا رنگ بدلتا چہرہ دیکھ رہی تھی جبکہ ایراز کو اچھا لگا تھا عمر کا اس بے قصور لڑکی کی حمایت میں بولنا۔

سفینہ جوابا" میں لوٹتی تلملا اٹھیں۔

"یہ کیا بکواس ہے عمر... ؟ میں نے کیا یہاں تمہیں اس کی صلاحیتوں اور خوبیوں پہ روشنی ڈالنے کے لیے بلایا تھا۔"

"وہ سورج جیسی لڑکی ہے پھپھو۔ جسے دیکھنے سے آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ سادہ دنیا سے بے خبر۔ لوگ تو ترستے ہیں ایسی لڑکی کو بہو بنانے کے لیے۔" وہ سنجیدہ تھا۔

"تمہیں بڑا پتا چل گیا ہے پندرہ دنوں میں۔" انہوں نے جل کر طنز کیا۔

"ظاہر ہے۔ اسی کام کے لیے۔ انویسٹی گیشن بھجوایا گیا تھا مجھے۔" عمر نے آرام سے جواب دیا۔

"بھائی کو فورس مت کریں ماما۔ انہیں ان کی مرضی کا فیصلہ کرنے دیں۔ ویسے بھی وہ شاید رباب میں انٹرسٹڈ ہیں۔ تو پھر انہیں موقع دیں وقت دیں صحیح فیصلہ کرنے کا۔"

ایراز نے ہمیشہ کی طرح غیر جانب داری کا مظاہرہ کیا تو سفینہ بیگم سر تھام کے بیٹھ گئیں۔

☆ ☆ ☆

ایمہا بے حد پرجوش تھی۔ ثانیہ کی شادی میں آنے والے متوقع "مزے" کے خیال ہی نے اسے خوش کر رکھا تھا۔ اس کے امتحان ختم ہو چکے تھے اور آج وہ ثانیہ کے ساتھ اپنی زندگی کی پہلی باقاعدہ شاپنگ کے لیے آئی تھی۔

مہندی کا سوٹ معہ جوتے اور جیولری کے ثانیہ نے اسے اپنی طرف سے گفٹ کیا تو وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

"اٹس اوکے ثانیہ۔ پیسے ہیں میرے پاس۔"

واقعی اس کا والٹ نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ ابھی تک معیز اسے جو ماہانہ دس ہزار دیتا رہا تھا اس میں سے کچھ خرچنے کی نوبت ہی کہاں آئی تھی، سو وہ اطمینان سے شاپنگ کر سکتی تھی۔

اپنی زندگی کی پہلی شاپنگ... والٹ میں سے نوٹ نکال کے پے منٹ کرتے اس کے ہاتھ لرزنے لگے۔ ایک عجیب سی سنسناہٹ اس کے وجود میں دوڑا تھی۔

دل یک لخت ہی بوجھل سا ہو گیا اور رنگت زرد۔

ثانیہ گھبرا کر شاپنگ ادھوری چھوڑ اسے قریبی کولڈ اسپاٹ پہ لے آئی۔ اسے روڈ سائیڈ کرسی پہ بٹھایا۔ اور زبردستی ٹھنڈا جوس اس کے ہاتھ میں تھمایا۔

اور پھر اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرتے آنسو دیکھ کر وہ ساکت رہ گئی۔

"ایبھا... آر یو اوکے؟ کیا ہوا جانو..."

ثانیہ نے جھک کر اس کا ہاتھ تھاما تو وہ اس کے ساتھ لگ کے رو دی۔ اس کا خود پہ قابو ہی نہیں تھا۔

"بیا... بتاؤ تو کیا ہوا... طبیعت ٹھیک نہیں ہے کیا؟" ثانیہ پریشان تو تھی ہی اب گھبرا بھی گئی۔

"بس کرو نا یار۔ روڈ سائیڈ پہ ہیں ہم۔ لوگ گھور گھور کے دیکھ رہے ہیں۔" ثانیہ نے دوسرا حربہ آزمایا اور اس کا اثر بھی فوری طور پر ہوا۔ یا شاید دل کا غبار نکلنے کے بعد اس کے "دورے" کی کیفیت کم ہو گئی تھی۔

ثانیہ سے الگ ہو کے وہ چادر سے چہرہ پونچھنے لگی۔

"جوس پیو پھر اطمینان سے بات کرتے ہیں۔"

ثانیہ اس کے ساتھ والی کرسی پہ بیٹھتے ہوئے نرمی سے بولی تو اس نے خاموشی سے اسٹرا لبوں میں دبا لیا۔

"اب بتاؤ... کیا ہوا تھا... سوٹ کا کلر پسند نہیں آیا یا قیمت سن کے رو پڑی تھیں؟"

جوس ختم کرنے تک وہ خاصی سنبھل چکی تھی تب ثانیہ نے مزاقاً پوچھا۔ تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔ مگر آواز نہیں نکلی۔ گلے میں جیسے کوئی سخت چیز اٹکنے لگی۔ آنکھوں کی زمین پھر نم ہونے لگی۔

"ایسے ہی... یہ روپے خرچ کرتے مجھے... امی یاد آنے لگیں۔ وہ بے چاری تو روپیہ روپیہ کماتے جوڑتے مر گئیں۔ حلال روزی کمانے کا جنون... مجھے بچانے کا خوف... اور آج میں دونوں ہاتھوں سے یہ روپیہ اڑا رہی ہوں۔"

ثانیہ کے دل میں تاسف اور ہمدردی بھر گئی۔

"ہر انسان اپنی قسمت پاتا ہے بیا! اور یہ تمہاری امی کی دعائیں ہیں جو تمہیں لگ گئی ہیں۔ تم رو مت۔ بس ان کی بخشش کے لیے دعا کر دیا کرو۔ قرآن پڑھا کرو ان کے لیے۔ اپنے دل کے اطمینان کے لیے۔"

ایبھا نے آنکھیں ہتھیلیوں سے رگڑتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور مسکرانے کی کوشش کی۔

"میرے خیال میں دہی بھلے، سموسے کھا لینے چاہئیں باقی کی شاپنگ اس کے بعد۔ تمہارا ولیمہ کے لیے جوڑا لینا باقی ہے اور کچھ موسم کی شاپنگ کرواؤں گی۔ گرمی آئی ہے اور لون کے جتنے بھی کپڑے ہوں کم ہی ہوتے ہیں۔"

ثانیہ نے جلدی جلدی کا تاثر پھیلاتے ہوئے بات بدلی۔ ایبھا متشکر ہوئی۔ واقعی اسے کہاں خیال آنا تھا بدلتے موسم کی شاپنگ کرنے کا۔ یہ تو ثانیہ ہی تھی جو بڑی آپا بن کے خیال رکھتی تھی سب باتوں کا۔

ان دونوں نے سموسے کھائے، دہی بھلوں کی ایک پلیٹ لے کے شیئر کی اور اوپر سے کولڈ ڈرنکس... اس کے بعد کی ساری شاپنگ ثانیہ نے بہت اطمینان سے کروائی۔ ایبھا کو تو ہر چیز نئی اور اچھی لگتی تھی۔ ثانیہ نے خود ہی

فالتو چیزوں سے پرہیز کرتے ہوئے اسے کپڑوں اور ضرورت کی دوسری اشیاء کی شاپنگ کر کے دی' دونوں لدی پھندی ٹیکسی میں گھسیں تو بھی فلاں چیز اور فلاں چیز کی باتیں۔ ثانیہ اتنی اچھی شاپنگ کا کریڈٹ خود کو دے رہی تھی اور ایبہا خود کو بہت امیر تصور کر رہی تھی۔ جو اب دنیا کی ہر چیز خرید سکتی ہو۔

ایبہا کے ساتھ سامان لے کر اترتے ثانیہ نے ٹیکسی والے کو کرایہ دے کر رخصت کیا اور دونوں سامان لے کر انیکسی میں چلی آئیں۔

"غلطی کر دی۔ ٹیکسی والے کو ویٹ کرنے کا کہتی' اسی ٹیکسی پہ گھر چلی جاتی۔" ثانیہ کو پانی پیتے ہوئے دھیان آیا تو تاسف سے بولی۔

"عون بھائی سے کہیں۔ اڑتے ہوئے آئیں گے وہ تو۔" ایبہا شرارت سے کہتی اس کے پاس آ بیٹھی۔

"ہاں... وہ تو ہے۔" ثانیہ کا دل اداس ہونے لگا۔ پہلے والا عون ہوتا تو یونہی آتا... پھر بھی وہ بشاشت سے بولی۔

"دادی کہتی ہیں اب عون سے مکمل پردہ کرنا ہے' ورنہ شادی والے دن منہ پہ پھٹکار برسے گی۔"

ایبہا ہنسنے لگی۔

"یہ کون سی سائنس ہے؟"

"جو بھی ہے۔ مگر مجھے شادی کے دن پھٹکار زدہ چہرہ لے کے پھرنے کا کوئی شوق نہیں۔" ثانیہ نے شانے اچکائے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آج یہیں رک جائیں۔" ایبہا نے آفر کی مگر ثانیہ نہیں مانی۔

"جا کے ساری پیکنگ کرنی ہے۔ خالہ کے پورے گھر میں میری چیزوں کا پھیلاوا ہے۔ آدھی تو میرے جانے کے بعد برآمد ہوں گی۔" باہر آ کے ثانیہ کو ایک بار پھر افسوس ہوا۔ رکشہ یا ٹیکسی ملتا بھی تو ذرا مین روڈ پہ آ کے۔

اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ اس نے ثانیہ کو شاپنگ کرواتے ہوئے اپنی بھی تھوڑی سی چیزیں خریدی تھیں۔ اب اس کے شانے پہ شولڈر بیگ تھا اور ہاتھ میں دو شاپنگ بیگز۔ وہ تیز قدموں سے چلتی مین روڈ کی طرف بڑھی جو سامنے ہی تھی۔ مگر ایسے میں وہ اپنے پیچھے آتی گاڑی سے انجان ہی رہی۔ وہ اب بھی دھیان نہ کرتی...

مگر اس شخص نے گاڑی عین اس کے پیچھے روکی تو ہیڈ لائٹس نے ثانیہ کو گڑبڑا کر سائیڈ پہ ہونے پہ مجبور کر دیا۔ وہ شخص پھرتی سے گاڑی سے اترا اور ثانیہ کی طرف بڑھا جو بنا اس کی طرف متوجہ ہوئے آگے بڑھنے کے ارادے میں تھی۔

اس شخص نے درشتی سے ثانیہ کا بازو تھام کر گاڑی کی طرف کھینچا تو بے اختیار ثانیہ کی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ گاڑی کا اگلا دروازہ کھول کر اسے زبردستی گاڑی میں دھکیل دیا گیا تھا۔ اگلے ہی لمحے اس شخص نے ثانیہ کی چیخ و پکار سے بے پرواہ گاڑی دوڑا دی تھی۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

نمرہ احمد

نمل

فارس غازی انٹیلی جنس کے اعلا عہدے پر فائز ہے۔ وہ اپنے سوتیلے بھائی وارث غازی اور اپنی بیوی کے قتل کے الزام میں چار سال سے جیل میں قید ہے۔ سعدی یوسف اس کا بھانجا ہے۔ جو اس سے جیل میں ہر ہفتے ملنے آتا ہے۔
سعدی یوسف تین بہن بھائی ہیں' ان کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ حنین اور اسامہ' سعدی سے چھوٹے ہیں۔ ان کی والدہ ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ چلاتی ہیں۔ زمر' سعدی کی پھپھو ہے۔ وہ چار سال قبل فائرنگ کے ایک واقعہ میں زخمی ہو جاتی ہے۔ فائرنگ کا الزام فارس غازی پر ہے۔ فارس غازی کو شک تھا کہ اس کی بیوی اس کے بھائی کے ساتھ انوالو ہے۔ اس نے جب فائرنگ کی تو زمر اس کی بیوی کے ساتھ تھی۔ فائرنگ کے نتیجہ میں بیوی مر جاتی ہے اور زمر شدید زخمی ہو جاتی ہے۔ ایک انگریز عورت اپنا گردہ دے کر اس کی جان بچاتی ہے۔ سعدی کو یقین ہے کہ اس کا ماموں بے گناہ ہے۔ اسے پھنسایا گیا ہے۔ اس لیے وہ اسے بچانے کی کوشش کرتا ہے' جس کی بنا پر زمر اپنے بھتیجے سعدی یوسف سے بدظن ہو جاتی ہے۔ بدظن ہونے کی ایک اور بڑی وجہ یہ ہے کہ زمر جب موت و زندگی کی کشمکش میں ہوتی ہے تو سعدی اس کے پاس نہیں ہوتا۔ وہ اپنی پڑھائی اور امتحان میں مصروف ہوتا ہے۔
جواہرات کے دو بیٹے ہیں۔ ہاشم کاردار اور نوشیرواں۔
ہاشم کاردار بہت بڑا وکیل ہے۔ ہاشم اور اس کی بیوی شہرین کے درمیان علیحدگی ہو چکی ہے۔ ہاشم کی ایک بیٹی سونیا ہے۔ جس سے وہ بہت محبت کرتا ہے۔
فارس غازی' ہاشم کی پھپھو کا بیٹا ہے۔ جیل جانے سے پہلے وہ ہاشم کے گھر میں جس میں اس کا بھی حصہ ہے' رہائش پذیر تھا۔ سعدی کی کوششوں سے فارس رہا ہو جاتا ہے۔

مکمل ناول

والد کے کہنے پر زمر سعدی کی سالگرہ پر اس کے لیے پھول اور ہاشم کی بیٹی سونیا کی سالگرہ کا کارڈ لے کر جاتی ہے۔ سعدی ہاشم کی بیوی سے ہاشم کے لیپ ٹاپ کا پاس ورڈ مانگتا ہے۔ شہرین اپنے دیور نوشیرواں سے' جو اپنی بھابھی میں دلچسپی رکھتا ہے' بہانے سے پاس ورڈ حاصل کرکے سعدی کو سونیا کی سالگرہ میں دے دیتی ہے۔
پاس ورڈ ملنے کے بعد سعدی ہاشم کے کمرے میں جاکر اس کے لیپ ٹاپ پہ فلیش ڈرائیو لگا کر ڈیٹا کاپی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔
چیف سیکریٹری آفیسر خاور' ہاشم کو اس کے کمرے کی فوٹیج دکھاتا ہے' جس میں سعدی کمرے میں جاتے ہوئے نظر آتا ہے' ہاشم خاور کے ساتھ بھاگتا ہوا کمرے میں پہنچتا ہے' لیکن سعدی اس سے پہلے ہی وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔
ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی اس کے کمرے میں لیپ ٹاپ سے ڈیٹا کاپی کرنے آیا تھا اور شہرین نے نوشیرواں کو استعمال کرکے پاس ورڈ سعدی کو دیا تھا۔ دوسری جانب بڑے ابا زمر کو یہ بتا دیتے ہیں کہ زمر کو کسی یورپین خاتون نے نہیں بلکہ سعدی نے گردہ دیا تھا۔ یہ سن کر زمر کو بے حد دکھ ہوتا ہے۔
نوشیرواں ایک بار پھر ڈرگز لینے لگتا ہے اس بات پر جواہرات فکر مند ہے۔
بعد میں سعدی لیپ ٹاپ پہ فائلز کھولنے کی کوشش کرتا ہے لیکن فائلز ڈیلیٹ ہو جاتی ہیں۔
سعدی حنین کو بتاتا ہے کہ وہ گیم کے ہائی اسکورز کی فہرست میں پہلے نمبر پر نہیں ہے' حنین حیران ہو کر اپنی گیم والی سائٹ کھول کر دیکھتی ہے تو پہلے نمبر پر "آمس اوور آفٹر" لکھا ہوتا ہے۔ وہ علیشا ہے اور جیت جاتی ہے۔ حنین کی علیشا سے دوستی ہو جاتی ہے۔
اب کہانی ماضی میں آگے بڑھ رہی ہے۔ فارس' زمر سے لاء کی کچھ کلاسز لیتا ہے۔ ندرت اس سے شادی کا پوچھتی ہیں۔ وہ لاپروائی سے زمر کا نام لے لیتا ہے۔ ندرت خوش ہو کر ابا سے بات کرتی ہیں۔ ان کی ساس فارس کو اجڈ اور بدتمیز سمجھتی ہیں اور اس کے مقابلے میں فہد سے زمر کی بات طے کردیتی ہیں۔ وارث غازی' ہاشم کے خلاف منی لانڈرنگ کیس کے پر کام کر رہا ہے۔ اس کے پاس مکمل ثبوت ہیں۔ اس کا باس فاطمی ہاشم کو خبردار کردیتا ہے۔ ہاشم' خاور کی ڈیوٹی لگاتا ہے کہ وہ وارث کے پاس موجود تمام شواہد ضائع کرے۔ وارث کے ہاسٹل کے کمرے میں خاور اپنا کام کر رہا ہے۔ جب وارث ریڈ سگنلز ملنے پر اپنے کمرے میں جاتا ہے۔ پھر کوئی راستہ نہ ہونے کی صورت میں بہت مجبور ہو کر ہاشم' خاور کو وارث کو مار دینے کی اجازت دے دیتا ہے۔ دوسری صورت میں وارث' فارس کو سارے شواہد میل کردیتا۔ وارث کے قتل کا الزام ہاشم' فارس پہ ڈلواتا ہے۔
زرتاشہ کو قتل اور زمر کو زخمی کرنا بھی فارس کو وارث کے قتل کے الزام میں پھنسانے کی ہاشم اور خاور کی منصوبہ بندی ہوتی ہے۔ وہ دونوں کامیاب ٹھہرتے ہیں۔ زرتاشہ مرجاتی ہے۔ زمر زخمی حالت میں فارس کے خلاف بیان دیتی ہے۔ فارس جیل چلا جاتا ہے۔ سعدی زمر کو سمجھاتا ہے کہ فارس ایسا نہیں کر سکتا۔ اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔ زمر کہتی ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولتی اور اپنے بیان پر قائم رہتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ زمر کی ناراضی کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وارث کے قتل کے وقت بھی اس کی شادی لیٹ ہو جاتی ہے اور وہ اپنی شادی روک کر فارس کے لیے مقدمہ لڑتی ہے۔ اب وہی شخص اپنے اس قتل کو چھپانے کے لیے اسے مارنا چاہتا ہے۔ وہ بظاہر اتفاقاً" بچ جاتی ہے مگر اس کے دونوں گردے ضائع ہو جاتے ہیں۔ اور اس حادثے کی صورت اس کی شادی ٹوٹ جاتی ہے۔
حنین کی نیٹ فرینڈ علیشا دراصل اورنگ زیب کی بیٹی ہے جسے وہ اور ہاشم تسلیم نہیں کرتے۔ وہ باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے حنین سے دوستی کرتی ہے اور پڑھائی کے لیے کاردار سے پیسے کے لیے غیر قانونی پاکستان آتی ہے۔ مگر ہاشم اس سے بہت برے طریقے سے پیش آتا ہے اور کوئی مدد نہیں کرتا۔ زرتاشہ اور زمر کے قتل کے وقت فارس اور حنین وارث کیس کی ایل ایل بی کے سلسلے میں علیشا کے پاس ہی ہوتے ہیں مگر علیشا ہاشم کی وجہ سے کھل کر ان کی مدد کرنے سے قاصر ہے۔
زمر فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ فارس کے خلاف بیان دے گی۔ گھر میں اس فیصلے سے کوئی بھی خوش نہیں' جس کی بنا پر زمر کو

دکھ ہوتا ہے۔

جواہرات‘ زمر سے ملنے آتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ فارس کے خلاف بیان دے۔ وہ زمر کے ساتھ ہے‘ اسی وقت زمر کا منگیتر اس کو دیکھنے آتا ہے۔ اس کی ہونے والی ساس یہ رشتہ ختم کرنا چاہتی ہے۔ جواہرات اس کے منگیتر کو اپنی گاڑی میں بٹھالیتی ہے اور اسے آسٹریلیا بھجوانے کی آفر کرتی ہے۔

سعدی‘ فارس سے ملنے جاتا ہے تو وہ کہتا ہے ہاشم اس قسم کا آدمی ہے جو قتل بھی کرسکتا ہے اور وہ فارس سے مخلص نہیں ہے۔

سعدی کو پتا چلتا ہے کہ اسے اسکالر شپ نہیں ملا تھا۔ زمر نے اپنا پلاٹ بیچ کر اس کو باہر پڑھنے کے لیے رقم دی تھی۔ اسے بہت دکھ ہوتا ہے۔

زمر کو کوئی گردہ دینے والا نہیں ملتا تو سعدی اسے اپنا گردہ دے دیتا ہے۔ وہ یہ بات زمر کو نہیں بتاتا۔ زمر بدگمان ہو جاتی ہے کہ سعدی اس کو اس حال میں چھوڑ کر اپنا امتحان دینے ملک سے باہر چلا گیا۔

سعدی‘ علیشا کو راضی کرلیتا ہے کہ وہ یہ کہے گی کہ وہ اپنا گردہ زمر کو دے رہی ہے‘ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر زمر کو پتا چل گیا کہ گردہ سعدی نے دیا ہے تو وہ کبھی سعدی سے گردہ لینے پر رضامند نہیں ہوگی۔

ہاشم حنین کو بتا دیتا ہے کہ علیشا نے اورنگ زیب کاردار تک پہنچنے کے لیے حنین کو ذریعہ بنایا ہے۔ حنین اس بات پر علیشا سے ناراض ہو جاتی ہے۔

ہاشم‘ علیشا کو دھمکی دیتا ہے کہ وہ اس کی ماں کا ایکسیڈنٹ کروا چکا ہے اور وہ اسپتال میں ہے۔ وہ علیشا کو بھی مروا سکتا ہے۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ اور اس کی ماں بھی امریکن شہری ہیں۔

جواہرات‘ زمر کو بتاتی ہے کہ زمر کا منگیتر حماد شادی کررہا ہے۔

فارس کہتا ہے کہ وہ ایک بار زمر سے مل کر اس کو بتانا چاہتا ہے کہ وہ بے گناہ ہے۔ اسے پھنسایا جارہا ہے۔ وہ ہاشم پر بھی شبہ ظاہر کرتا ہے‘ لیکن زمر اس سے نہیں ملتی۔

ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی اس کے کمپیوٹر سے ڈیٹا چرا کرلے جاچکا ہے۔ وہ جواہرات سے کہتا ہے کہ زمر کی شادی فارس سے کرانے میں خطرہ ہے‘ کہیں وہ جان نہ جائے کہ فارس بے گناہ ہے‘ لیکن وہ مطمئن ہے۔ جواہرات‘ زمر کو بتاتی ہے کہ فارس نے اس کے لیے رشتہ بھجوایا تھا‘ جسے انکار کردیا گیا تھا۔ زمر کو یقین ہو جاتا ہے کہ فارس نے اسی بات کا بدلہ لیا ہے۔ زمر‘ جواہرات کے اکسانے پر صرف فارس سے بدلہ لینے کے لیے اس سے شادی پر رضامند ہو جاتی ہے۔

ڈیڑھ ماہ قبل ایک واقعہ ہوا تھا جس سے سعدی کو پتا چلا کہ ہاشم مجرم ہے۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ نوشیرواں نے ایک ڈراما کیا تھا کہ وہ کوریا میں ہے اور اغوا ہوچکا ہے۔ تاوان نہ دیا گیا تو وہ لوگ اس کو ماردیں گے۔

ہاشم‘ حنین اور سعدی کو آدھی رات کو گھر بلاتا ہے اور ساری سچویشن بتا کر اس سے پوچھتا ہے‘ کیا اس میں علیشا کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔

وہ حنین سے کہتا ہے کہ تم اس کے بارے میں پتا کرو۔ حنین کمپیوٹر سنبھال لیتی ہے۔ سعدی اس کے ساتھ بیٹھا ہوتا ہے۔ تب ہی ہاشم آکر اپنا سیف کھولتا ہے تو سعدی کی نظر پڑتی ہے۔ اس کو جو کچھ نظر آتا ہے۔ اس سے اس کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔

اس میں وارث کی بیٹیوں کی تصویر ہوتی ہے۔ جو وارث ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ وہ ہاشم کے سیف کا کوڈ آئینے میں دیکھ لیتا ہے اور کمرے سے اس کے جانے کے بعد سیف کھولتا ہے۔ اس سے ایک لفافہ ملتا ہے‘ جس میں اس ریسٹورنٹ میں فائرنگ کے فوراً بعد کی تصویر ہوتی ہے‘ جس میں زمر خون میں لت پت نظر آتی ہے اور ایک فلیش ڈرائیو بھی ملتی ہے۔

تب اسے پتا چلتا ہے کہ ہاشم مخلص نہیں تھا۔ یہ قتل اسی نے کرایا تھا۔
حنین، نوشیرواں کی پول کھول دیتی ہے، وہ کہتی ہے کہ نوشیرواں پاکستان میں ہی ہے اور اس نے پیسے اینٹھنے کے لیے اغوا کا ڈراما رچایا۔
سعدی وہ فلیش سنتا ہے تو سن رہ جاتا ہے۔ وہ فارس کی آواز کی ریکارڈنگ ہوتی ہے۔ جس میں وہ زمر کو دھمکی دیتا ہے۔
سعدی بار بار سنتا ہے تو اسے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ جعلی ہے۔ وہ فارس کے وکیل کو فارغ کر دیتا ہے۔ جو ہاشم کا آدمی تھا۔
سعدی زمر کے پاس ایک بار پھر جاتا ہے اور اسے قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ فارس بے گناہ ہے۔ وہ کہتا ہے اس میں کوئی تیسرا آدمی بھی ملوث ہو سکتا ہے۔
"مثلاً" کون؟" زمر نے پوچھا۔
"مثلاً"... مثلاً" ہاشم کاردار..." سعدی نے ہمت کر کے کہہ ڈالا۔ زمر سن سی ہو گئی۔

نویں قسط (ل)

"ہاشم کاردار؟" زمر کو شاک سے نکلنے میں چند لمحے لگے اور پھر ایک دم آنکھوں میں ناگواری ابھر آئی۔ "اس کا نام کیسے لے سکتے ہو تم؟"
"وہ ان کے کزن ہیں۔ پھر جائیداد کے تنازعے! وہ فارس غازی کو اس میں پھنسا سکتے ہیں اس سے ان کو فائدہ ہو گا نقصان نہیں۔"
"او کے، سعدی! بہت ہو گیا۔" ٹانگ پہ رکھی دوسری ٹانگ سیدھی کی اور درشتی سے کہتی آگے کو ہوئی۔ "نہیں یہ ڈیفنس اسٹریٹجی بہت دفعہ کورٹ میں استعمال کر چکی ہوں۔ جب اپنے دفاع میں کوئی بات نہ ہو تو کسی تیسرے شخص پہ شک دلوا دو۔ مگر کیا تمہارے پاس کوئی ثبوت ہے؟"
سعدی کی گردن نفی میں ہلی۔ (کیا اس آڈیو اور ان تصاویر کا ہاشم کے کمپیوٹر سے ملنا ایسا ثبوت تھا جسے وہ پیش کر سکے؟ ہرگز نہیں۔)
"پھر تم کیسے کسی پہ اتنا بڑا الزام لگا سکتے ہو؟ فارس کے خلاف میری گواہی کو چھوڑ دو تب بھی ثبوت ہیں۔ اس کی گن، اس کے فنگر پرنٹس۔ تم مجھے اس سے بڑے ثبوت ہاشم یا کسی اور کے خلاف لا کر دو، میں تمہاری بات سنوں گی، مگر اس سے پہلے نہیں۔" تلخی سے بولتی وہ کھڑی ہو گئی۔ سعدی نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ اکتائی ہوئی لگ رہی تھی۔

"تو آپ ڈھائی سال سے ہماری بات اس لیے نہیں سن رہیں کیوں کہ ہم ثبوت نہیں دے رہے؟"
"اگر مجھے جھوٹا کہنے کے بجائے کچھ کہتے تو میں سنتی۔"
"آپ اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔" سرہلا کر وہ کھڑا ہوا۔ چند لمحے دونوں آمنے سامنے کھڑے رہے۔
"آخری بات، پھپھو۔" وہ ذرا جھجکا۔ "مجھے کسی ایسے وکیل کا بتائیں، جو ہم افورڈ بھی کر سکیں اور وہ ہمارے ساتھ مخلص بھی ہو۔ فارس غازی کے لیے۔"
(اس کے سامنے اب وہ اسے ماموں کہنے سے دانستہ احتراز برتنے لگا تھا۔)
زمر نے سر جھٹکا۔ ذرا توقف کیا۔ تنے اعصاب جیسے ڈھیلے پڑے۔
"خلجی صاحب سے مل لو۔ نمبر اور پتا ٹیکسٹ کر دیتی ہوں۔ ان کے پہلے تاثر پہ مت جانا۔ اچھے وکیل ہیں۔" اور اسی طرح سینے پہ بازو لپیٹے وہ مڑ گئی۔ اسے پیچھے آنے کا نہیں کہا۔ چاہے تو وہ اندر آ جائے، چاہے تو نہ آئے۔ سعدی یاسیت سے اسے جاتے دیکھتا رہا۔ ڈھائی سال سے وہ بس اس کی پھپھو تھی۔ زمر نہیں۔
اگر ایک دفعہ، ایک دفعہ وہ شکوہ کر دے تو وہ اسے بتا دے گا، یا شاید نہیں بتائے گا۔ بس ایک دفعہ۔

☼ ☼ ☼

جو زہر پی چکا ہوں تمہیں نے مجھے دیا
اب تم تو زندگی کی دعائیں مجھے نہ دو

چھوٹے باغیچے والے گھر کے لاؤنج میں فل آواز کے ساتھ ٹی وی چل رہا تھا۔ ندرت کبابوں کی ٹکیاں بناتی، بڑی ڈش میں رکھتی جارہی تھیں۔ ساتھ ہی صوفے پہ پیر اوپر رکھے حنین موبائل پہ نمبر ملا رہی تھی۔ بار بار کال ملاتی، پھر کاٹ دیتی۔ بالآخر اب ہمت کرہی لی۔ دوسری طرف گھنٹی جاتی رہی۔ پھر ندرت نے اسے کہتے سنا۔

"کیا میں علیشا سے بات کرسکتی ہوں؟" وہ سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگیں۔

"میں حنین ہوں۔ حنہ۔ پاکستان سے۔" وہ ذرا ہچکچا کر کہہ رہی تھی۔ "علیشا میری میلز کا جواب نہیں دے رہی۔ وہ کدھر ہے؟ دراصل مجھے اس کو کسی کا پیغام دینا تھا۔"

وہ اب بہت دھیان سے دوسری طرف کی بات سننے لگی تھی۔ بالکل چپ۔ خاموش اور ساکت۔ پھر بغیر کچھ کہے فون رکھ دیا۔

"کیا ہوا؟" مگر حنہ نے نہیں سنا۔ چپ بیٹھی رہی۔

سعدی اندر آیا اور سلام کرکے ماں کے قریب صوفے پہ گر سا گیا۔ وہ تھکا ہوا لگ رہا تھا۔

"فارس سے ملے؟" وہ امید سے پوچھنے لگیں۔

"جی اور پھپھو سے بھی۔" وہ دور خلا میں دیکھتا اپنی سوچ میں گم تھا۔

"کیا وہ اب بھی تمہاری بات سننے کو تیار نہیں؟"

"ان کا قصور نہیں ہے۔ ان کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی کرتا۔"

"تم سے بھی وہی رویہ ہے؟"

"چھوڑیں امی!" وہ چہرے پہ بشاشت واپس لاتے سیدھا ہوا، اور ہاتھ بڑھا کر چنے کی دال اور گوشت کے پسے آمیزے کو تین انگلیوں میں اٹھانا چاہا۔ انہوں نے اس کے ہاتھ پہ چپت رسید کی۔

"ہزار دفعہ کہا ہے، مت کھایا کرو درمیان سے۔ بے برکتی ہوتی ہے۔"

مگر ندرت کی ڈھیٹ اولاد کو فرق نہیں پڑتا تھا۔ سعدی نے آمیزہ منہ میں رکھا اور چباتے ہوئے پھر سے پیچھے ہو کر بیٹھ گیا۔ حنین بدستور سر جھکائے بیٹھی تھی۔ دفعتاً ان کو خیال آیا۔

"سعدی۔ بیٹا! وہ مرکز کے فرنٹ پہ جو بیکری ہے نا، وہ لوگ جگہ خالی کررہے ہیں۔ کیوں نہ ہم اس کو کرایے پہ لے کر کوئی کام شروع کردیں؟"

"آپ نے ابھی تو اسکول کی جاب ختم کی ہے اور آپ کی صحت بھی اتنی اچھی نہیں۔ کیوں خود کو ہلکان کرتی ہیں؟"

"خرچے بہت ہیں اور تمہاری تنخواہ سے وہ نہیں پورے ہوتے۔ میں آج کل یہی سوچ رہی ہوں۔ بیکری کی جگہ کافی بڑی ہے۔ کپڑوں کا بوتیک شروع کرنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اگر فارغ بیٹھی رہی تو زیادہ بیمار ہوجاؤں گی۔"

سعدی نے ایک نظر ان کے ہاتھوں کو دیکھا جو مہارت سے کباب کو شکل دے رہے تھے۔ کچھ سوچ کر وہ مسکرایا۔

"آپ ریسٹورنٹ کھول لیں امی! کسی کو کھانا کھلانے سے پیارا احسان کیا ہوگا بھلا؟"

"ریسٹورنٹ؟" وہ سوچ میں الجھیں۔

"مگر پہلے کسی سے مشورہ کرلیجیے گا۔"

"کس سے کروں؟"

"کوئی بھی کام شروع کرنے سے پہلے دو لوگوں سے مشورہ لیتے ہیں امی! ایک وہ جس نے اس کام میں فائدہ اٹھایا ہو اور ایک وہ جس نے اس میں نقصان اٹھایا ہو۔" پھر حنہ کو دیکھا جو ابھی تک شل بیٹھی تھی۔

"گڈو بیگم! ریسٹورنٹ بننے سے تمہارے تو دن پھر جائیں گے؟" سعدی نے اسے آواز دی۔ اس نے سفید پڑتا چہرہ اٹھایا۔

"ہاشم بھائی سے بات ہو تو انہیں بتا دیجیے گا کہ اب علیشا کو ان کے پیسوں کی ضرورت نہیں رہی۔"
کچے کباب کا ٹکڑا اس کے حلق میں رہ گیا' وہ چونکا۔
"کیوں؟ کیا ہوا؟"
"اس کو جب پیسے چاہیے تھے' تب انہوں نے نہیں دیے۔ پھر اس نے خود ہی حاصل کرنے چاہے۔" وہ شاک کے عالم میں بول رہی تھی۔ "اس نے کچھ دوستوں کے ساتھ مل کر چوری کرنے کی کوشش کی۔ وہ کمپیوٹرز میں اچھی تھی اور قسمت میں بری۔ سب گرفتار ہو گئے۔ اب وہ جیل میں ہے' ایک لمبے عرصے کے لیے۔"
وہ بے یقین تھی' بالکل حق دق۔ پھر ایک دم اٹھ کر اندر چلی گئی۔ سعدی ابھی تک ساکت و جامد بیٹھا تھا۔ ندرت افسوس سے کچھ کہہ رہی تھیں مگر وہ نہیں سن رہا تھا۔
اور پھر جب شاک اُترا تو ہر طرف تاسف چھا گیا۔

☼ ☼ ☼
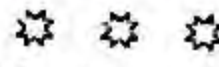
ان ہی پتھروں پہ چل کر اگر آسکو تو آؤ
مرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

قصر کاردار میں ملازموں کی چہل پہل جاری تھی۔ سرما کی وہ دھند آمیز صبح باہر تک محدود تھی۔ اندر سینٹرل ہیٹنگ نے لاؤنج کو گرم رکھا تھا۔ نئی لڑکی فینونا ایک ان ڈور گملے کو پانی دے رہی تھی۔ گاہے بگاہے نگاہ اٹھا کر اورنگ زیب کے کمرے کی سمت بھی دیکھ لیتی۔ جہاں دروازہ ادھ کھلا تھا اور وہ آئینے کے سامنے کھڑے تیار ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔ فینونا وہاں سے مکمل منظر نہیں دیکھ سکتی تھی' آوازیں بھی مدھم تھیں' مگر جھگڑے کی آواز بہرا بھی سمجھ لیتا ہے' وہ تو صرف زبان سے نا آشنا تھی۔
اگر اندر جھانکو تو سامنے کاؤچ پہ ٹانگ پہ ٹانگ جما کر جواہرات بیٹھی تھی۔ سلگتی آنکھیں اورنگ زیب کی پشت پر جمی تھیں۔

"اگر تم ایک دفعہ شیرو کی بات سن کے۔۔۔"
"اپنے بیٹے کی سفارش مت کرو میرے سامنے۔ میں اس کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔" وہ تلخی سے کہتے ٹائی کی ناٹ باندھ رہے تھے۔
"وہ کتنا ہائپر ہے' تم جانتے ہو۔ اس طرح کا رویہ رکھو گے تو وہ گھر چھوڑ کر چلا جائے گا۔"
"تو چلا جائے۔ دو دن فٹ پاتھ پہ رہنا پڑے گا تو عقل آجائے گی۔ اپنے باپ کو بے وقوف بناتا ہے۔"
"اگر وہ گیا نا اورنگ زیب! تو اس کے ذمہ دار تم ہو گے۔" وہ بمشکل ضبط کر کے بولی تھی۔
"ہر چیز کی ذمے دار تم ہو۔ تمہاری بے جا حمایت نے اس کو اس مقام پہ لا کھڑا کیا ہے۔" کالر جھٹک کر کوٹ پہنا۔ تنفر بھری نگاہ آئینے میں پیچھے نظر آتی جواہرات پہ ڈالی اور پھر باہر نکل گئے۔ وہ وہیں بیٹھی کلستی رہ گئی۔
لاؤنج میں وہ لمحے بھر کو رکے۔ نوشیرواں سیڑھیوں کے وسط میں کھڑا تھا۔ خاموش' فکر مند سا۔ اورنگ زیب نے اس پہ نظر ڈالی اور اتنی جلدی پلٹی کہ جیسے کوئی ناگوار نظارہ سامنے ہو' مڑے' میری کو آواز دی' اور واپس کمرے میں چلے گئے۔ فینونا جلدی سے پانی رکھ کر میری کو بلانے بھاگی۔ شیرو وہیں زینے پہ بیٹھ گیا۔ گردن جھکالی۔ نہ پیسے ہاتھ میں رہے' نہ رشتے۔
"کتنے دن تک یونہی بیٹھے رہو گے؟" شہرین سرسری سا پوچھتی' ہاتھ میں کٹے سیبوں کی پلیٹ پکڑے' اس کے ساتھ زینے پہ بیٹھی تو وہ چونکا' پھر دوبارہ سر جھکا لیا۔
"جب تک وہ مجھے معاف نہیں کر دیتے۔"
"تو تم ان سے معافی مانگ لونا۔ سمپل۔" ملازموں کی زبانی وہ سب سن چکی تھی۔
"کتنی دفعہ مانگ چکا ہوں' مگر جواب میں چیخ چلا کر مجھے دفعان کر دیتے ہیں۔"
"اور ہاشم؟" اس نے پلیٹ سے سیب کا ٹکڑا اٹھا کر منہ میں ڈالا۔

"وہ تو مجھ سے بات بھی نہیں کر رہے۔"

"اور تم نے اسی لیے اسے ایک دفعہ بھی مخاطب نہیں کیا؟ کھاؤ گے؟" ساتھ ہی پلیٹ بڑھائی۔ نوشیرواں نے بے دلی سے منہ پھیر لیا۔ البتہ اب شہرین سے پہلے کی طرح بے زار نہیں رہتا تھا۔ صرف وہی تھی جس نے سارا قصہ سننے کے بعد اس سے ہمدردی جتائی تھی اور کہا تھا۔

"بھئی، تم نے لالچ میں تو نہیں کیا نا" ایک ایڈونچر تھا یہ "اس میں اتنا ناراض ہونے والی کیا بات ہے؟"

اب بھی وہ کندھے اچکا کر کہہ رہی تھی۔

"یوں کرو" اوپر جاؤ اور ہاشم سے معافی مانگ لو۔ بات ختم۔ اس کو صرف تمہاری معافی کا انتظار ہے۔"

"واقعی؟" اس نے بے چینی سے شہرین کو دیکھا۔ تھپڑ پھر سے یاد آیا۔ بے اختیار گال پہ ہاتھ رکھا۔

"ہاں نا۔ وہ تم سے کبھی خفا نہیں ہو سکتا اور مجھے اپنا فون دے جاؤ۔"

"کیوں؟" وہ فون دیتے دیتے رکا۔ شہرین نے موبائل اس کے ہاتھ سے اچک لیا۔

"وقت ضائع مت کرو' وہ آفس کے لیے نکل ہی نہ جائے۔"

"اچھا۔" وہ فوراً" اوپر آیا۔ تھوڑی دیر اس کے کمرے کے باہر رکا رہا' پیچھے سیڑھیوں پہ بیٹھی شہرین نے اس کے موبائل سے سعدی کا نمبر نکالا اور اپنے فون پہ منتقل کیا۔

شیرو نے بغیر کھٹکھٹائے دروازہ کھولا۔ ہاشم ڈریسنگ مرر کے سامنے کھڑا تھا۔ کوٹ ابھی اسٹینڈ پہ تھا' اور وہ کف لنکس پہن رہا تھا۔ آہٹ پہ گردن موڑی' اسے دیکھا اور واپس کف لنک پہننے لگا۔

"آؤ شیرو۔" انداز نارمل تھا۔ نہ غصہ' نہ پیار۔ وہ سر جھکائے' لب کاٹتا قدم قدم چلتا قریب آیا۔ یہ اس دن کے بعد دونوں کی پہلی بات چیت تھی۔ یہ سوشل بائیکاٹ اس کے لیے بہت سنگین ثابت ہوا تھا۔

"بھائی! ابھی تک ناراض ہیں مجھ سے؟" نگاہ اٹھانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ہاشم نے ٹائی گردن میں ڈالی اور آئینے میں دیکھتے اس کی گرہ لگانے لگا۔

"کیا میں اسے معذرت سمجھوں؟"

نوشیرواں نے بے چینی سے چہرہ اٹھایا۔

"آئی ایم سوری بھائی۔ میں نے آپ کو بہت ہرٹ کیا۔"

"میں معذرت قبول کرتا ہوں۔ بھول جاؤ سب۔" ٹائی کی گرہ باندھتے ہوئے وہ اب بھی نہیں مسکرایا۔

"آپ مجھ سے ابھی تک ناراض ہیں؟"

"نہیں۔" اس نے ناٹ کسی' کالر درست کیے' اسٹینڈ سے کوٹ اٹھایا اور مڑ کر شیرو کو سنجیدہ نظروں سے دیکھا۔ "ناراض نہیں ہوں' حیران ہوں۔ اس پہ نہیں کہ میں بے وقوف کیسے بنا۔ اعتبار کرنے والے دھوکا کھا جاتے ہیں۔ اس پہ بھی نہیں کہ تم ایک کرمنل ذہن رکھتے ہو۔ بلکہ صرف اس پہ کہ اگر تمہیں پیسے چاہیے تھے' تو تم میرے پاس کیوں نہیں آئے؟"

"ایڈونچر کرنا... چاہ رہا تھا... بس۔" نوشیرو نے شرمندگی و خفت سے گردن جھکا لی۔ ہاشم نے کوٹ پہنا اور اسے دیکھتے ہوئے بٹن بند کیا۔

"تم شیرو! میری ایک بات اپنے دماغ میں بٹھا لو۔ تمہارا بھائی تمہارے سب معاملے سنبھال سکتا ہے۔" اس نے اس کے کندھے پہ سختی سے ہاتھ جمایا تو نوشیرواں نے شرمندہ چہرہ اٹھایا۔

"تمہیں پیسہ چاہیے' تم میرے پاس آؤ گے۔ تمہیں کوئی لڑکی چاہیے' تم میرے پاس آؤ گے۔ تمہیں کسی کی جان چاہیے' تم میرے پاس آؤ گے۔ مگر تم خود کچھ نہیں کرو گے۔ کبھی بھی نہیں۔ سمجھ میں آیا؟"

اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ پھر قدرے جھجکا۔

"وہ جو کہا آپ نے کہ کاش وہ... وہ... سعدی آپ کا بھائی ہوتا..."

"وہ ایک اچھا لڑکا ہے' رشتوں کا پاس کرنا جانتا ہے' وہ ہمارا تیسرا بھائی ہوتا تو مجھے خوشی ہوتی' مگر وہ نہیں

ہے۔ اورنگ زیب کاردار کے دو ہی بیٹے ہیں' میں اور تم۔ تمہاری نظر میں میری کتنی اہمیت ہے' مجھے واقعی نہیں معلوم' مگر میرے لیے تم اور سونیا برابر ہو۔"

"آپ کو پتا ہے' میں آپ سے کتنی محبت کرتا ہوں' کتنا احترام کرتا ہوں آپ کا۔"

"نہیں مجھے نہیں پتا۔" پرفیوم خود پہ چھڑکتے سنجیدگی سے کندھے اچکائے۔ شیرو روہانسا ہو گیا۔

"یہ سچ ہے۔"

"پھر اسے ثابت کرو۔ کیونکہ مجھے دوبارہ سے تمہارے تخریبی ذہن پہ اعتبار کرنے میں وقت لگے گا۔" اس کے کندھے کو تھپتھپا کر وہ موبائل اٹھاتا باہر نکل گیا۔ اب بھی نہیں مسکرایا تھا۔ نوشیرواں پریشان سا وہیں کھڑا رہ گیا۔

شہرین اب سیڑھیوں کے وسط میں کھڑی تھی۔ اسے آتے دیکھ کر راستہ دیا۔ ہاشم چند زینے اترا' پھر اس کے قریب رکا۔

"کچھ کاغذات پہ تمہارے دستخط چاہیے ہیں' دوپہر میں آفس آجانا۔"

"میں خلع لے رہی ہوں' طلاق نہیں' چاہو تو یہ لمبی چوڑی رقم اور مراعات نہ بھی دو۔ ضرورت نہیں مجھے تمہارے پیسے کی۔"

"وہ باتیں مت کہو جن کا مطلب تم خود بھی نہیں جانتیں۔ جو دے رہا ہوں' اپنی بیٹی کے لیے دے رہا ہوں۔ ماں سے الگ نہیں کر سکتا اس کو۔ اب ہٹو سامنے سے۔" وہ مزید سرکی' اور ہاشم نیچے اتر گیا۔ وہ تلملاتے ہوئے اسے جاتے دیکھتی رہی۔ آنکھوں میں شدید بغض اور بے بسی تھی۔

وہ ماں باپ کے کمرے کے سامنے رکا تو جواہرات ہنوز کاؤچ پہ بیٹھی کلس رہی تھی اور ڈریسنگ مرر کے سامنے کھڑے اورنگ زیب میری اینجیو کو ہدایات دے رہے تھے۔ وہ چوکھٹ میں آرکا۔

"میں علیشا کی فیس پے کر رہا ہوں۔ کسی کو کوئی اعتراض ہو تب بھی مجھے کچھ کہنے کی زحمت نہ کرے' میرا دماغ آج کل بہت گھوما ہوا ہے۔"

اطلاع دی اور اسی سنجیدہ چہرے کے ساتھ مڑ گیا۔ جواہرات تلملا کر اٹھی' اورنگ زیب نے اسے برہمی سے پکارا مگر وہ باہر جا چکا تھا۔ دونوں بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔ باہر دھند ابھی تک چھائی تھی۔ وہ برآمدے تک پہنچا تھا جب خاور تیزی سے قریب آتا دکھائی دیا۔ وہ فکرمند لگ رہا تھا۔

"سعدی یوسف نے آپ کے کیے وکیل کو فائر کر دیا ہے۔"

"معلوم ہے۔"

"آپ اتنے بے فکر کیسے ہو سکتے ہیں؟"

"فکر کی کیا بات ہے؟" وہ الٹا حیران ہوا۔ "لوگ وکیل بدلتے رہتے ہیں۔ اگلا بھی ہمارا ہی ہوگا۔ نہیں تو جج تو ہمارا ہی ہے۔"

"مگر مجھے پریشانی ہے۔ ان لوگوں کو وہ آڈیو کہاں سے ملی؟"

"کون سی آڈیو؟" وہ ٹھٹک کر رکا۔ خاور نے محمود صاحب سے جو سنا تھا بتا دیا۔

"ہاں' زمر ایسے کام کر سکتی ہے۔ وہ کہہ رہا ہے تو ایسا ہی ہوگا۔" وہ گاڑی کی طرف جا رہا تھا۔ خاور تیزی سے اس کے پیچھے لپکا۔

"کیا واقعی ایسا ہی ہے؟ ہو سکتا ہے' وہ جھوٹ بول رہا ہو۔" ہاشم رک کر اسے دیکھنے لگا۔

"آپ نے اسے اور اس کی بہن کو اس رات اپنا لیپ ٹاپ دیا تھا' کہیں اس نے وہ آپ کے پاس سے تو نہیں نکالی؟"

"ایسا کچھ نہیں ہے۔" وہ بے زار ہوا۔ "وہ آڈیو میرے سیف میں ہے' میں نے دو دن پہلے ہی دیکھی ہے۔ لیپ ٹاپ میں میرے ڈاکومنٹس کا فولڈر لاک ہے' وہ دونوں اتنے بھی اسمارٹ نہیں کہ ہر چیز کھول لیں اور سعدی جھوٹ نہیں بولتا' جو کہہ رہا ہے وہی ہوگا۔ مگر جج ہمارا ہے' پھر کیا مسئلہ ہے؟"

"سر! آپ کا اوور کنفیڈینس۔" وہ کہتے کہتے رکا۔

ہاشم نے ایک سخت کاٹ دار نظر اس پہ ڈالی' اور آگے بڑھ گیا۔ خاور نے بے چینی سے تھوڑی کھجائی۔ بظاہر ہاشم ٹھیک کہہ رہا تھا مگر پھر بھی اسے یہ لڑکا کچھ گڑبڑ لگ رہا تھا۔ خیر' ہاشم سعدی کو زیادہ بہتر طور پہ جانتا تھا یقیناً۔ وہ سر جھٹکتا' آگے بڑھ گیا۔

☼ ☼ ☼

ٹوٹے ہوئے مکاں ہیں مگر چاند سے مکین
اس شہر آرزو میں اک ایسی بھی گلی ہے

وہ ایک ابتر سا آفس تھا۔ فائلوں کے ڈھیر' بے ترتیب کتابوں سے بھرے ریک اور میز پہ بکھرا اتنا کچھ' کہ اس سارے میں کرسی پہ بیٹھا سعدی بے حد بے بسی محسوس کر رہا تھا۔ اس کے مقابل' آفس کے مالک کی کرسی پہ موجود ادھیڑ عمر صاحب نیچے جھکے دراز سے کچھ نکال رہے تھے۔ دفعتاً" وہ سیدھے ہوئے۔ وہ اڑے اڑے کھچڑی بالوں' موٹی عینک اور شریف چہرے والے انسان تھے۔ سعدی کو ان پہ ترس' خود پہ رحم اور زمر پہ غصہ آیا جس نے اسے یہاں بھیجا تھا۔

سیدھے ہوتے ہی انہوں نے کچھ فائلز دھپ سے میز پہ رکھیں۔ نتیجتاً" اوپر تلے رکھی سیاہ کتابیں دھڑام سے سعدی کی طرف لڑھکیں۔ وہ کرنٹ کھا کر پیچھے ہوا۔ ایک موٹی کتاب پیر پہ جا لگی۔ باقی دو گھٹنوں پہ۔ آؤچ!

"لگی تو نہیں؟" انہوں نے ناک پہ عینک دھکیلتے پوچھا۔

"بالکل نہیں جی۔" (میں کوئی انسان تھوڑی ہوں؟) وہ جھک کر ان کو سمیٹنے لگا۔ پھر میز پہ رکھیں' اسی بے چارگی سے خلجی صاحب کو دیکھا۔

"سر! آپ بے شک ابھی اپنے کام کریں' میں پھر آجاؤں گا۔" وہ کرسی کے کنارے پہ آگے کو ہو گیا۔ بھاگنے کو تیار۔

"نہیں نہیں' میں آپ کی بات سن رہا ہوں۔" انہوں نے دائیں بائیں گردن ہلائی۔ "کیس بھی دیکھ لیا تھا میں نے۔"

"تو پھر آپ یہ کیس لیں گے؟" بے توجہی سے پوچھتے پیچھے کھڑی الماری پہ نظر ڈالی۔ شیشے کے دروازوں کے پیچھے کتابیں اور فائلیں بھری تھیں۔ اوپر تلے اڑے کاغذ۔ بے ترتیبی سی بے ترتیبی۔

"دیکھو بیٹے! فارس غازی جیسے بندے کا دفاع کرنا آسان نہیں۔"

"خیر ہے' آپ رہنے دیں' میں کہیں اور چلا جاؤں گا۔" وہ شکریہ کہتا جلدی سے اٹھا۔ بس بھاگنے کی دیر تھی۔ یہ اتنا بھی مروت میں بیٹھ گیا۔

اس آدمی کی تو عینک گم جائے تو یہ نہ ڈھونڈ سکے' فارس کو کیا خاک رہا کروائے گا۔"

"مجھے پتا ہے' فارس غازی کا دفاع آپ کے لیے مشکل ہو گا کیونکہ آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ ہی قاتل ہے تو۔"

"نہیں۔ میرا خیال ہے وہ بے گناہ ہے۔"

وہ جو بس مڑنے ہی والا تھا' ایک دم ٹھہر کر انہیں دیکھنے لگا۔ "جی؟"

"ہاں نا' گناہ گار کا دفاع کرنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ مگر بے گناہ کا کیس سوچ سمجھ کر لینا چاہیے۔ کیونکہ اگر ایک معصوم آدمی کا ہم دفاع نہ کر سکے اور وہ جیل چلا گیا' تو وہ بہت خطرناک ہو جاتا ہے۔"

وہ آہستہ سے دوبارہ بیٹھا۔ آگے کو جھک کر حیرت اور الجھن سے ان کو دیکھنے لگا۔

"آپ کو لگتا ہے کہ وہ بے گناہ ہیں۔ باوجود پراسیکیوٹر زمر کے بیان کے؟"

"پراسیکیوٹر صاحبہ نے تو یہ بیان دینا ہی تھا۔ وہ سرکار بنام سجاد راؤ کی پراسیکیوٹر جو رہی ہیں۔ ویسے مجھے بڑی حیرت ہے تمہارے پچھلے وکیل نے اس کیس کا ذکر نہیں کیا۔" ابھی ابھی نکالے فائلز کے گٹھڑ کو اس کی طرف دھکیلا۔ اس سے قبل کہ کتابیں دوبارہ گرتیں' سعدی نے جلدی سے اسے واپس پیچھے کیا۔ البتہ وہ ان کے چہرے سے اپنی بے چین نظریں نہیں ہٹا پا رہا تھا۔

"یہ کون سا کیس تھا؟"

"یہ وارث غازی قتل سے کوئی پانچ ماہ پہلے ختم ہوا تھا۔ میں اس میں ڈیفنس اٹارنی تھا اور زمر صاحبہ پراسیکیوٹر۔ ایک آدمی نے اپنی بیوی پہ گولی چلائی، مگر ایسا کرنے سے قبل اس کے سامنے اعتراف کیا، اس کی پراپرٹی پہ قبضہ کرنے کا، اس کے ساتھ مزید کچھ زیادتیاں کرنے کا۔ قسمت سے بیوی بچ گئی اور اس نے پولیس کو بتادیا۔ سات ماہ زمر لگی رہیں، یہ ان کا پہلا کیس تھا، ریپو بھی بنائی تھی، بہرحال فیصلہ ان ہی کے حق میں گیا۔ میرا خیال ہے، جس نے بھی فارس کے بھائی اور بیوی کا قتل کیا ہے، اس کی ڈسٹرکٹ کورٹ کے کیسز پہ گہری نظر ہوگی، اسے معلوم ہوگا کہ انسان اپنی زبان سے کہی بات میں سب سے اچھا پھنستا ہے۔ پراسیکیوٹر صاحبہ ویسے بہت سمجھ دار خاتون ہیں، لیکن وہ یہاں مار کھا گئیں، کیونکہ وہ اسی طرح کا ایک کیس پراسیکیوٹ کر چکی ہیں۔"

"یعنی۔۔۔ زمر اپنے حملہ آور کی کال پہ اس لیے یقین کر رہی ہیں کیوں کہ وہ آخری منٹ کے اعتراف کے ایسے ہی ایک کیس کو لے چکی ہیں۔ ان کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ کوئی ایسا کرے۔" ایک دم اسے محسوس ہوا کہ زمر نے اسے صحیح بندے کے پاس بھیجا ہے۔ (ان کے پہلے تاثر پہ مت جانا!)

"بالکل۔ ویسے لوگ یہ کرتے بھی ہیں۔ قتل بڑا بوجھ ہوتا ہے۔ انہیں کسی سے تو بانٹنا ہوتا ہے۔ بہت سے کیسز دیکھے ہیں میں نے، جہاں لوگ کسی کو مارنے سے پہلے اپنے پچھلے گناہوں کا اعتراف کر لیتے ہیں۔"

"مجھے پتا ہے، یہ سب کس نے کروایا ہے۔" وہ ایک دم جوش میں بولنے لگا تو انہوں نے فوراً ہاتھ اٹھا کر روکا۔ "شش شش۔" وہ بے اختیار رک گیا۔

"کیا وہ لوگ طاقت ور ہیں؟"

"بہت زیادہ۔" اس کے گلے میں کچھ اٹکا۔

"اور کیا تمہارے علاوہ کوئی اور بھی جانتا ہے کہ وہی اصل قاتل ہیں؟"

"نہیں۔"

"تو پھر اپنا منہ سی لو۔"

"جی؟" وہ دم بخود رہ گیا۔

"دیکھو بچے! تم ایک بااثر آدمی کو اس میں نہیں گھسیٹ سکتے۔ ایسا کرو گے تو وہ فارس کو جیل میں ختم کروا دیں گے اور تمہیں جیل سے باہر۔ تم جس کو بھی ان کے نام بتاؤ گے تم اس کی زندگی خطرے میں ڈالو گے۔ تم ان کو گناہ گار ثابت مت کرو، صرف فارس کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کرو۔ ایک دفعہ وہ باہر آجائے، پھر جو کرنا ہو کر لینا۔"

وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر سر خود بخود اثبات میں ہل گیا۔ بات غلط نہیں تھی۔

"کیا ہم ان کو رہا کروا لیں گے؟"

"اگر جج ایمان دار ہوا تو ہاں۔"

اور اتنے دنوں میں یہ پہلی امید کی کرن تھی جو اسے نظر آئی تھی۔ اندھیری رات کا پہلا تارہ۔ جو سورج نکلنے کی نوید ہوتا ہے۔ ہاں، کبھی تو صبح ہوگی۔ وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

جس کو دیکھو اس کے چہرے پر لکیریں سوچ کی
جیسے ہو جائے مقدر کسی شے کا مقدر سوچنا

سعدی کورٹ سے واپس اپنے آفس کی طرف جا رہا تھا جب کسی اجنبی نمبر سے فون آنے لگا۔ اس نے ڈرائیو کرتے ہوئے کال لے لی۔

"سعدی؟"

"جی۔۔۔ کون؟"

"شہرین بول رہی ہوں۔" اس نے موبائل کان سے ہٹا کر اسے گھورا۔

"کہیے، کیسے فون کیا مسز کاردار؟"

"کیا ہم مل سکتے ہیں؟ کسی ایسی جگہ جہاں میرے اور تمہارے گھر والوں کو علم نہ ہو!"

"جہاں تک مجھے یاد ہے میں تئیس سال کا ہوں

اور آپ کم از کم بھی مجھ سے بارہ سال بڑی ہیں تو۔۔۔"
"او شٹ اپ' مجھے تمہارے ساتھ ڈیٹ پہ نہیں جانا' تم سے ایک کام ہے' مگر ہاشم کو پتا نہ چلے۔"
"پھر ٹھیک ہے۔ پتا ٹیکسٹ کرتا ہوں' دوپہر میں آجایے گا۔" اپنی حیرت چھپاتے ہوئے اس نے فون کان سے ہٹایا۔
عرصہ پہلے شہرین نے اس سے صلح کرلی تھی' اس کو تب سے معلوم تھا کہ ایک دن یہ لڑکا اس کے کام آئے گا اور وہ دن آن پہنچا تھا۔

☼ ☼ ☼

جو آگ لگائی تھی تم نے اس کو تو بجھایا اشکوں نے
جو اشکوں نے بھڑکائی ہے' اس آگ کو ٹھنڈا کون کرے
کچھ دیر بعد وہ سارہ کے آفس میں موجود تھا۔ وہ کرسی پہ براجمان' ہاتھ میں پکڑے کاغذ کو پڑھ رہی تھی۔ پھر چہرہ اٹھایا اور تحمل سے اسے دیکھا۔
"یہ تمہاری اس ہفتے میں لی جانے والی دوسری لیو ہے۔ اگر میں یہ منظور کرلوں' تو آفس کے باقی لوگ کیا خیال کریں گے؟"
"مجھے فارس ماموں کے کیس کے لیے کچھ اہم کام کرنے ہیں۔"
"وہ اتوار کو نہیں ہوسکتے کیا؟" سعدی نے معصومیت سے سرنفی میں ہلایا۔ "اتوار کو پاکستان میں چھٹی ہوتی ہے۔"
سارہ نے سمجھنے والے انداز میں اسے گھورا' پھر کرسی کی سمت اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گیا۔
"تم اتنے اہم ادارے میں بطور ایک سائنس دان کام کررہے ہو تو اپنی ڈگری کی وجہ سے' مگر یہاں سب جانتے ہیں کہ تم میرے بھانجے ہو۔ اگر اسی طرح میں تمہیں فیورز دینے لگی تو تم یہاں اپنی عزت کھو دو گے۔ پہلے تاثر دائمی ہوتے ہیں سعدی!"
"مگر سچ نہیں ہوتے۔" وہ اداسی سے مسکرایا۔ "خیر' آج کے بعد ایسا نہیں ہوگا۔ بس آج کے لیے۔"

"صرف آج کے لیے۔" تنبیہی نظروں سے اسے دیکھ کر سارہ نے درخواست پہ دستخط کیے۔ پھر کاغذ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"آپ کیسی ہیں؟ بہت دن سے کام کے علاوہ آپ سے کوئی بات نہیں ہو سکی۔" اس نے دیکھا، سارہ کے چہرے پہ ملال بھری مسکراہٹ بکھر گئی۔ نیلی آنکھوں اور نرم چہرے والی سارہ اب بھی پہلے کی طرح لگتی تھی، مگر بس صرف لگتی ہی تھی۔ ایک تھکان، اداسی، ناامیدی اس کی آنکھوں میں آکر ٹھہر سی گئی تھی۔

"اللہ کا شکر ہے۔ میں، امی، بچیاں، ہم سب ایک دوسرے کو سنبھالے ہوئے ہیں۔" ذرا توقف کیا۔

"فارس کیسا ہے؟"

"بے گناہ آدمی قید میں رہ کر کیسا ہو سکتا ہے؟ بے بس اور غم و غصے سے نڈھال۔ مگر ہم انہیں جلد رہا کروالیں گے اور اصل قاتلوں کو سزا دلوائیں گے۔"

"اس سے کیا ہوگا سعدی؟ وارث واپس تو نہیں آئے گا۔"

اور وہ اس کے اسی فقرے کا انتظار کر رہا تھا۔ ایڈووکیٹ خدیجہ سے ملاقات کے بعد اس کو اس سوال کا جواب مل گیا تھا۔

"ہم قاتل کو سزا مقتول کو واپس لانے کے لیے نہیں دیتے۔ بلکہ اس لیے دیتے ہیں تاکہ وہ کسی اور کو قتل نہ کرے۔ قصاص میں زندگی ہوتی ہے، مقتول کی نہیں، بلکہ کسی اور کی۔ آپ کی، آپ کے بچوں کی، فارس غازی کی، یا شاید میری اپنی۔"

اب کے سارہ نے آنکھیں سکیڑ کر غور سے اسے دیکھا۔ کرسی پہ پیچھے کو ہوئی، ہاتھوں میں قلم گھماتے ہوئے کچھ سوچا۔

"تمہارا انداز پراسرار ہوتا جا رہا ہے۔"

"اونہوں۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ اب میں جاؤں؟" اور وہ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"یہ آخری دفعہ ہے، سعدی یوسف خان!" اس نے درخواست کی طرف خفگی سے اشارہ کیا۔

"جی بالکل، اس ہفتے میں آخری دفعہ۔" کاغذ اٹھایا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ سارہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہنس پڑی اور پھر سر جھٹک کر کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہو گئی اور جس وقت وہ وہاں سے نکل رہا تھا، اسی شہر میں کئی میل دور، ہاشم اپنے آفس میں موجود، فون پہ کہہ رہا تھا۔

"کیسی ہو بچہ؟ تمہارا پھر سے شکریہ۔"

اپنے لاؤنج میں صوفے کے ساتھ کھڑی، لینڈ لائن فون کا ریسیور کان سے لگائے حنہ اداسی سے مسکرائی۔

"اٹس اوکے ہاشم بھائی! ویسے شیرو بھائی نے وہ ویڈیو شوٹ کہاں کی تھی۔"

"اس کا ایک کاٹیج ہے ایوسیہ میں، وہیں پہ۔ خیر۔ فارس کا کیس کیسا جا رہا ہے؟ اس آڈیو سے کوئی فرق پڑا یا نہیں؟"

"بھائی کہہ تو رہا تھا کہ فرق پڑے گا۔"

"ہوں، ویسے وہ کہاں سے ملی آڈیو؟" بظاہر سرسری سا پوچھا۔

"زمر پھپھو نے نکلوا کر دی تھی، مگر۔ یہ بات آپ کسی کو بتایئے گا نہیں۔ یہ فیملی سیکریٹ ہے۔" اس نے مدھم سا کہا، وہی جو بھائی نے بتایا تھا۔ "زمر پھپھو کو بھی نہیں بتایئے گا کہ میں نے بتا دیا ہے۔"

"یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے کیا؟" وہ الٹا حیران ہوا۔

اس یقین دہانی پہ وہ مسکرا دی۔ "ہاشم بھائی، آپ بہت اچھے ہیں۔"

"معلوم نہیں، خیر۔ تمہیں ایک کام کہا تھا؟"

حنین کی مسکراہٹ سمٹتی گئی۔ آنکھوں میں گہرا کرب چھانے لگا۔ "علیشا کو۔" اور جو سنا تھا بتاتی گئی۔ وہ دوسری جانب بالکل خاموشی سے سنتا گیا یہاں تک کہ حنین کو لگا، وہ وہاں موجود ہی نہیں ہے۔

"ہاشم بھائی، کچھ تو بولیں؟"

وہ چپ رہا، بالکل چپ۔ حنہ کا دل ڈوبنے لگا جیسے نیلے پانیوں میں بحری جہاز ڈوب جاتا ہے۔

"کیا آپ اتنا بھی نہیں کہیں گے کہ آپ کو افسوس ہے؟ کیا آپ کو ذرا سا بھی افسوس نہیں؟" اس کی آواز

بھر آئی مگر ہاشم نے فون رکھ دیا۔

اس دن کے بعد سے وہ حنہ کے لیے ایفل ٹاور بن گیا۔ گوکہ اس نے چند منٹ انتظار کیا کہ وہ کال بیک کرے گا مگر نہیں، کوئی کال نہیں آئی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اب اگلے ڈیڑھ سال وہ اس سے سوائے دور دور سے خاندانی تقریبات پہ ملنے کے، بالکل نہیں مل پائے گی۔ اور یہ بھی کہ دوبارہ وہ ہاشم سے فون پہ بات ڈیڑھ سال بعد تب کرے گی جب وہ امتحانی مرکز میں چیٹنگ کرتی پکڑی جائے گی۔

اگر ہم سب کاہن (نجومی) ہوتے تو زندگی کا سارا تھرل ہی ختم ہو جاتا!

☼ ☼ ☼
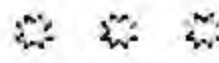
خود کو بڑھا چڑھا کے بتاتے ہیں یار لوگ
حالانکہ اس سے فرق تو پڑتا نہیں کوئی

چھوٹے باغیچے والے گھر سے قدرے فاصلے پہ مین روڈ پہ موجود شاپ اس وقت مرمت کے مرحلے سے گزر رہی تھی۔ اندر مستری مزدور لگے تھے۔ پینٹ کی مہک، لکڑی اور سیمنٹ کا جا بجا بکھرا، چیزوں کی اٹھا پٹخ۔ ندرت اس شاپ کو چھوٹا سا ریسٹورنٹ بنانے کی تیاریوں کی نگرانی کر رہی تھیں۔ ساتھ ہی گاہے بگاہے کونے میں رکھی میز کی جانب بھی دیکھ لیتیں (جو آج ڈیڑھ سال بعد ریسٹورنٹ کے مرکزی سٹنگ ایریا میں شامل تھی) جہاں سعدی کے ساتھ ہاشم کی بیوی بیٹھی تھی اور وہ خاموشی سے اس کو سن رہا تھا۔ ندرت اس طرف نہیں گئی تھیں، سعدی نے بتایا تھا کہ فارس کے کیس کے سلسلے میں اسے شہرین سے کوئی کام تھا، تفصیل کو رہنے دیں اور ندرت نے پھر پوچھا نہیں۔

شہرین ہاتھ باہم پھنسائے، وقفے وقفے سے شانے جھٹک کر اور ابرو اچکا کر، مدھم بول رہی تھی۔

"مجھے نہیں معلوم تھا، آپ ہاشم بھائی سے اتنی عاجز ہیں۔"

"اتنی دیر سے بتا رہی ہوں، کس طرح وہ مجھ پہ ٹارچر کرتا ہے، شک کرتا ہے، مارتا ہے، اب بھی تمہیں لگتا ہے کہ مجھے عاجز نہیں آنا چاہیے؟" وہ ناگواری سے چیخ کر بولی۔ سعدی نے ہلکے سے شانے اچکائے۔

"تو اب کیا آپ ان سے انتقام لینا چاہتی ہیں؟"

"وہ بھی لوں گی، اپنے اوپر کیے گئے ایک ایک ظلم کا حساب لوں گی، لیکن ابھی میں کسی اور کام کے لیے آئی ہوں۔"

"میں ہاشم بھائی کا دوست ہوں، ان کے خلاف آپ میری مدد لیں گی؟ اتنا اعتبار کیسے ہے، مجھ پہ؟"

"میرے تمام آپشنز میں تم سب سے زیادہ بھروسے کے قابل لگے مجھے۔ کسی پروفیشنل کو ہائر کیا تو وہ ہاشم کو بتا دے گا یا مجھے بلیک میل کرے گا۔"

"سو اس کا مطلب ہے، آپ سے کچھ غلط ہوا ہے؟" اس نے جوس کا گھونٹ بھرتے ہوئے غور سے شہرین کو دیکھا۔ اس کا رنگ بدلا۔

"ہرگز نہیں۔ یہ تو ایک مسئلہ ہے، جس میں مجھے ہاشم پھنسا سکتا ہے۔ اب تک تو تمہیں اندازہ ہونا چاہیے کہ وہ مجھے ذلیل کرنے کے لیے کس حد تک جا سکتا ہے۔"

اور اندازہ تو سعدی کو ہو رہا تھا۔ اس نے پہلے اتنی لمبی رام کہانی صرف اس لیے سنائی تاکہ جو وہ آگے بتانے جا رہی ہے اس میں وہ خود بے قصور لگے۔ خیر وہ سنتا گیا۔

"ہماری طلاق کے بعد بچی کی کسٹڈی مجھے چاہیے اور مجھے ہی ملے گی، لیکن اگر ہاشم کو میرے بارے میں کچھ بھی برا معلوم ہوا تو وہ سونی کو مجھ سے چھین لے گا۔ میرے کزن والی بات پرانی ہو گئی اور دب گئی۔ اب ایک اور مسئلہ ہے۔" کہتے کہتے وہ ذرا رکی، بالوں میں ہاتھ پھیرا، انگلیاں مروڑیں۔

"آپ سے کیا ہوا ہے؟"

"گالف کلب میں کچھ عورتیں کارڈز کھیلتی ہیں، آئی سوئیر میں ان میں شامل نہیں تھی۔ میرا مطلب ہے، وہ صرف ایک کارڈز گیم تھی، مگر میں نے کافی کچھ لوز کر دیا اس میں۔"

"او کے۔ پھر؟"

"ان کے پاس کوئی رجسٹر کوئی کمپیوٹر کارڈ کچھ نہیں ہوتا میں نے سارا پیسہ بعد میں پورا کروا دیا مگر اس شام کی سی سی ٹی وی فوٹیج ان کے کمپیوٹرز میں ہے۔ اور اگر کلب میں کبھی کسی نے وہ ہاشم کو دے دی ہو تو... گو کہ وہ ایسا نہیں کرتے مگر میں رسک نہیں لینا چاہتی۔ ہاشم کو نہیں معلوم میں نے کتنی بڑی رقم ہاری تھی۔ اس کو رقم سے فرق نہیں پڑتا مگر ہاشم کاردار کی بیوی gambling کرتے (جوا کھیلتے) ہوئے دکھائی دے۔ یہ ایک اسکینڈل ہے اس کی کتنی بدنامی ہوگی اور کوئی بھی اسکینڈل مجھے میری بچی کی شکل دیکھنے سے تاعمر محروم کر سکتا ہے۔"

"آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟"

"تم اور تمہاری بہن ان چیزوں میں اچھے ہو۔ کلب کے ریکارڈ سے اس دن کی فوٹیج غائب کردو میں تمہیں کچھ بھی دینے کو تیار ہوں۔"

"اپنی بہن کو میں ایسے کلب میں لے کر نہیں جانے والا سو میری بہن کا نام آئندہ اس معاملے میں نہیں لیں گی آپ مگر آپ کا کام کردوں گا۔ ڈونٹ وری۔"

"کیسے کرو گے؟" وہ متعجب ہوئی۔

"یہ میرا مسئلہ ہے۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔ ویسے ہاشم بھائی جیسے شاطر آدمی کو دھوکا کیسے دے لیتی ہیں آپ؟"

"ہر شخص کی ایک کمزوری ہوتی ہے اس کی بھی ہے اسے لگتا ہے جن لوگوں سے وہ محبت کرتا ہے وہ اسے کبھی دھوکا نہیں دے سکتے۔ جیسے اس کی فیملی جیسے کبھی میں تھی اور جیسے اب تم ہو۔ وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے کہتا نہیں ہے مگر اسے تم نیرو کی طرح ہی پیارے ہو۔"

سعدی نے (ہونہہ) سر جھٹکا۔ شہرین گہری سانس بھر کر پیچھے کو ہو بیٹھی چہرے پہ آئے بال پرے ہٹائے۔

"اور تم جواب میں کیا لوگے؟"

"آپ کو ہاشم بھائی سے ان کے تمام ظلم و ستم کا بدلہ لینا ہے نا؟ تو بس اس وقت کا انتظار کریں جب ہم مل کر یہ کام کر سکیں۔"

شہرین نے الجھن سے اسے دیکھا۔ "تم تو ہاشم کے دوست ہو۔ ایسا کیا ہوا تم دونوں کے درمیان؟"

وہ مسکراتے ہوئے کرسی دھکیلتا اٹھا۔

"آپ کے برعکس میرے آپشنز میں سب سے کم قابل اعتبار آپ ہیں۔"

شہرین نے شانے اچکائے۔ وہ سعدی کی ہر بات سننے پہ مجبور تھی۔

☼ ☼ ☼

گئے تھے زعم میں اپنے پر اس کو دیکھتے ہی
جو دل نے ہم سے کہے تھے پیام بھول گئے

یہ سرما کی ایسی سرد دوپہر تھی جب ذرا سی دھوپ روح تک کو نکور بخشتی۔ ایسے میں عدالت کی عمارت کے گرد کہر کے دائرے میں دھوپ چھید کر کے چوری چھپے داخل ہوگئی تھی مگر کمرہ عدالت کے اندر شکوک شبہات نے ہنوز سب دھندلا رکھا تھا۔

جسٹس سکندر بغور وکیل دفاع خلجی صاحب کو بولتے سن رہے تھے جو کٹہرے میں کھڑی زمر سے سوال کر رہے تھے۔ سامنے حاضرین کی چند کرسیاں رکھی تھیں۔ بمشکل ڈیڑھ قطار بھر کرسیاں جو اس ٹی وی اور فلم سے یکسر مختلف اور بدصورت کورٹ روم کو مزید بدنما دکھا رہی تھیں۔ کمرے سے باہر کچہری میں پھرتے بھانت بھانت کے لوگوں کا شور یہاں تک سنائی دے رہا تھا مگر وہ سب زمر کو سن رہے تھے۔ سعدی خاموشی سے اور فارس ناگواری سے۔ دونوں ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ فارس کی تیوری چڑھی تھی۔ آنکھوں میں زمر کو دیکھتے دبا دبا غصہ تھا۔ سفید کرتے کے کف کلائی پہ موڑ رکھے تھے اور بال پونی میں بندھے تھے۔

البتہ سعدی بالکل چپ چاپ تھا۔ ریشم بننے کے بعد کا نرم مگر بے لچک سا۔

زمر بھی اتنی ہی بے لچک لگ رہی تھی۔ سفید لمبی قمیص اوپر بلیک منی کوٹ۔ دوپٹا شانوں پہ اور اعتماد سے

اٹھی گردن۔ وہ زمر ہی لگ رہی تھی۔ اور صرف خلجی صاحب کو دیکھ رہی تھی۔

"آپ دیکھ چکی ہیں کہ کس طرح ابھی ایک ایکسپرٹ witness (ماہر گواہ) نے یہ ثابت کر کے دکھایا ہے کہ اس ریکارڈنگ میں موجود فارس غازی کی آواز اصلی نہیں ہے۔"

"الفاظ وہی ہیں جو میں نے سنے تھے۔ ریکارڈنگ کے بارے میں عدالت درست فیصلہ کر سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے ریکارڈنگ سے اصل آواز نکال کر جعلی ڈالی گئی ہو تاکہ عدالت میں اپنی مرضی کی بات ثابت کی جا سکے۔ فی الحال اس ریکارڈنگ کا سورس غیر تصدیق شدہ ہے۔" ذرا سے شانے اچکائے۔

"یہ فیصلہ عدالت پہ چھوڑ دیا جائے تو بہتر ہے۔" خلجی صاحب نے اس کو بے اختیار ٹوکا۔ پھر کٹہرے کے مزید قریب آئے۔ "کیا آپ اب بھی اپنے بیان پہ قائم ہیں؟"

"جو جس طرح ہوا، جو میں نے سنا، میں نے کورٹ اور پولیس کو بتا دیا۔ فیصلہ کرنا میرا کام نہیں ہے۔" وہ بے تاثر اور مطمئن کھڑی تھی۔

"اور جب آپ نے سن لیا تھا کہ ایک شخص آپ کو قتل کرنے جا رہا ہے تو آپ بھاگی کیوں نہیں؟"

"وہ میرا اسٹوڈنٹ تھا، میرا رشتہ دار تھا، مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ مجھے مارے گا۔ میں اسے خالی دھمکی سمجھی تھی۔"

"مگر بعد میں آپ کو یقین آ گیا؟"

"مجھے تین گولیاں لگی تھیں، میرے سامنے ایک لڑکی قتل ہوئی، کیا یقین نہیں آنا چاہیے تھا؟" وہ پرسکون ٹھنڈے انداز میں جواب دے رہی تھی۔

"یعنی آپ مانتی ہیں کہ آپ نے اس وقت گولی مارنے والے کی بات کو غلط جج کیا اور نہ بھاگ کر غلطی کی؟"

"بھاگ کر کہاں جاتی؟ سارا ریسٹورنٹ تو اوپن تھا۔ اور اس کے پاس اسنائپر (sniper) گن تھی۔" ایک کاٹ دار نظر سامنے بیٹھے فارس پہ ڈالی۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا، چبھتی ہوئی نظروں سے اور واپس خلجی صاحب کو دیکھا۔ "اس نے ایسی جگہ منتخب کی جہاں بھاگنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔"

خلجی صاحب نے ہاتھ میں پکڑے کاغذات پہ نظر ڈالی، پھر سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ "زمر صاحبہ! آپ کب سے پراسیکیوٹر ہیں؟"

"میرا خیال ہے، آپ کے کاغذ اور دماغ دونوں میں تاریخ درج ہو گی، بہرحال، ساڑھے تین سال سے۔"

"میں آپ سے درخواست کروں گا کہ اپنے جوابات کو مختصر رکھیے۔"

"پھر آپ کو چاہیے کہ آپ مجھ سے ڈبلیو کوئسچز نہ پوچھیں۔" (یعنی کیا، کیوں، کب، کہاں والے سوالات۔) خلجی صاحب نے اثر لیے بنا کاغذات کو پھر سے دیکھا۔ وہ انگلیوں سے کان کی لو مسلتا فارس آنکھیں سکوڑے اسے دیکھ رہا تھا۔

"کیا یہ درست ہے کہ آپ اپنے جونیئرز میں ایک سخت گیر پراسیکیوٹر کے طور پہ مشہور ہیں؟"

"بالکل۔ اور کیسا ہونا چاہیے پراسیکیوٹر کو؟" اس نے گردن اکڑائی۔ وہ فارس کو نہیں دیکھ رہی تھی۔

"زمر صاحبہ، آپ جانتی ہیں کہ جب تک جرم ثابت نہ ہو جائے، قانون کے تحت ہم فارس غازی کو Presumed Innocent (ملزم) کہیں گے، مجرم نہیں۔ گو کہ آپ اسے مجرم ہی خیال کرتی ہیں۔"

"بالکل۔" سر اثبات میں ہلایا۔ فارس نے (ہونہہ) سر جھٹکا۔

"اور زمر! جب آپ کسی کو پراسیکیوٹ کرتی ہیں، تو اس کو مجرم گردان کر ہی ایسا کرتی ہیں، درست؟"

"ثبوت اور شواہد اس کے خلاف ہوں تو 'ہاں!'" وہ ٹھنڈی اور پرسکون تھی۔

"میں آپ سے پھر درخواست کروں گا کہ اپنے جوابات کو ہاں یا ناں تک محدود رکھیں۔"

"یہ سوال پہ منحصر ہے۔"

خلجی صاحب نے ضبط سے گہری سانس لی۔ پھر اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ کمرہ عدالت میں سناٹا چھایا

تھا۔

"پچھلے ساڑھے تین سال میں آپ کے پراسیکیوٹ کیے گئے کیسز میں سے قتل کے سولہ مقدمات ایسے ہیں' جن کے فیصلے آچکے ہیں۔"

"جی!"

"اور ان میں سے سات فیصلے دفاع کے حق میں ہیں۔ یعنی کہ سولہ دفعہ آپ نے کہا کہ یہ شخص قاتل ہے' نو دفعہ عدالت نے کہا کہ ہاں یہ قاتل ہے' مگر سات دفعہ عدالت نے کہا کہ یہ قاتل نہیں ہے۔"

"سات دفعہ شواہد اور گواہیاں اتنی مضبوط نہیں کہ فیصلہ۔" وہ تصحیح کرنے لگی "مگر"

"ہاں یا نہیں' زمر صاحبہ!" قدرے بلند آواز سے یاددہانی کروائی۔ زمر نے گہری سانس بھری۔

"جی ہاں۔"

"یعنی کہ سات دفعہ آپ غلط ثابت ہوئیں۔ سولہ میں سات۔" انگلیوں پہ گنا۔ "تقریباً" پچاس فیصد تناسب نکلتا ہے۔ یعنی۔ آپ نے سات لوگوں کو پھانسی کی طرف لے جانا چاہا' مگر عدالت نے انہیں بے گناہ قرار دے دیا۔ اس تناسب سے آپ جتنے لوگوں کو قصوروار ٹھہراتی ہیں' ان میں سے آدھے تو بے گناہ نکلتے ہیں۔" زمر کے ابرو تن گئے اور فارس کے تنے اعصاب ڈھیلے ہوئے۔

"ہم سب جانتے ہیں کہ آپ الفاظ کے ہیر پھیر سے کام لے رہے ہیں' ورنہ ایسے نہیں ہوتا۔" وہ چیخ کر بولی۔ سعدی اپنے جوتوں کو دیکھ رہا تھا۔ فارس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ناگواری سے خلجی صاحب کو دیکھا۔

"زمر صاحبہ! کیا یہ درست نہیں کہ آپ پراسیکیوشن آفس میں بیٹھ کر دفاع کی جانب سے کان بالکل بند کر لیتی ہیں' اور ایک دفعہ کسی کو مجرم گردان لیتی ہیں تو یہ ثابت کرنے کے لیے آخری حد تک جاتی ہیں؟"

"میں بغیر وجہ یا ثبوت کے کسی کو مجرم نہیں گردانتی۔" چبا چبا کر' سلگتی آنکھوں سے وہ انہیں دیکھ کر بولی۔ سامنے کھڑے خلجی صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر اپنے ہاتھ میں پکڑے کاغذ دیکھے۔

"کیا یہ درست ہے کہ وارث غازی قتل سے چند روز قبل آپ نے ایک موک ٹرائل میں حصہ لیا تھا۔ سرکار بنام ہیری پوٹر!" اور زمر نے بری طرح چونک کر سامنے بیٹھے سعدی کو دیکھا۔ اس نے گردن مزید جھکائی۔ زمر کی آنکھوں میں بے یقینی' صدمہ' دھچکا' ہر شے ابھری تھی۔

"جی ہاں!" وہ دوبارہ خلجی صاحب کی جانب مڑی تو جیسے ڈھیروں غصے کو ضبط کر رہی تھی۔

"اس میں آپ نے ہیری پوٹر کو سیڈرک ڈگوری کا قاتل ثابت کروایا۔ کیا یہ درست ہے؟"

"وہ ایک موک ٹرائل تھا!" گلابی پڑتی آنکھوں سے وہ غرائی تھی۔ مگر وہ اثر لیے بنا کاغذات کو پڑھ رہے تھے۔

"جبکہ ہیری پوٹر کے چوتھے حصے میں درج اس واقعے کی تفصیل کے مطابق ہیری قاتل نہیں تھا۔"

"وہ ایک موک ٹرائل تھا!" سختی سے کٹہرے کا جنگلہ پکڑے' وہ ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"زمر! میرا آخری سوال۔" کاغذ سے چہرہ اٹھا کر انہوں نے سادگی سے پوچھا۔ "کیا ہیری کو پراسیکیوٹ کرنے سے قبل آپ نے وہ چوتھا حصہ پڑھا تھا؟"

"وہ ایک موک ٹرائل تھا' خلجی صاحب!" اس کی آواز کانپی۔

"اس چوتھے حصے کے مطابق' ہیری بے گناہ تھا یا گناہگار؟"

اور فارس بے چینی سے سعدی کی طرف جھکا۔ "وکیل کو منع کرو۔ اس کے ساتھ یوں نہ کرے۔ وہ ایک عورت ہے۔"

سعدی نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ "اتنی ہمدردی تھی تو گولی کیوں ماری؟"

فارس نے جواباً غصے سے اسے گھورا۔

"کیا نہیں ماری تھی؟ تو اگر کوئی یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے تو کرنے دیں۔" اور پھر سے قدموں

میں دیکھنے لگا۔

"وہ تمہاری پھپھو ہیں۔" اس نے گویا ملامت کی۔

"اور مجھ سے زیادہ مضبوط ہیں' سنبھال لیں گی۔"

اور خلجی صاحب کہہ رہے تھے۔

"میں آپ سے ایک سادہ سی بات پوچھ رہا ہوں۔ ہیری پوٹر کی چوتھی کتاب کے تحت 'ہیری پوٹر' جس کو آپ نے سزا دلوائی تھی' گناہ گار تھا یا بے گناہ؟" لب بھینچے' زمر نے سرخ ہوتی آنکھیں خلجی صاحب پہ جمائیں' چند لمحے مختصر سی خاموشی چھائی رہی۔

"بے گناہ!" ایک لفظ بولا۔ جج نے قلم سے کاغذ پہ کچھ نوٹ کیا' خلجی صاحب "ویٹس آل" کہتے پیچھے کو ہٹے' مگر وہ ان سے پہلے پرس کندھے پہ ڈالتی نیچے اتر آئی۔ سعدی کے قریب سے گزرنے لگی تو اس نے سر اٹھا کر دیکھا' زمر نے ملامتی' کاٹ دار نظر اس پہ ڈالی اور آگے چلتی چلی گئی' یہاں تک کہ وہ کمرہ عدالت سے باہر تھی۔ کوئی اسے روک کے دکھائے تو اس کی ماں اسے رو دے۔

راہداری میں چلتے ہوئے اس کا چہرہ احساس توہین سے سرخ ہو رہا تھا۔ بار بار وہ کنپٹی مسلتی۔ سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ واپس اپنے آفس آئی اور اندر جو بھی بیٹھا تھا اس کو "باہر جاؤ' فوراً" کہہ کر بھیجا اور کرسی پہ گر سی گئی۔ آنکھیں گلابی پڑ رہی تھیں۔ سر درد الگ۔ پتا نہیں کتنی دیر وہ اُدھر بیٹھی رہی' پھر پرس اور چابیاں اٹھا کر باہر نکلی۔ راہداری میں ابھی آگے آئی ہی تھی کہ سامنے سے دو اہلکار ہتھکڑی لگے فارس کو لے کر آ رہے تھے' اس کے ہاتھوں سے بندھی زنجیریں سپاہیوں کے ہاتھوں سے جڑی تھیں۔ سماعت ختم ہو چکی تھی۔

اسے قریب آتا دیکھ کر وہ رکا' گردن ترچھی کر کے سپاہی کو دیکھا۔

"نذر اسلام! تمہاری بیوی کا نام رخسانہ ہے' چار بچے ہیں تمہارے' سیٹلائٹ ٹاؤن کے پاس گھر ہے تمہارا۔ اگر تم نے مجھے پراسیکیوٹر سے بات کرنے سے روکا' تو یاد رکھنا' جس دن چھوٹوں گا' سب سے پہلے تمہارے گھر جاؤں گا۔" ایک کاٹ دار نظر اہلکار پہ ڈالی جو بے بسی سے خشک لبوں پہ زبان پھیر کر رہ گیا۔ وہ چلتی ہوئی قریب آ رہی تھی' اسے دیکھا تو رخ پھیر کر نکلنے لگی' مگر۔

"آپ نے کہا' آپ میرے ساتھ کھڑی ہوں گی' میری وکیل بنیں گی۔" زمر کی' چونک کر اسے دیکھا۔ وہ وسط راہداری میں' ہتھکڑیوں میں کھڑا بہت ضبط سے اسے دیکھتے کہہ رہا تھا۔

"اس ریکارڈنگ میں آپ نے کہا' آپ میرا ساتھ دیں گی' حالانکہ آپ کو بتایا جا رہا تھا کہ میں نے وارث کو مارا ہے۔" وہ چند قدم مزید قریب آیا۔ دونوں اہلکار ساتھ کھنچے آئے۔ راہداری میں سے گزرتے لوگ رک کر دیکھنے لگے۔ زمر لب بھینچے کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور سانس تیز ہو رہی تھی۔ وہ دو قدم مزید آگے آیا۔ ان ہی غصے بھری آنکھوں سے اسے دیکھتے بولا۔ "بھائی کو مارا تو خیر تھی' بات سننے کو تیار تھیں آپ' مگر آپ کو مارا تو اصول بدل گئے' ہاں؟"

وہ چبھتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھے گئی۔ پہلو میں گرے ہاتھ سے پرس کو زور سے بھینچا۔ ضبط سا ضبط تھا۔

"آپ نے کہا' ادھر کٹہرے میں۔" ہتھکڑی والے ہاتھ سے کمرہ عدالت کی سمت اشارہ کیا۔ "میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی کرتا' سچ کہا' مگر آپ کوئی نہیں تھیں' آپ زمر تھیں!" انگلی اٹھا کر' پیچھے ہٹتے اس نے غصے اور درد سے بھری آنکھوں سے اسے دیکھا۔ "آپ سے' کم از کم آپ سے مجھے امید تھی کہ آپ مجھے سنیں گی' مگر آپ نے سب سے پہلے میری امید توڑی۔" اور وہ پیچھے ہٹتا گیا۔ "میں بے گناہ تھا میڈم زمر' میں بے گناہ تھا!"

غصے کی جگہ ان آنکھوں میں دکھ ابھر آیا اور پھر وہ پیچھے ہٹ گیا۔ یہاں تک کہ وہ لوگ اسے لیے مڑ گئے' مگر اس کی آنکھیں۔ وہ ہر جگہ نقش تھیں۔ زمر نے ادھر ادھر دیکھا' پر رک کر اسے دیکھتے شخص کے اوپر وہی آنکھیں چسپاں تھیں۔ وہ تیز تیز چلتی دوسری

سست بڑھنے لگی۔ اس کا سانس اب بھی بے ترتیب تھا اور آنکھوں کا گلابی پن بڑھتا جا رہا تھا۔

گھر آکر اس نے ابا، صداقت، کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ کھانا بھی نہیں کھایا۔ کمرے میں بند ہو گئی۔ ڈاکٹر کی اپائنٹمنٹ پہ بھی نہیں گئی۔ بس بستر پہ چت لیٹی چھت کو دیکھتی رہی۔ پھر شام ڈھلے اسٹڈی ٹیبل پہ آ بیٹھی، اور کچھ فائلز کو پڑھتی رہی۔ رات دیر تک اس کے کمرے کا یہی منظر رہا۔ کب سر فائل پہ رکھے وہ سو گئی، اسے پتا بھی نہیں چلا۔

☼ ☼ ☼

کیا گزرتی ہے بھری دنیا میں تنہا شخص پر
ایک لمحے کے لیے خود سے بچھڑ کر سوچنا

رات کا وہ سرا پہر تھا شاید، جب اس کی آنکھ کھلی۔ وہ ایک دم اٹھ بیٹھی۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ لیمپ جانے کب بجھ گیا۔ شاید بجلی چلی گئی تھی۔ وہ بال لپیٹتی اٹھی۔ بتی جلائی۔ یو پی ایس نے کمرہ روشن کر دیا۔ وہ قدم قدم چلتی شلف تک آ رکی۔ وہاں سیاہ جلد والی، موٹی موٹی قانون کی کتابیں رکھی تھیں۔ زمر نے ہاتھ اٹھا کر ان کو چھوا۔ آنکھوں میں کرب ابھرا۔ پھر وہ مزید دائیں جانب آئی۔ یہاں الماری تھی۔ اس نے پٹ کھولا۔ جوتوں والے خانے میں ایک ڈبہ رکھا تھا جس میں چند ایک تراشے اور کاغذ پڑے تھے۔

یہ ڈھائی سال قبل اس نے جمع کیے تھے۔ پھر چھوڑ دیے۔ یہ تکلیف دیتے تھے اور وہ تکلیف سے بچنا چاہتی تھی، پھر بھی بچ نہیں پاتی تھی۔ مگر جو تکلیف، ہتک، ذلت، آج اٹھانی پڑی تھی۔ بھری عدالت میں۔ اس نے ڈبے کو چھوئے بنا الماری بند کر دی اور باہر نکل آئی۔

لاؤنج ویران، اندھیرا پڑا تھا۔ اور سرد بھی۔ وہ باہر لان میں آ گئی۔ برآمدے کے اسٹیپ پہ بیٹھی۔ ایک گال گھٹنوں پہ رکھے، دور گھاس اور پودوں کو تکتی، خاموش بیٹھی رہی۔ لمحے چپ چاپ کٹتے رہے، پھسلتے رہے، یہاں تک کہ فجر اترنے لگی، تب زمر اٹھی اور لان کے کنارے تک آئی۔ یہاں پودوں کو پانی دینے کے لیے ٹونٹی لگی تھی۔ اس نے وہی کھولی، ٹھنڈے یخ پانی سے وضو کیا اور وہیں گھاس پہ کھڑے نماز کی نیت باندھ لی۔

آخری سجدے کے بعد، التحیات پڑھ کر سلام پھیرا تو دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے، مگر پھر گرا دیے۔ چپ چاپ سجدے کی جگہ کی گھاس کو دیکھتی رہی۔ اس پہ انگلی پھیرتی رہی۔ سخت سردی میں بغیر سوئیٹر کے وہ کتنی ہی دیر وہاں بیٹھی رہی۔

وہ رات اس حوالاتی کوٹھری میں بھی آنکھوں میں کاٹی گئی تھی۔ وہ ذرا سا کونہ جہاں برآمدے کی بتی کی مدھم روشنی گرتی تھی، آج فارس ادھر نہیں لیٹا تھا۔ وہ دوسری دیوار کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اکڑوں، سر دیوار سے ٹکائے، آنکھوں کی پتلیاں سکیڑے دور سلاخوں کے پار دیکھ رہا تھا۔ باہر فجر ابھی تک تازہ تھی۔ پہرے دار ٹہل رہے تھے۔ باتیں کر رہے تھے۔ چند ایک کوٹھریوں میں سے آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ احمر جمائی لیتا، آنکھیں مسلتا اٹھ بیٹھا، پھر اِدھر اُدھر دیکھا۔

"غازی بھائی۔ ادھر کیوں بیٹھے ہو؟ سوئے نہیں کیا؟"

"اونہوں!" وہ باہر دیکھتا رہا۔ یقیناً وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ احمر لبوں پہ ہاتھ رکھ کر جمائی روکتا سیدھا ہو کر بیٹھا۔ فارس اس سے چند قدم ہی دور تھا۔

"کیا بات ہے؟ نماز نہیں پڑھی؟"

"پڑھ لی۔"

"اس نماز کا کیا فائدہ جس کے آخر میں کوئی دعا ہی نہ مانگی جائے؟ چار سجدے کیے، اور اٹھ گیا۔" پھر وہ خود ہی ہنسا، مگر جب فارس نے ہنسی کا جواب نہیں دیا تو وہ چپ ہو گیا۔

"برے حالوں میں لگ رہے ہو آپ۔" وہ آنکھیں جھپکا جھپکا کر غور سے اسے دیکھنے لگا۔ پھر قریب کھسک آیا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟ آپ پریزن رائٹس کے بارے میں؟"

خلاف معمول فارس بیزار نہیں ہوا، ہلکی سی نفی

میں گردن ہلائی۔

"پھر کیا چرپل کے بارے میں؟ کل کورٹ میں پیشی ہوئی تھی نا؟"

"ہاں!" فارس نے اثبات میں سرہلایا۔

"آپ نے بتایا ہی نہیں کل سے کہ کیا ہوا۔ کیا اس نے وہی کہا جو پہلے کہہ چکی تھی یا کچھ نیا تھا اس میں؟"

"سب پرانا تھا۔"

"تو اتنے اپ سیٹ کیوں ہو؟"

"عدالت نے نو مہینے بعد کی تاریخ دی ہے۔" تکلیف سے کہتے اس نے گردن پھیر کر احمر کو دیکھا جس کے لب اوہ میں سکڑے۔

"نو مہینے اسٹیفنی! نو مہینے میں ایک پیشی کا انتظار نہیں کر سکتا۔"

"مگر۔ آج تو سب کچھ آپ کے حق میں گیا تھا نا۔"

"مجھے بھی یہی لگا' سعدی کو بھی' مگر جب جج نے اگلی تاریخ دی تو میرے وکیل نے بھانپ لیا کہ جج بک چکا ہے۔" تکان سے کہتے اس نے آنکھوں کے درمیان کی ہڈی مسلی۔ "اتنے مہینے کے انتظار' جس کی اتنی راتیں' مگر انصاف کی کوئی امید نہیں۔"

احمر نے گردن پھیر کر روشنی والا کونہ دیکھا جو آج خالی پڑا تھا۔

"مجھے بھی لمبی تاریخ مل گئی ہے۔" وہ تھوڑی دیر بعد منہ بسورے بولا تو فارس نے چونک کر اسے دیکھا۔

"مگر تمہارا وکیل تو ہاشم ہے۔"

"ہاشم اپنے والد کے مجبور کرنے پہ میرے لیے کوشش کر رہا تھا۔ مگر اسے اندر سے مجھ سے کوئی ہمدردی نہیں' شروع شروع میں اس نے یوں ظاہر کیا کہ بس میں رہا ہوا کہ ہوا' مگر۔ اب تک اور ننگ زیب کاردار مجھے بھولنے لگے ہیں" پہلی دفعہ وہ بے فکرا اور لاپروا نہیں لگا تھا' اسے جیسے اب واقعی فکر ہونے لگی تھی' مگر وہ اسے چھپانے کی سعی کر رہا تھا۔

فارس نے کرب سے سر جھٹکا۔

"پھر اب آپ کیا کریں گے؟"

"تم کیا کرو گے؟ بلکہ۔" وہ ایک دم احمر کو دیکھنے لگا۔

"بلکہ ہم کیا کریں گے؟" تو وہ جو ہنوز اداس بیٹھا تھا' چونکا' پھر پیچھے کو ہٹا۔

"ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں مجھے؟" مشکوک انداز میں اسے گھورا۔

فارس کچھ کہے بنا اس کو دیکھتا رہا۔

"نہیں' بالکل نہیں۔" احمر نے جلدی سے ہاتھ اٹھا دیے۔ "میں وہ نہیں کرنے والا جو آپ سوچ رہے ہیں۔"

"میرے پاس ایک پلان ہے اسٹیفنی' اگر تم سننا چاہو تو!"

"بالکل بھی نہیں' ہم ایسا کچھ نہیں کریں گے' عدالت پہ یقین رکھیں' بس!" بگڑ کر کہتا وہ پرے لیٹ گیا۔ فارس اسے دیکھ رہا تھا' اس نے گھبرا کے کروٹ بھی بدل لی۔

باہر فجر میں ایک ویران صبح کی روشنی گھلتی گئی۔

☼ ☼ ☼

واجب القتل اس نے ٹھہرایا۔
آیتوں سے' روایتوں سے مجھے

جسٹس مکرم کے چیمبرز میں خاموشی چھائی تھی۔ ہیٹر نے ماحول کو گرم اور خشک کر رکھا تھا۔ زمر سامنے سر جھکائے بیٹھی تھی اور وہ اپنی کرسی پہ براجمان' عینک کے پیچھے سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"مجھے پراسیکیوشن آفس سے استعفیٰ دے دینا چاہیے!" بہت دیر بعد اس نے سر اٹھایا تو آنکھوں میں تکان تھی۔ گھنگھریالی لٹیں دونوں طرف سے گالوں کو چھو رہی تھیں۔

انہوں نے فکرمندی سے اسے دیکھا۔ "تمہارے ذہن میں کیا چل رہا ہے زمر؟"

"یہی کہ میں ایک اچھی پراسیکیوٹر نہیں ہوں۔ میرے خیالات فکسڈ ہو چکے ہیں' اور میں تصویر کا دوسرا رخ دیکھنا چھوڑ چکی ہوں۔" وہ یاسیت بھری آنکھیں ان پہ جمائے' بدقت ایک ایک لفظ ادا کر پائی۔

جسٹس مکرم نے مایوسی سے نفی میں سرہلایا۔

"سب سے برے مریض ڈاکٹر ہوتے ہیں' اور سب سے برے گواہ خود وکیل بنتے ہیں۔ تم نے یہ ثابت کردیا۔" پھر قدرے آگے کو جھکے۔ "مجھے' بلکہ پوری کچہری کو معلوم ہے کہ کل تمہارے ساتھ کیا ہوا۔ دفاعی وکیل گواہ کو ڈس کریڈٹ کرنے کے لیے ہر قسم کا ہتھکنڈا استعمال کرتے ہیں۔ مجھے امید نہیں تھی کہ تم اس وکیل کی بات دل پہ لے لوگی۔"

"وہ میرے راستے میں آیا اور اس نے میری آنکھوں میں دیکھ کر کہا کہ وہ بے گناہ ہے۔"

وہ چونکے۔ "کون؟"

"فارس۔" وہ کہہ کر چپ ہوگئی۔ چند ثانیہ کو چیمبر میں سناٹا چھا گیا۔

"کیا اس نے یہ پہلی دفعہ تم سے کہا؟"

"میں ڈھائی برس تک اس سے ملنے سے انکار کرتی رہی' اس لیے نہیں کہ مجھے تکلیف ہوتی ہے' اس لیے بھی نہیں کہ کوئی مجھے ثبوت کیوں نہیں لا کر دیتا۔ یہ وہ بہانے تھے جو میں بناتی تھی' صرف اس لیے کہ مجھے معلوم تھا' اگر وہ میرے سامنے آیا اور کہا کہ وہ شرمندہ ہے تو میں اسے معاف کردوں گی۔ مگر کل وہ سامنے آیا تو کہا کہ وہ بے گناہ ہے۔ اور میں نے سن بھی لیا۔"

"اور کیا مان بھی لیا؟"

اس بات پہ زمر نے ٹھنڈی سانس بھری اور گردن جھکا کر اپنے ناخن کھرچنے لگی۔

"میں کنفیوز ہوگئی ہوں۔"

"جیسا کہ دفاعی وکیلوں کی خواہش ہوتی ہے' اگر کنونس نہ کرسکو تو کنفیوز کردو۔" وہ قدرے ناراض نظر آنے لگے۔ زمر نے نفی میں گردن ہلائی۔

"شاید وہ ٹھیک ہیں۔ میں اپنے غم' بیماری اور ڈراما میں خود غرض ہوگئی ہوں۔ میں نے دوسری طرف کی کہانی سننا چھوڑ دی ہے۔ مجھے اس کی بات سننی چاہیے تھی۔ وہ قاتل تھا یا نہیں' مجھے اس سے ملنا چاہیے تھا۔"

"تمہاری جگہ کوئی دوسرا بھی ہوتا تو یہی کرتا۔"

"مگر میں کوئی دوسری عورت نہیں تھی۔ میں زمر تھی۔ مجھے اپنے جذبات ایک طرف رکھنے چاہیے تھے۔"

انہوں نے جواباً "اکتا کر ناک سے مکھی اڑائی۔

"یہ کتابی باتیں ہیں' کوئی بھی انسان اتنا غیر جانب دار نہیں ہوسکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو ہمارے دوست وکلاء ہم ججوں کے سامنے پیش ہونے سے یہ کہہ کر معذرت نہ کرلیتے کہ یہاں Conflict of interest آگیا ہے۔ وکیلوں کے بھی جذبات ہوتے ہیں۔"

"اور بطور ایک جج آپ کو کیا لگتا ہے؟ سرکار بنام فارس غازی میں مجرم کون ہے؟" وہ بالکل خالی نظروں سے ان کو دیکھتی پوچھ رہی تھی۔

"جتنا میں نے اس کیس کے بارے میں سن رکھا ہے' میرا خیال ہے' فارس غازی مجرم ہے۔" عینک کے بازو کا کنارہ دانتوں میں دبائے وہ کندھے اچکا کر بولے۔

"کیونکہ ثبوت اس کے خلاف ہیں؟ مگر قانون تو یہ کہتا ہے کہ عدالت کا فیصلہ آنے تک ملزم کو "مجرم" نہ کہا جائے بلکہ اسے Innocnet Presumed سمجھا جائے۔" وہ بہت تکلیف میں بول رہی تھی۔

"یہ درست ہے۔"

"اور قانون یہ بھی کہتا ہے کہ اگر ایک طرف ملزم کے خلاف شواہد کا پہاڑ ہو' مگر دوسری جانب اتنا ذرا سا۔" انگوٹھا اور انگشت شہادت قریب کرکے بتایا۔

"اتنا ذرا سا بھی شک ہو' Doubt Reasonable ہو' تو ہمیں ملزم کو بری کردینا چاہیے' کیونکہ سو گناہ گاروں کو بری کردینا ایک معصوم کو سزا دینے سے بہتر ہے۔" اور پھر وہ خاموش ہوگئی۔ چند لمحے اسی سناٹے میں پھسل گئے۔

"میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا' اور وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا' سر۔"

عینک کا ہنڈل چباتے ہوئے انہوں نے ہنکارا بھرا۔

"ہوں' تو تمہیں کیا ڈر ہے؟"

"اگر میری وجہ سے ایک بے گناہ آدمی کو سزا ہوئی تو

میں زندگی میں کبھی دوبارہ لاء میں پریکٹس نہیں کرسکوں گی۔"

جسٹس مکرم آگے کو ہوئے' سوچتے ہوئے عینک کے کنارے سے میز پہ نادیدہ لکیریں کھینچیں۔

"تو پھر؟ کیا وہ بے گناہ ہے؟"

"میرے پاس بہت کچھ ہے جو اس کو مجرم ثابت کرتا ہے میری نظروں میں' مگر اس کے پاس Reasonable Duobt ہے اور اگر میں ان دونوں کو ان پلڑوں میں رکھوں۔" میز پہ رکھے ڈیکوریشن ترازو کی سمت اشارہ کیا۔ "تو رتی بھر شک کا پلڑا ہمیشہ جھک جائے گا۔"

"شک کیا ہے؟"

"وہ آواز جو میں نے سنی' وہ جعلی تھی۔ یہ میرے لیے ماننا بہت مشکل ہے' آپ کے لیے بھی ہوگا' لیکن۔" وہ بے چینی سے آگے کو ہوئی۔ "اب دو باتیں ہیں۔ اول' قاتل فارس ہی تھا اور یہ آڈیو ردوبدل کے بعد پیش کی گئی ہے' اسی لیے وہ لوگ اس کا سورس نہیں بتا رہے۔ دوم' (ایک گہری سانس لی) آڈیو اصلی ہے' وہ فارس نہیں تھا' وہ ایک جعلی آواز تھی۔"

"تمہارا دل کیا کہتا ہے؟"

"دل سے آخری فتویٰ لیا جاتا ہے' پہلا نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہی مجرم ہے' اسی نے کیا ہے یہ سب۔ لیکن۔" اور یہیں آکر اس کا پورا وجود کرب میں مبتلا ہو جاتا۔

"تمہارے دل میں شک آ گیا ہے۔"

زمر نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اور تم نے اس کا حل یہ سوچا کہ تم فرار ہو جاؤ؟ استعفیٰ دے کر؟"

"میں فرار نہیں ہو رہی۔ میں شاید اس کرسی کی مستحق نہیں ہوں۔ شاید پراسیکیوشن کی کرسی پہ بیٹھ کر میں دوسرا رخ دیکھنا چھوڑ چکی ہوں۔"

"جب عدالت میں اس وکیل نے یہ کہا کہ تمہارے اتنے کیسز کے فیصلے تمہارے خلاف آئے ہیں' تو تم نے اسے سچ کیوں نہیں بتایا؟"

"اور سچ کیا تھا؟" وہ اداسی سے مسکرائی۔

"یہ کہ ان کیسز میں ملزم بری اس لیے ہوئے تھے' کہ کبھی گواہ ڈر گئے یا بک گئے' کبھی جج ہمت نہ کرسکے' کبھی ثبوت نہیں تھے' کبھی شک کا فائدہ دیا گیا۔ میں روز کتنے ہی ایسے کیسز میں لوگوں کو بری کرتا ہوں' جہاں مجھے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ملزم ہی مجرم ہے مگر میرے سامنے اتنے ثبوت ہی پیش نہیں کیے جاتے جو ان کو جیل میں روک سکے۔ پراسیکیوٹر کا کام حقائق اور شواہد سامنے لانا ہوتا ہے' اور تم ایک بہترین پراسیکیوٹر ہو زمر!" پھر گہری سانس لے کر پیچھے ہوئے۔

"رہا فارس غازی کا کیس' تو اس کے خلاف اتنے ثبوت ہیں کہ تم نہ گواہی دیتیں' تب بھی وہ جیل میں ہوتا۔ پھر بھی اگر تمہیں لگتا ہے کہ اس کے بے گناہ ہونے کا ذرا سا بھی چانس ہے' تو تم اپنی گواہی واپس لے لو' اور جا کر ایک دفعہ اس کی بات سن لو۔ اگر وہ کہے کہ وہ بے گناہ ہے تو یقین مت کرنا' کیونکہ سب ملزم یہی کہتے ہیں۔ لیکن اگر اس کے علاوہ کوئی اور بات کہے تو دھیان سے سن لینا۔"

زمر نے اثبات میں سر ہلایا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تھینک یو سر! میں بہتر محسوس کر رہی ہوں۔ میں اپنی گواہی واپس لے لوں گی کیونکہ مجھے ابھی تک خود پہ یقین ہے' مگر اس کیس سے الگ ہونے کے لیے میں یہ ضرور کروں گی۔" کہتے ہوئے وہ پہلی دفعہ قدرے تحمل سے مسکرائی۔ وہ واقعی بہتر محسوس کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

اب کہ ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

جیل کے برآمدے میں معمول کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ صحن میں قیدی ادھر ادھر چلتے پھرتے' کام کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ ایک کونے میں' سرما کی دھوپ سے بے نیاز' وہ دونوں بھی موجود تھے۔ فارس ٹانگ موڑ کر' دیوار سے ایک پاؤں لگائے کھڑا تھا' اور احمر اس کے سامنے کھڑا سینے پہ بازو لپیٹے' دھوپ کے

باعث آنکھیں چندھیا کر اسے دیکھ رہا تھا۔

"پریشان ہو ااسٹپنی!"

"نہیں یار!" احمر نے بے چینی سے سر جھٹکا اور پتلیاں سکیڑ کر دور سفید کپڑوں والے قیدیوں کو دیکھنے لگا۔

"اے!" فارس نے اس کے چہرے کے آگے ہاتھ ہلایا۔ "مسئلہ ہے کوئی؟"

"ہاشم اس سماعت پہ نہیں آیا۔ ٹالے جارہا ہے۔ اگلے ہفتے بھی معلوم نہیں آئے یا نہیں۔" اور ان ڈھیر سارے دنوں میں پہلی دفعہ وہ مایوس نظر آنے لگا تھا۔

"ہاشم کے وعدوں پہ رہو گے تو یہی ہوگا۔" پھر ادھر ادھر سرسری سا دیکھا اور احمر کے قدرے قریب ہوا۔ "مجھے یا تمہیں کوئی عدالت یہاں سے نہیں نکالے گی۔ اب بھی وقت ہے' میرے پلان کے بارے میں سوچو۔"

احمر نے ہلکا سا اثبات میں سر ہلایا۔ فارس نے ہاتھوں میں پکڑا کاغذ کا ٹکڑا منہ میں ڈالا اور چباتے ہوئے گردن موڑ کر سامنے دیکھنے لگا۔ ایک اہلکار اسی طرف آرہا تھا۔

"تمہاری ملاقات آئی ہے غازی۔" اس نے فارس کو مخاطب کیا۔

"کون ہے؟" کاغذ چباتے آہستگی سے پوچھا۔

"پراسیکیوٹر صاحب۔"

کاغذ اس کے حلق میں پھنس گیا' بہتے جبڑے رکے' چونک کر اسے دیکھا' پھر احمر کو۔ وہ بھی ایک دم سیدھا ہوا تھا۔

"چڑیل آئی ہے؟ آپ سے ملنے؟" شاک اتنا شدید تھا کہ وہ اسے ٹوک بھی نہ سکا۔ بس کاغذ منہ سے اگلا اور خاموشی سے سپاہی کے پیچھے ہولیا۔

جب وہ اس کمرے میں داخل ہوا تو میز کے اس پار کرسی پہ وہ بیٹھی تھی۔ گھنگھریالے بال آدھے کیچر میں بندھے تھے' ٹانگ پہ ٹانگ جمائے' شال کندھوں کے گرد اور بار بار کلائی کی گھڑی دیکھتی۔ آہٹ پہ نظریں اٹھائیں۔ وہ چھوٹے قدم اٹھاتا آیا اور اس کے سامنے بیٹھا۔ بال ویسے ہی پونی میں تھے' اور شیو ہلکی ہلکی سی نظر آتی تھی۔

"لانگ ٹائم میڈم!" آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھ رہا تھا۔

زمر نے سر کو ہلکے سے اثبات میں جنبش دی۔

"لانگ ٹائم فارس!"

اور تیکھی نظریں اس پہ مرکوز کردیں۔ ہاتھ گود میں رکھ لیے تھے' اور مٹھیاں ضبط سے بھینچ لی تھیں۔ ذہن کے پردوں پہ وہی آوازیں گونجنے لگیں۔ (میں تمہیں صرف ایک گولی ماروں گا زمر۔ آئی ایم سوری۔) اس نے ان تکلیف دہ یادوں کو ذہن سے جھٹکنا چاہا مگر یہ آسان نہ تھا۔

"سو؟" دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے اور وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا منتظر تھا۔

"میں تمہیں سننے آئی ہوں۔ تم ڈھائی سال سے یہی درخواست کرتے رہے ہو نا۔ تو اب میں یہاں ہوں۔ کہو جو بھی کہنا ہے۔"

فارس کے لبوں پہ تلخ مسکراہٹ بکھری۔

"دیر کی آپ نے آنے میں۔ اب مجھے آپ کے قانون سے کوئی امید نہیں رہی۔"

وہ خاموشی سے اسے دیکھے گئی۔

"بتاؤں کیا کہنا ہے مجھے آپ سے؟" وہ ہاتھ ملا کر میز پہ رکھے آگے کو جھکا اور چبا چبا کر ہر لفظ ادا کیا۔ "یہی کہ میری بیوی کی موت کی ذمہ دار آپ بھی ہیں۔ آپ کو چاہیے تھا کہ آپ اس کا ہاتھ پکڑتیں اور وہاں سے بھاگ جاتیں' آپ کو اسے بچانا چاہیے تھا اس کی حفاظت کرنا چاہیے تھی' مگر اپنی دوسروں کو قائل کرنے کی صلاحیت پہ یقین کرکے آپ نے اسے بھی نقصان پہنچایا اور خود بھی۔" زمر اب کہنی کرسی کے ہتھے پہ رکھے' انگلی ٹھوڑی تلے جمائے' اسے دیکھ رہی تھی۔

"میرے پاس اپنے دفاع میں کہنے کو کوئی لمبی چوڑی بات نہیں ہے۔ دل اچاٹ ہوگیا ہے اس قانون سے۔ صرف اتنا کہوں گا کہ تین سال آپ کے شہر میں

گزارے، اتنا تو جانتی تھیں آپ مجھے کہ ایک دفعہ میری بات سن لیتیں۔ اتنا تو یاد رکھتیں کہ آپ میری ٹیچر تھیں۔ ایک دفعہ تو تصویر کا دوسرا رخ دیکھتیں۔"

وہ پھر رکا کہ شاید وہ کچھ بولے مگر وہ چپ چاپ سن رہی تھی۔ ناک کی لونگ ہنوز دمک رہی تھی۔ فارس نے اس لونگ پہ نظریں جمائیں تو لہجے کی کڑواہٹ زائل ہونے لگی۔ اعصاب قدرے ڈھیلے پڑے۔

"مجھے قاتل سمجھتی ہیں تو سمجھیں میڈم! جو دل میں آئے سمجھیں، مگر ایک دفعہ میرے کیس کو ضرور دیکھیں اور وہ بھی خود دیکھیں۔" وہ واپس پیچھے ہوا۔

"کچھ کہیں گی نہیں آپ؟" اب کے اس کا لہجہ دھیما تھا۔ نرم تھا۔

"میں کہنے نہیں، سننے آئی تھی۔ کیونکہ اگر کہنے آئی تو آواز باہر تک جائے گی۔" وہ گہری سانس لیتی ٹھنڈے انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ سپاٹ نظروں سے اس کی آنکھوں کو دیکھا۔

"یقیناً" تم کہہ چکے ہو جو کہنا تھا، سو ملاقات ختم ہوئی۔" اور کرسی دھکیل کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

فارس نے بے حد تکلیف سے اسے جاتے دیکھا، اور پھر آنکھیں میچ کر گردن جھکالی۔

جب وہ واپس آیا تو احمر صحن کے اس کونے میں منتظر سا ٹہل رہا تھا۔ اسے آتے دیکھ کر بے چینی سے لپکا۔

"کیا کہہ رہی تھی چڑیل؟" امید اور خوشی سے اس نے پوچھا۔

"وہ اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے آئی تھی، ورنہ اسے اب بھی یقین ہے کہ میں مجرم ہوں۔" احمر کی آنکھوں میں الجھن ابھری۔

"مگر۔ کہا کیا اس نے؟"

"کچھ نہیں، کیونکہ اگر وہ کچھ کہے گی تو آوازیں باہر تک جائیں گی۔" وہ دیوار سے کمر لگا کر کھڑا ہو گیا۔ انداز ڈھیلا ڈھیلا سا تھا۔

"لیکن وہ آئی تو سہی نا۔ آہستہ آہستہ ہی انسان پگھلتا ہے۔"

"وہ پھر نہیں آئے گی اسپنی۔ مجھے ایک موقع ملا اور میں نے وہ بھی گنوا دیا۔ اسے قائل نہیں کر سکا میں۔" وہ گردن موڑ کر آنکھیں سکیڑے دھوپ کی سمت دیکھنے لگا۔ امید کی کرنیں اب سورج سے بھی نکلنا بند ہو گئی تھیں۔

"لیکن چڑیل کو چاہیے تھا کہ۔"

"اگر تم نے ایک دفعہ پھر اس کو چڑیل کہا تو میں اپنا ہاتھ تمہارے جبڑے تک لے جانے پہ مجبور ہو جاؤں گا اور اس کے نتیجے میں تم اپنے دو تین دانت گنوا دو گے۔"

وہ جتنے تحمل سے بولا تھا، احمر کی چلتی زبان اسی تیزی سے بند ہوئی۔ پھر ہونہہ کہہ کر سر جھٹکا۔

☼ ☼ ☼

سیف انداز بیاں رنگ بدل دیتا ہے!
ورنہ دنیا میں کوئی بات نئی بات نہیں

زمر گھر میں داخل ہوئی تو لاؤنج سے آوازیں آ رہی تھیں۔ حنین آئی ہوئی تھی۔ وہ اسی طرف آ گئی۔ بڑے ابا وہیل چیئر پہ بیٹھے مسکرا کر اسے دیکھ رہے تھے۔ اور حنہ صوفے پہ پیر اوپر کر کے بیٹھی ان کو کسی کورین ڈرامے کی کہانی سنا رہی تھی۔ خوب مزے سے، مسکرا مسکرا کر، آنکھیں گھما گھما کر۔ زمر کو چوکھٹ پر دیکھ کر اس کی بولتی بند ہوئی۔ سنجیدہ ہو کر پاؤں اتارے۔ آہستہ سے سلام کیا۔ ابا نے مڑ کر دیکھا۔ وہ تھکی تھکی سی سامنے صوفے پہ آ بیٹھی۔

"تمہیں دیر ہو گئی آج؟" انہوں نے پوچھا۔ حنین سر جھکا کر اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگی۔

"میں کورٹ سے سیدھی جیل چلی گئی تھی۔ فارس سے ملنے۔"

حنین نے کرنٹ کھا کر سر اٹھایا۔ وہ سرسری سا بتا کر، صداقت کو آواز دینے لگی کہ اس کی چیزیں لے جائے۔

"فارس سے۔ کیا بات ہوئی؟" ابا کے بے یقین

الفاظ اٹکے۔

"وہ چاہتا تھا میں اس کو سنوں' میں نے سن لیا۔"

صداقت اندر آیا تو وہ اسے چیزیں تھمانے لگی۔ حنہ جلدی سے آگے ہوئی' ساری ناراضی بھلا کر تیزی سے پوچھا۔

"اور کیا مان بھی لیا؟"

"اس نے کہا کہ وہ بے گناہ ہے اور جیل میں کوئی ایسا شخص مقید نہیں' جو یہ فقرہ منتر کی طرح نہ دہراتا ہو۔" وہ تکان سے کنپٹی مسل رہی تھی۔

"پھپھو! میں ان کے ساتھ تھی' میں نے پولیس کو بھی بتایا تھا' وہ بے گناہ ہیں۔" وہ تڑپ کر بولی تھی۔ زمر نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا' انگلی سے برابر کنپٹی مسلتی رہی۔

"حنہ بچے! میں تمہیں کٹہرے میں نہیں کھڑا کرنا چاہتی۔"

"مگر آپ ایک دفعہ مجھ سے تو پوچھیں کہ کیا ہوا تھا؟"

"اوکے' حنین یوسف!" اس نے سر اثبات میں ہلایا' پیچھے ہو کر بیٹھی' ٹانگ پہ ٹانگ جمائی۔ "شروع کرتے ہیں پھر۔"

حنین نے کمر سیدھی کرلی۔ بڑے ابا خاموشی سے بے بسی سے ان دونوں کو دیکھنے لگے جو آمنے سامنے بیٹھی تھیں۔ اور دونوں کے درمیان بہت سا فاصلہ تھا۔

"اس روز' جب مجھ پہ فائرنگ کی گئی تم ہوٹل کے کمرے میں تھیں۔ ایک سے ساڑھے تین بجے تک تقریباً'ہ؟"

"جی!" اس نے گردن اکڑائی۔

"اور اس دوران فارس کہیں نہیں گیا؟" زمر سنجیدگی سے سوال کررہی تھی۔

"نہیں' وہ ہمارے ساتھ تھے۔"

"اور اس دوران تم بھی کہیں اٹھ کر نہیں گئیں؟"

"جی نہیں۔"

"تم سارا وقت اسی کمرے میں تھیں؟"

"جی۔"

"اور اس دوران تم نے فارس سے نظر نہیں ہٹائی؟ فارس اور علیشا کے سوا کسی سے کوئی بات بھی نہیں کی؟"

"نہیں۔"

"پولیس کو بھی تم نے بالکل یہی کہا تھا۔ کیا میں اسے تمہارا حتمی بیان تصور کرلوں؟"

"جی' میم پراسیکیوٹر!" کافی اعتماد سے گردن اکڑائے وہ بولی۔ زمر نے آنکھیں میچیں' گہری سانس لی' اور اٹھ کر باہر نکل گئی۔ چند لمحے بعد وہ دوبارہ کمرے میں آئی تو اس کے ہاتھ میں وہی باکس تھا جو وہ الماری میں جوتوں کے خانے میں رکھتی تھی۔

"یہ تمہاری امی کے موبائل کا بل ہے۔ وہ موبائل جو اس روز تمہارے پاس تھا۔"

حنین نے قدرے حیرت سے وہ کاغذ تھاما' اور جب اس پہ نگاہیں دوڑائیں تو اس کا چہرہ سفید پڑنے لگا۔

"تم نے پولیس کو بھی کہا کہ تم نے اس دوران کسی سے کوئی بات نہیں کی' یعنی ایک لمحے کو بھی تم فارس سے غافل نہیں تھیں۔ جب کہ اس بل کے مطابق تم نے ڈیڑھ بجے اپنے گھر چار منٹ' اور پونے تین بجے پہ ایک دوست کو دس منٹ کے لیے کال کی۔"

پھر ایک دوسرا کاغذ اس کے سامنے کیا۔ "یہ اس ہوٹل کی لابی کے سی سی ٹی وی کیمرے کا ایک اسٹل امیج ہے۔ اس میں تم نیچے ایک شاپ میں کھڑی دکھائی دے رہی ہو اور وقت' ہوا ہے دو بج کر سترہ منٹ۔ مگر تم نے کہا تھا کہ تم اس دوران کمرے سے کہیں نہیں گئیں۔"

"میں بتانا بھول گئی' اور' اور یہ فائرنگ سے بہت پہلے کا وقت تھا۔" اس نے بجھے چہرے کے ساتھ وضاحت دینے کی کوشش کی۔

"حنہ بچے! میں نے تم سے اس بارے میں کوئی بات اس لیے نہیں کی کیونکہ میں جانتی تھی' تم ڈھائی گھنٹے ایک کمرے میں ٹک کر نہیں بیٹھ سکتیں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم نے یہ باتیں کیوں نہیں بتائیں' تم فارس کو پروٹیکٹ کرنا چاہتی تھیں' مگر حنہ' یہ گواہی کا معاملہ ہے' اور گواہی کے معاملے میں ہمیں اگر کسی کی

ایک بات جھوٹ معلوم ہو تو اس کی باقی ساری باتیں بھی سچی نہیں رہتیں۔ میں تھک گئی ہوں' آرام کرنے جارہی ہوں۔ آپ لوگ باتیں کریں۔"

وہ نرمی سے کہتی کاغذات واپس ڈبے میں ڈالتی اٹھ گئی۔ حنین چہرہ جھکائے کتنی ہی دیر اسی طرح بیٹھی رہی' اور ابا' وہ بس افسوس سے اسے دیکھتے رہے۔ اگر ان کے خاندان کے سارے لوگ ایک دن کے لیے اپنی ذہانت پہ بھروسا کرنا چھوڑ دیں تو کتنا اچھا ہو۔

☆ ☆ ☆
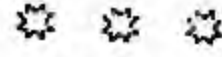
میں چاہتی ہوں مرا عکس مجھ کو لوٹا دے
وہ آئینہ جسے اک بار میں نے دیکھا تھا

اس روز چھوٹے باغیچے والے گھر میں حنین کی چیخ پکار گئی تھی۔ اپنے کمرے کی ساری الماریاں تلپٹ کیے' وہ کاغذات ڈھونڈ رہی تھی۔ میٹرک کی سند' ب فارم' شناختی کارڈ۔ ہمیشہ داخلے کی آخری تاریخ سر پہ آئی کھڑی ہوتی اور اس کے کاغذات نہیں مل رہے ہوتے تھے۔ اس تلاش میں کتنے عرصے کی کھوئی ہوئی درجنوں چیزیں مل جاتیں' مگر اصل شے نادارد رہتی۔

"کتنی دفعہ کہا ہے اپنی چیزیں ترتیب سے جوڑ کر رکھا کرو۔ لوگوں کی بیٹیوں کو دیکھا ہے' بھی' کیسے ہر چیز۔" امی کی ڈانٹ پھٹکار (جسے سعدی "بیک گراؤنڈ میوزک" کہا کرتا تھا) کچن سے سنائی دے رہی تھی۔

تب ہی ہیم کمرے میں داخل ہوا۔

"حنہ! یہ تمہارے لیے کوریئر آیا ہے۔ امریکہ سے۔"

وہ جو الماری میں سر دیے بیٹھی تھی' چونکی' پھر سب چھوڑ چھاڑ اس کی طرف آگئی۔ ہیم اتنا اچھا تو تھا نہیں کہ ڈبہ رکھ جاتا۔ اطلاع دینے کے ساتھ ساتھ کھول بھی رہا تھا۔ اس نے درشتی سے وہ جھپٹا' اسے کمرے سے بھگایا' اور پھر خود کھولنے لگی۔

اندر ایک چھوٹی ڈبی تھی۔ اس میں ایک کی چین تھی۔ علیشا کی چین۔ ساتھ میں تہہ شدہ خط۔ دھڑکتے دل سے حنین نے کاغذ کی تہیں کھولیں۔

"ڈیئر حنین!

می سے معلوم ہوا کہ ڈھائی سال بعد تمہارا فون آیا تھا۔ سن کر خوشی ہوئی۔ میں اس دور سے نکل چکی ہوں جب ای میل اور ٹیکسٹ کیا کرتی تھی۔ یہاں اس جیل میں مجھے خط لکھنا زیادہ پرسکون لگا' اس لیے لکھ رہی ہوں۔ کم از کم اسے تم پڑھے بغیر مٹا تو نہیں سکو گی۔"

حنین وہیں زمین پہ پھیلی چیزوں کے درمیان بیٹھ گئی' اور گویا سانس روکے پڑھتی گئی۔

"میں اپنی کی چین تمہیں بھیج رہی ہوں۔ یہ میرے انتقام کے عزم کی نشانی ہے۔ جب ہاشم نے تمہارے سامنے مجھے بے عزت کرکے نکالا تو میں نے سوچا تھا کہ تم بھی اپنی پھپھو جیسی ہو۔ جیسے اس نے فارس کی بات نہیں سنی' ویسے ہی تم نے بھی میری نہیں سنی۔ مگر تم دونوں اپنی جگہ ٹھیک ہو۔ کافی عرصہ میں نے سوچا کہ ہاشم سے اس بات کا بدلہ لوں' مگر پھر میں نے جان لیا کہ میں اتنی کمزور اور خوف زدہ سی لڑکی ہوں کہ کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ سو میں نے بدلے کی تمنا کو ترک کردیا۔ یہ کی چین بھی تمہیں دے رہی ہوں۔ سب لوگوں میں سے صرف تمہیں۔ لاکٹ بھی اسی لیے تمہیں دیا تھا کہ ایک دن ہم محرم راز بن جائیں گے اور تم میرے ساتھ کھڑی ہوگی۔ پھر مجھے میرا حق مل جائے گا۔ مگر وہ دن اب کبھی نہیں آئے گا حنین!

مایوسی انسان کو تباہ کردیتی ہے' مجھے بھی کردیا۔ میں نے ڈرگز میں فرار چاہا۔ جرائم میں چاہی۔ اب لگتا ہے کہ زندگی ضائع کردی۔ تمہیں یہی بتانے کو خط لکھ رہی ہوں کیونکہ مجھ میں اور تم میں ذہانت کے علاوہ اور بھی کچھ مشترک ہے۔ ہماری برائی کی طرف مائل ہونے والی طبیعت۔

کہتے ہیں' ہر انسان کے اندر دو بھیڑیے ہوتے ہیں۔ ایک اچھائی کا' دوسرا برائی کا۔ غالب وہی رہتا ہے جس کو ہم کھلاتے پلاتے ہیں۔

میں تمہیں بتاؤں حنین! میرے اندر کا منفی بھیڑیا

غالب آگیا' اور میں نے وہ کردیا جسے دنیا جرم کہے' دھوکا کہے' یا ڈرگز کہے' مگر خدا اسے ایک ہی لفظ سے پکارتا ہے "گناہ۔" اور میں تمہیں بتاؤں' تمہارا بھی بدی کا بھیڑیا جلد یا بدیر تم پر غالب آئے گا' اس لیے متنبہ کررہی ہوں۔ گناہ مت کرنا۔ کسی کی کمزوری کو شکار مت کرنا۔ کسی کی اچھی نیچر سے فائدہ مت اٹھانا۔ اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم ایسا ضرور کروگی۔ کیونکہ تم بھی evil جینیس ہو' شاید مجھ سے بھی زیادہ۔

تو بس اتنا جان لو حنین کہ ہر گناہ صرف توبہ کرلینے سے معاف نہیں ہوجاتا۔ بڑے گناہوں کے بڑے کفارے ہوتے ہیں۔ سو کچھ بھی غلط مت کرنا۔ کیونکہ کفارے دیتے تمہاری زندگی بیت جائے گی اور غم کم نہیں ہوگا۔ مجھے اس خط کا جواب مت دینا۔ میں اس قید میں کچھ عرصہ مزید رہنا چاہتی ہوں کسی بھی تعلق کی امید کے بغیر۔ مجھے میری غلطیوں کے لیے معاف کردینا۔ میں بھی تمہیں تمہاری اچھائیوں کے لیے معاف کرتی ہوں۔

دن کے آخر میں ہم تینوں ایک سے ہیں۔ میں "تم" زمر۔

کمزور چیونٹیاں جو ہمیشہ اپنے سے کئی گنا بڑے دشمن بناتی ہیں۔

فقط

علیشا کاردار۔

حنین کا چہرہ سفید تھا اور لب جامد۔ آنکھوں کی پتلیاں ساکت تھیں۔ کپکپاتے ہاتھ کاغذ پر جمے تھے۔ وہ بس شل بیٹھی بار بار ان الفاظ کو پڑھ رہی تھی۔ کسی نے گردن دبوچ کر اسے اپنی ہی ذہانت اور قابلیت کی تاریک سرنگ سے نکال کر حقیقت کے روشن کمرے میں لا کھڑا کیا تھا اور اس کمرے میں ہر طرف آئینے تھے اور ان میں نظر آتے سیاہ سفید عکس اس کے وجود کو کرچی کرچی کررہے تھے۔

باہر سے آتی ندرت' اسامہ' بی وی' سب کی آوازیں اس کے لیے لایعنی ہوچکی تھیں۔ وہ نمک کا مجسمہ بنی' اس کاغذ کو ہاتھ میں لیے فرش پہ بیٹھی تھی۔

میٹرک' ایف ایس سی کے رزلٹ کارڈ' بہترین طالبہ کے سرٹیفکیٹ' فلاں اور فلاں ایوارڈ' سب اس کے آس پاس ہی بکھرا تھا اور وہ ان سب جھوٹے کاغذوں کے ڈھیر میں ایک سچے پرچے کو پکڑے بیٹھی تھی۔

زندگی میں پہلی دفعہ حنین ذوالفقار یوسف خان نے خود سے سوال کیا' وہی جو وارث ماموں کے قتل کی رات فارس نے ہوٹل میں تب پوچھا تھا جب اس نے اس لونگ کا ذکر کیا تھا۔

"تم کون ہو حنین؟"

اور ارد گرد لگے آئینوں کی دیواریں کہہ رہی تھیں۔ ایک کمزور کا شکار کرنے والی غارت گر۔ ایک بے بس انسان کی جان لینے والی حنین!

✵ ✵ ✵

خود سے بھی کوئی ربط نہیں مرا ان دنوں
تجھ سے تعلقات کی تجدید کیا کروں

پبلک پراسیکیوشن آفس کی کھڑکی سے سرما کی دھوپ چھن کر آتی' میزوں پہ رکھی فائلوں کو چمکا رہی تھی مگر موسم سے بے نیاز زمر سنجیدگی سے بصیرت صاحب سے وہ پوچھ رہی تھی جو ان کو الجھا رہا تھا۔

"کیا آپ نے اس کیس میں کسی دوسرے مشتبہ شخص کو چیک کیا تھا؟"

"زمر! یہ رکھی ہیں ساری فائلز۔" انہوں نے جیسے ہاتھ اٹھا دیے۔ "اور آپ جس دن کہیں' میں یہ کیس آپ کو دینے کو تیار ہوں' اوپر بات کرلوں گا میں۔"

"مجھے یہ کیس فائلز نہیں دیکھنی' نہ یہ کیس چاہیے۔" وہ گویا کسی ناپسندیدہ شے سے دور ہٹی۔ "میں صرف اتنا جاننا چاہتی ہوں کہ کیا آپ نے اس کیس کی ویسے تفتیش کی تھی جیسے آپ کو کرنا چاہیے؟"

"کیا آپ کو فارس کے قاتل ہونے پہ شبہ ہے؟" وہ حیران تھے۔

"نہیں' مگر میرے خیالات سے فرق نہیں پڑتا۔ میں اس کیس کی پراسیکیوٹر نہیں ہوں' آپ ہیں۔ میں

وکٹم ہوں‘ دوسرا رخ نہیں دیکھنا چاہتی‘ مگر آپ کو ہر رخ دیکھنا چاہیے۔ میں یہ پوچھ رہی ہوں‘ کیا آپ نے کسی دوسرے suspect (مشتبہ شخص) کو چیک کیا تھا؟“

”ظاہر ہے‘ میں نے کیا تھا۔ ہر اس شخص کو جس کا کیس سے ذرا سا بھی تعلق بنتا تھا۔“ وہ پھر کوئی فائل اٹھانے لگے مگر زمر نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روک دیا۔

”مجھے کوئی فائل نہیں دیکھنی‘ میں نے خود کو اس کیس سے لاتعلق کر لیا ہے۔ مجھے بس زبانی بتا دیں‘ کیا آپ کو کوئی ایسی چیز ملی جو فارس کو بے گناہ ثابت کرتی ہو؟“ یہ کتنا تکلیف دہ تھا‘ مگر اسے کہنا تھا۔

”نہیں۔ کوئی بھی چیز کسی بھی دوسرے شخص کی طرف اشارہ نہیں کرتی تھی۔“

وہ چند لمحے‘ لب بھینچے ان کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔

”کیا آپ نے ہاشم کاردار کو چیک کیا تھا؟“ چند لمحے سناٹا چھا گیا۔ اسی وقت زمر کا فون بجا۔ حنین کی امی کا نمبر تھا۔ اس نے عجلت میں کال لی۔

”پھپھو؟“ وہ حنین تھی۔

”حنین! میں ذرا بزی ہوں‘ تھوڑا ٹھہر کر کال کرتی ہوں۔“ اور بصیرت صاحب کو دیکھا۔ اس کی توقع کے برعکس وہ بولے۔

”وہ ان پہلے لوگوں میں سے تھا جن کو میں نے چیک کیا تھا کیونکہ فارس کا اصرار تھا‘ یہ وارث کے قتل کو کور کرنے کی سازش ہے۔ تو ہو سکتا ہے کہ وارث غازی کے پاس ہاشم کا کوئی کیس ہو جس کو چھپانے کے لیے ہاشم نے اسے قتل کروایا ہو۔ مگر...“ انہوں نے فائل کھولی اور اس میں رکھے فوٹو اسٹیٹ صفحے کی طرف اشارہ کیا۔ زمر کی نگاہیں اس پہ جھکیں۔

”یہ ان تمام کیسز کی فہرست ہے جو وارث غازی کے پاس تھے۔ ان میں ہاشم یا اس کے باپ کا کوئی کیس شامل نہیں ہے۔“ زمر چند لمحے کے لیے چپ سی ہو گئی۔ وہ مسلسل کچھ سوچ رہی تھی۔

”ہم سب جانتے ہیں بصیرت صاحب! کہ ہاشم کتنا کرپٹ ہے۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اس کے خلاف نیب میں ایک کیس بھی نہ ہو؟“

”آپ غلط سمجھتی ہیں۔ غازی کے پاس اس کا کیس نہیں تھا۔ دوسرے اٹھارہ آفیسرز کے پاس اس کے بیسیوں کیسز زیر تفتیش ہیں۔“

”اوہ۔“ اس کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑے۔

”تو میں نے وارث کے موجودہ کیسز سے متعلقہ افراد کو چیک کیا۔ کسی کے خلاف کچھ نہیں ملا۔ میں نے ان تمام آفیسرز سے بھی فرداً فرداً بات کی جو ہاشم کے کیسز دیکھ رہے تھے اور مجھے یہ معلوم ہوا کہ ہاشم یا اس کے خاندان نے کبھی بالواسطہ ان لوگوں کو کوئی دھمکی نہیں دی۔ سب جانتے ہیں‘ نیب کیسز کا کچھ نہیں بنتا اور وہ ان کو ڈرا دھمکا کر یا رشوت دے کر ان کا منہ بند نہیں کرتا۔ بلکہ ان کو کورٹ میں لا کر بہت فخر سے اپنا دفاع کر کے ان کو خوار کیے رکھتا ہے۔ اگر تو ہاشم کا کوئی کیس وارث کے پاس ہوتا تو میں تب بھی فرض کر لیتا کہ ہو سکتا ہے۔ وارث کو کوئی ایسی بات معلوم ہوئی ہو جو ہاشم کے لیے نقصان دہ ہو‘ مگر اس کا تو سرے سے کوئی کھاتہ ہی وارث کی طرف نہیں کھلا۔“

زمر نے فائل بند کر کے پرے کر دی۔ اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔

”زمر۔ فارس غازی نے دو قتل کیے ہیں۔ اس نے یہ بات خود آپ سے کہی تھی‘ اس کو نہیں معلوم تھا کہ آپ بچ جائیں گی اور سب کو بتا دیں گی‘ اس لیے۔“

”مگر وہ مجھے ہسپتال دیکھنے آتا رہا تھا۔ میرے بیان سے پہلے۔ اس نے دوبارہ مجھے مارنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟“ پتا نہیں کیوں وہ اس کی طرف سے صفائی دینے کی کوشش کر رہی تھی۔

”اتنی سیکورٹی اور پولیس کی تعیناتی کے باعث وہ ایسی کوشش کرنے کی بے وقوفی کیسے کر سکتا تھا؟“ وہ الٹا حیران ہوئے۔ ”کیا آپ کو وہ بے گناہ لگنے لگا ہے؟“

”یہی تو سارا مسئلہ ہے۔ میرے نزدیک وہ گناہ گار ہے اور میں چاہ کر بھی کوئی ایسی وجہ نہیں ڈھونڈ پا رہی جو

اس کو ان جرائم سے بری کردے۔" وہ گہری سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

حنین ان کاغذوں کے ڈھیر کے بیچ ہنوز بیٹھی موبائل پہ نمبر ملا رہی تھی۔ پہلی دفعہ ہچکچاہٹ سے، پھر بے چینی سے پھر بے قراری سے اور اب دیوانگی سے بار بار زمر کا نمبر ملا رہی تھی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ اسے لگا وہ چند سال پیچھے چلی گئی ہے، جب چھت پہ اندھیرے میں بیٹھے، زمر نے نرم لہجے میں سیم اور اسے جنات کا قصہ سنایا تھا۔ تب اسے لگا تھا۔ جنات سے زیادہ طاقت ور انسان ہوتا ہے اور اس کے لیے وہ انسان زمر تھی، جو اس کا ہر مسئلہ حل کر سکتی تھی۔ اب بھی اسے یہی لگ رہا تھا۔ درمیان کے ماہ و سال اور ان کی تلخی کہیں کھو سی گئی تھی۔ صرف زمر تھی جس کو وہ اپنا مسئلہ بتا سکتی تھی اور زمر نے ساتویں کال اٹھا کر بس اتنا کہا۔

"حنین! میں بزی ہوں، تمہیں ذرا دیر تک کال کرتی ہوں۔" اور وہ خاموش آنسوؤں کے ساتھ فون ہاتھ میں لیے بیٹھی رہ گئی۔ کافی دیر بعد وہ بجا۔ اس نے دیکھا، زمر کا نمبر آرہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں غصہ اترا۔ ہتھیلی کی پشت سے آنکھیں رگڑیں اور کال اٹھائی۔

"ہاں... سوری میں اس وقت..." وہ نرمی سے کہنے لگی تھی، مگر اس نے درشتی سے بات کاٹی۔

"سوری مجھے کہنا چاہیے، غلطی سے کال کرلی تھی۔ کسی اور کو ملا رہی تھی، بائے۔" اور فون رکھ دیا۔ آنسو پھر سے بہنے لگے۔ اتنے سال بعد اس نے پہلی دفعہ زمر کو پکارا تھا، مگر وہ مصروف تھی۔ کیا اس کی مصروفیت حنین کی بھیگی رندھی آواز سے زیادہ اہم تھی؟ اس کا دل ٹوٹ سا گیا۔

زمر کی پھر سے کال آنے لگی، مگر حنین نے موبائل آف کر دیا۔

علیشا ٹھیک کہتی تھی۔ وہ جلد یا بدیر کوئی ایسا گناہ ضرور کرے گی، جس کا کفارہ اسے پوری زندگی دینا پڑے گا۔ بس علیشا کو یہ معلوم نہیں تھا کہ حنین وہ چند ماہ پہلے ہی کر چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

ہجر کی رات کاٹنے والے
کیا کرے گا اگر سحر نہ ہوئی

حنین کی ادھوری، ان کہی کال اس کے ذہن میں اٹک سی گئی تھی۔ اس صبح بھی وہ سماعت ختم ہوتے ہی کورٹ روم سے نکلنے کے بجائے کرسی پہ بیٹھ گئی اور ابا کو کال ملانے لگی۔ آج دھوپ نہیں نکلی تھی اور سرد کمرہ عدالت میں صبح بھی بتیاں جلی تھیں۔ جسٹس صاحب اپنے چیمبرز میں واپس جا رہے تھے، اہلکار احمر شفیع نامی لڑکے کو واپس لے جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ ہاشم پھر نہیں آیا تھا اور سب کا وقت ہی ضائع ہوا تھا۔ وہ اطراف میں نظریں دوڑاتی، ابا کو جاتی فون کی گھنٹی سن رہی تھی۔

"آپ نے پوچھا... ہے؟" ان کا سلام سنتے ہی وہ سر جھکائے مدھم سا پوچھنے لگی۔

"میں نے کال کی تھی، وہ جلدی میں تھی کہہ رہی تھی غلطی سے تمہیں کردی تھی کال۔ تم پریشان مت ہو کوئی بات نہیں ہے۔"

"اونہوں... کوئی بات تھی۔ وہ ٹھیک نہیں تھی۔ آپ دوبارہ پوچھنے کی کوشش کریں۔"

"تم خود اس کے گھر چلی جاؤ۔" اور ابا کی تان یہیں آکر ٹوٹا کرتی تھی۔ زمر نے "رہنے دیں ابا" کہہ کر کال کاٹی تو احساس ہوا، سفید شلوار قمیص میں کوئی اس کے سامنے آکھڑا ہوا ہے، چونک کر سر اٹھایا تو وہ احمر تھا۔ اہلکار بھی ساتھ تھے۔ زمر نے ادھر ادھر دیکھا، کمرہ خالی ہو رہا تھا۔

"میم!" وہ ملتجی، بے چین سا انگریزی میں کہنے لگا۔

"مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔"

"اپنے وکیل کے بغیر آپ کو مجھ سے بات نہیں کرنی چاہیے۔" نرمی سے کہتی وہ اٹھی۔ پرس کندھے پہ لٹکایا۔

"پراسیکیوٹر بصیرت کہاں ہیں؟ مجھے ان کا پوچھنا

ہے۔" کہہ کر اس نے پھر اہلکاروں سے درخواست کی کہ چند لمحے مزید اس کو بات کرنے دیں۔

"وہ ایک ہفتے کی چھٹی پہ گئے ہیں۔" وہ موبائل پرس میں ڈالتی جانے کو مڑی۔

"مجھے غازی کے بارے میں بتانا ہے۔ فارس غازی' وہ کچھ غلط کرنے جا رہا ہے۔"

زمر کے قدم منجمد ہوئے۔ آہستہ سے اس نے گردن موڑی۔ آنکھیں سکیڑ کر اچنبھے سے اسے دیکھا۔

"کیا؟"

"پہلے آپ وعدہ کریں کہ کبھی ظاہر نہیں کریں گی کہ یہ آپ کو مجھ سے معلوم ہوا ہے ورنہ فارس مجھے جان سے مار دے گا۔" پریشانی سے کہتا وہ آگے کو ہوا۔

"میں سن رہی ہوں۔" وہ غور سے اسے دیکھنے لگی۔

"اس نے کچھ پلان کیا ہے۔ اسے عدالت سے امید نہیں رہی تو وہ جیل میں کچھ لوگوں سے انتقام لینے جا رہا ہے۔ وہ کچھ ساتھیوں کے ساتھ جیل میں Riots (گڑبڑ) کرنے جا رہا ہے اور اس فساد میں کچھ لوگ جان سے بھی جائیں گے۔"

"کیا فارس نے خود کہا یہ؟"

"جی۔۔۔ یہ وہ تمام تفصیل ہے جو مجھے معلوم ہو سکی ہے۔ وہ مجھے بھی اس میں شامل کرنا چاہتا ہے مگر میں نے ابھی اسے حتمی جواب نہیں دیا۔" ساتھ ہی ایک مڑا تڑا کاغذ اس کی جانب بڑھایا۔ زمر نے کاغذ پکڑ کر کھوجتی نظروں سے اسے دیکھا۔

"مجھے پولیس پہ اعتبار نہیں ہے' کسی وکیل کو بتانا زیادہ بہتر لگا مجھے۔ آپ اس کو رنگے ہاتھوں پکڑوا سکتی ہیں۔ اب مجھے جانا چاہیے۔" جیسے کوئی اضطراب ختم ہوا۔ وہ پرسکون سا سانس لیتا اہلکاروں کے ہمراہ مڑ گیا۔ زمر کاغذ ہاتھ میں لیے کھڑی' سوچتی نظروں سے اس طرف دیکھتی رہی جہاں سے وہ گیا تھا۔

جب وہ اپنی حوالاتی کوٹھڑی تک واپس لایا گیا تو سہ پہر اتر چکی تھی۔ سپاہی نے سلاخوں کا دروازہ کھولا۔ وہ اندر آیا' تو دروازہ مقفل کر دیا گیا۔ احمر قدم قدم چلتا دیوار تک آیا اور پھر فرش پہ اکڑوں بیٹھ گیا۔ فارس چند قدم دور اسی طرح بیٹھا تھا۔ احمر قریب آیا تو اس نے غور سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔

"کہاں تھے؟" گردن موڑ کر اسے دیکھا جو قریب بیٹھا اپنے گھٹنوں کو دیکھ رہا تھا۔

"کچہری۔"

"معلوم ہے۔۔۔ مگر۔۔۔ کچھ اور بھی ہوا ہے کیا؟" وہ غور سے احمر کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

"وہی جو ہونا چاہیے تھا۔"

"بک بھی چکو۔" وہ اکتا گیا۔

احمر نے ہولے سے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"میں نے انہیں بتا دیا کہ آپ جیل میں riots شروع کرنے لگے ہیں۔"

چند لمحے کو کوٹھڑی میں سناٹا چھا گیا۔ فضا بوجھل ہو گئی۔

"اور؟ اس نے یقین کر لیا؟" فارس کے پوچھنے پہ احمر مسکرایا۔

"ایک ایک حرف پہ!" اور اس کے ہاتھ پہ ہاتھ مارا۔ دونوں ہلکے سے ہنس دیے۔ یہ وہ ان چند دفعہ میں سے تھا جب احمر نے اسے ہنستے دیکھا تھا۔

"گڈ!" پھر سے سنجیدہ ہوتے ہوئے فارس نے جیب سے مڑا تڑا کاغذ نکالا اور سامنے پھیلایا۔ پھر باہر دیکھا۔ اہلکار دور تھے۔ وہ مدھم آواز میں کہنے لگا۔

"جمعرات کی رات فیصلے کی رات ہو گی۔ اگر اس نے یقین کر لیا کہ ہم riots شروع کرنے لگے ہیں تو وہ لوگ جیل کے شمالی حصے پہ ادھر۔" نقشے پہ ایک جگہ انگلی رکھی۔ "اپنی نفری تین گنا بڑھا دیں گے۔ ایسے میں جنوب مشرقی دیوار پہ نفری کم ہو جائے گی۔ ہم فساد نہیں کریں گے۔ ہم اس طرف صرف آگ لگائیں گے۔ یہ ہمارا diversion ہو گا اور یوں ہم جنوب مشرقی حصے سے نکل جائیں گے۔"

"جانتا ہوں۔ ہم کوئی تین سو دفعہ اپنا منصوبہ دہرا چکے ہیں۔ اب تو میں خود کو آدھا جیل سے باہر تصور

کرنے لگا ہوں۔" وہ رکا۔ فارس جو کاغذ لپیٹ رہا تھا، قدرے چونکا۔

"ایک منٹ۔ تمہارے چہرے پہ کچھ اور بھی لکھا ہے۔" اس نے غور سے احمر کو دیکھا۔ "کوئی مسئلہ ہے کیا؟"

"وہ۔ دراصل۔" وہ اٹکا۔ پھر اٹھ کر چند قدم مزید دور جا بیٹھا۔ (کہ اگلی بات سن کر فارس غازی اس کا گریبان نہ پکڑ لے۔) اور کان کھجاتے ہوئے سادگی سے بولا۔ "پراسیکیوٹر بصیرت چھٹی پہ ہیں۔" فارس کو شاک لگا۔

"تو تم یہ ساری بکواس کس سے کر کے آئے ہو؟ میں نے کہا تھا، پولیس کو نہیں انوالو کرنا۔"

"وہ۔ چڑیل کو بتایا ہے۔"

اور اس کے گویا چودہ طبق روشن ہو گئے۔ "کیا بک رہے ہو؟ میں نے منع کیا تھا کہ۔۔۔" وہ غصے سے چلانا چاہتا تھا، مگر پہرے دار قریب آ رہے تھے۔ سو طیش بھری آواز ذرا دبائی۔ "اس سے کیوں کہا؟"

"اگر آپ اپنا غصہ ایک طرف رکھ کر میری بات سنیں تو زیادہ اچھا ہوگا۔ پوری کچہری میں سب سے زیادہ آپ کو سزا کون دلوانا چاہتا ہے؟ ظاہر ہے چڑیل۔ بصیرت صاحب شاید میری بات پہ کان ہی نہ دھرتے، مگر وہ دھرے گی، اسے اس سے بہتر موقع نہیں ملے گا، آپ کو سزا دلوانے کا اور پھر بصیرت صاحب تھے ہی نہیں، ہفتے بعد آئیں گے اور ہفتے بعد ان سے کیسے ملوں گا؟ اگر درخواست کروں ملنے کی تو ان کو شک نہیں ہوگا کیا کہ اتنے علی الاعلان کیوں کر رہا ہوں؟ میرے پاس صرف آج کا دن تھا، اور میں نے وہی کیا جو بہتر لگا۔"

"اس کو استعمال کر کے جیل نہیں توڑنا مجھے۔" وہ ناگواری سے غرایا۔ "اس طرح تو وہ ساری عمر یہی سمجھے گی کہ میں مجرم تھا۔"

"جب آپ جیل توڑیں گے تو سب یہ ہی سمجھیں گے، پھر مسئلہ کیا ہے؟"

اور فارس چپ ہو گیا۔ دونوں ہاتھوں میں سر تھاما۔ آنکھیں بند کر کے کنپٹی مسلی۔

"یہ ٹھیک نہیں ہے۔ میں اس کو استعمال نہیں کرنا چاہتا۔"

"کیوں؟" دور بیٹھے احمر نے پتلیاں سکیڑ کر اس کا چہرہ تکا۔ "آپ دونوں کے درمیان کچھ رہا ہے کیا؟"

اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ آنکھوں میں ناگواری آئی۔ "بالکل بھی نہیں۔"

"اچھا سوری، مجھے یوں ہی لگا۔"

"کیا لگا؟" اس کا سانس رک گیا تھا۔

"نہیں دراصل۔ اتنا کچھ ہو جانے، اتنے سال گزر جانے، آپ سے اتنی نفرت ہونے اور آپ کے خلاف ہر جگہ بیان دینے کے باوجود بھی جب آپ اس کا ذکر سنتے ہیں تو کچھ آتا ہے آپ کے چہرے پہ، اور پھر چڑیل بھی۔ سوری۔ وہ بھی ابھی تک آپ کو فارس کہہ کر بلاتی ہے۔ اس نے ہر چیز کے بعد بھی First Name Terms ختم نہیں کیں۔"

"ایسے کسی عورت کا نام نہیں لیتے، ہر وقت بک بک نہ کیا کرو، دماغ گھوما ہوا ہے میرا اس وقت۔"

اس نے درشتی سے ڈپٹ کر رخ پھیر لیا۔ احمر کو اب اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا، سو شانے اچکا کر رہ گیا۔

"اچھا سوری۔ غلطی سے کہہ دیا خیر۔" پھر آرام سے لیٹ گیا، بازوؤں کا تکیہ سر تلے رکھا۔ "آپ باہر جا کر کیا کریں گے؟ میں تو امریکہ بھاگ جاؤں گا۔ یہاں تو نوکری کر نہیں سکتا اب۔" وہ بولے جا رہا تھا اور فارس چہرہ موڑے دیوار کو دیکھ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

آپ لوگوں کے کہے پر اکھڑ جاتے ہیں۔
لوگ تو جھوٹ بھی سو طرح کے گھڑ جاتے ہیں۔

عین اس وقت جب وہ دونوں اس کوٹھڑی میں یوں بیٹھے تھے، چند میل دور کاردارز کی کمپنی کے ٹاپ فلور کی راہ داری میں زمر ایک بینچ پہ بیٹھی تھی۔ دونوں ہاتھوں میں کافی کے دو ڈسپوزیبل گلاس تھے۔ ایک

سے وہ کچھ سوچتے ہوئے وقفے وقفے سے گھونٹ بھر رہی تھی۔ دوسرے کا ڈھکن بند تھا۔ نگاہیں راہداری میں گزرتے لوگوں پہ جمی تھیں۔ دفعتاً" وہ کھڑی ہوئی' کیونکہ دوسری جانب سے ہاشم چلتا آرہا تھا۔ ایک ہاتھ میں بریف کیس' دوسرے میں پکڑے موبائل پہ بٹن دباتا۔ زمر کے قریب وہ رکا' پہلے اس کے پیر دیکھے' پھر نظریں اٹھائیں۔ وہ بند ڈھکن کا گلاس اس کی طرف بڑھائے ہوئے کھڑی تھی۔ ہاشم کھل کر مسکرایا۔

"بغیر چینی کے؟" گلاس پکڑتے ابرو اٹھائی' زمر نے سر کو خم دیا۔

"بغیر چینی کے!" اور دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

"ویسے آپ تو شہر سے باہر گئے ہوئے تھے؟"

"آپ مجھ سے سماعت پہ غیر حاضری کی بازپرس کرنے نہیں آئیں' جانتا ہوں' وہ کام بتائیے جو آپ کو ادھر کھینچ لایا؟" وہ گھونٹ بھرتے ہوئے مسکرا کر پوچھ رہا تھا۔ دونوں ہاشم کے آفس کی سمت جارہے تھے۔

"کچھ دیر کے لیے میرے ساتھ احمر شفیع کا وکیل بنے بغیر بات کرسکتے ہیں؟"

"میں سن رہا ہوں۔"

"احمر کتنا قابل بھروسا انسان ہے؟"

"کافی حد تک۔" ہاشم نے شانے اچکائے۔ "میرے والد کے ساتھ اس نے کافی عرصہ کام کیا۔ گو کہ میں اسے پسند نہیں کرتا' مگر وہ ایک قابل اعتبار انسان ہے' کیوں؟" اب غور سے ساتھ چلتی زمر کو دیکھا۔ "کیا اس کی کسی بات پہ بھروسا کرنے میں آپ کو دقت پیش آرہی ہے؟"

ہاں۔ وہ اچھا لڑکا ہے' مگر ہوا کیا ہے؟" دونوں اب آفس کے دروازے کے سامنے کھڑے تھے۔

"آپ کافی ختم کیجیے۔" وہ مسکرا کر مڑ گئی تو ہاشم نے پیچھے سے پکارا۔

"میں اس مشورے کے بدلے میں ضرور کوئی فیور مانگوں گا۔"

"آپ کب بدلہ نہیں مانگتے؟" وہ رکے بنا آگے چلتی گئی۔

"وہ ٹیپ آپ کو کہاں سے ملی؟" ہاشم نے عقب سے پکارا۔ زمر بیچ راہداری میں رکی۔ ایڑیوں پہ گھومی۔ اچنبھے سے اسے دیکھا۔

"کون سی ٹیپ؟"

"آپ کی اور فارس کی کال جو عدالت میں پیش کی گئی۔ سعدی نے بتایا کہ وہ آپ نے نکلوا کردی تھی۔" گھونٹ بھرتے ہوئے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔

"یہ سعدی نے کہا؟" وہ حیرت زدہ رہ گئی۔ ہاشم قدرے چونکا۔ ابرو سکیڑے۔

"کیا آپ نے نہیں نکلوا کردی؟ کیا اس نے جھوٹ بولا؟"

"وہ جھوٹ کیوں بولے گا؟ ظاہر ہے میں نے ہی نکلوا کردی ہے اور کہاں سے نکلوائی ہے' یہ نہیں بتاؤں گی۔ مگر مجھے حیرت ہے کہ اس نے آپ کو کیوں بتایا' میں نے منع کیا تھا۔" وہ زمر تھی' فوراً" سنبھل گئی اور ناپسندیدگی سے بات مکمل کرکے پلٹ بھی گئی۔ ہاشم کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑے۔ اگر زمر کے ہاتھ آڈیو لگی ہے اور اس کے باوجود وہ فارس کو گناہ گار سمجھتی ہے تو پھر کوئی مسئلہ نہیں' وہ بھی خوامخواہ خاور کی بات پہ ابھی تک اٹکا تھا۔ اونہوں۔ سر جھٹک کر' کافی کا گلاس پکڑے' وہ اندر کی جانب بڑھ گیا۔

☼ ☼ ☼

فصیل جسم پہ تازہ لہو کے چھینٹے ہیں
حدود وقت سے آگے نکل گیا کوئی

وہ رات قصر کاردار پہ یوں اتری کہ اپنے اندر ڈھیروں خوف ناک بھید چھپائے ہوئے تھی۔ دور جنگل سے جانوروں کے بولنے کی آوازیں' پرندوں کی سہمی ہوئی چہکار اور پھر ہر سو طاری ہوجانے والا موت کا سناٹا۔ سب اس رات میں گم سا ہوگیا تھا۔

لونگ روم میں ٹی وی چل رہا تھا اور ہاشم صوفے پہ نیم دراز' پیر میز پہ رکھے' ٹی وی اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔ سونیا اس کے کندھے پر سر رکھے ترچھی لیٹی' کسی

کتاب کے صفحے الٹ رہی تھی۔ شیریں جاچکی تھی اور چند دن تک سونی ادھر ہی تھی اور اب وہ دونوں باپ' بیٹی وہاں اکٹھے بیٹھے تھے۔ اس بات سے یکسر بے خبر کہ ان کے دائیں سمت' اورنگ زیب اور جواہرات کے کمرے کے بند دروازے کے پیچھے کیا ہو رہا تھا۔

کمرے کے اندر مدھم زرد بتیاں جلی تھیں۔ جواہرات نائٹ گاؤن میں ملبوس' بیڈ کے ساتھ کھڑی' حیران پریشان سی ایک فائل کے صفحے پلٹ رہی تھی۔ باتھ روم کا دروازہ کھلا تھا۔ اندر تیز سفید روشنی میں اورنگ زیب کھڑے شیو بنا رہے تھے۔ (ان کو رات کو شیو بنانے کی عادت تھی۔) بلیڈ گال پہ پھیرتے ذرا وقفہ دیا اور گردن موڑ کر جواہرات کو دیکھا جو ہنوز شاک کے عالم میں فائل دیکھ رہی تھی۔

"اب اپنا میلوڈرامانہ شروع کر دینا۔ میں فیصلہ کر چکا ہوں اور اسے نہیں بدلوں گا۔"

"اورنگ زیب!" اس نے سفید پڑتا چہرہ اٹھایا اور بے یقینی سے باتھ روم میں کھڑے اپنے شوہر کو دیکھا۔ "تم ایسا کیسے کر سکتے ہو' وہ تمہارا بیٹا ہے۔"

"جس نے مجھے بے وقوف بنا کر پیسے ہتھیانے کی کوشش کی' کم از کم وہ میرا بیٹا کہلانے کے لائق نہیں۔" تنفر سے کہتے ریزر جھاگ لگے گال پہ پھیرا۔

"تم نے اس کے اکاؤنٹس فریز کر دیے' میں چپ رہی۔ اس سے بات نہیں کر رہے' میں چپ رہی۔ مگر تم اس کی کمپنی اس سے واپس لے رہے ہو' تم اس کو قلاش کر رہے ہو' میں اس پہ چپ نہیں رہوں گی۔" وہ غصے سے پھنکاری تھی۔

"اپنی معلومات میں مزید اضافہ کر لو۔" آئینے میں خود کو دیکھتے اورنگ زیب نے ٹھوڑی پہ ریزر پھیرا۔ "میں اس کو یہاں سے بھیج رہا ہوں۔ مجھے وہ اپنے ارد گرد برداشت نہیں ہے۔"

"وہ تمہارا بیٹا ہے۔" وہ چلائی' ساؤنڈ پروف دیواروں نے تمام آوازیں دبا لیں۔ باہر لاؤنج میں بیٹھے ہاشم اور سونیا بے خبری وی دیکھتے رہے۔ باتھ روم کے عین اوپر' ہاشم کی بالکونی میں کھڑی پودوں کو پانی دیتی میری ابنجو بھی بے خبر گنگناتی ہوئی پانی دیتی رہی۔

"اس لیے اسے اب عرصہ تک میرے بغیر رہنا ہو گا۔ خود کمائے گا' خود کھائے گا۔"

"یہ سزا ہے' یہ انتقام ہے۔"

"تم چاہو تو اپنے بیٹے کے ساتھ جا سکتی ہو۔" اس بات پہ جواہرات نے مٹھیاں بھینچ لیں۔

"تم ہوتے کون ہو مجھے یہاں سے نکالنے والے؟" وہ سرخ آنکھوں کے ساتھ غرائی تھی۔

"میں اس گھر کا مالک ہوں۔"

"تم ایک احسان فراموش' بے حس اور گھٹیا انسان ہو۔" وہ حلق کے بل چلائی تھی۔ سانس بے ترتیب ہو رہا تھا اور آنکھیں لال۔

اورنگ زیب کے کان سرخ ہوئے' غصے سے اسے دیکھا۔ وہی غصہ جو ورثے میں نوشیرواں اور فارس نے لیا تھا۔

"اپنے کام سے کام رکھو اور اپنے بیٹے سے کہو کہ کاغذات پہ دستخط کر دے' ورنہ مجھے دوسرے طریقے بھی آتے ہیں۔"

"تم ایسا نہیں کرو گے۔" وہ چوکھٹ پہ ہاتھ سختی سے جمائے' اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غرائی۔ "ہاشم ایسا نہیں ہونے دے گا۔"

"میں مالک ہوں' ہاشم نہیں۔ تمہارے بیٹے کیا' میں تمہیں بھی ہر شے سے بے دخل کر سکتا ہوں۔"

"تمہاری سوچ ہے۔" اس نے نفرت سے انہیں دیکھا۔

"نوشیرواں اب ادھر نہیں رہے گا۔ میری طرف سے وہ آزاد ہے۔ جیسے میں نے محنت کر کے کمایا' وہ بھی کما لے۔"

"محنت؟ اونہہ۔ میرے باپ کے ٹکڑوں پہ پلنے والے ہو تم! یہ سب میرے باپ کا تھا' تم اپنے ساتھ نہیں لائے تھے۔" وہ شدید حقارت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ اورنگ زیب غصہ ضبط کیے اسے دیکھتے رہے' پھر سر کو اثبات میں ہلایا۔

"میں مزید کیا کر سکتا ہوں' بتاؤں تمہیں؟ میں

علیشا کو اس گھر میں لا سکتا ہوں۔ بلکہ اچھا کیا' تم نے فیصلے میں میری مدد کر دی۔ ہاشم تو ویسے بھی اس کی کمپنی دینے کا سوچے ہوئے ہے' وہ اس فیصلے سے بہت خوش ہو گا۔" اس کو مزید اشتعال دلا کر وہ دوبارہ آئینے میں دیکھتے' شیو کرنے لگے اور چوکھٹ میں کھڑی' نائٹ گاؤن میں ملبوس جواہرات کا پورا جسم جل کر بھسم ہو گیا۔

لب بھینچے' گہرے گہرے سانس لیتی' سرخ دہکتی آنکھیں اورنگ زیب پہ جمائے کھڑی اس زخمی شیرنی کے اندر ایک جوار بھاٹا سا اٹھنے لگا۔ برسوں کا دیا لاوا ابلنے لگا۔ اتنا زیادہ کہ اس کے تیز ہوتے تنفس کی آواز اورنگ زیب کو بھی آنے لگی۔ نظریں موڑ کر اسے اسی حقارت سے دیکھا۔

"اپنی بدصورت شکل لے کر تم بھی یہاں سے چلی کیوں نہیں جاتیں؟"

"کون کہاں جائے گا' یہ فیصلہ اب میں کروں گی؟" نفرت سے کہتی وہ پیچھے ہٹی۔ "میں ساری عمر تمہاری ہر بری بات برداشت کرتی رہی' لیکن تم مجھے اور میرے بیٹے کو یہاں سے بے دخل کرنا چاہتے ہو۔ اب تم دیکھو کہ میں کیا کرتی ہوں۔" وہ پیچھے ہٹتی گئی یہاں تک کہ ڈریسنگ ٹیبل تک آ رکی۔ وہاں سامنے اس کا ہیئر Straigtening آئرن راڈ رکھا تھا۔ وہ کوئی عقل و خرد سے بے گانہ لمحہ تھا جب اس نے راڈ اٹھائی اور کمر کے پیچھے کرلی۔ پھر قدم قدم چلتی باتھ روم کی چوکھٹ تک آئی۔

اورنگ زیب کے آدھے چہرے پہ ابھی فوم تھا۔ گال پہ کوئی کٹ لگا جس کو صاف کرنے کے لیے وہ ٹشو لینے نیچے جھکے' تب ہی ان کی جھکی گردن کے پیچھے' آئینے میں جواہرات کا چہرہ ابھرا۔ نفرت اور غضب سے بھری آنکھوں سے پر چہرہ۔۔۔ اورنگ زیب ٹشو اٹھا کر سیدھے ہوئے تو ٹھٹکے۔ مگر۔۔۔

جواہرات نے پوری قوت سے آئرن راڈ ان کے سر کی پشت پہ ماری۔ وہ لڑکھڑائے اور دائیں جانب جا گرے۔ ٹائلز کے فرش پہ پہلو کے بل' کہنی کے بل' ایک کٹ کنپٹی پہ لگا اور پھر سیدھے ہوئے۔ جہاں جواہرات نے مارا تھا وہ جگہ فرش سے آ لگی۔ خون نکل نکل کر بہنے لگا۔

جواہرات' ہاتھ میں آئرن راڈ پکڑے' ان ہی نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی اور وہ اس کے قدموں کے پاس بے یقین سے گرے پڑے تھے۔

"جا۔۔۔ جوا۔۔۔" الفاظ اٹک کر نکلے۔ درد سے بولنے کی کوشش کی' اپنا ہاتھ اٹھا کر بڑھانا چاہا کہ وہ ان کو تھامے' تھام کر اٹھائے' مگر وہ چوکھٹ پہ کھڑی رہی۔ لب بھینچے' شعلہ بار نظروں سے انہیں دیکھتی۔

غریبی میں اور امیری میں۔۔۔
بیماری میں اور صحت میں
ہم ساتھ رہیں گے۔
حتیٰ کہ موت ہم کو جدا کر دے۔

اور وہ ان کے ساتھ ہی کھڑی تھی' مگر موت ابھی جدا کرنے نہیں آ رہی تھی۔ گہرے گہرے سانس لیتے اورنگ زیب کا خون نکلنا رک گیا تھا۔ چوٹ شدید تھی' مگر جان لیوا نہیں' انہوں نے ہتھیلی کے بل اٹھنے کی کوشش کی۔ جواہرات چونکی' پھر فوراً پیچھے ہوئی۔ واپس کمرے میں آئی۔ صوفے پہ رکھا کشن اٹھایا۔ واپس اورنگ زیب تک آئی۔ وہ اٹھنے کی ناکام کوشش اور تکلیف کے احساس سے ہانپنے لگے تھے۔ ان کے سر کے قریب' وہ گھٹنوں کے بل بیٹھی اور کشن ہاتھ میں پکڑے' ان کے اوپر جھکی۔

"مجھے تمہارے ساتھ یہ بہت پہلے کرنا چاہیے تھا۔" کشن اورنگ زیب کے منہ پہ جما کر دبایا' یوں کہ آنکھیں کشن سے باہر تھیں اور ان آنکھوں میں بے پناہ بے یقینی اتر آئی۔ وہ بے اختیار اپنے بے جان ہاتھوں سے اس کی انگلیاں ہٹانے کی کوشش کرنے لگے۔ چیخیں' آوازیں' سب کشن کے اندر دب گئیں۔ وہ چہرہ ان کے کان کے قریب کیے کہہ رہی تھی۔

"کیا تم جانتے ہو میں نے اور ہاشم نے تمہارے لیے کیا کچھ کیا؟"

ہولے سے کہتے اس نے کشن مزید زور سے دبایا۔ مزاحمت کرتے اورنگ زیب اس کے ہاتھ کو پکڑے پاؤں ادھر ادھر مار رہے تھے۔

”ہم نے وہ کیا تھا جس کا الزام فارس کو لینا پڑا۔ ہاشم نے مروایا تھا ان دو لوگوں کو۔ کیا تم نے؟ تمہارا بھانجا بے گناہ تھا۔ کیا تم نے سنا؟ ہاشم نے کیا تھا یہ سب اور میں بھی اس میں شامل تھی۔ کیا تم نے سنا؟“

اورنگ زیب کے پاؤں ساکت ہو گئے تھے۔ جواہرات کے ہاتھوں کو ہٹاتے ہاتھ بھی ٹھہر گئے تھے۔ جواہرات نے چہرہ اٹھا کر دیکھا' ان کی بے یقینی اور دکھ سے پھیلی آنکھیں ساکت تھیں۔ سانس نکل چکا تھا' مگر کیا آخری بات انہوں نے سنی تھی؟ کیا پہلے سانس نکلا تھا یا پہلے دل نے صدمے سے کام کرنا چھوڑا تھا؟

اس نے کشن ہٹایا۔ چونکہ ان کے سر سے نکلتا خون فرش پہ دوسری طرف کو جا رہا تھا۔ سو جواہرات کے کپڑوں پہ خون کا کوئی نشان نہیں لگا تھا۔ وہ آہستہ سے کھڑی ہوئی۔ اورنگ زیب کی کھلی آنکھیں' کھلے لب اور بے حس و حرکت وجود اس کے قدموں میں پڑا تھا۔ ایک ہاتھ میں اسٹریزر راڈ اور دوسرے میں کشن لیے کھڑی جواہرات کے سنگ دل چہرے کے رنگ بدلنے لگے۔ ایک دم چونک کر اس نے ادھر ادھر دیکھا۔

وہ باتھ روم میں کھڑی تھی۔ اس نے اپنے شوہر کو قتل کر دیا تھا اور اس کا بیٹا چند قدم دور دیوار کے پار موجود تھا۔

”اوہ خدایا۔“ وہ بدک کر پیچھے ہٹی۔ ہراساں نظروں سے اورنگ زیب کی لاش کو دیکھا۔ اس کے چہرے پہ پسینہ آنے لگا تھا۔ اوہ خدا۔۔۔ اب وہ کیا کرے؟

جواہرات سینے پہ ہاتھ رکھے' اپنی بے ترتیب دھڑکنیں سنتی کتنی دیر دیوار سے لگی کھڑی' تیز سانسیں لیتی رہی۔ بمشکل اعصاب بہتر ہوئے تو وہ باتھ روم سے نکلی۔ کمرے کے دروازے تک آئی۔ اسے ذرا سا کھولا۔ درز سے باہر صوفے پہ بیٹھے ہاشم اور سونیا نظر آئے۔ اس نے جلدی سے دروازہ بند کر کے لاک کر دیا۔ وہ اس کا ہر مسئلہ سنبھال لیا کرتا تھا۔ مگر آج وہ ہاشم کو نہیں بلا سکتی تھی۔ اسے جو کرنا تھا' خود کرنا تھا۔

کشن اور آئرن راڈ اورنگ زیب کی لاش کے ساتھ ہی گرے تھے۔ وہ تیزی سے اندر آئی' خون کے تالاب سے پیر بچاتی وہ دونوں چیزیں اٹھائیں' ڈریسنگ روم کی وارڈروب کھولی' اوپری خانے میں پیچھے کر کے ان کو گھسایا' الماری بند کر کے لاک کی اور پھر مڑی تو بیڈ کنارے گری فائل نظر آئی۔ وہ جو فساد کی جڑ تھی۔ پھرتی سے اس کو بھی دراز میں گھسایا۔ پھر آگے آئی۔ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔

ریشمی گاؤن کندھوں سے ڈھلک رہا تھا' چہرہ سفید تھا' بالکل مردہ اور آنکھیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ اس کی آنکھیں ناقابل بیان تھیں۔ ان کی کیفیت لفظوں میں نہیں سما سکتی۔

وہ باتھ روم میں داخل ہوئی۔ سنک کے اوپر کھڑے نل کھولا۔ چہرے پہ پانی ڈالا۔ پھر اسے تولیے سے تھپتھپایا۔ قدرے سکون آیا۔ سنک کے مرمریں پتھر پہ ہاتھ رکھے۔ اس نے نیچے دیکھا۔ اورنگ زیب کی کھلی آنکھوں والی لاش ہنوز پڑی تھی۔

اب اسے کیا کرنا تھا؟ یہ۔۔۔ یہ اس نے نہیں کیا تھا۔ یہ صرف اور صرف ایک حادثہ تھا اور اسے حادثہ کیسے بنانا تھا؟

جواہرات کا دماغ تیزی سے کام کرنے لگا۔ اس نے پہلے باتھ روم کے دوسرے دروازے کو دیکھا جو پچھلے برآمدے میں کھلتا تھا اور پھر واپس کمرے میں آئی۔ کمرے کا بھی ایک دروازہ پچھلے برآمدے میں کھلتا تھا۔ جواہرات نے اس دروازے کی چٹخنی گرا دی اور پھر سے باتھ روم میں آئی۔ دروازہ اندر سے بند کیا۔

”یہ اس طرح اورنگ زیب نے لاک کیا ہو گا' پھر وہ شیو بنانے لگے ہوں گے۔“ اس نے بڑبڑاتے ہوئے شیو کے سامان کو سنک کے سلیب پہ پھیلایا۔ ریزر اورنگ زیب کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گرا تھا۔ اس نے وہ اٹھا کر ان کے ٹھنڈے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ

ان کا چہرہ دیکھنے سے احتراز برت رہی تھی۔

"اور شیو کے دوران انہوں نے نہیں دیکھا کہ یہ ٹونٹی لیک ہو رہی ہے۔" کہتے ہوئے سنک کے نیچے جھکی' وہ نیچے سے کھلا تھا۔ اس نے پائپ میں ریزر سے ہلکا سا کٹ لگایا۔ پانی دھار کی صورت ٹپکنے لگا۔ وہ اس طرف جا رہا تھا جہاں اورنگ زیب کا وجود گرا پڑا تھا۔

"اور پھر اس پانی سے وہ پھسل گئے' سر پہ چوٹ لگی اور..." بڑبڑاہٹ روکی' ان کی لاش کے ایک طرف سے احتیاط سے پھلانگ کر وہ باتھ روم کے دوسرے دروازے تک آئی جو برآمدے میں کھلتا تھا۔

اس نے سوچا کہ ایک آخری نظر مڑ کر اورنگ زیب کو دیکھے۔ مگر... وہ پلٹے بنا دروازہ کھول کر باہر آئی اور اسے احتیاط سے اپنے پیچھے بند کیا۔

باہر سرد ہوا ہر سو چل رہی تھی۔ ریشمی گاؤن کو خود پہ لپیٹتے' اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اس طرف سی سی ٹی وی کیمرے نہیں تھے۔ آس پاس کوئی ملازم بھی موجود نہیں تھا۔ وہاں اندھیرا اور سردی تھی۔ نیچے فارس کی انیکسی بھی اندھیرے میں ڈوبی دکھائی دیتی تھی۔

جواہرات سے چند قدم کے فاصلے پہ کمرے کا دروازہ تھا۔ جس کی چٹخنی اس نے اندر سے گرا رکھی تھی۔ سینے پہ بازو لپیٹے' سر جھکائے' وہ دروازے کی طرف جا رہی تھی' جب...

"مسز کاردار..." آواز پہ وہ کرنٹ کھا کر اچھلی' ادھر ادھر دیکھا۔ پھر... گردن اٹھائی۔ اوپر ہاشم کی بالکونی میں پودوں کو پانی دیتی میری جھکی کھڑی تھی۔

"آپ اتنی ٹھنڈ میں باہر ہیں۔ کیا میں آپ کو شال لا دوں؟"

وہ فکرمندی سے کہتی پانی کی بکٹ رکھنے لگی۔ جواہرات نے سفید پڑتے چہرے پہ بمشکل مسکراہٹ لانے کی کوشش کی۔

"نہیں... میں اندر جا رہی ہوں۔ یہ پودے دیکھنے آئی تھی۔" برآمدے میں قطار میں رکھے پودوں کی طرف اشارہ کیا۔ خوامخواہ کی وضاحت۔

"میں نے ان کو وقت پہ پانی دے دیا تھا۔"

"اوکے... تم ایسا کرو اورنگ زیب کے لیے کافی بنا دو۔ وہ ابھی شاور لیں گے' سو پندرہ بیس منٹ تک لے آنا۔" اور پھر بدقت مسکرائی۔ سانس ابھی تک اٹکا تھا۔ میری نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اورنگ زیب صرف اس کے ہاتھ کی کافی پیتے تھے۔ جواہرات کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آئی اور پھر پشت دیوار سے لگا کر آنکھیں بند کیے گہرے سانس لینے لگی۔

میری نے کچھ نہیں دیکھا' میری نے کچھ نہیں دیکھا۔ اس نے خود کو تسلی دی۔ پھر ڈریسنگ ٹیبل کی طرف آئی۔ اسٹول پہ بیٹھی۔ اسفنج اٹھایا۔ چہرے پہ پاؤڈر کیا۔ آنکھوں میں مسکارا اور ہونٹوں پہ ہلکی سی لپ اسٹک... مسکرانے کی کوشش کی۔ کیا وہ بہتر لگ رہی تھی یا اس کی آنکھیں ابھی تک کھوکھلی دکھ رہی تھیں؟

گاؤن کی ڈوری کسی اور موبائل اٹھائے وہ باہر نکلی۔ ہاشم اور سونیا بدستور اسی طرح بیٹھے تھے' ٹی وی چل رہا تھا۔

"ہاشم! میرا جی میل نہیں کام کر رہا۔ کیا تم اسے فکس کر دو گے۔" فکرمندی سے کہتے موبائل اس کی طرف بڑھایا۔ وہ جو ابھی ماں کے چہرے کو دیکھ بھی نہ پایا تھا۔ نگاہیں موبائل پہ جھکا دیں اور اسے اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

"کیا مسئلہ ہے۔" اسکرین پہ انگلی چلاتا دیکھنے لگا۔ جواہرات اس کے قریب صوفے پہ بیٹھی' ٹانگ پہ ٹانگ جمائی' انگلیاں باہم ملائیں گویا ان کی لرزش روکنے کی سعی کی۔

"میلز سینڈ نہیں ہو رہیں۔ اپنے اکاؤنٹ کی طرف کچھ بھیج کر دیکھو۔"

"اوکے..." وہ ٹائپ کرنے لگا۔ "یہ ہاشم ہے مام کے فون سے۔" لکھا اور اپنے ای میل پہ بھیجا۔

"چلی گئی... شاید کوئی وقتی ایرر ہو۔" مسکرا کر کہتے موبائل اس کی طرف بڑھایا۔ جواہرات نے بدقت مسکراتے اسے تھاما۔ وہ پھر سے ٹی وی دیکھنے لگا۔

"تمہاری اپنے ڈیڈ سے کوئی بات ہوئی؟"

"شیرو کے بارے میں؟ نہیں میں ان کے غصے کے ٹھنڈے ہونے کا انتظار کرنا چاہتا ہوں؟"

"علشبا کے بارے میں۔۔۔" وہ ذرا توقف کے بعد اٹک اٹک کر کہنے لگی۔ نگاہیں ٹی وی اسکرین پہ جمی تھیں۔ "تم اس کی فیس دینے لگے ہو، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اپنے ڈیڈ سے ایک دفعہ کھل کر بات کرلو۔ کیا پتا وہ خود بھی دل سے یہ ہی چاہتے ہوں اور اسی بہانے شیرو کو معاف کردیں۔" بولتے ہوئے اسے لگا اس کی گردن پہ پسینہ آرہا ہے اور شاید ہتھیلیوں کے اندر بھی۔ دل بھی دھک دھک کررہا تھا۔

ہاشم آنکھیں ٹی وی پہ جمائے چند لمحے خاموش رہا۔

"اب نہیں دے رہا فیس، ضرورت نہیں رہی۔"

وہ چونکی۔ "کیوں؟"

"اس نے پیسے کے لیے جرم کیا، اب جیل میں ہے اور یونی ورسٹی جانے کی ضرورت نہیں رہی۔"

جواہرات دم سادھے اسے دیکھے گئی۔ اسے یوں لگا آنسو آنکھوں سے ابلنے کو بے تاب تھے، مگر اس نے انہیں نگل لیا۔

"آئی۔۔۔ آئی ایم سوری!" ہاشم نے بس سر کو خم دیا اور اسکرین کی طرف دیکھتا رہا۔

وہ دونوں کچھ نہیں بولے، حتیٰ کہ میری کافی کی ٹرے اٹھائے آئی۔

"سوری! مجھے دیر ہوگئی، میرے بیٹے کا فون آگیا تھا۔" وہ عادتاً وضاحت دیتی کمرے کی جانب بڑھی۔

"کاردار صاحب سے کہنا باہر آجائیں، ہاشم نے ان سے کچھ بات کرنی ہے۔" جواہرات نے پکارا۔ وہ سر ہلا کر اندر چلی گئی۔ چند ہی لمحوں بعد باہر نکل آئی۔

"سر باتھ روم میں ہیں، میں نے کافی ٹیبل پہ رکھ دی ہے۔"

جواہرات نے (ہاتھوں کی نمی مٹھی میں چھپاتے) تعجب سے اسے دیکھا۔

"ابھی تک نکلے نہیں؟ شاید شیو بنانے لگے ہوں۔ اوکے۔ تم جاؤ۔" اور جیسے سر جھٹک کر خود ہی مطمئن ہوگئی۔

"میں ان سے ابھی اس موضوع پہ بات نہیں کرنا چاہتا۔" کافی دیر بعد وہ بولا۔ دیکھ ہنوز ٹی وی کو رہا تھا۔

"مگر تمہیں کرنی چاہیے۔" وہ نرمی سے بولی۔ تو ہاشم چپ رہا۔ چند منٹ یوں ہی بیٹھا سوچتا رہا، پھر اٹھا۔

"اوکے۔۔۔" پھر اورنگ زیب کے کمرے کی جانب بڑھا۔ جواہرات کا میک اپ سے ڈھکا چہرہ سفید پڑنے لگا۔ زور سے صوفے کی گدی مٹھی میں بھینچی۔ سانس روکے ہاشم کو اندر جاتے دیکھا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ کمرہ خالی تھا۔ کافی میز پہ دھری تھی۔ ادھر ادھر گردن گھمائی۔ باتھ روم کا دروازہ بند تھا۔ ہاشم واپس پلٹ آیا۔ چوکھٹ میں ایک دم وہ ٹھہرا۔ جواہرات اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"ڈیڈ کتنی دیر سے اندر ہیں؟"

"کیا ابھی تک نہیں نکلے؟" وہ بے اختیار کھڑی ہوئی۔ چہرے پہ در آئی پریشانی چھپا نہیں سکی۔

"وہ اتنی دیر کبھی بھی نہیں لگاتے۔" ہاشم ایک دم مڑا اور باتھ روم کے دروازے تک آیا۔ اسے کھٹکھٹایا۔ پہلے ہلکا۔ "ڈیڈ؟" پھر زور سے۔ "ڈیڈ؟ ڈیڈی؟ آپ ٹھیک ہیں؟"

جواہرات تیزی سے اس تک آئی۔ "اورنگ زیب؟" کانپتی آواز میں پکارا۔ ہاشم اب پریشانی سے دروازہ دھڑ دھڑا رہا تھا۔

"اس دروازے کی چابی کدھر ہے۔"

"نہیں۔۔۔ وہ چٹخنی چڑھاتے ہیں عموماً۔"

وہ اب زور سے دروازے پہ ہاتھ مارنے لگا۔ ساتھ ان کو پکار بھی رہا تھا۔ شور سن کر میری بھاگی چلی آئی۔

"ڈیڈ دروازہ نہیں کھول رہے میری، تم برآمدے والا دروازہ چیک کرو، وہ کھلا ہے کیا؟" وہ زور سے دروازے کو بوٹ سے ٹھوکر مارتے بولا۔ میری ہکا بکا آگے بڑھی کہ۔۔۔

"میں وہ دروازہ دیکھتی ہوں، تم شیرو کو بلاؤ، جاؤ میری!" جواہرات کو قدرے چلا کر کہنا پڑا۔ میری کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرے، مگر چونکہ جواہرات خود برآمدے کی طرف جانے لگی تھی تو وہ فوراً لاؤنج میں

بھاگی۔ جواہرات چند ہی لمحے بعد واپس آ گئی۔

"وہ دروازہ بھی بند ہے۔" اس نے جھوٹ بولا۔ ہاشم نے سنا بھی نہیں، وہ دیوانہ وار باپ کو پکارتے دروازے پہ ہوشار رہا تھا۔

"ڈیڈ! آپ اندر ہیں؟ ڈیڈ؟" اور تب ہی شیرو بھاگتا ہوا اندر آیا۔ میری بھی اس کے پیچھے تھی۔

"تمہارے ڈیڈ..." جواہرات نے اسے صورت حال سمجھانی چاہی، مگر آنسوؤں نے گلا بند کر دیا۔ اسے سمجھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

"ڈیڈی؟ ڈیڈی؟" وہ ہاشم کے ساتھ اسی دیوانہ وار انداز میں اونچا اونچا پکارتا دروازے کو دھکا دینے لگا۔

"خاور کہاں ہے؟" جواہرات کے پوچھنے پہ میری بتانے لگی۔

"وہ تو مر چکا ہے۔ اسے کال کروں؟"

"ضرورت نہیں ہے۔"

(اور جو آخری شخص وہ اد مر جا چاہتی تھی وہ خاور تھا۔)

"ڈیڈ... ڈیڈ..." پکارتے ہوئے ہاشم نے پوری قوت سے دروازے کو ٹھوکر ماری تو چٹخنی ٹوٹی، وہ اڑ تا ہوا دوسری جانب جا لگا، اور اندر کو لڑھکتا ہاشم گرتے گرتے بچا اور پھر اسے لگا اس کے جسم سے جان نکل گئی ہے۔

فرش پہ خون تھا اور چت گرے، کھلی آنکھوں والے اورنگ زیب کاردار، ان کی آنکھیں بالکل ساکت تھیں، چہرہ بے رنگ۔

نوشیرواں بچوں کی طرح چیختا ان کو پکار رہا تھا اور ہاشم... وہ بے دم سا گھٹنوں کے بل نیچے بیٹھتا چلا گیا۔ میری نے چیخ روکنے کو دونوں ہاتھ منہ پہ رکھ لیے۔ پھر نگاہیں اٹھیں۔ برآمدے کی طرف کے دروازے کی چٹخنی کھلی تھی۔

"میری... اسپتال... ڈاکٹر... کسی کو کال کرو۔" آنسو ابل ابل کر جواہرات کی آنکھوں سے گر رہے تھے۔ میری کا لمحے بھر کو کنڈی پہ الجھا ذہن وہاں سے ہٹا اور وہ فوراً" باہر بھاگی۔ جواہرات نے سفید بھیگے چہرے کے ساتھ اندر قدم رکھا۔ شیرواں کا چہرہ تھپتھپا رہا تھا۔

شاید رو بھی رہا تھا۔ ان کو بار بار پکار رہا تھا اور ہاشم بالکل ساکت سا ان کے قریب بیٹھا تھا۔ ان کے بے جان، لڑھکے ہوئے ہاتھ کو دیکھ رہا تھا۔ جواہرات قدم بہ قدم چلتی اورنگ زیب کے سر کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ اس کے دونوں بیٹے، باپ پہ جھکے تھے۔ دونوں میں سے کوئی بھی اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ قدم قدم پیچھے ہٹی، جیسے شاک اور بے یقینی سے ہٹ رہی ہو، یہاں تک کہ اس کی پشت پہ برآمدے کا دروازہ آ گیا۔ اس نے نامحسوس انداز میں ہاتھ پیچھے کیا۔ چٹخنی لگائی۔ (جس کی آواز شیرو کے زور زور سے باپ کو پکارنے کے شور میں دب گئی۔) اور پھر وہ آہستہ آہستہ چلتی اورنگ زیب کے سر کے قریب آ گئی۔

"کوئی آ کیوں نہیں رہا؟ ممی کسی کو بلائیں۔ ڈیڈی کو اسپتال لے کر جانا ہے۔" شیرو آستین سے آنکھیں رگڑتا کہہ رہا تھا۔ "یہ کیا ہوا ہے ڈیڈی کو؟"

"ہی از ڈیڈ، شیرو۔" ہاشم نے بے جان سا کہتے ہوئے باپ کے ہاتھ کو تھاما۔ جیسے ہی ان کی جلد کو مس کیا، ہر سو کرب سا پھیل گیا۔ "ہم باہر بیٹھے رہے، اتنے قریب اور وہ اکیلے تھے۔ وہ پھسل گئے۔" اس نے اردگرد گرے پانی کو دیکھا۔ "اور ہمیں پتا بھی نہیں چلا۔" وہ سرخ ہوتی آنکھوں سے کہتا اٹھا اور سہارا دے کر باپ کو اٹھانے لگا۔ نوشیرواں نے دوسرے کندھے سے انہیں تھاما اور لوگ اسی دن کے لیے تو بیٹے مانگتے ہیں۔

میری واپس آ گئی تھی۔ ہاشم اور شیرو، اورنگ زیب کو باہر لا رہے تھے۔

میری کی نگاہیں سب سے پہلے برآمدے کے دروازے تک گئیں۔ چٹخنی بند تھی۔ مگر اس نے ابھی تو دیکھا تھا کہ... لیکن سوچنے کی مہلت نہیں ملی۔ کیونکہ جواہرات جو بالآخر ہر بوجھ سے آزاد ہو کر، ساری کارروائی کامیابی سے اپنے رنگ میں دکھا کر نڈھال سی ہو گئی تھی اور شاید اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور گرنے کو تھی کہ میری نے "مسز کاردار" چلاتے ہوئے آگے بڑھ کر اس کو تھاما۔ ہر شے سے بے نیاز،

اس کا ذہن بھیانک تاریکی میں ڈوب رہا تھا اور آنکھوں سے پانی برابر گر رہا تھا۔

"اورنگ زیب۔۔۔ آئی ایم سوری۔۔۔"

☼ ☼ ☼

بے کراں تنہائیوں کا سلسلہ رہ جائے گا
تیرے میرے درمیاں بس اک خلا رہ جائے گا

نیند کی کئی قسمیں ہوتی ہیں، جس قسم میں اس وقت جواہرات ڈوبی تھی وہ بہت تکلیف دہ تھی اور اس سے جاگنا اس سے بھی زیادہ کرب آمیز۔ آنکھیں کھولیں تو وہ اپنے بیڈ پہ مخملیں لحاف میں لیٹی تھی۔ پلکیں جھپکا جھپکا کر ارد گرد دیکھتے وہ کہنیوں کے بل اٹھی۔ سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ پہلے لگا وہ سب خواب تھا، مگر نہیں، حقیقت لمحے بھر میں ہی سامنے ناچنے لگی۔

وہ کمرے میں تنہا تھی "مگر یقیناً" گھر میں بہت لوگ جمع تھے۔ اس نے پیر زمین پہ رکھے۔ سائیڈ ٹیبل پہ دوائیں دھری تھیں۔ اسے سکون آور انجکشن دے کر ڈاکٹر آفتاب ملک نے سلایا تھا۔ ان کی فیملی ڈاکٹر، سرکاری اسپتال میں ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ۔ جن کو سب سے پہلے بلایا گیا تھا۔ یہ نام ذہن میں آیا تو جھماکا سا ہوا۔ وہ جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

خوف اور وحشت نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ ڈاکٹر دھوکا کھا جائے گا کیا؟ شاید نہیں۔

بمشکل قدم قدم چلتی وہ دروازے تک آئی۔ ذرا سا کھولا تو باہر ہاشم اور خاور کھڑے نظر آئے۔ وہ آپس میں بات کر رہے تھے۔ ابھی صبح نہیں ہوئی تھی اور میت کے گھر آنے والوں کا انتظام کھلے سبزہ زار میں تھا۔ جواہرات نے دروازے کے پیچھے کان لگا کر سنا، خاور کہہ رہا تھا۔

"موت سے پہلے وہ فیروز حیات کی پارٹی سے آئے تھے۔ مجھے ڈر ہے انہوں نے سر کو کچھ ڈر گز نہ پلا دی ہوں۔ ہمیں پوسٹ مارٹم کروانا چاہیے، تاکہ اگر وہ کسی اور وجہ سے پھسلے ہوں تو وہ سامنے آجائے۔"

"میں اپنے باپ کی لاش کی بے حرمتی نہیں ہونے دوں گا۔" وہ سیاہ کرتے اور سفید شلوار میں ملبوس تھا، آنکھوں میں سختی تھی، مگر چہرہ زرد و ویران سا تھا۔

"سر۔۔۔ وہ اتنے کمزور نہیں تھے کہ گریں تو اٹھ نہ سکیں۔ ڈاکٹر آفتاب خود اصرار کر رہے ہیں کہ پوسٹ مارٹم کروانا چاہتے ہیں تو آپ کو کروانا چاہیے۔"

ہاشم نے اب کی بار انکار نہیں کیا۔ اس کی خاموشی نیم رضامندی تھی۔ جواہرات نے گہری سانس لی اور دروازہ پورا کھولا، باہر نکلی، دونوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ہاشم فکرمندی سے آگے بڑھا۔

"ممی! آپ ٹھیک ہیں؟" نرمی سے اس کو شانوں سے تھاما۔ خاور نے افسوس سے تعزیت کی۔

"اورنگ زیب کہاں ہے؟ منع مت کرنا، میں ہوش نہیں کھوؤں گی، کچھ دیر اس کے پاس بیٹھنا چاہتی ہوں۔" اس نے بھی اتنی ہی نرمی سے کہا کہ وہ اسے کندھوں سے تھامے راہ داری میں آگے لے آیا۔

یہاں ایک بیڈ روم میں ڈاکٹر آفتاب میت کے ہمراہ کھڑے تھے۔ وہ اندر آئی اور ملازموں کو باہر نکل جانے کو کہا۔ ہاشم اور میری سمیت سب نکلے، اور دروازہ بند کر دیا تو اورنگ زیب کے سرہانے کھڑی جواہرات ڈاکٹر آفتاب کی جانب گھومی۔ وہ دونوں اب اکیلے تھے۔

"تو آپ کہہ رہے ہیں کہ پوسٹ مارٹم کروانا چاہیے؟" وہ تیکھی نظروں سے انہیں گھورتی ایک دم پھنکارتی تھی کہ وہ جو تعزیت کرنے لگے تھے، تعجب سے اسے دیکھنے لگے۔

"جی۔۔۔ کیونکہ جو زخم ان کے۔۔۔"

"ملولی یاد ہے کون تھی؟"

ڈاکٹر آفتاب کو گویا لقوہ ہو گیا، ہکابکا سے اسے دیکھنے لگے۔ وہ سینے پہ بازو لپیٹے، چبھتی نظروں سے دیکھتی ان کے قریب آئی، بالکل مقابل یہاں تک کہ واضح محسوس ہونے لگا کہ وہ ان سے دراز قد تھی۔

"ملولی! آپ کی بیوی کے پہلے شوہر سے ہوئی بیٹی تھی۔ یاد ہے آپ نے کیسے اس کے ساتھ زیادتی کی تھی اور میں نے اسے کور اپ کرنے (چھپانے) میں آپ کی کیسے مدد کی تھی؟ آپ کی بہت ساری گفتگو

ریکارڈڈ ہے میرے پاس۔ کیا سنوادوں آپ کے بچوں کو؟"

ڈاکٹر آفتاب نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا' پھر پریشانی سے اس کے قریب آئے۔

"مسز کاردار! وہ میرے اور آپ کے درمیان تھا۔"

"تو پھر جیسے وارث غازی کی پوسٹ مارٹم رپورٹ آپ نے بدلوائی تھی' ویسے ہی یہ رپورٹ بھی میری مرضی کی لکھی جائے گی' سمجھ میں آرہا ہے کہ میں کیا بات کررہی ہوں؟"

ڈاکٹر آفتاب کا سر خود بخود اثبات میں ہلا۔ وہ کچھ بولنے کے قابل نہیں رہے تھے۔

باہر سب لوگ بکھر چکے تھے۔ ہاشم برآمدے میں جا کھڑا ہوا تھا۔ سبزہ زار میں بیٹھے لوگوں کے ساتھ بیٹھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ وہیں کھڑا دور پہاڑوں پہ طلوع ہوتا صبح کا سورج دیکھنے لگا۔

"ہاشم بھائی!" وہ کب اس کے ساتھ آکھڑا ہوا' اسے علم نہیں ہوا۔ سعدی کے پکارنے پہ چونکا۔ وہ خبر ملنے پہ آفس کے راستے سے ہی ادھر آگیا تھا۔

"بہت افسوس ہوا مجھے' کیسے ہوا یہ سب؟" وہ تاسف سے پوچھ رہا تھا اور پژمردہ کھڑا ہاشم آہستہ آہستہ بتانے لگا۔

✲ ✲ ✲

جانے کس کے لیے وا ہے ترا آغوش کرم
ہم تو جب ملتے ہیں' اک زخم نیا لیتے ہیں

جیل کی اونچی چاردیواری کے اندر اس کھلے احاطے میں وہ دونوں کنارے کنارے چل رہے تھے۔ احمر مدھم آواز میں کچھ کہہ رہا تھا اور فارس آنکھیں سکیڑے گردن موڑ کر ایک طرف دیکھ رہا تھا۔

"آپ نے سوچا ہے' یہاں سے نکل کر کیا کریں گے' غازی بھائی؟"

"تم وہی کرو گے جو پہلے کر کے ادھر آئے ہو۔ فراڈ اور جعل سازی۔" اس نے اسی خشک انداز میں کہہ کر سر جھٹکا۔ احمر نے نہایت صدمے سے اسے دیکھا۔

"میں نے صرف ایک۔۔۔" انگشت شہادت اٹھا کر دکھائی۔ "صرف ایک دفعہ یہ حرکت کی تھی اور دوبارہ کبھی نہیں کروں گا۔"

"تم بالکل کرو گے۔ انسان نہیں بدلا کرتے' جو ایک دفعہ کرتا ہے وہ دوبارہ ضرور کرتا ہے۔" ساتھ ہی جوتے سے کنکر کو ٹھوکر ماری۔

"اشفاق احمد نے کہا ہے' جو اچھا انسان صرف ایک دفعہ گناہ کرے اور پھر توبہ کرلے تو وہ دوبارہ کبھی ایسا نہیں کرتا۔"

"یہ اشفاق احمد نے نہیں کہا' تم نے ابھی ابھی گھڑا ہے۔" اس صاف گوئی پہ احمر نے ناراضی سے اسے دیکھا۔

"اتنے خشک کیوں ہو رہے ہیں؟ کاردار صاحب کی موت کا مجھے بھی بہت افسوس ہے۔ مگر۔۔۔"

"کیا تم کچھ دیر خاموش نہیں رہ سکتے۔" وہ جھلا گیا۔ احمر نے ہونہہ کر کے منہ پھیر لیا' پھر لبوں میں کچھ بڑبڑایا۔ پھر ذرا کی ذرا اس کا چہرہ تکا کہ بڑبڑاہٹ کا کیا ردعمل آیا ہے' مگر وہ نہیں سن رہا تھا۔

"آپ کو ان پہ ابھی تک غصہ ہے؟"

"اونہوں۔۔۔ صرف افسوس ہے۔ غصے والی اٹیچ منٹ نہیں رہی ان سے کبھی۔"

"اور شاید اس بات کا بھی دکھ ہے کہ وہ آپ کی بے گناہی جانے بغیر ہی دنیا سے چلے گئے۔"

"پتا نہیں۔" وہ اسی طرح بے زار سا قدم اٹھاتا رہا۔ دونوں تب رکے جب راہ میں ایک سپاہی آن کھڑا ہوا۔

"تمہاری ملاقات ہے۔" فارس کو اشارہ کیا۔

"کون؟" وہ چونکا۔

"پراسیکیوٹر صاحبہ۔" ان دونوں نے بے اختیار ایک دوسرے کو دیکھا۔ احمر کے لب "اوہ۔۔۔" میں سکڑے۔

"ایک ہفتے میں دوسری ملاقات؟ یہ چڑیل کو اتنا رحم کب سے آنے لگا؟"

مگر وہ بغیر بے تاثر اور سخت تاثرات کے ساتھ چلتا' سپاہی کے پیچھے ہولیا۔ جب اس کے سامنے آکر

کرسی پہ بیٹھا تو ابرو تنے تھے مگر آنکھوں کی سختی میں کمی تھی۔ وہ سفید لمبی قمیص کے اوپر سیاہ منی کوٹ میں ملبوس تھی، سفید دوپٹا شانوں پہ تھا اور بال کیچر میں ہاف بندھے تھے۔ نگاہیں میز پہ رکھے اپنے باہم ملے ہاتھوں پہ تھیں، تونگ کی دمک برسوں بعد بھی ویسی ہی تھی۔ وہ بیٹھ چکا تو زمر نظریں اٹھا کر اس کے چہرے تک لے گئی۔ وہ سپاٹ مگر چبھتی ہوئی نگاہیں تھیں۔

"ایک ہفتے میں دوسری دفعہ؟ اتنا رحم کب سے آنے لگا آپ کو؟" احمر کے الفاظ (سینسر کرکے) دہرائے۔ آنکھیں اس کی بھوری آنکھوں پہ جمی تھیں۔

"پہلے سننے آئی تھی، اب بولنے آئی ہوں۔ دھیان سے سننا، کیونکہ جب میں بولوں گی تو آواز باہر تک جائے گی۔" الفاظ اس کے لبوں سے ادا ہوئے اور ماحول کا تناؤ بڑھ گیا۔ فارس کی آنکھوں کی نرمی مدھم ہوتی گئی۔

"بیٹھیے۔"

"تم نے کہا، میں تصویر کا دوسرا رخ نہیں دیکھتی۔ یہ بھی کہا کہ مجھے بالکل یاد نہیں کہ کبھی میں تمہاری ٹیچر تھی۔ تم غلط تھے۔

جب وہ تمہارا سائیڈ کک میرے پاس آیا، تب میں صرف مشکوک ہوئی تھی، مگر فارس! میں تصویر کا دوسرا رخ ضرور دیکھتی ہوں، سو جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ وہ ایک وفادار انسان ہے، تو یہ بھی پتا چل گیا کہ اپنے سیل میٹ سے دغا کیوں کرے گا؟ تم لوگ جیل میں کوئی Riots پلان نہیں کر رہے۔ تم جیل توڑنے جا رہے ہو۔" اس کی سلگتی نگاہیں فارس کی آنکھوں کے اندر اتر رہی تھیں۔ وہ سپاٹ چہرہ لیے خاموش رہا۔

"ڈونٹ وری۔ میں اس ممکنہ جرم کو رپورٹ نہیں کروں گی۔ میرے لیے زیادہ اچھا ہے کہ تم جیل توڑو اور پھر سے وہی جرم کرو جس کے لیے اندر گئے تھے۔ پتا ہے، تم کیا کرو گے؟" آگے جھکی، میز پہ زور سے ہاتھ مارا، دہکتی آنکھوں سے اسے تنفر سے دیکھا۔ "دوبارہ شادی کرو گے اور اس بیوی کو بھی مار دو گے، تم سب وائف کلرز کی سائیکی ایک ہی ہوتی ہے۔ اس لیے توڑو جیل، تاکہ سب جان لیں کہ تم گناہ گار تھے۔ اسی لیے بھاگے۔"

وہ چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ کرسی پہ پیچھے کو ہو کر بیٹھا، منہ میں کچھ چباتے ہوئے شاید کوئی کاغذ کا ٹکڑا تھا۔

"مگر تمہیں یہ پلان کسی اور کے ساتھ مل کر بنانا ہوگا، کیونکہ احمر شفیع کے خلاف چارجز پراسیکوشن ڈراپ کر رہا ہے۔ ثبوت کی عدم موجودگی کی وجہ سے۔ سو وہ جلد رہا ہو جائے گا۔" فارس نے کوئی ردعمل نہیں دیا۔ بس اسے دیکھتا رہا۔

"معلوم ہے کیا، اتنے سال بعد، پہلی دفعہ میں نے چند دن کے لیے فرض کر لیا تھا کہ تم بے گناہ ہو، میں تمہارا کیس خود لینے لگی تھی، میں تمہیں Presumed Innocent خیال کر کے تمہاری طرف کی کہانی کے حق میں ثبوت ڈھونڈنے جا رہی تھی مگر۔۔۔"

اور پھر اس کی آنکھوں میں صدمہ اترا۔ نفرت سے اسے دیکھتے نفی میں گردن ہلائی۔

"مگر تم نے پھر مجھے استعمال کیا۔ فارس! تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟ میں تمہاری ٹیچر تھی۔ سعدی کی پھپھو تھی یا کوئی بے کار چیز جس کو تم ہمیشہ استعمال کرتے جاؤ؟ میرا یہ حال کر دیا تم نے، کیا یہ کافی نہیں تھا جو تمہیں رہائی بھی میرے کندھے پہ پیر رکھ کر چاہیے تھی؟" آگے ہو کر ایک ایک لفظ غصے سے بولتے ہوئے زمر کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ آنکھوں میں اب نمی بھی اترنے لگی تھی۔

"اس حرکت کے لیے کسی بھی پراسیکیوٹر یا پولیس آفیسر کو استعمال کر سکتے تھے تم، کیا مجھے استعمال کرتے ہوئے اس لڑکے کو میرے لیے پیغام دیتے تمہیں ایک لمحے کو بھی احساس نہیں ہوا کہ تم بار بار ایک عورت کو استعمال کر رہے ہو؟ تم مجھ سے چاہتے کیا تھے؟"

غصے سے بولتے بھی ایک آنسو آنکھ سے لڑھک کر گال پہ جا گرا۔ اسے خود بھی نہیں احساس ہوا کہ کوئی

آنسو گرا ہے۔

وہ تب بھی چپ رہا۔

"اور معلوم ہے میں اتنی دیر سے تمہارے سامنے کیوں بیٹھی ہوں؟ تمہارے منہ سے صرف معذرت سننے کے لیے۔ یہ کہنا اتنا مشکل نہیں تھا فارس! مجھے دوبارہ استعمال کرنے کے لیے، میری زندگی برباد کرنے کے لیے میری صحت تباہ کرنے کے لیے کیا تم ایک دفعہ بھی معافی نہیں مانگ سکے؟"

میز پہ زور سے ہاتھ مار کر وہ آگے کو ہوئی' آنکھیں سرخ دہک رہی تھیں۔

"یہ کہنا اتنا مشکل نہیں تھا فارس... آئی ایم سوری زمر" بس تین الفاظ تھے' تم ایک دفعہ مجھ سے معافی مانگ کر دیکھتے' تم ایک دفعہ یہ سارے جھوٹ بولنے کے بجائے پشیمان ہو کر دیکھتے' میں تمہارے ساتھ کھڑی ہو جاتی مگر ... جو تم نے اب کیا ہے نا اس سے تم میرے دل میں موجود اپنا آخری نرم گوشہ بھی کھو چکے ہو۔ تم نے ابھی ابھی اس شخص کو گنوا دیا ہے جسے اگر تمہاری بے گناہی کا یقین ہو جاتا تو وہ تمہاری سب سے بڑی طرف دار بن سکتی تھی مگر اب... ..

بیچھے ہوتے ہوئے تنفر سے اسے دیکھتے' نفی میں گردن ہلائی۔

"اب نہیں' اب مجھے تمہارے کیس میں نہ گواہ بننا ہے نہ کچھ اور میں نے اپنی گواہی بھی واپس لے لی ہے' اس لیے نہیں کہ تم سے ہمدردی ہے' صرف اس لیے کہ میں تمہارے ساتھ کوئی واسطہ ہی نہیں رکھنا چاہتی۔ کیونکہ میرا تم سے کوئی ذاتی جھگڑا تھا ہی نہیں۔ اگر ہوتا تو تم دیکھتے میں کیسے تمہیں انجام دیتی ہوں' لیکن نہیں..."

سر جھٹک کر میز پہ سیدھا ہاتھ مارا' وہ چپ چاپ بند ہونٹوں سے کاغذ چباتے اسے دیکھتا رہا۔

"میں تو ایک استعمال کی شے تھی جس کے ذریعے جب چاہو تم اپنا مطلب نکالو اور تمہیں ابھی بھی کوئی شرمندگی نہیں؟"

تعجب بھرے صدمے سے اسے دیکھتی وہ نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

"فارس! تم نے مجھے اس قابل نہیں چھوڑا کہ میں کبھی اپنا گھر بسا سکوں' کبھی ماں تک نہیں بن سکتی میں۔" (اس کا چباتا جبڑا رکا' آنکھوں میں چونکنے کا تاثر ابھرا جسے اگلے ہی پل وہ چھپا گیا۔)

"میرے کبھی بچے نہیں ہوں گے' میرا غم لیے میرا باپ وقت سے پہلے مر جائے گا' مگر تم... کیا تم اب بھی معذرت کے تین لفظ نہیں کہہ سکتے؟ آئی ایم سوری زمر... یہ تین لفظ بولنا اتنا مشکل نہیں ہے۔ اس سے کچھ بھی نہیں بدلے گا' میں اب بھی تمہارے ساتھ کھڑے ہونے کا نہیں سوچوں گی' لیکن شاید... تمہارے لیے... یہ تمہارے اپنے لیے ہو شاید..."

تیز تیز بولتے اس کو سانس چڑھ گیا تھا۔ سو خاموش ہو گئی۔ وہ کہہ چکی تھی جو وہ کہنے آئی تھی اور آواز باہر تک گئی تھی یا نہیں' میز کے پار بیٹھے فارس کے اندر تک ضرور گئی تھی۔

وہ آگے کو ہوا' ہاتھ باہم ملا کر میز پہ رکھے اور سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور پھر جب بولا تو ایک ایک لفظ ٹھہرا ہوا' مگر مضبوط تھا۔

"مجھے افسوس ہے جو آپ کے ساتھ ہوا۔ مجھے دکھ ہے کہ آپ کے والد آپ کا غم لے کر وقت سے پہلے مر جائیں گے۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ آپ کی زندگی تباہ ہوئی' بہت صدمہ ہے کہ آپ کبھی اپنی فیملی نہیں بنا پائیں گی' بہت زیادہ ہمدردی ہے کہ آپ کی صحت وقت کے ساتھ بگڑتی چلی جائے گی... مگر..." ذرا سا رکا' بنا پلک جھپکے اس کی آنکھوں میں دیکھتے کہا۔ "مگر میں فارس غازی ہوں اور فارس غازی کی اپنی نظر میں اس کی بہت عزت ہے' سو میڈم ڈسٹرکٹ پراسیکیوٹنگ اٹارنی صاحبہ! میں... معافی... نہیں مانگوں گا۔" چبا چبا کر الفاظ ادا کیے۔ ہلکا سا نفی میں سر ہلایا۔

"آپ نے جو کرنا ہے کر لیں' مگر میں معافی نہیں مانگوں گا۔" کھڑا ہو گیا تھا۔ جھٹکے سے کرتے کا گریبان ٹھیک کیا' آستین پیچھے فولڈ کی۔ ملاقات ختم! وہ سلگتی نظروں سے اسے دیکھتی اٹھی۔ پرس اٹھایا اور باہر نکل

گئی۔

"اسے بتایا کیوں نہیں کہ آپ نے بصیرت صاحب کو' سب کہنے کا کہا تھا' اسے نہیں۔ یہ میری غلطی تھی۔" جب وہ واپس آیا سیل میں دیوار کے ساتھ بیٹھا تھا تو سلاخوں کے قریب کھڑے احمر نے پوچھا۔ اسے اپنی رہائی کا سن کر خوشی نہیں ہوئی تھی۔ پلان غارت جانے کا افسوس زیادہ تھا۔ اپنی رہائی والی بات تو مذاق لگی تھی۔

"اور وہ یقین کر لیتی؟"

"کرے یا نہ کرے' بتانا تو چاہیے تھا۔"

"میں ساری زندگی اس کو اپنی صفائی نہیں دے سکتا۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ جیسی ہے اسے رہنے دو۔ اس نے بھی بہت کچھ کھویا ہے۔"

"کم از کم جیل میں تو نہیں ہے وہ۔" وہ جل کر بولا۔

"قید کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں۔ اس کی قید اور طرح کی ہے۔ اگر اس قید میں اس کا واحد روزن کسی کو الزام دینا اور دیے چلے جانا ہے تو بجھے۔ وہ اس سے نہیں چھیننا چاہیے۔ کم از کم اس کے پاس کوئی ہے تو سہی جس کو وہ الزام دے سکے۔ میرے پاس وہ بھی نہیں اور جب کوئی ایسا نہ ہو تو انسان خود کو الزام دینے لگتا ہے' سو وہ جیسی ہے' اسے رہنے دو۔" وہ مدھم آواز میں ٹھہر ٹھہر کے کہہ رہا تھا' مگر احمر نفی میں سر ہلاتا بحث کرنے لگا' لیکن اسے سن کون رہا تھا؟

موت سے گزر کر یہ کیسی زندگی پائی
شاخ شاخ ہوتا ہے دار کا گماں یارو

جواہرات کاردار کے کمرے میں ہیٹر کی گرمائش تھی۔ دوپہر میں بھی بند پردوں کے باعث اندھیرا لگتا تھا۔ وہ گردن تلے چھوٹے چھوٹے تکیے رکھے۔ سیاہ ریشمی لحاف میں لیٹی' ویران اور بیمار دکھتی تھی۔ بال کانوں کے پیچھے اڑسے' حلقوں سے مزین روئی روئی آنکھیں' میک اپ کے بغیر پیلا کمزور چہرہ۔ وہ تھی بھی سیاہ لباس میں اور ویران آنکھوں سے دیکھ بھی پردوں کی سیاہی کو رہی تھی۔

سعدی سامنے کرسی پہ گھٹنے ملا کر بیٹھا' فکر مندی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کی طبیعت پوچھنے آیا تھا' مگر وہ سوتی جاگتی کیفیت میں' بالکل بے گانہ دکھائی دیتی تھی۔ دواؤں کا اثر شدید تھا۔

"مسز کاردار... اللہ آپ کو اکیلا نہیں چھوڑے گا۔ وہ آپ کو سنبھال لے گا۔ بھروسا کر کے دیکھیں اس پہ' آپ کا ہر مسئلہ وہ حل کر دے گا۔" وہ نرمی سے سمجھا رہا تھا جب کھڑکی کو دیکھتی جواہرات کے لب پھڑپھڑائے۔

"کیا تم نے وہ ڈاکومنٹری شو دیکھا ہے' میں غارت گر" IPredator "؟"

"نہیں... میں دراصل..."

"اس دن اس کی ایک قسط لگی۔ وہ مادہ (غارت گردں) کے بارے میں تھی۔ غارت گروں کی ملکہ' مادہ چیتا۔ مجھے اس نے بہت رلایا' معلوم ہے کیوں؟"

"آپ بتائیں کیوں۔" وہ نرمی سے آگے ہو کر سننے لگا۔ وہ گردن موڑے کھڑکی کو دیکھتی بولتی جا رہی تھی۔ گویا اونچا سوچنے کی کیفیت میں ہو۔

"غارت گر جانتے ہو' کیا ہوتے ہیں؟ Predators وہ جانور جو اپنے سے کمزور کا شکار کرتے ہیں۔ تم لوگ سمجھتے ہو وہ بھوک مٹانے یا عادت دہرانے کو ایسا کرتے ہیں' مگر نہیں' مادہ چیتا ایسی نہیں ہوتی۔ کیونکہ نر چیتا بے وفا جانور ہے' اپنی مادہ کو اولاد کا تحفہ دے کر چھوڑ جاتا ہے۔ مادہ چیتا اپنے بچوں کو تن تنہا پالتی ہے اور اس روز میں نے دیکھا' اس شو میں کہ مادہ غارت گر ہونا کتنا مشکل ہے۔"

پردے پہ جمی اس کی آنکھیں گلابی پڑنے لگیں۔ آواز رندھنے لگی۔ وہ افسوس سے اسے دیکھتا رہا۔ "وہ اپنے غم کے بارے میں بات نہیں کرنا چاہتی۔ اسی لیے ادھر ادھر کی باتیں کر رہی ہے' اسے یہی لگا۔"

"وہ ایک مادہ چیتا تھی اور اس کے دو ننھے بچے تھے۔ جن کے لیے شکار اسی کو ڈھونڈ کر لانا تھا۔ جانتے ہو' ہر چیتے کا توانائی کا ذخیرہ ہوتا ہے' ایک شکار پکڑنے کے لیے وہ جتنا بھاگتا ہے' اس کے نتیجے میں اس کی توانائی آدھی رہ جاتی ہے۔ وہ بھی اپنے بچوں کو کچھار میں چھوڑ کر

شکار پہ نکلتی ہے' گھات لگاتی ہے' ہرن کے پیچھے بھاگتی
ہے۔ اوہ مگر اللہ کا نظام۔۔۔ ہرن جتنا بھاگ لے' توانائی
نہیں کھوتا۔ مگر وہ تیز رفتار مادہ چیتا' ہرن کو دبوچ بھی لیتی
ہے۔ اپنی کچھار
میں لے بھی آتی ہے' مگر آدھی توانائی کھو چکی ہوتی
ہے۔ نڈھال ہے' بچے بھوکے ہیں' مگر اس سے قبل
کہ وہ ہرن کے لاشے کو کھا سکے۔ ایک ببر شیر آجاتا
ہے۔ ایک بڑا غارت گر۔" اس نے کرب سے
آنکھیں بند کیں۔ دو آنسو نکل کر گالوں پہ لڑھکے۔
"شیر غراتا ہے اور وہ مجبور مادہ پیچھے ہٹ جاتی ہے'
اگر ایسا نہیں کرے گی تو شیر اس کے دونوں بچوں پہ
جھپٹ پڑے گا اور وہ شیر کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس
کے سامنے شیر اس کا شکار کھا جاتا ہے اور وہ اپنے بچے
چاٹتی رہ جاتی ہے۔"
سے چہرے کے ساتھ نہ تلخی سے مسکرائی۔ وہ
خاموشی سے سنتا رہا۔ اسے اس کہانی میں کوئی دلچسپی
نہیں تھی۔ صرف مسز کاردار کی حالت غم میں مبتلا
کر رہی تھی۔ ہاشم کے ساتھ جو بھی مسئلہ تھا اس کا'
اس میں اس کا تو قصور نہ تھا۔ وہ تو شاید جانتی بھی نہ ہو
کہ ہاشم نے وارث کو قتل کروایا تھا اور پھر وہ تو اس کی
دوست رہی تھی۔ وہ اس کے پاس آکر اکثر بیٹھتا تھا'
باتیں کرتا تھا اس کی حالت سے وہ اور کیا محسوس کرتا۔
"اب اس کی آدھی توانائی ختم ہو چکی ہے۔ اسے
کل لازمی شکار کرنا ہے' تاکہ وہ توانائی پوری کرے'
ورنہ مر جائے گی اور بچے اس کے بعد بھوک سے ہی مر
جائیں گے۔" وہ بات جاری رکھے ہوئے تھی۔ "سو
اگلے روز وہ پھر نکلتی ہے' ہرن کے پیچھے بھاگتی ہے'
اسے جا دبوچتی ہے اور اسے گھسیٹ کر ایک تنہا گوشے
میں لے آتی ہے' اپنی ساری توانائی وہ لٹا چکی ہے' اگر یہ
ہرن بھی کوئی شیر یا بڑا غارت گر لے گیا تو وہ مر جائے گی
اور سب سے تکلیف دہ بات' آج ہرن نہیں بلکہ ہرن
کا بچہ شکار کیا ہے' وہ اتنا چھوٹا ہے کہ اسے بچوں کو دے
تو اپنے حصے میں چند لقمے ہی آئیں گے اور وہ مر جائے
گی۔ توانائی برابر کرنے کے لیے اسے یہ اکیلے کھانا ہوگا'
تو وہ اسے بچوں تک نہیں لے کر جاتی' خود کھا لیتی
ہے۔" پلکیں بند کیں۔ آنسو متواتر گر رہے تھے۔
"بچے ابھی بھی بھوکے ہیں۔ اگلے روز وہ پھر شکار
کے لیے دوڑتی ہے۔ توانائی کم ہے' کیوں کہ کل کا ہرن
چھوٹا تھا' سو آج وہ ایک بڑا ہرن شکار کرتی ہے۔ بالآخر
اب اس کے بچے اور وہ مل کر اسے کھا سکیں گے۔ وہ
ہرن کا لاشہ گھسیٹ کر کچھار تک لاتی ہے تو۔۔۔ تو۔۔۔"
اس کی آواز کپکپائی۔ ٹپ ٹپ گرتے آنسوؤں میں
روانی آئی۔
"تو اس کے وہ ننھے چیتے وہاں نہیں تھے۔ وہ لاشہ
وہیں چھوڑ کر آگے پیچھے بھاگتی ہے۔ وہ بچے جنگلی
hyenas (لکڑ بھگوں) کے نرغے میں ہوتے
ہیں۔ وہ قریب آتی ہے۔ حملہ نہیں کرتی۔ جھپٹتی بھی
نہیں ہے۔ صرف غراتی ہے اور hyena (لکڑ
بھگا) ڈر جاتی ہے' معلوم ہے کیوں؟ کیونکہ مادہ چیتا کی
آنکھوں تلے سیاہ Lines ہوتی ہیں جو غراتے وقت
اسے بہت پارعب اور خوف ناک بناتی ہیں اور پھر وہ نا
بھاگ جاتی ہے اور وہ۔۔۔ وہ اپنے بچوں کو واپس لے آتی
ہے اور تم لوگ۔۔۔ تم لوگ سمجھتے ہو مادہ چیتا بھوک کے
لیے طاقت کے زعم میں شکار کرتی ہے۔ ایسا نہیں ہوتا
سعدی۔ کوئی اپنی خوشی سے کسی کا خون نہیں کرتا۔
اپنے بچوں کے لیے اپنی بقا کے لیے وہ ایسا کرتی ہے' اور
پھر سر تکیے پر گرا دیا۔" اس نے آنکھیں موند لیں۔
آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ سعدی افسوس سے
لبوں پہ مٹھی رکھے اسے دیکھتا رہا۔
"جاؤ سعدی! مجھے اکیلا چھوڑ دو۔" اس نے کروٹ
بدلی تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔
کچھ دیر بعد جواہرات نے کروٹ بدلی تو ادھ کھلے
دروازے سے باہر کا منظر دکھائی دیا۔ سعدی' میری
انجھو کے ساتھ کھڑا کچھ کہہ رہا تھا۔ ان کی باتیں عام
نوعیت کی ہیں' وہ نہیں جانتی تھی' صرف میری کی
موجودگی ہی اسے بے چین کر گئی۔ وہ کیا' کیا بول گئی

سعدی کے سامنے اور اگر جو میری نے کچھ بک دیا تو؟ اگر جو سعدی نے دو جمع دو بائیس بنالیے تو؟ وہ اٹھنا چاہتی تھی' مگر خواب آور دوا کا اثر گہرا ہوتا جارہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہوتی گئیں۔ ذہن ڈوبتا گیا اور دل ڈوب ڈوب کر ابھرتا رہا۔

اس سے یکسر بے خبر سعدی میری سے اس کے مالک کی تعزیت کر رہا تھا۔

کاہش آرزو سہی' حاصل زندگی سہی
حاصل آرزو ہے کیا سوز مدام کے سوا

وہ گھر آیا تو سناٹا سا تھا۔ سیم اسکول گیا تھا اور امی غالباً" نئے نئے ریسٹورنٹ۔ حنین نے اس کا نام رکھا تھا اور وہ جانتا تھا کہ یہ نام علیشا کے کی چین سے متاثر شدہ تھا' مگر وہ تھی کہاں؟ اس کے کمرے میں جھانکا تو وہ بیڈ پہ اکڑوں بیٹھی تھی۔ سامنے چند کاغذات پرزہ پرزہ ہوئے پڑے تھے۔ وہ اندر آیا۔ نگاہیں اس کے ویران وجود سے کاغذوں تک گئیں۔ اسے جیسے بجلی کا جھٹکا لگا۔ تیزی سے ان پہ جھپٹا۔ ٹکڑوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔

"یہ کس نے کیا ہے؟ یہ تو تمہارا ایڈمیشن فارم تھا' انجینئرنگ یونیورسٹی کے لیے ــــ" پہلا خیال سیم کی طرف گیا تھا۔ حنہ ساکت بیٹھی رہی' وہ پریشانی سے سامنے بیڈ پہ بیٹھا۔

"حنہ ــــ تم نے کیا ہے؟ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ بتاؤ مجھے۔" نرمی سے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا۔ وہ جو بستر کی چادر کو تک رہی تھی' آنکھیں اٹھائیں۔ بنا عینک کے وہ چھوٹی لگتی تھیں۔

"میں ایڈمیشن نہیں لوں گی۔ مجھے نہیں پڑھنا۔" آنسوؤں سے آنکھیں بھر گئیں۔

"حنین! بس کرو۔ علیشا نہیں پڑھ سکی تو اس میں تمہارا قصور نہیں ہے۔" اب کے اسے غصہ چڑھا تھا۔

"مجھے نہیں پڑھنا بھائی۔" مگر وہ اس کی نہیں سُن رہا تھا۔

"وہ علیشا اور ہاشم بھائی کا معاملہ تھا' تم نے کچھ غلط

نہیں کیا، تم خود کو مجرم مت سمجھو حنہ۔"

"میں مجرم ہوں۔ میں گناہگار ہوں۔" آنسو اس کے گالوں پہ لڑھک رہے تھے۔

"حنہ! علیشا کو وہ ملا جو اس نے بویا تھا' علیشا نے ..."

"کیا علیشا علیشا لگا رکھی ہے آپ نے؟ بھاڑ میں گئی علیشا!" وہ ایک دم اتنے زور سے چلائی کہ سعدی بے اختیار پیچھے ہٹا۔ اس کی آواز درد سے پھٹنے لگی تھی۔ "ہر بات علیشا کی وجہ سے نہیں ہوتی۔ یہ میں ہوں' حنین!" انگلی سے اپنے سینے پہ دستک دی۔ "یہ میرے گناہ ہیں!"

کچھ تھا اس کے انداز میں' اس کی آنکھوں میں کہ وہ چونکا۔ پہلی دفعہ اسے لگا کہ وہ علیشا کے لیے اپ سیٹ نہیں ہے۔

"کوئی اور بات ہے پھر؟ کیا ہوا ہے حنہ؟" قدرے متوحش سا ہو کر وہ اس کا چہرہ کھوجنے لگا۔ حنین کے آنسوؤں میں روانی آگئی۔

"میں کون ہوں' بھائی؟"

"تم حنہ ہو... ہمارے گھر کا سب سے پیارا اور ذہین بچہ۔ تم' تم کے کلچر کی دیوانی ہو اور..." وہ جلدی جلدی بتانے لگا۔ "اور تم نے بورڈ میں ٹاپ کیا ہے' تم نے..." اس کی آخری بات پہ حنین سر گھٹنوں پہ گرا کر رونے لگی۔

"نہیں کیا میں نے ٹاپ۔ نہیں لی میں نے پہلی پوزیشن!"

"حنین! کیا کہہ رہی ہو؟" وہ پریشانی سے اس کا سر تھپک رہا تھا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اس نے بھیگا چہرہ اٹھایا' گیلی آنکھوں سے بھائی کو دیکھا۔

"میں نے بورڈ ٹاپ نہیں کیا۔ مجھے غارت کر دیا ان کورین ڈراموں اور فلموں نے۔ میں نے تو اس سال پڑھا بھی نہیں ٹھیک سے۔" اس کا سر تھپکتا سعدی کا ہاتھ ٹھہرا۔ حیرت سے اس نے حنہ کو دیکھا۔

"کیا اول فول بولے جا رہی ہو؟"

"میں نے بورڈ میں ٹاپ نہیں کیا۔"

"پاگل ہو گئی ہو؟ پورا شہر جانتا ہے تم نے بورڈ ٹاپ کیا ہے' تم... تمہارا رزلٹ کارڈ' بورڈ کی تقریب' اخبار میں چھپا رزلٹ' وہ سب سچ تھا۔"

"نہیں تھا وہ سچ۔" وہ زور سے چیخی۔ "میں نے چیٹنگ کی تھی۔ سنا آپ نے؟ میں نے پیپرز پہلے سے دیکھ رکھے تھے۔"

اسے گویا بچھو ڈنک مار گیا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھا۔ نفی میں سر ہلاتا پیچھے ہوا۔ "کیا بکواس ہے حنہ؟ کوئی چیٹنگ کر کے ٹاپ نہیں کر سکتا... کوئی پیپرز بھی پہلے نہیں دیکھ سکتا۔ تم میرے ساتھ... تم کوئی پرانک (مذاق) کر رہی ہو؟" اسے اب بھی لگ رہا تھا وہ ایک دم ہنسنا شروع کر دے گی' مگر وہ رو رہی تھی۔

"میں نے دیکھے تھے... سب پیپرز دیکھے تھے' مجھے معلوم تھا ایگزام میں کیا آتا ہے۔" مگر وہ اب بھی نہیں سمجھ رہا تھا۔

"ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم چیٹنگ میں کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو' کسی بورڈ کا مین فریم ہیک نہیں کر سکتیں۔ تم کہہ کیا رہی ہو؟ پیپرز تو بورڈ کے چیئرمین تک کے پاس نہیں ہوتے' اتنی سخت سیکورٹی ہوتی ہے۔" وہ نفی میں سر ہلا رہا تھا۔ "پیپر سیٹ کرنے والوں تک کو فائنل پیپر کو علم نہیں ہوتا' بورڈ کا کوئی اہلکار تک پیپرز نہیں دیکھ سکتا سوائے..." اور یہیں پہ وہ اٹکا۔ بے یقینی سے حنین کو دیکھا۔

"سوائے آفیسر کانفیڈینشل پریس (OCP) کے" اس نے بھائی کا فقرہ مکمل کیا۔

"تم مذاق کر رہی ہو۔ ہے نا؟" بالکل دنگ سا کھڑا وہ کپکپاتی آواز میں پوچھ رہا تھا۔ "او سی پی ایماندار سے ایماندار شخص کو بنایا جاتا ہے۔ معزز' دیانت دار آدمی' کوئی او سی پی ایسا نہیں کر سکتا۔ مجھے پتا ہے' تمہاری اس دوست کے ابو او سی پی ہیں' جو اسکول میں تھی تمہارے ساتھ' مگر او سی پی تمہیں پیپرز نہیں دکھا سکتا۔" وہ اب بھی ذہنی طور پہ یہ قبول کرنے سے انکاری تھا۔ حنین نے دکھ بھری بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"کیا آپ جانتے ہیں' انسان اپنے خاندان کے لیے کس حد تک جا سکتا ہے؟" اور آنسو پھر سے ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ سعدی بے دم سا بیڈ کے پرلے کنارے پہ بیٹھا۔ حنین سے کافی دور۔ اس کی شل سی نظریں اس پہ جمی تھیں' جو اپنے گھٹنوں کو دیکھتی بتا رہی تھی۔

"حمیرا کے ابو اوسی پی ہیں' ان ہی کی وجہ سے حمیرا ہمارے بورڈ سے امتحان نہیں دے سکتی۔ جیسا کہ اصول ہے۔ حمیرا میرے پاس آئی۔ امتحانوں سے پندرہ دن پہلے' یہ وہ دن تھے جب میں شدید دباؤ میں تھی۔ آپ باہر تھے' اور میں سارا دن رات "کے" ڈرامے دیکھتی اور پھر یہ ڈپریشن ہوتا کہ پڑھ نہیں رہی' مگر کتابوں میں دل ہی نہیں لگتا تھا۔ ایف ایس سی کے فرسٹ ایئر میں قسم سے میں نے واقعی محنت کی تھی' اور بورڈ میں دوسرے ہائی ایسٹ مارکس تھے میرے۔ اب مجھے پوزیشن لینی تھی۔ اتنا تھی بڑا امی کو خوش کرنا تھا۔ وہ کہتیں اگر تم فیل ہوئیں تو تمہارا کمپیوٹر بند کروا دوں گی۔ یہ مائیں غصے میں ہمیں ہماری پیاری چیز سے دور کرنے کی دھمکی کیوں دیتی ہیں ہمیشہ؟" ہتھیلی کی پشت سے گال رگڑا۔ سر جھکائے وہ بول رہی تھی اور وہ سانس روکے سن رہا تھا۔

"تب ہی حمیرا میرے پاس آئی۔ ساتھ میں اس کے ابو بھی تھے۔ میری کمپیوٹر skills (مہارت) کی شہرت دور دور تک تھی۔ لڑکیاں کام لے کر اکثر آتی ہیں' میں کبھی کرتی ہوں' کبھی نہیں۔ بدلے میں کچھ نہیں لیتی۔ بس تعریف بہت ہوتی ہے۔ حمیرا کو بھی کام تھا۔ اس کی بہن کی محلے کے کسی لڑکے سے دوستی ہو گئی تھی' لڑکے کے پاس اس کی ویڈیو تھی' ابو نے وہاں شادی سے انکار کر کے ایک معزز گھرانے میں رشتہ کروایا۔ مہینے بعد اس کی شادی تھی' مگر وہ لڑکا بلیک میل کرنے لگا۔ عین شادی کے روز ویڈیو کی تصاویر بنا کر فنکشن میں بانٹے گا' یہی کہا تھا اس نے۔ حمیرا میرے پاس آئی' درخواست کی کہ اس لڑکے کا سارا کمپیوٹر ڈیٹا مٹا دوں۔ کچھ کروں۔ تو۔۔۔ میں نے کہا کہ وہ اپنے ابو کو بھیجے' اکیلے۔ اگلی صبح اس کے ابو آئے۔

یہیں ڈرائنگ روم میں۔ امی اسکول میں تھیں' میں نے انہیں ادھر بٹھایا' ان کی بات سنی' وہ شرمندہ اور بے بس نظر آتے تھے' بولے کہ میں کیا کر سکتی ہوں؟ تو میں نے کہا۔"

اس کے آنسوؤں نے سارا منظر دھندلا دیا۔ اور اس دھند میں سے ایک پرانا منظر ابھرنے لگا۔

ان کا ڈرائنگ روم۔۔۔ صوفے پہ بیٹھے ادھیڑ عمر مگر معزز اور شریف سے فاروق صاحب' اور ان کے سامنے صوفے پہ ٹانگ پہ ٹانگ جما کر بیٹھی حنین۔ عینک لگائے' بال فرنچ چوٹی میں باندھے وہ سنجیدہ اور پرسکون نظر آ رہی تھی۔

"میں اس کا موبائل اور گھر کے تمام کمپیوٹرز وائرس ڈال کر انفیکٹڈ کر دوں گی۔ پھر اس کو پیغام بھیجوں گی کہ جن فلیش اور سی ڈیز میں تم نے وہ سب ڈال کر رکھا ہے' وہ خراب ہو چکی ہیں۔ حیران ہو کر وہ ان کو باری باری چیک کرے گا۔ یوں ہر شے Infected ہو جائے گی۔

چند گھنٹوں میں اس کا تمام ڈیٹا مٹ جائے گا۔ نہ صرف یہ بلکہ میں اس کے کمپیوٹر تک رسائی حاصل کر کے اس میں موجود اس کی بہنوں وغیرہ کی پکچرز لے لوں گی' پھر ان کے ذریعے اس کو بلیک میل کروں گی کہ اگر نازیہ باجی کے بارے میں کسی سے ایک لفظ بھی کہا تو میں اس کی بہنوں کی تصویریں فوٹوشاپ کر کے اسی کے محلے میں بانٹ دوں گی۔ اس کے بعد اس کی مجال نہیں ہو گی کہ وہ نازیہ باجی کو دوبارہ بلیک میل کر سکے۔"

وہ گویا سانس روکے سن رہے تھے۔ بمشکل سر اثبات میں ہلایا۔

"بیٹا! آپ یہ سب کر سکتی ہیں؟ واقعی؟ نارمل لوگ تو۔۔۔"

"میں نارمل نہیں ہوں۔ میں حنین ہوں۔" وہ لمحے بھر کو رکی' ان کی آنکھوں میں دیکھا۔ "مگر آپ نے یہ سوچا ہے کہ اگر میں پکڑی گئی' یہ سائبر کرائم ہے آخر' تو میرا کیا ہو گا؟ بدنام بھی ہوں گی' اور جیل بھی ہو گی۔ زندگی تو برباد ہو جائے گی میری' سو اگر آپ کی بیٹی

کے لیے میں اتنا کچھ کرنے جا رہی ہوں تو آپ کو بھی میرے لیے کچھ کرنا ہوگا۔"

"جی بتائیے' میں کیا کر سکتا ہوں؟" وہ آگے کو ہوئے۔

"آپ اوسی پی ہیں' آپ کے پاس اگلے مہینے ہونے۔"

"ایک لفظ بھی اس سے آگے مت بولنا۔" وہ لال سرخ ہوتے ایک دم کھڑے ہو گئے۔ "سوچنا بھی مت کہ میں ایسا کچھ کروں گا۔"

"میں بورڈ ٹاپر ہوں' مجھے پیپرز نہ دکھائیں تب بھی دوسری پوزیشن لے لوں گی۔" وہ بھی ساتھ کھڑی ہوئی' ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سختی سے بولی۔ "مگر مجھے پہلی لینی ہے' یہ میری عزت کا معاملہ ہے۔"

"میں ایسا کچھ بھی نہیں کروں گا۔" انگلی اٹھا کر سختی سے تنبیہہ کی۔ وہ تلخی سے مسکرائی۔

"تو پھر کسی اور ایکسپرٹ کے پاس جائیں اور اس سے کہیں کہ اس لڑکے کا ڈیٹا مٹا دے' مگر۔۔۔ میرا ڈیٹا کیسے مٹائے گا کوئی؟ آپ شاید بھول رہے ہیں' وہ ویڈیو میرے پاس بھی ہے۔"

فاروق صاحب بے یقینی سے جھٹکا کھا کر دو قدم پیچھے ہٹے۔

"اور اس وقت بھائی! مجھے لگا میں نے اس شخص کو آدھا مار دیا ہے۔ ان کو قائل کرنا آسان نہیں تھا' مگر وہ مجبور ہو گئے۔ میں نے ان کا کام کر دیا اور انہوں نے میرا۔ میں نے یہ بھی کہا کہ رزلٹ آنے تک نازیہ کی ویڈیو تلف نہیں کروں گی' تاکہ وہ میری مخبری نہ کروا سکیں۔ مجھے پیپرز دے دیے انہوں نے' اور میں نے بورڈ ٹاپ کر لیا۔ مجھے کوئی گلٹ نہیں ہوا۔ رزلٹ والے دن ان کو کال کر کے کہا کہ ویڈیو میں نے تلف کر دی ہے' انہوں نے جواباً کچھ کہے بغیر فون رکھ دیا۔ اتنے مہینے گزر گئے مگر مجھے ایک دفعہ بھی گلٹ محسوس نہیں ہوا۔ جس نے وارث ماموں کو قتل کیا تھا' اسے بھی شاید ایک دفعہ تو دکھ ہوا ہوگا' میں تو اس سے بھی بُری نکلی کہ مجھے تو لگا میں پیپرز دیکھے بنا بھی دوسری پوزیشن لے سکتی تھی' کوئی جرم نہیں کیا میں نے۔ مگر یہ سچ نہیں تھا۔ علیشا کے خط نے مجھے بتایا کہ یہ سچ نہیں تھا۔ میں اچھے نمبر لے لیتی' مر مر کر میرٹ پہ آجاتی مگر میں ٹاپ کبھی نہ کر سکتی کیونکہ مجھے ان کورین ڈراموں نے پڑھائی سے دور کر دیا تھا۔ علیشا کے خط نے مجھے بتایا کہ میں کتنی بُری ہوں۔ تب بھی میں نے سوچا' میں فاروق صاحب سے معافی مانگ لوں گی' اور بس۔ سو علیشا کے خط کے بعد میں نے ان کے گھر فون کیا' تو ان کی بیٹی نے بتایا' جس دن میرا رزلٹ آیا تھا' اس روز میرا فون سننے کے بعد وہ اسٹڈی ٹیبل پہ گئے' اپنا استعفیٰ لکھا' دستخط کیے اور سر وہیں میز پہ رکھ دیا۔ حمیرا ان کو ہلانے گئی مگر تب تک وہ مر چکے تھے۔ وہ مر گئے بھائی۔ برسوں اس نازک عہدے کی دودھاری تلوار پہ ایمان داری سے چلے تھے' ان کو میں نے کاٹ کر رکھ دیا۔ میں نے اس شخص کی جان لے لی۔ میں کون ہوں بھائی؟ میں کون ہوں؟"

وہ گھٹنوں پہ سر رکھے' روئے جا رہی تھی۔ اور وہ سامنے' بالکل چپ بیٹھا تھا۔ بہت دیر بعد وہ ذرا سنبھلی' سر اٹھایا' ہتھیلی کی پشت سے گیلا چہرہ صاف کیا۔

"میں اب ایڈمیشن نہیں لوں گی۔ ہر گناہ توبہ سے معاف نہیں ہو جاتا۔ بڑے گناہوں کے بڑے کفارے ہوتے ہیں۔ یہ مت کہنا میں دوبارہ امتحان دے دوں۔ میں ان کتابوں کو دوبارہ کھول بھی نہیں سکتی' پڑھنا تو دور کی بات۔" وہ ان پرزہ پرزہ کاغذوں کے مزید ٹکڑے کرنے لگی۔ پھر نظریں اٹھا کر بھائی کو دیکھا۔ وہ بالکل چپ تھا۔

"کچھ تو کہیں۔"

"مجھے تم سے کچھ نہیں کہنا۔" کہتے ہوئے وہ اٹھا' اور دبے قدموں سے چلتا ہوا باہر نکل گیا۔ حنین کا سر مزید جھک گیا اور بہتے آنسوؤں میں روانی آ گئی۔ بڑے گناہوں کے بڑے کفارے۔

☆ ☆ ☆

قصر کاردار پہ سہ پہر سرما کی ٹھنڈ اور خنکی اندر

سموئے اتر رہی تھی۔ لاؤنج کی دیوار گیر کھڑکیوں کے پردے ہٹے تھے' باہر کی روشنی نے سارے لاؤنج کو روشن کر رکھا تھا۔ ملازم کاموں میں لگے آجا رہے تھے۔ ایسے میں اونچی کھڑکی کے آگے جواہرات کھڑی تھی۔ مغربی طرز کا سیاہ گھٹنوں تک آتا لباس اور سیاہ ٹائیٹس میں ملبوس' سینے پہ بازو لپیٹے' دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے بائیں کہنی پہ مسلسل دستک دیتی' اس کی شہرنی سی آنکھیں باہر جمی تھیں جہاں سبزہ زار پہ سعدی چل کر آتا دکھائی دے رہا تھا۔

آج اورنگ زیب کی وفات کو ساتواں روز تھا اور اس دوران وہ کئی دفعہ جواہرات کا حال پوچھنے آچکا تھا۔ مگر اس آخری ملاقات میں' وہ جواہرات کا اس کے سامنے اول فول بول دینا' وہ اس کا میری سے بات کرنا' وہ جواہرات کو ابھی تک چبھ رہا تھا۔

اور پھر اس کی تیکھی نظروں میں مزید ناگواری ابھری۔ سبزہ زار پہ چل کر آتا سعدی درمیان میں رکا۔ میری جوتڑے اٹھائے گزر رہی تھی' اس کے مخاطب کرنے پہ رک کر اس سے بات کرنے لگی۔ جواہرات کو الفاظ آتنی دور سے سنائی نہیں دے رہے تھے مگر اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

"کیا اس کو اپنے گھر میں چین نہیں جو روز چلا آتا ہے۔" عقب میں نوشیرواں نے کہا تو وہ چونک کر پلٹی۔ وہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا ناگواری سے کھڑکی کے پار سعدی کو دیکھ رہا تھا۔

"اب مجھے برا بھلا مت کہے گا کہ میں نے آپ کے دوست کی شان میں گستاخی کردی۔" ساتھ ہی اکتائے ہوئے انداز میں ہاتھ اٹھا دیے کہ وہ ڈانٹ سننے کے موڈ میں نہیں ہے۔ جواہرات چند لمحے اسے دیکھتی رہی' پھر مڑ کر کھڑکی کو دیکھا۔ نیچے کھڑے سعدی اور میری اینجیو ہنوز محو گفتگو تھے۔ میری کچھ کہے یا نہیں' جو وہ اس دن خود اتنا کچھ کہہ چکی' وہ بھی خطرناک تھا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو' اسے یہاں ہر وقت نہیں آنا چاہیے۔ تو پھر کیوں نہ اس کا اس گھر میں داخلہ بند کردوں؟" چمکتی ہوئی آنکھوں سے مسکراتی وہ شیرو کی طرف گھومی۔ سات دن بعد وہ بالآخر سنبھلی ہوئی' پرانی والی جواہرات لگ رہی تھی۔

نوشیرواں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "آپ کیا کریں گی؟"

"جو میں کروں گی' وہ تمہارے بھائی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ سمجھے؟"

نوشیرواں کو چند لمحے لگے اس کا مطلب سمجھنے میں' اور پھر اس کا سر خود بخود اثبات میں ہل گیا۔ "سمجھ گیا۔"

"میرے ساتھ آؤ۔" وہ ایڑیوں پہ گھومی اور تیز تیز قدم اٹھاتی آگے چلتی گئی۔ اس کا رخ باہر کی جانب تھا۔ شیرو تیزی سے پیچھے لپکا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

تمثیلہ زاہد

وقت پر اگر بات سمجھ میں نہ آئے تو بندہ خالی چائے کا کپ لیے ساری زندگی کھڑا رہ جاتا ہے لیکن جو بات سمجھنا ہی نہ چاہے وہ۔۔۔!

وہ اپنے لب کچل کر رہ گئی۔ کچن کاؤنٹر پر کھڑے کھڑے ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ کب خالی ہو گیا، اسے خبر ہی نہ ہوئی اس نے چولہے کی طرف دیکھا، پتیلی میں رکھا پانی ابل کر اب گرنے لگا تھا۔ اس نے چولہا بند کر دیا۔ ہاتھ میں تھاما خالی کپ کچن کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ کھڑکی سے باہر آسمان کو تکنے لگی۔ جہاں صبح سے ہی بادل چھائے ہوئے تھے۔ موسم خوش گوار تھا۔ ہوا بھی خوب چل رہی تھی، لیکن جب دل کا موسم خزاں رسیدہ ہو تو یہ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے۔۔۔

اس نے ایک لمبی گہری سانس خارج کی۔ اس سے آگے وہ کچھ اور سوچنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ ایک ناپسندیدہ شخص جو اس کی زندگی میں شامل تھا۔ وہ اس سے یہ بھی نہ کہہ سکتی تھی وہ اسے پسند نہیں۔ نہ جانے اس کے آگے زبان گنگ کیوں ہو جاتی۔ یہ تو وہی زبان ہے، جو بقول اماں، بہنوں کے اچھے اچھوں کی چھٹی کر دے۔ پھر آخر اس زبان کو تالے اسی کے آگے کیوں لگ جاتے تھے۔۔؟

وہ اپنے ناخن بے دردی سے کترنے لگی پھر دھیرے سے اپنے شولڈر کٹ بالوں کو سہلانے لگی۔ اچانک ڈور بیل بجی۔ اس نے دیکھا نو بج چکے تھے۔

"ماسی آئی ہو گی۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے دروازہ کھولنے کے لیے بڑھی۔

"سلام باجی!"

"وعلیکم السلام!" سدرہ نے اس کے جھلملاتے سرخ سوٹ پر ایک تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے کہا تو وہ شرمندہ سی ہو کر مسکرا کر بولی۔

"کل میری سالگرہ تھی باجی! نادر کا ابا زبردستی گھمانے پھرانے باہر لے گیا۔ یہ جوڑا دلایا اور صدر سے کھانا بھی کھلایا۔ کہہ رہا تھا۔ میں جوڑا پہن کے جاؤں۔" وہ شرماتے ہوئے بول رہی تھی۔ سدرہ اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اب جھاڑو سنبھال کر کمرے کی روز مرہ صفائی میں مشغول ہو چکی تھی۔

"کیا قسمت پائی ہے صفورہ بی بی نے۔۔۔ شادی کے دس سال بعد بھی میاں، بیگم کے چونچلے اٹھا رہا ہے اور یہاں دس ماہ کی شادی میں ایک بار بھی میاں جی کو باہر کھانا کھلانے یا گھمانے پھرانے کی توفیق نہ ہوئی ہے۔" وہ فادر کشن پر بیٹھی خود کو کوس رہی تھی۔ اس کی دکھتی رگ پر آج کسی نے ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"بی بی جی! ایک بات کہوں برا نہ ماننا۔" ماسی صفورہ پھرتی سے کام کرتے ہوئے بولی۔

"ہاں کہو!" اس نے مختصراً" کہا۔

"بی بی جی! تم بولتی بہت کم ہو۔ بولا کرو جو دل میں آئے کہہ دیا کرو۔ اندر ہی اندر چپ رہنے والی عورتوں کو مرد پسند نہیں کرتے۔"

"صفورہ بی بی سامنے والا ہی نہ بولے تو کیا اکیلے ہی چڑیوں کی طرح چہچہاتے رہیں۔" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

"نہ جی نہ۔۔۔ آپ بولا کرو۔ کبھی نہ کبھی آپ کا مرد بھی بولے گا۔" صفورہ کی نظریں اسے نہ جانے کیا کیا پیغام دے رہی تھیں، وہ پچھلے دس ماہ سے اس کے گھر کے کام کر رہی تھی ان میاں بیوی کے سرد مزاجوں

سے بھی شاید واقف ہو چکی تھی۔

"یا اللہ ہم دونوں کے درمیان پہلے دن سے جو فاصلے ہیں۔ کیا اب وہ لوگوں کو بھی دکھنے لگے ہیں۔ بعض باتیں انسان کے اختیار میں ہونے کے باوجود اختیار سے باہر ہوتی ہیں۔"

"باجی! کیا آج کپڑے دھونے ہیں۔" ماسی صفورہ کی آواز پر اس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹا تھا۔

"نہیں کل دھو لینا۔" اس نے مختصراً کہا پھر کچھ سوچ کر فریزر سے چکن نکالی۔ چکن بریانی سعد کو پسند تھی۔ ماسی صفورہ کی باتیں اس کے دماغ میں حرف بہ حرف گونج رہی تھیں۔

رات کے اچھے سے ڈنر کے لیے اس نے اپنا کام تیزی سے کرنا شروع کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

باہر ــــ موسلادھار بارش ہو رہی تھی۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ وہ خوش تھی سعد نے بریانی مزے لے لے کر کھائی تھی۔ میٹھے میں ٹرائفل نے مزہ دوبالا کر دیا تھا۔ سعد مسکرا کر یہ سب چیزیں نوش کر رہا تھا، لیکن تعریف کے دو بول سننے کی منتظر سدرہ اسی بات مطمئن تھی کہ آج اس نے خود سے چائے مانگی تھی۔ ورنہ جب اس کا موڈ ہوتا وہ خود ہی بنا کر پی لیتا تھا۔ وہ بھی پروا نہ کرتی۔

سدرہ نے کیتلی سے چائے کپ میں انڈیلی اور ایک دھیمی مسکان لبوں پر سجائے ایک خوش گوار احساس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ گرم گرم چائے کا کپ تھامے سعد کو کتاب میں غرق دیکھ کر اس کے منہ کا زاویہ کچھ ٹیڑھا ہو گیا۔

"عجیب بقراط، افلاطون کی نسل کا بندہ میرے پلے پڑ گیا ہے۔ جب دیکھو کتابوں میں غرق رہتا ہے۔ اتنی اچھی کتاب دس ماہ سے اس کے ہمراہ ہے۔ ایک بار بھی پڑھنے کی توفیق نہ ہوئی۔" وہ بڑبڑائی۔

"آپ نے کچھ فرمایا؟" سعد نے اپنا جھکا سر اٹھایا تو وہ گڑبڑا سی گئی۔

"نہیں ــ نہیں ــ یہ چائے۔" بے ربط لفظ بولتے ہوئے گھبرا کر چائے کا کپ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس اثناء میں چائے کا کپ اس کے کپکپاتے ہاتھوں سے چھلک گیا اور سعد کی سفید شرٹ کو داغ دار کر گیا۔

"یہ کیا احمقانہ حرکت ہے۔ آنکھیں ہیں یا بٹن، محترمہ آنکھیں کھول کر دیکھا کریں۔" وہ غصے سے دھاڑا تھا۔

"معاف کردیں۔" وہ منمنائی تھی، لیکن وہ لمبے لمبے قدم اٹھاتا ڈرائنگ روم سے نکل کر واش روم میں گھس گیا تھا وہ اس کی پشت تکتی رہ گئی۔

"اللہ جانے کیسا شخص ہے۔ آدم بے زار کہیں کا۔ جب بھی کچھ بہتر کرنے کی کوشش کرتی ہوں الٹا ہی اثر ہوتا ہے موصوف پر۔ خوش مزاجی تو چھو کر نہیں گزری۔ محترم سڑی ہوئی طبیعت کے مالک کیوں نہ ہوں سنا ہے۔ خالہ بھی ایسی ہی تھیں۔ الگ تھلگ اپنی دنیا میں مگن رہنے والی۔ اماں کی عادات و خصائل آنے ہی تھے۔ چوبیس گھنٹوں میں سولہ گھنٹے اپنے آفس کی نذر کردیتے ہیں، باقی بچے گھنٹوں میں آدھے سے زیادہ سونے یا پھر کتابوں کی ورق گردانی کرنے میں گزار دیتے ہیں۔ نئی نویلی بیگم سارا دن روبوٹ کی طرح گھر کا کام کرے اور اگر شوہر سے اچھی باتیں کرنے کو دل چاہے تو شوہر صاحب کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں۔"

ڈرائنگ روم میں قالین پر بیٹھی وہ خود ہی کو جلی کٹی سنا رہی تھی۔ آدھا گھنٹہ موصوف کا انتظار کرتے گزر گیا چائے کا کپ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ کتنی خوشی سے اس نے یہ چائے تیار کی تھی۔ سوچا تھا ماسی صفورہ کے کہنے پر شوہر سے دل کی باتیں کہنے کی کوشش کرے گی۔ وہ تمام باتیں کہہ ڈالے گی جو اس کے دل میں ہیں، بدگمانیوں کی دیواریں نہ چاہتے ہوئے بھی کبھی ہوتی چلی جارہی تھیں، انہیں گرانے کی ایک کوشش ضرور کرے گی، لیکن یہ کیا... چائے کے چند چھینٹوں نے خوش گواریت کی جو فضا قائم ہونے جارہی تھی، سب ختم کردی۔ دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے اپنے کمرے میں قدم رکھا تھا۔ موصوف زیرو بلب تلے بے سدھ سوئے ہوئے تھے۔

"چائے کے چند چھینٹوں سے کیسے چراغ پا ہو کر یہ شخص بھاگا تھا۔" اس کا دل چاہا چائے کا باقی ٹھنڈا کپ اس کے وجود پر انڈیل دے۔ غصے میں اس نے کچن میں جاکر سنک میں چائے کا کپ انڈیل دیا اور پھر اپنے بستر پر آکر لیٹ گئی۔ اس نے اپنے برابر سوئے بے حس وجود کی طرف نظر ڈالی۔ ان دونوں میں کچھ بھی مماثل نہ تھا۔ دونوں کے مزاجوں میں مماثلت نہ ہونے کی بنا شاید اتنے فاصلے تھے۔

سعد اس کا خالہ زاد کزن تھا۔ خالہ اور خالو بہت پہلے دبئی شفٹ ہوگئے تھے، سعد ساتویں جماعت کا طالب علم تھا جب خالو کو دبئی سے نوکری کی کال آگئی تھی۔ وہ لوگ ایک لمبے عرصے بعد پاکستان شادی ہی کی غرض سے آئے تھے۔ سعد پاکستان میں رہنا چاہتا تھا۔ خالہ کی دونوں بیٹیوں کی شادی دبئی میں ہی ہوئی۔ ان کا وہاں اپنا سیٹ اپ تھا جسے چھوڑ کر آنا ممکن نہ تھا۔ سعد کی مرضی کے مطابق اسے یہیں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھی آفر آگئی۔ شادی کرکے خالہ کی فیملی واپس دبئی چلی گئی۔

شادی کے پہلے دن سعد کو دیکھ کر اسے شدید دھچکا پہنچا۔ اس کی داڑھی، لباس اور سنجیدہ اطوار نے اسے ذہنی شاک دیا تھا۔ وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچی تھی۔ اس کے دل و دماغ میں جو تصویر اپنے ہونے والے اسمارٹ سے شوہر کی تھی، اس سے بالکل جدا تھا۔ وہ خود ایک شوخ مزاج لڑکی تھی اس کے خوابوں کے سارے رنگ بکھر گئے۔ باہر سے آنے والے کزن کے بارے میں سہیلیوں نے کیسی کیسی رائے نہ دی تھی، لیکن سعد تو یکسر مختلف نکلا۔ سدرہ کی صبح کا آغاز فاسٹ میوزک سے ہوتا تھا۔ سعد فجر کی نماز کے بعد قرآن کی تلاوت ضرور کرتا۔

سعد نے اس کی زندگی کے سارے رنگ آہستہ آہستہ بدل ڈالے تھے۔ وہ بھی بنا چوں چراں کیے جو کبھی نماز کی طرف راغب نہ تھی۔ اب نماز پڑھنے لگی تھی۔ سعد حد سے زیادہ سنجیدہ میچور انسان تھا۔ اس کی بارعب شخصیت کے آگے سدرہ کی زبان کو تالا لگ جاتا تھا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی دل کی باتوں کو زباں نہ دے پاتی تھی۔ دل ہی دل میں کڑھتی رہتی۔

"خالہ خود تو دبئی میں مزے سے ہیں۔ مجھے یہ نمونہ تھما گئی ہیں۔"

وہ کڑھتے ہوئے سوچ رہی تھی پھر نہ جانے کب نیند اس کے حواسوں پر چھانے لگی۔

☼ ☼ ☼
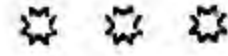
رائل بلیو۔۔۔ نفیس کام سے آراستہ سوٹ پر میچنگ جیولری اور ہلکے نفیس میک اپ سے سجی سنوری آج خلاف معمول سدرہ فریش لگ رہی تھی۔ آئینہ میں اس کا سراپا اچھا لگ رہا تھا۔ وہ خود کو سراہتی نظروں سے جانچ ہی رہی تھی کہ سعد کی گاڑی کے ہارن کی آواز آئی۔ وہ تیزی سے اپنے شولڈر کٹ بالوں کو برش کا آخری ٹچ دیتی پلٹی تھی۔ پھر پرس سنبھالے باہر کی جانب بڑھ گئی۔ شام کو سعد نے اسے ٹھیک آٹھ بجے تیار ہونے کا حکم صادر فرمایا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی امی کی طرف گئے کافی دن گزر گئے ہیں وہیں لے جانا مقصود ہوگا۔ پھر دونوں کے درمیان پچھلے ڈیڑھ ماہ سے خاموشی کی فضا تھی۔ کیا معلوم یہ "عنایت" اس "خاموشی" کا قفل توڑنے کی ایک کڑی ہو۔ اس کو خوش کرنے کی خاطر اسے میکے لے جایا جا رہا ہے۔ وہ یہی سوچ کر فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔

"یہ راستہ امی کے گھر کا تو نہیں۔" دس منٹ کی خاموشی کے بعد دوسرے راستوں پر۔۔۔ گاڑی کو جاتے دیکھ کر سدرہ چونک کر بولی۔

"ہم امی کی طرف نہیں جا رہے ہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"ہائیں۔۔۔ لیکن کیوں؟" وہ گھبرا کر بولی۔

"کیا ہو گیا محترمہ! گھبرا کیوں رہی ہیں۔ میں آپ کو بھگا کر نہیں لے جا رہا۔ شوہر ہوں اپنی مرضی کا مالک ہوں، جہاں دل کرے گا لے جاؤں گا۔" وہ گاڑی کو بریک لگا کر بولا۔ وہ حیران پریشان کبھی سعد کو اور کبھی سامنے لگے سرخ سگنل کو دیکھنے لگی۔ سعد نے راہ چلتے ایک بچے کو اشارے سے بلایا۔ اس بچے کے ہاتھ میں اسٹک تھی جس میں ڈھیروں گجرے لٹک رہے تھے۔ گجرے خرید کر وہ بے حد اطمینان سے سدرہ کے گود میں رکھے ہاتھوں میں پہنانے لگا۔ سدرہ کو جیسے کسی کرنٹ نے چھو لیا۔ اس نے جھٹکے سے اپنے ہاتھ پیچھے کرلیے لیکن سعد نے پھرتی سے ایک ہاتھ کی کلائی اپنی گرفت میں لے لی اور دونوں گجرے پہنا دیے۔

"چھوڑیں میرا ہاتھ۔" وہ منمنائی۔

"کیوں برا لگ رہا ہے؟" وہ شرارت سے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔

"نہ۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں۔۔۔ وہ" وہ ہکلانے لگی تو سعد کے قہقہے نے اسے گنگ کر دیا۔

"یعنی اچھا لگ رہا ہے۔"

"آپ نے پہلے کبھی۔۔۔"

"جانتی ہیں۔ آج ہماری شادی کی پہلی سالگرہ ہے، مبارک ہو آپ کو۔" اس نے سرگوشی کی۔ سدرہ اس کے اس نئے روپ کو پہلی دفعہ دیکھ رہی تھی۔

"آپ نے بتایا نہیں۔" وہ بہ مشکل بولی۔

"آپ کو پوچھنے کی عادت نہیں۔ مجھے بتانے کی عادت نہیں، بہرحال۔ آج سے ہم نئی زندگی شروع کرنے جا رہے ہیں۔ میاں بیوی میں ذہنی ہم آہنگی نہ ہو تو زندگی پل صراط بن جاتی ہے۔ میں صرف آپ کو تھوڑا "سبق" دے کر زندگی کے اصل معنی و مفہوم سے روشناس کروانا چاہتا تھا۔ مجھے شادی کے پہلے دن آپ کے سرد رویے سے شاک پہنچا تھا۔ ضروری نہیں آزاد فضا میں پلنے بڑھنے والے آزاد خیال ہی ہوں۔ ہمیں اپنی سوچ بدلنی ہوگی۔ مسلمان چاہے کہیں کا رہنے والا ہو اپنے عادات و اطوار سے مسلمان ہی لگنا چاہیے۔ ویسے شادی کے اس عرصے میں تمہارے بارے میں اتنا ضرور سمجھ گیا ہوں کہ تم نہایت احمق اور جذباتی لڑکی ہو، لیکن اب بہتر ہوگئی ہو۔۔۔" وہ شادی مرگ کی کیفیت میں اس کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ اس کے نرم لہجے میں مکمل بھیگ چکی تھی۔

آج اس پر ادراک ہوا تھا اس کا شوہر اپنی شدتوں اور چاہتوں کا اظہار جانتا ہے۔ چھوٹی سی بات نے اسے اتنا عرصہ اپنے شوہر سے بدگمان رکھا۔ سعد نے اس کی بھیگی آنکھیں دیکھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانے لگے۔ ☼

تنزیلہ ریاض

عہدِ الست

نور محمد برطانیہ میں رہائش پذیر ہے اور لوٹن کی جامع مسجد میں موذن ہے۔ پیسے والا اور خوب دل والا ہے۔ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتا ہے۔ جس کا ایک کمرا ایک عربی طالب علم اپنے دوست کے ساتھ شیئر کرتا ہے جبکہ دوسرے کمرے میں اس کے ساتھ ایرانی زین العابدین رہتا ہے۔ اسے اپنے ایرانی ہونے پر فخر ہے۔ وہ برطانیہ میں اسٹڈی ویزے پر جاب کرتا ہے۔ سخت محنتی ہے مگر پاکستان میں موجود بارہ افراد کے کنبے کی کفالت خوش اسلوبی سے نہیں کرپارہا۔

عمر شہوز کا کزن ہے، جو اپنی فیملی کے ساتھ انگلینڈ میں مقیم ہے۔ وہ لوگ تین چار سال میں پاکستان آتے رہتے ہیں۔ عمر اکثر اکیلا بھی پاکستان آجاتا ہے۔ وہ کافی منہ پھٹ ہے۔ اسے شہوز کی دوست امائمہ اچھی لگتی ہے۔ شہوز کی کوششوں سے ان دونوں کی منگنی ہوجاتی ہے۔

ڈاکٹر زارا شہوز کی سادہ مزاج منگیتر ہے۔ ان کی منگنی بڑوں کے فیصلے کا نتیجہ ہے۔ ان دونوں کے درمیان محبت ہے لیکن شہوز کے کھلنڈرے انداز کی بنا پر زارا کو اس کی محبت پر یقین نہیں ہے۔

اس کے والد نے اسے گھر پر پڑھایا ہے اور اب وہ اسے بڑی کلاس میں داخل کرانا چاہتے ہیں۔ سر شعیب انہیں منع کرتے ہیں کہ ان کا بچہ بہت چھوٹا ہے۔ اسے چھوٹی کلاس میں ہی داخل کروائیں مگر وہ مصر رہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے بچے پر بہت محنت کی ہے۔ وہ بڑی کلاس میں داخلے کا مستحق ہے۔ سر شعیب اسے بچے پر ظلم سمجھتے ہیں مگر اس کے باپ کے

مکمل ناول

اصرار پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ وہ بچہ بڑی کلاس اور بڑے بچوں میں ایڈجسٹ نہیں ہو پاتا۔ اسکالرشپ حاصل کرنے والے اس بچے سے حیرت انگیز طور پر ٹیچرز اور فیلوز میں سے بیشتر ناواقف ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ اس کے باپ کی طرف سے غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر سخت مخالفت ہے۔

وہ خواب میں ڈر جاتا ہے۔

73ء کا زمانہ تھا اور روپ نگر کا علاقہ۔

بلی انڈیا میں اپنے گرینڈ پیرنٹس کے ساتھ آیا تھا۔ اس کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ برطانیہ کے رہنے والے تھے۔ گرینڈ پا یہاں کسی پروجیکٹ کے سلسلے میں آئے تھے۔ گرینی نے یہاں کوچنگ سینٹر کھول لیا تھا۔ یتارا (؟) اس کے ہاں پڑھنے آتی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ ماس مچھی کھانے والے کسی کے دوست نہیں بن سکتے۔ وہ وفادار نہیں ہو سکتے۔ گرینڈ پا کو بتایا۔ وہ اسے سمجھاتے ہیں کہ قدرت نے ہمیں بہت محبت سے تخلیق کیا ہے اور ہماری فطرت میں صرف محبت رکھی ہے۔ انسان کا اپنی ذات سے اخلاص ہی اس کی سب سے بڑی وفاداری ہے۔

امائمہ کے کسی رویے پر ناراض ہو کر عمر اس سے انگوٹھی واپس مانگ لیتا ہے۔ زارا شہوز کو بتاتی ہے۔ شہوز اور عمر کا جھگڑا ہو جاتا ہے۔

اس کی کلاس میں سلیمان حیدر سے دوستی ہو جاتی ہے۔ سلیمان حیدر بہت اچھا اور زندہ دل لڑکا ہے۔ سلیمان کے کہنے پر پڑھائی کے ساتھ ساتھ کھیل میں بھی دلچسپی لینے لگتا ہے۔ وہ اپنے گھر جا کر ای سے بیٹ کی فرمائش کرتا ہے تو اس کے والد یہ سن لیتے ہیں، وہ اس کی بری طرح پٹائی کر دیتے ہیں۔ ماں بے بسی سے دیکھتی رہ جاتی ہیں۔ پھر اس کے والد اسکول جا کر منع کر دیتے ہیں کہ سلیمان حیدر کے ساتھ نہ بٹھایا جائے۔ سلیمان حیدر اس سے ناراض ہو جاتا ہے اور اسے ابنارمل کہتا ہے۔ جس سے اس کو بہت دکھ ہوتا ہے۔

کلاس میں سلیمان حیدر پہلی پوزیشن لیتا ہے۔ پانچ نمبروں کے فرق سے اس کی سیکنڈ پوزیشن آتی ہے۔ یہ دیکھ کر اس کے والد غصے سے پاگل ہو جاتے ہیں اور کمرا بند کر کے اسے بری طرح مارتے ہیں۔ وہ وعدہ کرتا ہے کہ آئندہ پینٹنگ نہیں کرے گا۔ صرف پڑھائی کرے گا۔

اس کے والد شہر کے سب سے خراب کالج میں اس کا ایڈمیشن کراتے ہیں۔ تاکہ کالج میں اس کی غیر حاضری پر کوئی کچھ نہ کہہ سکے اور اس سے کہتے ہیں کہ وہ گھر بیٹھ کر پڑھائی کرے۔ باہر کی دنیا سے اس کا رابطہ نہ ہو۔ اس کا کوئی دوست نہیں ہے۔

امائمہ کی والدہ شہوز کو فون کرتی ہیں۔ شہوز کے سمجھانے پر عمر کو عقل آجاتی ہے اور وہ اپنے والد کو فون کرتا ہے۔ جس کے بعد عمر کے والد امائمہ کے والد کو فون کر کے کہتے ہیں کہ بچوں کا نکاح کرا دیا جائے۔ دونوں کے والدین کی رضامندی سے عمر اور امائمہ کا نکاح ہو جاتا ہے۔ نکاح کے چند دن بعد عمر لندن چلا جاتا ہے۔

نکاح کے تین سال بعد امائمہ عمر کے اصرار پر اکیلے ہی رخصت ہو کر لندن چلی جاتی ہے۔ لندن پہنچنے پر عمر اور اس کے والدین امائمہ کا خوشی خوشی استقبال کرتے ہیں۔

امائمہ عمر کے ساتھ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں آجاتی ہے جبکہ عمر کے والدین اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔ امائمہ عمر اتنے چھوٹے فلیٹ میں رہنے سے گھبراتی ہے اور عمر سے اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے عمر کے والدین کے گھر رہنے کو کہتی ہے جسے عمر یہ کہہ کر رد کر دیتا ہے کہ وہ اپنے والدین پر مزید بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔

اس شخص کے شدید اصرار پر نور محمد اس سے ملنے پر راضی ہو جاتا ہے۔ وہ اس سے دوستی کی فرمائش کرتا ہے۔ نور محمد انکار کر دیتا ہے، لیکن وہ نور محمد کا پیچھا نہیں چھوڑتا ہے۔ وہ نور محمد کی قرات کی تعریف کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس نے نماز پڑھنا نور محمد سے سیکھا ہے۔ پھر وہ بتاتا ہے کہ اسے نور محمد کے پاس کسی نے بھیجا ہے۔ نور محمد کے پوچھنے پر کہتا ہے۔ خضر الہٰی نے بھیجا ہے۔

روپ نگر سے واپس برطانیہ آنے پر گرینڈ پا کا انتقال ہو جاتا ہے اور گرینی مسٹر ایرک کی دوستی بڑھنے لگتی ہے۔ وہ بلی سے

تعلق نہیں ہے۔" پہلی بار اس کی ماں بھی کہہ اٹھتی ہیں کہ اس سے بہتر تھا کہ وہ مرجاتا۔ نور محمد' احمد معروف کو اپنے بارے میں سب بتادیتا ہے۔ جسے سن کر احمد معروف کا دل بوجھل ہوجاتا ہے اور اسے نور محمد کو سنبھالنا مشکل لگتا ہے۔
بلی ثنا کو بے حد چاہتا ہے' لیکن وہ انتہائی خود غرض' مطلب پرست اور چالاک لڑکی ہے۔
بلی کے گھر فیملی فرینڈ عوف بن سلمان آتا ہے۔ جس کا تعلق سعودی عرب سے ہے۔ عوف کو فوٹو گرافی کا جنون کی حد تک شوق ہوتا ہے۔ بلی عوف سے ثنا کو ملواتا ہے۔ ثنا' عوف سے مل کر بہت خوش ہوتی ہے۔ عوف اپنے کیمرے سے رقص کرتی ثنا کی بہت سی خوب صورت تصویریں کھینچ لیتا ہے۔ عوف اور ثنا تصویروں کو فرانس میں ہونے والی کسی تصویری مقابلے میں بھیج رہے تھے۔ بلی' ثنا کو ایسا کرنے سے روکنا چاہتا ہے۔ لیکن ثنا اس بات پہ بلی سے ناراض ہوجاتی ہے۔
عوف بتاتا ہے کہ وہ ثنا جیسی بناوٹی' خود پسند لڑکی کو بالکل پسند نہیں کرتا۔
بلی کو پتا چلتا ہے کہ اس کی ماں کو ہوکے عوف سے تعلقات ہیں' زارا کے والدین زارا اور شہوز کی شادی جلد از جلد کرنا چاہتے ہیں' جبکہ شہوز ایک ڈیڑھ سال تک شادی نہیں کرنا چاہتا ہے' کیونکہ اس نے ایک مشہور اخبار کا چینل جوائن کر لیا ہے اور اسے اپنی جاب کے علاوہ کسی چیز کا ہوش نہیں رہا ہے۔ شہوز' زارا سے کہتا ہے کہ جب تک وہ اسے شادی کرنے کے لیے گرین سگنل نہیں دیتا اس وقت تک وہ پھپھو (یعنی اپنی والدہ) کو اس کے ڈیڈی سے شادی کی بات کرنے سے روک کر رکھے۔ زارا کے لیے یہ ساری صورت حال سخت اذیت کا باعث بن رہی ہے۔
امائمہ' نور محمد کی بہن ہے۔ امائمہ کی ماں نے اس کی شادی عمر سے اسی لیے کی تھی کہ وہ لندن جاکر بھائی کو ڈھونڈے۔ وہ عمر کے علم میں لائے بغیر بھائی کو ڈھونڈنے کی کوششیں کرتی ہے' مگر عمر کو پتا چل جاتا ہے۔ امائمہ یہ جان کر حیران رہ جاتی ہے کہ عمر' نور محمد کو جانتا ہے۔ وہ اس کا ساتھ دیتا ہے۔ ثنا رقاصہ بن چکی ہے مگر غلط ہاتھوں میں چلی جاتی ہے اور اپنا بہت نقصان کرکے بلی کو ملتی ہے۔ بلی اس وقت تک ایک کامیاب ناول نگار بن چکا ہے۔ وہ دونوں شادی کرلیتے ہیں۔ ثنا کو بچوں کی خواہش ہوتی ہے۔ کافی علاج کے بعد انہیں خوش خبری ملتی ہے' مگر ثنا کے مس کیرج ہوجاتا ہے۔ ثنا خودکشی کرلیتی ہے۔
بلی کو کچھ لوگ مجبور کرتے ہیں کہ مسلمان دہشت گردوں کے خلاف ناول لکھے۔ وہ لوٹن کی مسجد کے موذن کے خلاف بات کرتے ہیں کہ وہ مسلمان دہشت گرد ہے۔ بلی اس موضوع پر ناول لکھنے کی تیاری کرتا ہے اور اس سلسلے میں نور محمد سے ملتا ہے۔ نور محمد سے احمد معروف کے نام سے ملنے والا شخص بل گرانٹ ہی ہے' مگر نور محمد سے مل کر اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے خلاف کی گئیں ساری باتیں غلط ہیں۔ وہ نور محمد سے متاثر ہونے لگتا ہے۔ کیونکہ وہ اسے اپنے سارے حالات بتا چکا ہوتا ہے کہ کس طرح اس کا باپ اس پر پڑھائی کے معاملے میں سختی کرتا تھا۔ کس طرح اکیڈمی سے نکالنے پر وہ دلبرداشتہ ہوا' پاگل ہوا۔ پھر اس کے ماموں اپنے ساتھ لندن لے آئے۔ وہاں انہوں نے اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھایا اور اپنی بگڑی ہوئی بیٹی ثریا سے شادی کردی' جو پانچ ماہ بعد ہی ماں بن گئی۔ نور محمد نے سب کچھ سمجھنے کے باوجود اس بچی سے محبت کی۔ اسے پالنے لگا۔ مگر جب ثریا نے بخار کی وجہ سے بچی کو برانڈی پلانے کی کوشش کی اور نور محمد کے منع کرنے کے باوجود باز نہ آئی تو تھپڑ مار دیا۔ جس پر ماموں نے اسے خوب لعن طعن کی اور وہ ان کا گھر چھوڑ کر یہاں آگیا۔ ماموں نے اس کے گھر والوں کو کہہ دیا کہ نور محمد ان کے گھر سے چوری کرکے بھاگ گیا ہے۔ تب سے نور محمد اور امائمہ کی ماں پریشان ہیں اپنے شوہر سے بھی بائیکاٹ کرچکی ہیں۔ زارا کی زندگی میں اتفاق سے ٹیپو نامی لڑکا آتا ہے۔ وہ بہت اچھا ہے۔ زارا اس پر بہت بھروسا کرتی ہے۔ شہوز خوب ترقی کررہا ہے۔ اس کی ملاقات عوف بن سلمان سے ہوتی ہے۔ وہ شہوز کو اپنے ساتھ کام کرنے کی آفر دیتے ہیں۔ شہوز بہت خوش ہوتا ہے۔

چودہویں قسط

"نور محمد کو استعمال کیا جارہا ہے" بل گرانٹ نے دہرایا تھا۔
اس کی خاموشی کو بھانپتے ہوئے دوبارہ پرعزم لہجے میں دو ہزار سات کی اس رات کو بالآخر کئی مہینوں کی

کہتی ہیں کہ وہ اپنی ممی سے رابطہ کرے۔ وہ اسے اس کی ممی کے ساتھ بھجوانا چاہتی ہیں۔ بلی انکار کے باوجود وہ کوہو کو بلوا لیتی ہیں اور اسے ان کے ساتھ روانہ کردیتی ہیں۔

میری کالج میں طلحہ اور راشد سے واقفیت ہوجاتی ہے۔

عمر نے اسے پبلک لائبریری کا راستہ بتا دیا ہے۔ عمر کو آرٹ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ لیکن وہ امائمہ کی خاطر دلچسپی لیتا۔ دونوں بہت خوش ہیں۔ لیکن امائمہ وہاں کی معاشرت کو قبول نہیں کرپارہی۔ عمر کی دوست مارتھا کے شوہر نے امائمہ کو گلے لگا کر مبارک باد دی تو اسے یہ بات بہت ناگوار گزری گھر جاکر دونوں میں جھگڑا ہوگیا۔

گرینی کے انتقال کے بعد بلی کوہو کے ساتھ رہنے پر مجبور تھا۔ کوہو پہلے بھی گرینی سے اچھا خاصا معاوضہ وصول کرتی رہی تھی۔ بلی کو اپنے پاس رکھنے کے معاملے پر کوہو نے مسٹر اریک سے جھگڑا کیا کیونکہ گرینی نے انہیں بلی کا نگراں مقرر کیا تھا۔ پھر دونوں نے سمجھوتا کرلیا اور کوہو نے مسٹر اریک سے شادی کرلی۔

نور محمد 'احمد معروف کو اپنے ساتھ گھر لے آیا تھا۔ احمد معروف کے اچھے اطوار 'عمدہ خوشبو 'نفیس گفتگو 'اعلا لباس کے باعث وہ سب اسے پسند کرنے لگے تھے۔ نور محمد بھی اس سے گھل مل گیا تھا۔ احمد نے کہا تھا کہ وہ جہاں رہتا ہے وہاں سے مسجد کافی دور ہے' اس لیے وہ اس کے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ نور محمد بھی اس سے گھل مل گیا تھا۔ احمد نے کہا تھا کہ وہ جہاں رہتا ہے وہاں سے مسجد کافی دور ہے' اس لیے وہ اس کے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ نور محمد اس سے کہتا ہے اسے دنیا سے کوئی دلچسپی نہیں ہے' اس کے لیے اللہ کا دین کافی ہے۔ احمد معروف کہتا ہے۔ "اللہ کا دین تو کیا دنیا اللہ کی نہیں ہے۔" "اسلام کی سب سے اچھی بات یہی ہے' اس میں دنیا کا انکار نہیں ہے۔ آپ دنیا کے ساتھ وہ مت کریں جو ابلیس نے آپ کے ساتھ کیا تھا۔

صبا نورین کالج کی ذہین طالبہ ہونے کے ساتھ ساتھ بہت چالاک بھی تھی۔ صبا نے اس سے صرف نوٹس حاصل کرنے کے لیے دوستی کی تھی۔ اکیڈمی کے لڑکوں طلحہ اور راشد نے اسے دوسرا رنگ دے کر اس کا مذاق بنالیا۔ اس مسئلہ پر لڑائی ہوئی اور نوبت مار پیٹ تک آگئی۔

امائمہ اور عمر میں دوستی ہوگئی لیکن دونوں کو احساس ہوگیا تھا کہ ان کے خیالات بہت مختلف تھے۔

کوہو کے ساتھ رہتے ہوئے بھی زندگی کا محور صرف کتابیں اور اسکول تھا۔ ایک دوست کے ہاں پارٹی میں ایک عرصے بعد اس کی ملاقات بیتا راؤ سے ہوئی۔ وہ اب نیا کہلاتی تھی۔ اس کا تعلق ہندوستان کے ایک بہت اعلا تعلیم یافتہ گھرانے سے تھا۔ وہ رقاصہ کے طور پر اپنے آپ کو منوانا چاہتی تھی اس لیے گھر والوں کی مرضی کے خلاف یہاں چلی آئی تھی۔

احمد معروف کی باتوں سے نور محمد عجیب الجھن میں مبتلا ہوجاتا ہے اور اپنے ذہن میں اٹھنے والے سوالوں سے گھبرا کر احمد معروف کو سوتے میں سے جگا دیتا ہے۔ نور محمد معروف کے سامنے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے اور اسے اپنے ماضی کے بارے میں بتانے لگتا ہے۔

اکیڈمی میں ہونے والی لڑائی کے بعد جنید اور طلحہ کے والدین کے ساتھ نور محمد کے والد کو بھی بلوایا گیا تھا۔ طلحہ اور جنید کے والدین اپنے بیٹوں کی غلطی ماننے کے بجائے نور محمد کو قصوروار ٹھہراتے ہیں جبکہ نور محمد کے والد اس کو موردالزام ٹھہرا کر لاتعلقی ظاہر کرتے ہیں۔ اکیڈمی کے چیئرپرسن حمید کاروانی جنید اور طلحہ کے ساتھ نور محمد کو بھی اکیڈمی سے فارغ کردیتے ہیں۔ نور محمد اکیڈمی سے نکالے جانے سے زیادہ اپنے والد کے رویے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ اسٹیشن کی طرف نکل جاتا ہے۔ ٹرین میں سفر کے دوران نور محمد کی ملاقات سلیم نامی جیب کترے سے ہوجاتی ہے۔ سلیم کو پکڑنے کے لیے پولیس چھاپہ مارتی ہے تو سلیم بھاگنے میں کامیاب ہوجاتا ہے' جبکہ نور محمد کو پکڑ کر پولیس تھانے لے آتی ہے اور پھر نور محمد کے والد پولیس کو رشوت دے کر اسے چھڑا کر گھر لے آتے ہیں۔

بھائی پھیرو سے لاہور تک کے پورے راستے میں نور محمد سے اس کے والد کوئی بات نہیں کرتے۔ لیکن گھر آکر وہ اونچی آواز میں چلا کر غصے کا اظہار کرتے ہوئے اس سے کہتے ہیں کہ "وہ آج سے اس کے لیے مرچکے ہیں اور اس سے ان کا کوئی

نور محمد نے اسے یہی ذمہ داری سونپی تھی۔ اور وہ جی جان سے یہ کرنے کو تیار تھا۔ اس نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ جب بھی اس آخری ناول کو پبلک کرنا چاہیں گے وہ ان کی تمام تر ممکنہ مدد کرے گا۔ اسی لیے نور محمد کی کال نے اسے بہت متحرک کر دیا تھا۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا جوائنٹ وینچر تھا' اور یہ کوئی رپورٹ نہیں تھی' جو وہ ایک فائل میں بند کر کے دے دیتا کہ اسے نشر کر دیا جائے' یا اس پر بحث کر کے اس کی افادیت دنیا کے سامنے ظاہر کی جائے۔ بلکہ یہ ایک ناول تھا جس کا آخری حصہ اس کی معاونت سے لکھا جانا تھا۔ یہ ایک ثبوت تھا ان پردوں کا جو جان بوجھ کر حقائق پر ڈال دیا جاتا تھا۔ یہ ایک فرض تھا جو اسے اپنے ملک کی خاطر ادا کرنا ہی کرنا تھا' سو وہ اسے دنیا کے سامنے لانے سے پہلے ہر طرح سے جانچنا چاہتا تھا کہ غلطی کا امکان کم سے کم رہ جائے۔ اس لیے یہ کام نا صرف اہم بلکہ دلچسپ اور بہت انوکھا بھی تھا۔ اس کے لیے دن رات کی اہمیت ختم ہو کر رہ گئی تھی۔

"نہیں سویا ہوا ہوں۔" امی کے سوال پر وہ ان ہی کے انداز میں بولا تھا۔

اس کی آنکھیں مسلسل ڈیسک ٹاپ پر کام کرنے کے باعث سرخ ہو رہی تھیں' لیکن ابھی بھی اس کا اٹھنے کا ارادہ نہیں تھا۔ وہ ایک بار پھر سے خود کو اس بوجھ کے تلے دبا محسوس کرتا تھا جو کچھ سال پہلے بل گرانٹ کے سامنے بیٹھ کر ان کی باتیں سنتے ہوئے اسے اپنے کندھوں پر محسوس ہوتا تھا۔ امی کی مداخلت اسے فی الحال ذرا نہیں بھائی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ اس کا ارتکاز ٹوٹ گیا تھا بلکہ اس کے دل کا بوجھل پن اس کے چہرے سے جھلک رہا تھا۔ کام کی اہمیت و افادیت اپنی جگہ' لیکن اتنے سالوں بعد بھی حالات کا جوں کا توں ہونا مایوس کن تھا' سو ایک مایوسی تو تھی' جو دل کے کسی کونے سے کبھی کبھی دستک دے کر اسے کمزور کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ اور وہ جانتا تھا اس کی امی کو دنیا میں کسی سے نفرت نہیں تھی سوائے "مایوسی" کے۔۔۔ وہ مایوسی کو کوئی کیفیت نہیں بلکہ جرم سمجھتی تھیں۔ سلمان نہیں چاہتا تھا کہ فی الوقت وہ ان کا سامنا کرے۔

"ساری قوم ہی سو رہی ہے بچے!" اب کی بار آواز زیادہ قریب سے آئی تھی۔ وہ دروازے میں کھڑے رہنے کے لیے اس کے کمرے میں نہیں آئی تھیں۔

سلمان نے مڑ کر دیکھے بنا بھی اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ اس کے بستر پر بیٹھ گئی تھیں۔

"سویا رہنے دیں امی! تہجد فرض نہیں ہے اذان ہونے دیں' نماز کے لیے اٹھ جائیں گے سب۔" یہ ایک ذومعنی بات تھی اور یہ کیسے ممکن تھا کہ اس کی امی اس بات کا جواب نہ دیتیں۔

"امتحان شروع ہے بیٹا اور امتحان آزمائش ہوتا ہے۔۔۔ آزمائش کے دنوں میں' وہ چیزیں جو فرض نہیں ہوتیں' انہیں بھی فرض سمجھ کر ادا کرنا پڑتا ہے۔۔۔ یہی دوراندیشی ہے' کامیابی کی کنجی بھی اور زندگی گزارنے کی درست حکمت عملی بھی۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی تھیں۔

"امی! آپ بھول جاتی ہیں کہ آپ کو ریٹائر ہوئے کافی عرصہ گزر چکا ہے' آپ نے اپنی گریجویٹی بھی ساری خرچ کر دی ہے امتحان' آزمائش' کمرہ جماعت' گوشوارے' حاضری سب کچھ پیچھے رہ گیا ہے' اس لیے آپ بھی لیکچر دینے بند کر دیں۔" وہ چڑ کر بولا تھا۔

امی اس کے عقب میں بیٹھ گئی تھیں اور ڈیسک ٹاپ پر نور محمد کی تصویر والی فائل کھلی تھی۔ وہ اسے ہٹانے کے لیے ماؤس پر کلک کر رہا تھا' لیکن اسکرین جامد ہو گئی تھی۔ امی سے کچھ بھی ڈھکا چھپا نہیں رکھا تھا اس نے' لیکن کام مکمل ہونے سے پہلے کبھی بتایا بھی نہیں تھا۔ ایک منٹ لگا تھا مانیٹر کی اسکرین سے فائل منی مائز ہو گئی تھی۔ وہ ریوالونگ چیئر کو گھما کر ان کی جانب مڑ گیا تھا۔ اس کی پشت نے مانیٹر کا احاطہ کر لیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ میں لیکچر دینا بند کر دیتی ہوں اور تم

محنت کے بعد وہ نوٹن کے ایک چھوٹے سے گھر میں اس حتمی نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ نور محمد واقعی کسی شکنجے میں جکڑا جا چکا ہے۔ کیا؟ کیوں؟ کیسا؟ اور کس لیے؟ جیسے کتنے ہی سوالات ابھی بھی سلمان کے ذہن میں گونج رہے تھے جن کے جوابات اور اس سازش کی بقیہ تمام تر تفصیلات اس بوڑھے سفید فام کے پاس تھیں جو خود ایک پہیلی بن کر اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

پریشان کن بات یہ تھی کہ وہ جس کا خیر خواہ بن کر آیا تھا وہ منظر سے غائب ہو گیا تھا جبکہ اچھی بات یہ تھی کہ بل گرانٹ جو خود کو نور محمد کے خیر خواہ ثابت کرنے کے لیے ہر حد سے گزرنے کو تیار تھے اسے اپنی دلی رضامندی سے سب کچھ بتانے جا رہے تھے۔ اس کی دلچسپی مزید بڑھ رہی تھی۔ اب کی بار وہ متذبذب نہیں تھا اس نے مزید اداکاری کا ارادہ بھی ترک کر دیا تھا۔ اس سے پہلے وہ بل گرانٹ کی صداقت کے بارے میں پُریقین نہیں تھا۔ وہ ان کی باتوں پر سو فیصد یقین کرے یا نہ کرے یہ وہ سوال تھا جو اسے بے چین تو کر رہا تھا لیکن بے چینی پر قابو پا کر ہی دریا کے پار اترا جاتا ہے یہ سبق اسے اچھی طرح سے سکھایا گیا تھا سو اس نے ان پر اعتبار کرنے کا ارادہ کیا تھا۔

"میں آپ کی بات مان لوں تو بھی بے شمار الجھنیں ہیں جو دماغ کو پریشان کر رہی ہیں۔۔۔ یہ سارا معاملہ اتنا پیچیدہ ہے کہ اس کو سمجھنے میں ہی بے حد محنت درکار ہے۔۔۔ میں کسی سے یہ کہہ کر بات ختم نہیں کر سکتا کہ "نور محمد معصوم ہے اور نور محمد کو استعمال کیا جا رہا ہے۔۔۔" ایسا کہنے سے مزید بحث شروع ہو جائے گی اور میں بحث سے کتراتا نہیں ہوں لیکن جب میں خود ہی اس معاملے کی تہہ تک نہیں پہنچ پایا تو کسی کو کیسے سمجھا پاؤں گا۔ آپ کو مجھے وہ سب بتانا پڑے گا جو آپ جانتے ہیں" اس نے بل گرانٹ کے سامنے اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا۔ یہ اس بات کا اظہار بھی تھا کہ وہ ان کی باقی ماندہ باتیں سننے کے لیے حوصلہ رکھتا ہے۔

"آپ اگر اس سارے نظام کو سمجھنا چاہتے ہیں تو آپ کو تحمل کے ساتھ میری ہر بات سننی پڑے گی۔ میں آپ کو ہر تفصیل بتاؤں گا لیکن آپ کو یہ بات بھی سمجھنی ہو گی کہ یہ کوئی راکٹ سائنس نہیں ہے۔۔۔ راتوں رات کچھ نہیں ہونے والا۔ جن لوگوں نے نور محمد کو دہشت گرد ثابت کرنے کے لیے اتنے سال محنت کی ہے۔ وہ اتنی آسانی سے آپ کو دنیا کے سامنے حقیقت فاش نہیں کرنے دیں گے۔ آپ کو صابر اور بے خوف ہونا پڑے گا۔" بل گرانٹ کی یہ بات سلمان کو پسند آئی۔ وہ ہر حال میں اس کے ساتھ تعاون کرنے پر تیار ہو گئے تھے۔ سلمان نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے انہیں بات جاری رکھنے کا اشارہ کیا تھا۔ اس مقام پر وہ مشکلات سے گھبرا کر مر سکتا تھا لیکن پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا۔ اس نے پوری دلجمعی سے اپنی سماعتیں بل گرانٹ کے بیان کی جانب مبذول کر لی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"اب تک جاگ رہے ہو۔" یہ امی کی آواز تھی۔

وہ بہت انہماک سے اپنا کام کر رہا تھا جب امی کی آواز نے سکوت کا تسلسل توڑ ڈالا۔ اس نے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ یقیناً "تہجد ادا کرنے کے لیے اٹھی تھیں اور باتھ روم کے ساتھ ہی چونکہ اس کا کمرہ تھا سو وہ وضو کرنے کے بعد اسے دیکھنے آگئی تھیں۔ وہ آج کل رات کو بہت دیر تک جاگتا رہتا تھا۔ وہ اپنے ہر پروجیکٹ کے لیے سخت محنت کرنے کا عادی تھا۔ لیکن اس بار ایک جنون تھا جو اس پر حاوی تھا۔ اس نے وہ تمام حقائق و شواہد مستند گوشوارے اور وہ ہر مصدقہ ریکارڈ جو نور محمد کی بے گناہی اور معصومیت کو ثابت کرنے کے لیے ضروری تھا کو ایک جگہ اکٹھا کر کے اسے فائل کی شکل دینی شروع کر دی تھی۔

اس کے علاوہ 2007ء سے لے کر تا حال تک کے واقعات اس نے خود کمپوز اور کمپائل کرنے تھے۔

بتاؤں گا آپ کو۔"
اس نے ہتھیار پھینکنے والے انداز میں کہا تھا۔ امی نے سر ہلایا' لیکن وہ کچھ بولی نہیں تھیں اور یہ ہی ان ماں بیٹے کا طریقہ کار تھا۔ اس نے کہہ دیا تھا کہ وہ وقت آنے پر بتائے گا تو اس کی امی کو بھی یقین تھا کہ وہ اپنی بات کا بھرم رکھے گا۔ یہ ان کی تربیت تھی جو انہیں بے حکم اللہ مایوس نہیں کرتی تھی۔
"میں تہجد ادا کرلوں۔۔۔ تم میرا بہت وقت ضائع کرواتے ہو۔" وہ مزید ایک بھی لفظ کہے بنا اٹھی تھیں پھر اس کے تھکے ہوئے انداز پر نظر ڈالی۔
"میں دھیمی آنچ پر چائے چولہے پر رکھ دیتی ہوں ۔۔۔ دس منٹ بعد مگ میں ڈال لانا۔" وہ داخلی دروازے کی جانب بڑھنے سے پہلے بولی تھیں۔ سلمان نے دائیں ہاتھ کی انگلیاں اور انگوٹھا ہونٹوں پر رکھ کر چوما تھا اور پھر اپنی امی کی طرف پھونک مار دی تھی۔
وہ مسکراہٹ چھپا کر باہر کی سمت چل دیں۔ ان کے یہاں محبت اور لاڈ بھی عام روایتی طریقوں سے ذرا ہٹ کر رائج تھے۔ ان کے کمرے سے جاتے ہی سلمان مانیٹر کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔ اسے بہت کام کرنا تھا۔ بہت سی پرانی یادیں ہاتھ باندھے اس کے سامنے کھڑی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"ہاں بھئی کیا پلان کیا ہے کل کا؟"
ابو (احسان صاحب) نے صوفہ کم بیڈ پر ٹانگیں پھیلاتے ہوئے ان سب کے چہروں کی جانب دیکھا تھا۔ شہوز کی وجہ سے عمر اور امائمہ بھی یہیں رکنے والے تھے۔ عمیر اپنے کمرے کے بجائے ان کے درمیان آکر بیٹھ گیا تھا۔ آنٹی (عمر کی ممی) بھی ابو کے ساتھ ہی بیٹھی سب کے خوش باش چہرے دیکھ کر مطمئن سے انداز میں اون سلائیوں سے کچھ بننے میں مصروف تھیں۔ ماحول بہت پرجوش سا لگنے لگا تھا۔ گھر میں رونق لگ گئی تھی۔
امائمہ کافی بنا کر لے آئی۔ اس نے کافی کے مگ والی ٹرے پہلے سامنے مرکزی میز پر رکھی تھی پھر باری باری سب کے مگ ان کے ہاتھوں میں تھما کر خود سنگل صوفہ پر نشست سنبھالی تھی۔ اس سارے ماحول میں صرف وہی تھی جو مرجھائی ہوئی سی لگتی تھی حالانکہ وہ بات بات پر مسکرا رہی تھی' لیکن پھر بھی اس کا چہرہ بجھا ہوا تھا۔ عمر نے اسے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں مگ نہیں تھا۔ عمر نے اپنا ہاتھ اونچا کر کے اس سے اشارے سے پوچھا تھا کہ اس کا مگ کہاں ہے۔ اس نے پھر بلاوجہ مسکراتے ہوئے نفی میں گردن ہلائی تھی کہ اسے خواہش نہیں ہے۔
عمر پوچھنا چاہتا تھا کہ کیوں؟ لیکن وہ ابو کی جانب متوجہ ہو گئی تھی۔ شہوز کی وجہ سے سب کل کے لیے بہت پرجوش انداز میں منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ پکنک وغیرہ کا ارادہ تھا۔
"شہوز کو ٹریفالگر اسکوئر دکھایا؟" آنٹی نے پوچھا تھا۔
"ممی' وہاں ہے کیا دیکھنے والا۔ لارڈ ایڈمرل نیلسن کا مجسمہ اس کے اردگرد چار شیروں کے مجسمے۔۔۔ اور اس کے اردگرد کبوتر ہی کبوتر۔" عمیر نے سب سے پہلے اعتراض کیا تھا۔
"کبوتروں کی وجہ ہی سے تو وہ جگہ اچھی لگتی ہے مجھے۔۔۔ اتنے مہذب اور تمیزدار کبوتر ہیں۔۔۔ پرسکون انداز میں انسانوں سے لاپروا ہو کر اپنا دانہ دنکا چنتے رہتے ہیں۔" انہوں نے ناک کی نوک پر آجانے والے چشمے کو سلائی کی مدد سے اوپر کرتے ہوئے جواب دیا تھا۔
"مہذب اور تمیزدار نہیں ہیں۔۔۔ بھوکے ہیں اور لالچی بھی۔۔۔ جب تک دانہ ہاتھ پر رہتا ہے تب تک انسان کی قدر کرتے ہیں' ورنہ پھر سے اڑ جاتے ہیں۔" عمیر چڑ کر بولا تھا۔
"ٹاور آف لندن چلتے ہیں۔" ابو نے کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے اپنی پسندیدہ جگہ کا نام لیا تھا جس پر عمر کو اعتراض تھا۔
"وہاں پر بھی کچھ نہیں ہے دیکھنے والا۔۔۔ اندر

دھوکا دینا بند کر دو۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھیں۔ چہرے پر خفگی بھی نمایاں تھی۔ سلمان کو ان کے انداز سے ہلکا سا جھٹکا لگا اور مسکراہٹ بھی ہونٹوں کے کنارے سے پھسل پھسل کر باہر نکلنے لگی جسے اس نے سرعت سے قابو کیا تھا۔

"میں نے کیا کیا ہے؟" یہ اس کا پسندیدہ سوال تھا۔ اپنی امی کے سامنے، بچپن سے ہر جھڑکی، ہر نصیحت اور ہر جواب طلبی پر وہ بھیگی بلی بن کر جب یہ پوچھتا تھا کہ "میں نے کیا کیا ہے؟" تو اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اس نے واقعی کچھ ایسا کیا ہے، جو امی کی پکڑ میں آچکا ہے۔

"کیا کرتے پھر رہے ہو آج کل تم۔" ان کا لہجہ ہی نہیں اب کی بار انداز بھی برہم تھا۔ سلمان کو سنجیدہ ہونا پڑا۔ وہ چند لمحے خاموشی سے ان کو دیکھتا رہا تھا پھر جیسے اس نے ہار مان لی۔

"امی! میں نے پہلے بھی کوئی ایسا کام نہیں کیا کہ مجھے ضمیر کی ملامت سہنی پڑے۔ کچھ غلط کر رہا ہوتا تو آپ سے پہلے ہی مجھے جھڑکیاں دے دے کر میرا جینا دوبھر کر دیتا۔ اس لیے بے فکر رہیں "آپ کا بیٹا اچھے برے کا فرق سمجھتا ہے۔"

"الحمدللہ بولو۔ اور پھر میرا شکریہ ادا کرو۔ یہ میرے لیکچرز کی وجہ سے ہی ہوا ہے۔ میں نے ہی سکھایا ہے یہ سب تمہیں۔" وہ متاثر ہوئے بنا بولی تھیں۔

"چلو۔ اب وضو کر کے بھی جھوٹ بولیں گے لوگ۔ یہی سننا باقی رہ گیا تھا۔ آپ نے تو کبھی کلمہ پڑھنا بھی نہیں سکھایا تھا۔ یہ تو اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے میری دادی ماں کو جنہوں نے میری تربیت کی۔ مجھے پروان چڑھایا۔" اس نے بازو پھیلا کر انگڑائی لی تھی۔ چائے کی طلب ہونے لگی تھی۔

"میرے بیٹے ہو لفظوں سے کھیلنا جانتے ہو۔ یہ مجھے پتا ہے۔ یہ ہنر مجھ پر مت آزماؤ۔ مجھے صرف یہ بتاؤ کہ ساری ساری رات جاگ کر کیا کر رہے ہو آج کل، پہلے بھی کام تو مشکوک ہی تھے تمہارے لیکن اب تو انداز ہی جدا ہے۔ سارا دن سوئے رہتے ہو اور رات بھر جاگتے رہتے ہو۔ اور دن کے وقت کمرہ کیوں لاکڈ رکھتے ہو۔" وہ ابھی بھی اسی انداز سے پوچھ رہی تھیں۔

"توبہ ہے امی۔! آپ کی جاسوسی سے۔ کمرہ اس لیے لاکڈ کرتا ہوں کہ آپ کمپیوٹر کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہ کریں۔ میرا لیپ ٹاپ تو کھول نہیں سکتیں آپ لیکن ڈیسک ٹاپ کی شامت لے آتی ہیں۔ کمپیوٹر چلانا آتا نہیں ہے آپ کو۔ میری ساری محنت کا بیڑا غرق کر دیتی ہیں۔" وہ ہاتھوں کی انگلیوں کو آرام دینے کی خاطر انہیں ایک دوسرے میں پھنسا کر چٹخاتے ہوئے بولا تھا۔

"بکواس مت۔ یہ بتاؤ تم آج کل "عہد الست" پر کام کر رہے ہو نا؟" ان کے اس سوال میں ہی ساری کہانی چھپی تھی۔ سلمان اب ہنسی نہیں روک پایا تھا۔

"دھت تیرے کی۔ اس گھر میں آپ سے کچھ نہیں چھپایا جا سکتا۔ آپ دیسی ساخت کی زیرو زیرو سیون ہیں۔" اس نے مبہم جملے میں بالآخر اعتراف کر لیا تھا۔

"جب یہ بات جانتے ہو تو پھر چھپاتے کیوں ہو اور مختصر بات کرو۔ تہجد کا وقت ختم ہونے سے پہلے بات ختم کرو۔" انہیں اب ٹالا نہیں جا سکتا تھا۔

"بات ختم ہو گئی ہے امی۔ آپ کو پتا چل تو گیا ہے کہ عہد الست پر کام کر رہا ہوں۔"

"پتا تو مجھے اسی روز چل گیا تھا جس روز نور محمد کی کال آئی تھی لیکن میں نے تم سے پوچھا نہیں یہ سوچ کر کہ تم خود ہی مجھے بتاؤ گے لیکن تم تو ایسے کمرہ نشین ہو گئے ہو جیسے کیڑے سردیوں میں ہائبرنیٹ ہوتے ہیں۔"

یہ تھا وہ اصل مدعا جس کے باعث امی تہجد کی ادائیگی میں بھی تاخیر برداشت کرنے کو تیار تھیں۔

"آپ نے یہ کیسے سوچ لیا امی! کہ میں آپ سے کچھ چھپاؤں گا۔ دراصل ابھی گتھیاں سلجھی ہی نہیں۔ میں خود ہر بات سے مکمل طور پر آگاہی حاصل کیے بغیر کیسے آپ کو کچھ بتا دوں۔ وقت آنے دیں۔ سب

تھے۔ امائمہ کو ایک دم سے گھٹن سی محسوس ہوئی۔ آج کل اس کی طبیعت بھی مزید خراب رہنے لگی تھی۔ صبح سے شام تک بھوک لگنے کے باوجود کچھ کھایا نہیں جاتا تھا' کھا لیتی تھی تو متلی کی کیفیت ہونے لگتی تھی' یہ تو خیر روٹین کی باتیں تھیں۔ اس حالت میں سب کے ساتھ ایسا ہوتا تھا۔ آنٹی اس کو سمجھاتی رہتی تھیں۔ اس کا خیال رکھتی تھیں۔ امائمہ کے لیے اصل پریشان کن چیز موڈ سوئنگز تھے۔ اسے بلاوجہ غصہ آنے لگتا تھا۔ بیزاری سے جتنا کتراتی تھی اتنا ہی بیزار رہتی تھی۔ عمر سے بلاوجہ جھگڑنے کا دل کرتا رہتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ اس کے بھائی کے معاملے میں لاپروائی برت رہا ہے۔ وعدہ کرنے کے باوجود اسے تلاش کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کر رہا۔

اسے شہوز کے ساتھ سیرو تفریح کی باتیں کرتا دیکھ کر وہ اکتاہٹ سی محسوس کر رہی تھی۔ اسی لیے خاموشی سے سب کے درمیان سے اٹھ کر کچن کے چھوٹے سے دروازے سے باہر آکر باغیچے کی جانب اترنے والی سیڑھی نما چبوترے پر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے عقب میں دروازہ بھی بند کر دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ گھر کے اندر سے آنے والی آوازیں اس کے اندر اٹھنے والی آوازوں کو دبا کر خاموش کروا دیں۔ اندر کی نسبت باہر بالکل سناٹا تھا۔ وہ گھٹنوں میں منہ دبا کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ اس وقت کچھ نہیں سوچنا چاہتی تھی حتی کہ اپنی امی کو بھی نہیں۔ یہ ایک عجیب بات تھی کہ اس حالت میں اسے اپنی امی کا دکھ پہلے سے کہیں زیادہ دکھی رکھتا تھا۔ وہ اپنی حالت دیکھتی تھی تو سوچتی تھی کہ امی بھی اسی حالت سے گزری ہوں گی۔ انہوں نے جب اولاد کی خوشی دیکھی ہو گی تو وہ بھی ان ہی مراحل سے نبرد آزما رہی ہوں گی۔ اور پھر جب یہ سوچتی تھی کہ ان سب حالات کو سہنے کے باوجود ان کے ہاتھ کچھ نہیں آیا تھا۔ بیٹا کھو گیا تھا اور بیٹی بیاہ دی تھی۔ وہ ابھی بھی اتنی ہی تنہا تھیں جتنا کہ ایک بے اولاد ماں ہوتی ہے تو دل بے حد بوجھل ہو جاتا تھا۔

ایسی حالت میں اس کا دل کسی کام میں نہیں لگتا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا۔ بس امی کہیں سے اڑ کر آجائیں اور وہ ان کو گلے سے لگا لے' کسی چھوٹے بچے کی طرح ان کو تسلی دے۔ انہیں یقین دلائے کہ امی! اللہ آپ کی گود کا سکھ آپ کو ضرور لوٹائے گا۔ آپ پریشان نہ ہوں امی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ امی کی یاد ہر وقت اسے گھیرے رکھتی تھی۔ ایسی صورت حال میں دوسرے لوگوں کا ہنسنا بولنا بھی چبھتا تھا۔ ساس سسر کی ایک دوسرے کے ساتھ لگاوٹ بھی زخموں پر چھڑکے جانے والا نمک محسوس ہوتی تھی۔ تنہائی میسر آتے ہی آنکھیں بھی بھر آئی تھیں۔ اولاد کے دکھ ماں باپ کے لیے بے حد تکلیف دہ ہوتے ہیں' لیکن بعض اوقات ماں باپ کے دکھ اولاد کے لیے زیادہ تکلیف دہ ہو جاتے ہیں۔

اسے بیٹھے چند منٹ ہی گزرے تھے جب عقب سے چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ کچن کا جالی والا دروازہ کھلا تھا۔ اس نے ذرا سا مڑ کر دیکھا تھا۔ اس کے اندازے کے عین مطابق عمر ہاتھ میں مگ تھامے اس کے قریب سیڑھی پر آبیٹھا۔

"تم باہر کیوں آگئے؟" امائمہ نے اب کی بار اس کی جانب دیکھے بنا سوال کیا تھا۔

"یہی تو میں پوچھنے آیا ہوں تم سے کہ تم باہر کیوں آگئیں؟" وہ اس کے سوال کو ٹال کر بولا تھا۔

"مجھے گھٹن سی ہو رہی تھی۔" اس نے کہا تھا۔

"مجھے بھی۔" عمر نے اسی کے انداز میں کہا تھا۔

امائمہ کچھ نہیں بولی۔

"کیا بات ہے۔۔۔ کیا ہوا ہے؟" چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ پوچھ رہا تھا۔

امائمہ پہلے ہی بوجھل دل لیے بیٹھی تھی۔ اسے مزید رلانے کا وہ سارا سامان اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ آواز میں فکرمندی' انداز میں اپنائیت اور آنکھوں میں محبت' ستم در ستم یہ کہ اس کے کندھے پر بازو بھی رکھ دیا۔

عورت کی ساری رمزیں عجیب ہیں۔ مرد رونے کی وجہ نہ پوچھے تب بھی روتی ہیں اور اگر پوچھ لے تو بھی

داخل ہوتے ہی لندن کے شاہی قلعے کا وارڈر (گارڈ) آجائے گا۔۔۔ پہلے اپنی تعریفیں کرے گا پھر اپنے بادشاہوں کی کرے گا اور پھر کرنا ہی چلا جائے گا۔ وہی قید خانے' وہی ظلم و بربریت کی داستانیں' وہی دنیا بھر سے چرا کر اور ہتھیار لائے ہوئے نوادرات اور جواہرات۔۔۔ مجھے نہیں جانا وہاں۔۔۔ میں سخت بور ہو جاتا ہوں ادھر۔" وہ چڑ کر بولا تھا۔

"اتنی اچھی جگہ ہے۔۔۔ پارک کا مزا بھی اور میوزیم کا مزا بھی۔۔۔ دیکھنے کو بھی بہت کچھ اور سیکھنے کو بھی۔" ابو اپنے انداز میں وضاحت کر رہے تھے۔ عمیر نے نفی میں انگلی ہلائی۔

"نہیں ابو۔۔ اس سے بہتر ہے ریجنٹ پارک چلے چلتے ہیں۔۔۔ وہاں مزا آجائے گا۔" وہ انہیں آمادہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

امائمہ نے دیکھا۔ سب کتنے خوش اور مطمئن تھے۔ آنٹی کی توجہ کا مرکز بظاہر ان کی اون سلائیاں تھیں لیکن وہ اپنے بیٹوں کی باتیں سن رہی تھیں' مسکرا رہی تھیں۔ طمانیت ان کے ہر عضو سے ظاہر ہو رہی تھی۔ اون کا گولہ پھسل کر زیادہ کھل گیا تھا۔ ابو اسے پکڑ کر اس کے گرد زائد کھلی اون باندھنے لگ گئے تھے۔ اس کے ساس سسر کی ایک عجیب سی کیمسٹری تھی۔ وہ ایک دوسرے کی بات بن کہے سمجھ جاتے تھے۔ آنٹی' ابو کے بغیر کھانا نہیں کھاتی تھیں۔ ابو ان کے ہاتھ کا کھانا ہی کھانا پسند کرتے تھے۔ آنٹی کو ایک چھینک آجاتی تھی تو ابو اپنے ہاتھوں سے قہوہ بنا کر پلاتے تھے۔ بار بار پیشانی چھو کر دیکھتے کہ کہیں بخار تو نہیں ہو گیا۔ ابو کو ذیابیطس تھی' لیکن میٹھا کھانے کے شوقین تھے تو آنٹی انٹرنیٹ سے ان کے لیے شوگر فری ڈیزرٹ بنانے کی ترکیبیں ڈھونڈتی رہتی تھیں' یا پھر ٹی وی پر ذیابیطس کے لیے کوئی ٹوٹکا یا گھریلو نسخہ دیکھنے کو ملتا تو بہت اہتمام سے اسے اپنی ڈائری میں تحریر کرتی تھیں اور ابو کو وہ سب بنا کر بھی دیتی تھیں۔ رات کو دونوں اہتمام سے گرم دودھ میں شہد ملا کر پینے کے عادی تھے' اور اس وقت دودھ گرم کرنے کی ذمہ داری ابو نے اپنے سر لے رکھی تھی۔ پاکستانی چینل پر لگنے والے سیریل بھی وہ لوگ ضرور دیکھتے تھے پھر اس پر سیر حاصل بحث بھی کرتے تھے۔

امائمہ کے لیے یہ سب چھوٹے چھوٹے محبت کے اظہار بہت انوکھے تھے۔ عمر بھی اس کے حق میں بہت اچھا تھا۔ اس کا خیال رکھتا تھا۔ اس سے محبت کرتا تھا۔ اسے وہ عزت دیتا تھا' جس کی وہ حق دار تھی' لیکن آنٹی اور ابو کے درمیان کی کیمسٹری اسے نجانے کیوں عجیب سے احساس میں مبتلا کر دیتی تھی۔ اس کے امی ابو کے درمیان کبھی کچھ نارمل نہیں رہا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو بنا ضرورت مخاطب بھی نہیں کرتے تھے۔ ہوش سنبھالنے کے بعد سے ابو اکثر اپنے کاموں کے لیے اسے یا پھر ملازم کو ہی مخاطب کرنے کے عادی تھے۔ ایک دوسرے کے قریب بیٹھے تو اس نے انہیں کبھی بھی نہیں دیکھا تھا۔ ایک عجیب سی نادیدہ چپقلش ہمیشہ ان کے رشتوں میں محسوس ہوتی تھی۔ دوسرے عمر رسیدہ شادی شدہ جوڑوں کی باہمی ہم آہنگی اسی لیے اسے چونکاتی ضرور تھی۔ آنٹی تو ان کے گھر کی ملکہ تھیں۔ ابو ان کی ہر خواہش کو پورا کرنا اپنا فرض اولین سمجھتے تھے۔ عمر' عمیر بھی ان سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ وہ خود بھی بیٹوں پر جان چھڑکتی تھیں۔ عمر ایک روز ملنے نہیں جاتا تھا تو بے چین ہو کر کال کرتی تھیں کہ وہ خیریت سے تو ہے۔۔۔ امائمہ یہ سب دیکھتی تھی' محسوس کرتی تھی اور سوچتی تھی۔

"کیسا قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں بیٹے۔۔۔ ماں کا مان' ان کی آنکھوں کی روشنی' ان کے دل کا سکون۔" اس نے گہری سانس بھری۔ آنکھیں نم سی ہونے لگی تھیں۔ وہ بلاوجہ مسکرانے کی کوشش کرنے لگی' لیکن اس سے مسکرایا نہیں گیا تھا۔ اس نے دوبارہ سے ان کی گفتگو میں دلچسپی لینی چاہی۔

"ابو۔۔۔ پہلے ٹاور آف لندن چلتے ہیں پھر ریجنٹ پارک چلے جائیں گے۔۔۔ شہوز بھائی کے لیے تو ہر جگہ نئی ہو گی تو ان کو تو اچھا ہی لگے گا۔"

عمیر کہہ رہا تھا۔ وہ لوگ شاید کچھ فائنل کر چکے

"جذباتی کیوں ہو رہے ہو۔۔۔ تمہارے چہرے پر تاثر ہی سوانو والا ہو گیا تھا تو میں نے سوچا۔۔۔ شاید۔" اس نے بھی بات ادھوری چھوڑ دی اور اسی کے بستر پر آڑا ترچھا لیٹ گیا۔

"یہ سوانو والا کون سا تاثر ہوتا ہے؟" شہروز نے سوال کیا تھا۔ عمر ہنسا۔ وہ اپنے دوستوں میں اکثر ہی ذاتی اختراع والی اصطلاح استعمال کرتے تھے۔ جس کا مطلب کسی دوسرے کی کنفیوژن، خفگی یا عدم دلچسپی کو ظاہر کرنا ہوتا تھا۔

"سوانو۔۔۔ یعنی بلینک۔۔۔ سیدھے سپاٹ۔۔۔ بنا کسی دلچسپی کے۔۔۔ الجھے الجھے تاثرات جیسے میری بات سن کر تمہارے چہرے پر آ گئے تھے۔" اس نے وضاحت کی۔

"دلچسپی تو ہے مجھے، لیکن الجھا ہوا بھی ہوں، کیونکہ کچھ معمہ سا ہے یہ ساری کہانی۔۔۔ برا مت ماننا لیکن مجھے ایسا لگتا ہے جیسے اس قصے میں کچھ جھول ہے۔۔۔ میں اسے جھوٹ نہیں کہہ رہا لیکن میری عقل نہیں مانتی۔۔۔ عجیب الجھن سی ہے۔۔۔ اور پھر لوٹن جا کر بھی ہم نہیں گئے کیا۔ ہمیں ایک شخص کے متعلق پوچھنا ہے جس کے بارے میں ہم کئی سالوں سے کچھ نہیں جانتے۔۔۔ تم نے مجھے بتایا تھا کہ تم اور امائمہ وہاں جا چکے ہو۔ اس کے متعلق پہلے بھی وہاں جا کر سن گن لینے کی کوشش کرتے رہے ہو۔۔۔ کسی نے پہلے بھی کچھ نہیں بتایا۔ ذرا سوچو، وہ شخص نور محمد اگر وہاں ہوتا تو وہ ایک بار تو خود بھی اپنی بہن سے ملنے کی کوشش کرتا۔ وہ اگر وہاں ہے تو کسی سے اسے بھی تو سن گن ملی ہوگی کہ اس کی بہن اسے تلاش کر رہی ہے۔" شہروز نے اپنے دل کی ساری بات بتا دی تھی۔

"سچ تو یہ ہے شہروز کہ تم غلط نہیں کہہ رہے۔۔۔ میرے پاس بھی کوئی زیادہ حوصلہ افزا رپورٹ نہیں ہے۔ کوئی مستند معلومات بھی نہیں ہیں۔ امائمہ کے پاس جو فون نمبر تھا نا، وہ اسی بحالی سینٹر کا ہے جہاں بقول امائمہ کے اس کا بھائی کبھی مقیم رہا تھا۔ ہم نے وہاں فون کیا اور ایک بار وہاں گئے بھی تھے۔ وہ کسی پاکستانی شخص کا سینٹر ہے۔ ان ہی سے امائمہ کی دو تین بار فون پر بات ہوئی تھی۔ یہ تصدیق تو انہوں نے کی ہے کہ نور محمد نام کا ایک موذن وہاں ہے، لیکن یہ بات بھی انہوں نے ہی کی تھی کہ نور محمد کے متعلق لوٹن جا کر پتا کریں۔ وہ کوئی حتمی بات بھی نہیں بتاتے۔ وہ وہاں کی جامع مسجد میں موذن رہا ہے۔ امائمہ دو ایک بار وہاں گئی ہے اور ایک بار میں بھی گیا تھا، لیکن کبھی کسی سے کچھ ٹھیک سے پتا نہیں چل سکا۔ ایک بار تو مسجد کو ہی تالا لگا ہوا تھا۔ ایک دو بار جو لوگ ملے ہیں۔ وہ خود کنفیوزڈ لگتے ہیں۔۔۔ کوئی بھی حتمی بات نہیں بتاتا۔۔۔ میں تو وہاں اپنا کانٹیکٹ نمبر بھی چھوڑ کر آیا تھا کہ کسی کو پتا ہو تو ہمیں کال کر کے بتائے، لیکن ابھی تک کوئی خیر خبر یا کوئی اطلاع نہیں مل سکی۔"

شہروز نے ساری بات سن کر سر ہلایا۔ اسے حقیقتاً "اس کہانی میں ابھی تک کوئی جان نہیں محسوس ہوئی تھی۔

"تم کچھ بھی کہو عمر۔۔۔ کنفیوژن تو ہے اس ساری کہانی میں۔۔۔ الجھنیں ہیں کافی۔۔۔ حقیقت کا عنصر ذرا کم ہی لگتا ہے۔" اس نے پرسوچ انداز میں عمر کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ اس نے امائمہ سے ابھی تک براہ راست کوئی بات نہیں کی تھی، کوئی تسلی دی تھی نہ کوئی آس دلائی تھی، لیکن اس کے وجود پر چھائی ہوئی بے چینی وہ محسوس کر سکتا تھا۔

"میں تمہاری بات سے انکار نہیں کروں گا۔۔۔ لیکن میں کوشش ترک بھی نہیں کروں گا۔۔۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ میری دلی خواہش ہے کہ میں اس شخص کے متعلق کوئی بھی اطلاع، کوئی خیر خبر پتا کر سکوں۔۔۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ کچھ الجھنیں ہیں، لیکن میں امائمہ سے۔۔۔ یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ اس کے بھائی کی تلاش میرے لیے معمہ ہے۔ کیونکہ یہ کسی ایکس وائی زیڈ کی بات نہیں ہے۔ اس کے سگے اکلوتے بھائی کی بات ہے۔"

عمر کا لہجہ پرعزم تھا۔ شہروز نے اسے دیکھا پھر گہری

روتی ہیں۔ امائمہ کی آنکھیں پہلے سے زیادہ تیزی سے بھیگی تھیں۔ وہ سر جھکا کر اپنے پاؤں کی جانب دیکھنے لگی۔ آنسو تیزی سے بہنے لگے تھے۔ عمر نے اس کے گرد بازو مزید سختی سے رکھا تھا اور اسے اپنے قریب کیا تھا۔

"کیا ہوا ہے یار۔۔۔ اچھا نہیں جائیں گے ہم ٹاور آف لندن۔۔۔ جہاں تم کہو گی وہاں چلے جائیں گے۔۔۔ لیکن تم رونا تو بند کرو۔" وہ شرارتی انداز میں اسے چڑا رہا تھا۔ امائمہ نے بائیں ہاتھ کی پشت سے آنکھیں صاف کیں۔ عمر کی بات سن کر ہنسی تو نہیں آئی تھی لیکن رونے کی وجہ بھی تو کوئی نہیں تھی۔ سو آنسو روک لینا ہی ٹھیک تھا۔

"عمر! میرا بھائی مل جائے گا نا؟" وہ اپنے ہی ہاتھ کی پشت پر چمکنے والی آنسوؤں کی نمی کو دیکھتے ہوئے سوال کر رہی تھی اور عمر اب جا کر سمجھا تھا کہ وہ رو کیوں رہی ہے۔ اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑا تھا۔

"میرا دل کہتا ہے کہ ضرور مل جائے گا۔" وہ قطعیت بھرے لہجے میں بولا تھا۔ امائمہ نے اس کی جانب دیکھا پھر اپنی جھنجلاہٹ چھپائے بغیر بولی۔

"اللہ کا نظام تمہارے دل کے مطابق نہیں چلتا۔" اس کے دل میں خفگی اس بات کی تھی کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے کیوں بیٹھا ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ اب جب کہ شہروز بھی آ چکا ہے تو وہ دونوں مل کر کوئی عملی قدم بھی اٹھائیں۔

"تو پھر تم مجھ سے مت پوچھو امائمہ۔۔۔ اللہ پر بھروسا رکھو۔۔۔ اللہ چاہے گا تو ہر مشکل آسان ہو جائے گی۔" وہ ابھی بھی اس کی خفگی سمجھے بنا تسلی دے رہا تھا۔

"عمر۔۔۔! اللہ پر بھروسہ ہے مگر توکل کا حکم بھی اونٹ باندھنے کے بعد کا ہے۔۔۔ تم کوئی پریکٹیکل ایفرٹ (عملی کوشش) بھی تو کرو۔ تم ایک بار تو لوٹن جاؤ۔" وہ التجا بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ عمر نے آنکھیں سکیڑ کر اس کے انداز کو دیکھا پھر یکایک جیسے اس کے الجھے اور اکتائے ہوئے رویے کی وجہ سمجھ میں آ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تم لوگوں نے کوئی پروگرام فائنل کر لیا ہے کیا۔" عمر نے اس کے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا تھا۔ عمر امائمہ اٹھ کر گئے تو چچی اور چاچو بھی سونے کی غرض سے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ عمیر بھی اپنے کمرے میں آ گیا تھا اور شہروز کا بھی لیپ ٹاپ پر کچھ چیزیں گوگل کرنے کا ارادہ تھا سو وہ بھی اٹھ گیا تھا لیکن عمر پھر اس کے پاس آ بیٹھا تھا۔

"تم لوگ گئے نہیں گھر۔۔۔ میں تو سمجھا تھا تم چلے گئے ہو۔" شہروز نے سرہانہ کمر کے پیچھے اڑستے ہوئے سوال کیا تھا۔ اس نے ابھی لیپ ٹاپ گود میں رکھا ہی تھا۔ عمر اور امائمہ اس کی وجہ سے روز رات کا کھانا ادھر آ کر کھاتے تھے اور پھر لیٹ نائٹ تک یہیں رہتے تھے۔

"نکلنے لگے تھے بس۔۔۔ ممی امائمہ کو کوئی نصیحتیں کرنے لگ گئیں تو میں تمہارے پاس آ گیا۔۔۔ میں نے پوچھنا تھا کل کا کیا پروگرام فائنل کیا ہے؟"

"مجھے کیا پتا۔۔۔ تم لوگ جانو۔۔۔ میں تو مہمان ہوں۔۔۔ جہاں لے جاؤ گے۔ چلا جاؤں گا۔" وہ اطمینان سے پاؤں پھیلاتے ہوئے بولا تھا۔

"میری بات غور سے سنو۔۔۔ امائمہ بہت پریشان ہے یار۔۔۔ اس لیے کل لوٹن چلتے ہیں۔۔۔ صبح صبح نکلیں گے۔ سنڈے کی وجہ سے ابو دیر سے اٹھیں گے تو ان کی گاڑی پر جائیں گے اور امائمہ کے بھائی کا پتا کر کے ان کے اٹھنے سے پہلے واپس آ جائیں گے۔" وہ اپنی پلاننگ بتا رہا تھا۔ شہروز نے کندھے اچکائے۔ اسے پروگرام کچھ زیادہ بھایا نہیں تھا۔

"ہم وہاں جا کر کہیں گے کیا۔۔۔ کیا پتا کریں گے۔۔۔ میرا مطلب ہے' ہم کیا کہیں گے ان سے۔" اس نے بات مکمل کیے بنا چھوڑ دی تھی۔ اس کے چہرے پر تذبذب تھا جسے عمر نے بھانپ لیا تھا۔

"کیا ہوا تم نہیں جانا چاہتے میرے ساتھ؟" عمر نے سوال کیا تھا۔ شہروز نے برا سا منہ بنایا۔

"صحافی میں ہوں۔۔۔ کہانیاں تم بناتے رہتے ہو۔۔۔ میں نے کب کہا کہ میں نہیں جانا چاہتا تمہارے ساتھ۔"

سانس بھرتے ہوئے کندھے اچکائے تھے۔

"چل یار ٹھیک ہے۔۔۔ چلے چلتے ہیں۔۔۔ کچھ نہ کچھ تو پتا چل ہی جائے گا نا۔" اس نے ہامی بھری تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ اگلے دن صبح ہی وہاں پہنچ گئے تھے۔ عمر کے انکار اور اصرار کے باوجود امائمہ ان کے ہمراہ آگئی تھی۔ عمر نے ممی سے رات ہی کہہ دیا تھا کہ وہ شہوز کے ساتھ بوٹ سیل (پرانی اشیا کی خرید و فروخت کے لیے لگائی جانے والی منڈی) جانے کا ارادہ رکھتا ہے اس لیے ابو سے گاڑی لینا بھی دشوار ثابت نہیں ہوا تھا اور ان کی جانب سے مزید کوئی سوال جواب بھی نہیں ہوئے تھے۔ کیونکہ بوٹ سیل اتوار بازار کی طرح پہلے آئیے پہلے پائیے کے اصولوں پر چلتی تھی سو جلدی نکلنا ہی مناسب تھا۔

وہ وہاں پہنچے تو مسجد کو پھر تالا ہی لگا ہوا ملا تھا لیکن پھر ملحقہ گلی کے کونے پر موجود پوسٹ آفس میں پوچھنے پر وہاں کام کرنے والے ایک شخص سے ملاقات ہوئی۔ ان کا نام استقلال بیگ تھا اور تعلق بنگلہ دیش سے تھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ اسی مسجد میں پارٹ ٹائم رضاکارانہ طور پر خدمات سرانجام دیتے ہیں اور ان کی مدد کر سکتے ہیں۔

"نور محمد اس وقت اپنے گھر پر ہوں گے۔ آپ کچھ دیر انتظار کرلیں تو نماز ظہر کے وقت ان سے ملاقات ممکن ہو سکے گی۔" انہوں نے مشفق لہجے میں کہا تھا۔

ان کی بات سن کر امائمہ کے چہرے پر اضطراب اور مسکراہٹ ایک ساتھ چمکی تھی۔

"یہاں پر نور محمد نام کے شخص ہی موذن ہیں نا۔۔۔ وہ جو بلیک برن سے آئے تھے۔" اس نے تصدیق کرنی چاہی تھی کیونکہ ابھی تک پوچھ گچھ کرنے پر شکوک شبہات سے بھری آرا ہی ملی تھیں۔ استقلال بیگ کے انداز میں استقامت تھی۔ امائمہ کو کافی حوصلہ ہوا تھا اس کی بات سن کر کہ آج تو کوئی اچھی خبر ضرور مل جائے گی۔

"یہ معمہ تو کوئی بھی حل نہیں کر پایا کہ کہاں سے آئے تھے پر ان کا نام نور محمد ہی ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

امائمہ نے چونکہ اردو میں بات کی تھی اس لیے وہ بھی بنگالی اور اردو کا ملا جلا جملہ بولے تھے۔ امائمہ کو ٹھیک سے سمجھ میں نہیں آیا لیکن عمر ضرور سمجھ گیا تھا۔

"ہمارے لیے یہی کافی ہے کہ وہ نور محمد ہیں۔۔۔ ہم ان سے ملنے کے لیے بہت بے چین اور پرامید ہیں۔۔۔ یہ ان کی بہن ہیں اور بہت عرصہ سے ان سے نہیں ملی ہیں۔"

اس نے ان کو بتایا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر استقلال بیگ نور محمد کو ذاتی طور پر جانتے ہیں تو اس کی بہن کا حوالہ مزید کارآمد رہے گا اور یہی ہوا تھا۔ انہوں نے حیرانی سے ان سب کے چہروں کو باری باری دیکھا۔

"ان کی کوئی بہن نہیں ہے۔" وہ اپنے تاثرات بنا چھپائے ہوئے بولے تھے۔

"میں ان کی بہن ہوں۔۔۔ میرا یقین کیجیے۔" امائمہ تڑپ کر بولی۔

"آپ ان کی بہن نہیں ہو سکتیں۔" وہ استہزائیہ انداز میں بولے تھے۔ ان کا انداز عجیب لگا تھا ان تینوں کو۔۔۔ امائمہ مزید کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن شہوز نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا تاکہ اسے خاموش رہنے کا سگنل دے سکے۔

"جی آپ درست کہہ رہے ہیں۔۔۔ کیا ہم ان سے مل سکتے ہیں۔" وہ بولا تھا۔

"آپ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر انتظار کریں میں ان کو فون کرتا ہوں۔" انہوں نے اپنا سیل فون جیب سے نکالا تھا۔ وہ تینوں واپس گاڑی میں آبیٹھے تھے۔ امائمہ تو عورت ذات تھی اور پھر اس کے گمشدہ بھائی کے متعلق پہلی بار کوئی مصدقہ اطلاع ملی تھی اس کا جوش اور خوشی تو سمجھ میں آتی تھی مگر فطری طور پر شہوز اور عمر بھی کافی ولولہ سا محسوس کرنے لگے تھے۔ لیکن اعصاب میں تناؤ سا بھی تھا۔ جیسے کسی ان دیکھے تحفے کی پیکنگ کھولنے سے پہلے والی کیفیت ہوتی ہے' ایسی ہی

ہے۔" وہ چڑ کر بولی۔

"امائمہ! میرا خیال ہے وہ لوگ جھوٹ نہیں بول رہے۔ انہیں کیا ضرورت ہے جھوٹ بولنے کی۔" عمر نے اس کے قریب کاؤچ پر بیٹھتے ہوئے تحمل بھرے لہجے میں کہا تھا۔ امائمہ کے بھڑکنے کا خطرہ تھا اور ہوا بھی یہی۔ اس نے مزید چڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

"عمر پلیز... تم اب میرا دماغ مت کھاؤ۔ میں پہلے ہی بہت اپ سیٹ ہوں... میں نہیں مان سکتی کہ میرا بھائی..." وہ فقرہ ادھورا چھوڑ کر اٹھ گئی تھی پھر اس نے چھوٹی تپائی پر پڑا اپنا بیگ اٹھا کر اس میں سے اپنا موبائل نکالا تھا۔ وہ کسی کا نمبر تلاش کر رہی تھی۔

شہروز فلور کشن پر بیٹھا ان دونوں کے چہرے دیکھ رہا تھا۔ اس کو تو اس سارے واقعے پر صرف کہانی کا گمان ہو رہا تھا لیکن چونکہ وہ یہ بات برملا کہہ نہیں سکتا تھا اس لیے خاموشی سے ان کو دیکھنے اور سوچنے میں مگن تھا۔

"نور محمد کا اصل قصہ کیا ہے؟"

☼ ☼ ☼

"میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ نور محمد استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس کے بعد سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نور محمد ہی کیوں...؟

اس عام سے شخص میں کیا بات ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ صرف نور محمد ہی نہیں ہے۔ بد قسمتی سے یہ سازش اتنی سادہ نہیں ہے۔ ایسے لاتعداد لوگ ہو سکتے ہیں اور ہوں گے بھی جن کے متعلق آپ کو آنے والے سالوں میں پتا چلتا رہے گا کہ وہ کیسے اس سازشی دائرے میں خود بخود پھنستے چلے گئے۔ تیسری دنیا کے غریب اور بالخصوص اسلامی ممالک سے لاتعداد لوگ ہر سال یورپ، کینیڈا، امریکہ آتے جاتے رہتے ہیں۔ ان کے متعلق ہر ملک ایک ٹھوس جامع پالیسی رکھتا ہے۔ اس ملک کے شہریوں کو اس پالیسی پر کتنے ہی اعتراضات کیوں نہ ہوں یہ ہیومن ٹریفکنگ کا سلسلہ رکتا نہیں ہے اور رک سکتا بھی نہیں ہے

کیونکہ یہ مین پاور ہے۔ اس کی بھی معاشی نظام میں ایک اہمیت ہے۔ یہ کسی بھی ملک کی معیشت کے دھارے کو رواں دواں رکھتے ہیں۔ نور محمد اسی نظام کا حصہ بن کر اپنے ماموں کے ساتھ سن 2000ء میں انگلینڈ آیا تھا۔ اس وقت بھی لوگوں کے بارے میں ایمبیسی میں معلومات رکھی جاتی تھیں، ریکارڈ موجود ہوتے تھے اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ یہ ایک طرح کی سکیورٹی ہے، اس پر کسی کو مشکوک نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن جب یہ معلومات لیک آؤٹ ہو جائیں اور انہیں کہانی گھڑ کر بڑھا چڑھا کر بیان کیا جانے لگے تو یہ بات کسی ایسے عنصر کی طرف اشارہ ضرور کرتی ہے کہ جس کے مقاصد غیر قانونی اور خطرناک ہو سکتے ہیں۔ افسوس صد افسوس کہ مسلمانوں کے متعلق ایسے عناصر کافی سرگرم ہیں۔

میری معلومات کے مطابق نور محمد کو ایک این جی او نے اسپانسر کیا تھا۔ لیکن یہ بات صرف نور محمد کے ماموں جانتے تھے۔ یہ آپ کو سننے میں بے شک اچھی نہ لگے لیکن یہ کوئی حیران کن یا انوکھی بات نہیں ہے۔ بہت سی این جی اوز تعلیم کے نام پر اسکالر شپس، گرانٹس اور لون طلبا کو فراہم کرتی ہیں۔ ان کا دائرہ کار سن 2000ء میں بھی وسیع تھا اور اب تو وسیع ترین ہو چکا ہے۔ آپ کے ملک میں دھڑا دھڑ وظائف تقسیم کیے جا رہے ہیں۔ لوگ ہاتھوں ہاتھ سود پر قرضے لے کر اپنی اولادیں یورپ میں علم حاصل کرنے کے لیے بھیج رہے ہیں۔ غریب ضرورت مند طلبا کو امداد دی جا رہی ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ یہ غلط ہے۔ یہ سوچنا آپ لوگوں کا کام ہے۔ میں کوئی مفتی نہیں ہوں کہ فتویٰ جاری کروں۔ میں آپ کو صرف اس نظام کو سمجھنے کے لیے یہ ساری باتیں بتا رہا ہوں کہ اصل میں نور محمد کے ماموں نے اس کے والدین کے علم میں لائے بغیر ایسی ہی این جی او کو نور محمد کو اسپانسر کرنے کے لیے درخواست دی تھی۔ اس کا تعلیمی ریکارڈ تو اچھا تھا، وہ پوزیشن ہولڈر تھا وہ اسکالرشپ کا مستحق تھا لیکن اس کی ذہنی حالت ایسی تھی کہ آسانی سے گرانٹ

کیفیت ان پر چھائی ہوئی تھی۔

کچھ دیر بعد استقلال بیگ نے انہیں مسجد کا دروازہ کھول کر ہال سے ملحقہ ایک حجرے میں بٹھادیا تھا تاکہ وہ وہاں بیٹھ کر انتظار کر سکیں۔ آدھا گھنٹہ مزید انتظار کرنا پڑا تھا اور پھر ایک شخص اندر آتا دکھائی دیا تھا۔ اس کا رنگ سرخ و سپید تھا' چہرے پر گھنی سیاہ داڑھی تھی۔ اس کی آنکھیں کسی قدر بے رونق لگتی تھیں۔ ان میں کئی سوال چھپے تھے۔ شہوز نے حیرانی سے عمر کی جانب سوالیہ انداز میں دیکھا اور عمر امائمہ کو دیکھنے لگا۔ وہ بھی مایوس نظر آتی تھی۔ عمر کے تنے ہوئے اعصاب میں مزید جھنجھلاہٹ سی ہوئی۔ بال گول میں جانے سے پہلے ہوا میں معلق محسوس ہوتا تھا۔ ان تینوں کے چہرے پر سوالیہ نشان چمکنے لگا تھا۔

"آپ نور محمد ہیں؟" شہوز نے سب سے پہلے خاموشی کو توڑا تھا۔

"نہیں۔" اس شخص نے سر ہلاتے ہوئے نفی میں جواب دیا تھا۔ ان تینوں کے اعصاب ایک دم ڈھیلے ہو گئے تھے۔ امائمہ نے تھوک نگل کر حلق کو تر کیا۔ اس کی حالت سب سے بری ہو رہی تھی۔ ہیجان اور تناؤ اس کی طبیعت کے پیش نظر ویسے بھی اچھا نہیں تھا۔

"ہمیں نور محمد سے ملنا تھا۔" یہ بھی شہوز نے ہی کہا تھا۔ امائمہ اور عمر تو خاموش ہی ہو گئے تھے۔

اس شخص نے سر اٹھا کر ان کی جانب دیکھا۔ وہ ان سے زیادہ تناؤ کا شکار نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی کچھ الجھی الجھی کہانیاں سناتی محسوس ہوتی تھیں۔ وہ تینوں اس کے چہرے کی جانب دیکھ رہے تھے۔

"میرا نام زین العابدین ہے۔ میرے پاس آپ کے لیے اچھی خبر نہیں ہے۔" اس نے کہا تھا۔ اس کی آواز میں بھی وہی اضطراب تھا جو اس کے چہرے سے چھلک رہا تھا۔ امائمہ نے عمر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تھا۔ ایسی صورت حال کا سامنا تو کبھی اسے تب بھی نہیں کرنا پڑا تھا جب اس کے رزلٹس اناؤنس ہوتے تھے۔

"نور محمد کا انتقال ہو چکا ہے۔" اس شخص نے ان میں سے کسی کی جانب دیکھے بنا کہا تھا۔

"یا اللہ۔" اب کی بار امائمہ نے تڑپ کر عمر کی جانب دیکھا جبکہ شہوز اور عمر بے یقینی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے تھے۔

☼ ☼ ☼

"میرا بھائی زندہ ہے عمر۔ یہ سب جھوٹ بول رہے ہیں۔" امائمہ نے ٹھوس لہجے میں اس سے کہا تھا۔

وہ گھر آ چکے تھے اور ان دونوں کو امائمہ کو سنبھالنے کے لیے کوئی خاص جتن نہیں کرنے پڑے تھے۔ توقع کے برعکس امائمہ بہت کمپوزڈ ہی تھی۔ وہ سارا راستہ روئی تھی نہ ہی اس نے مزید کوئی سوال کیا تھا۔ وہ کسی سوچ میں گھری محسوس ہوتی تھی۔ دل تو ان دونوں کے بھی بوجھل تھے اور دل میں سوالات اور خدشات بھی تھے۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ گھر میں تو عمر نے ابھی تک یہ ذکر بھی کسی سے نہیں کیا تھا کہ امائمہ اپنے بھائی کو تلاش کر رہی ہے۔ وہ سوچنے لگا تھا کہ اسے اب کیا کرنا چاہیے۔

وہ امائمہ کے لیے بھی افسردہ تو تھا لیکن ذہن میں یہ کشمکش بھی تھی کہ ممی کو جا کر بتانا چاہیے تاکہ فوتگی کے بعد والی دعائے مغفرت وغیرہ کروائی جا سکے اور پھر پاکستان میں امائمہ کے والدین کو کس طرح یہ بری خبر دینی تھی' یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ امائمہ کو اکلوتی بیٹی ہونے کی حیثیت سے اس موقع پر ان کے پاس ہونا چاہیے تھا۔ انہیں سنبھالنے کے لیے کسی قریبی عزیز کا وہاں ہونا بہت ضروری تھا۔ وہ ڈرائیونگ کے دوران بھی امائمہ کو تسلی یا دلاسا نہیں دے پایا تھا۔ کیونکہ وہ پینجر سیٹ پر بیٹھی تھی اور گھر واپس آ کر عمر کے کسی بھی دلاسے کو اس نے سنا ہی نہیں تھا۔ اس نے اس خیال کو ہی رد کر دیا تھا کہ اس کا بھائی اب اس دنیا میں نہیں رہا۔

"تم خود سوچو ایک' ایک شخص کہتا ہے۔ نور محمد ہی یہاں کا موذن ہے۔ ایک کہہ دیتا ہے۔۔۔ نہیں وہ نہیں ہے۔ پھر ایک تیسرا آدمی آتا ہے اور وہ کہہ دیتا ہے کہ نور محمد کا انتقال ہو چکا ہے۔۔۔ میرا دماغ تو ماؤف ہوا جا رہا

دراصل انسان "واحد" کا تصور کبھی ٹھیک سے سمجھ نہیں پایا۔ وہ عہد الست کو سمجھ ہی نہیں پایا۔ اللہ ایک ہے 'تھا اور رہے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہی اقتدارِ اعلیٰ ہے۔ اس نے جو چیز اپنے اختیار میں کر لی۔۔۔ آپ کا اختیار نہیں کہ آپ اس پر کسی قسم کا اختیار جتا سکیں۔ یہ دنیا ' اس کے وسائل اور ان وسائل پر پلنے والا "حضرت انسان" یہ اللہ کی چیزیں ہیں۔۔۔ ہم سب اللہ کی چیزیں ہیں۔ اسے صرف اسے حق ہے کہ وہ جب چاہے جسے چاہے اور جس طرح چاہے استعمال کرے۔۔۔ کسی امیر خاندان 'کسی رفاحی ادارے یا کسی طاقتور ملک کو یہ حق دیا ہی نہیں گیا کہ وہ انسان کو چیز کی طرح استعمال کر سکے۔ آپ اب ذرا رب کائنات کی عطا پر غور کریں کہ وہ اپنے سوا کسی دوسرے کو یہ حق دیتا ہے تو وہ خود انسان ہے 'جسے وہ خود مختار پیدا کرتا ہے اور اسے اس کے ہر عمل کے لیے آزاد چھوڑ دیتا ہے اور صرف ایک عہد کرتا ہے وہ پوچھتا ہے۔ بتاؤ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ انسان اقرار کرتا ہے اور پھر وہ جب دنیا کے چہرے پر نمودار ہوتا ہے تو سب بھول جاتا ہے۔" وہ ایک بار پھر خاموش ہو گئے تھے۔

اس ساری طویل گفتگو میں پہلی بار سلمان کو سبکی کا احساس ہوا۔ وہ اس شخص کو کس بنیاد پر مسلمان سمجھنے سے انکاری تھا۔ وہ اس سے بہتر اللہ کے حق کو سمجھتا تھا۔ وہ خود کو بہت مضبوط سمجھتا تھا 'لیکن اس سفید فام نے اس کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

"دنیا بہت خوب صورت ہے 'لیکن یہ کسوٹی بھی ہے۔ جب ایک سبق پڑھایا جاتا ہے تو وہ سنا بھی جاتا ہے۔ اس کی آزمائش بھی لی جاتی ہے تاکہ آپ کو جانچا جا سکے۔ آپ کو امتیازی نمبروں سے کامیاب ٹھہرایا جا سکے۔ اللہ نے آپ کو ایک ہی سبق خود پڑھایا ہے اور وہ "عہد الست" ہے۔ آپ کو امتیازی حیثیت چاہیے...

آپ کو کامیابی چاہیے تو آپ کو ان فتنوں سے ان آزمائشوں سے بچ کر گزرنا ہے 'دامن بچا کر چلنا ہے۔۔۔ یہ پل صراط سے پہلے والا پل صراط ہے۔۔۔ جو یہاں سے سر جھکا کر احتیاط سے ہر باطل قوت کو شکست دے کر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا گزر گیا۔ وہ ان شاء اللہ روز آخرت بے خطر سر اٹھا کر پل صراط سے گزر جائے گا۔ اس لیے ان باطل قوتوں کو پہچاننا بے حد ضروری ہے۔ المیہ یہ ہے کہ یہ پہلے سے کہیں زیادہ متحرک اور سرگرم ہو چکے ہیں۔"

انہوں نے ہاتھ آپس میں رگڑ کر انہیں اپنی داڑھی پر پھیرا تھا۔ وہ ایک بار پھر مذہب سے ریاست پر آ گئے تھے۔

"ان باطل قوتوں کا ایک ہی طریقہ کار ہے۔۔۔ یہ این جی اوز اور دوسرے رفاحی اداروں کی شکل میں ٹڈی دل کی طرح پھیل جاتے ہیں۔ ان کے دو بنیادی ہتھیار ہیں۔ یہ لوگ پیسہ پانی کی طرح بہاتے ہیں 'وسائل کا کھل کر استعمال کرتے ہیں اور ان کا اخلاق دل موہ لینے والا ہوتا ہے۔ یہ کسی بھی ریاست میں اپنی میٹھی زبان سے اپنی محبت سے وہاں بسنے والے لوگوں کا دل جیتتے ہیں اور پھر انہیں اپنی جانب راغب کر لیتے ہیں۔ یہ لوگوں کے مسائل سنتے ہیں ان کا تدارک کرتے ہیں یا پھر تدارک کرنے کی یقین دہانی کرواتے ہیں۔ عام انسان کے مسائل 'صحت 'تعلیم 'خوراک امن و امان تک محدود ہوتے ہیں اور یہ ادارے جب انہیں حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو معاشروں میں خود بخود ان کی خاص جگہ بن جاتی ہے۔ وہ کام جو لاکھوں ہتھیار نہیں کر پاتے وہ ان کا اخلاق کر دیتا ہے۔ یہ یوتھ کو یعنی سولہ سے پچیس سال کی عمر کے لوگوں کو ٹارگٹ کرتے ہیں 'ان کی برین واشنگ کرتے ہیں اور پھر آہستہ آہستہ یہ اس طرح سے جڑوں میں پھیل جاتے ہیں کہ کسی کو خبر ہی نہیں ہوتی اور ان کے سب کام آسان ہو جاتے ہیں۔ عوام میں جب ان کی ایک اچھی خاصی گڈول بن جاتی ہے تو پھر یہ اپنے پریشر گروپس 'مسلح دستے بنا لیتے ہیں۔ یہ اتنے طاقت ور ہو جاتے ہیں کہ کسی بھی ریاست کے مقتدر اعلیٰ نہ ہوتے ہوئے نہ صرف عوام بلکہ حکومتوں پر بھی حکومت کرنے لگتے ہیں۔ یہ اپنے مفاد کی خاطر ریاستوں کے وسائل کا اندھا دھند استعمال

نہیں مل سکتی تھی' اس لیے انہوں نے یہ کہانی بڑھا چڑھا کر خود بیان کی تھی کہ نور محمد کو اس کے والد کسی لڑکی کے ساتھ افیئر کی بنا پر ذہنی و جسمانی ٹارچر کرتے رہے ہیں' اور اسی لیے وہ اپنے حواس کھو بیٹھا ہے۔ اسے ماحول بدلنے کی اشد ضرورت ہے تاکہ وہ اپنی توانائی کو مثبت طریقے سے استعمال کر سکے۔

یہ کہانی بہت دلچسپ تھی۔ اس میں ہمدردیاں سمیٹنے' مسلمان والدین کی تربیت کی خامیاں گنوانے اور کسی اسلامی معاشرے کی گھٹن کو ظاہر کرنے کے بہت زیادہ امکانات تھے۔ اس این جی او کو یہ کہانی اور نور محمد کافی پسند آئے۔ ایک بات تو یقیناً" آپ کے علم میں ہوگی کہ ایسی این جی اوز نہ تو صرف آپ کے ملک میں ایکٹو ہیں اور نہ ہی یہ اب ایکٹو ہوئی ہیں۔ ایک عرصے سے یہ سلسلہ جاری ہے۔ وہ کام جو پہلے عیسائی مشنری کیا کرتے تھے۔ وہی کام یہ این جی اوز زیادہ موثر اور بہتر طریقے سے سرانجام دینے لگی ہیں۔ ان کا بنیادی مشن گراس روٹ لیول تک رائے عامہ کو اپنے مفاد اور حق میں نرم کرنا ہوتا ہے۔ یہ والی این جی او جس نے آپ کو مشکوک کیا ہے' اس کی ابتدا افغانستان سے ہوئی تھی' لیکن میں آپ کو بتاتا ہوں کہ اس خطے یعنی پاکستان افغانستان میں متحرک ہونے سے بھی پہلے یہ اور ان جیسے بہت سارے عناصر لاطینی امریکہ کے ممالک یعنی وینزویلا' پانامہ' کولمبیا۔ جنوبی ایشیا کے ممالک یعنی انڈونیشیا' ملائشیا' گلف ریاستیں یعنی سعودی عربیہ' متحدہ عرب امارات اور افریقہ کے بہت سارے غریب ممالک یعنی یوگنڈا' گھانا' سوڈان' الجزائر' صوالیہ میں متحرک رہے ہیں۔

اب یہاں سوال یہ اٹھتا ہے کہ ان این جی اوز یا رفاحی اداروں کا مقصد کیا ہوتا ہے... کیا واقعی یہ کسی ملک کی عوام کی محبت میں وہاں آکر اپنے نیٹ ورک مضبوط کرتے ہیں... اگر کوئی ہوش مند انسان ایسا سوچتا ہے تو اس سے بڑا بے وقوف روئے زمین پر کوئی نہیں ہوگا..." انہوں نے توقف کیا تھا۔

سلمان نے منہ کھولا' وہ کچھ کہنا چاہتا تھا تاکہ یہ ثابت کر سکے کہ وہ ہوش مند ہے' بے وقوف نہیں ہے۔ اسے اس نام نہاد جدید رفاح عامہ کے سارے نیٹ ورک کی خبر ہے اور وہ تو پہلے ہی جانتا تھا کہ بیرون ملک سے آئی امداد کبھی عوامی مفاد کے لیے نہیں ہو سکتی' لیکن اس کا منہ کھلا ہی رہا۔ سچائی یہی تھی کہ وہ اتنا بھی باخبر نہیں تھا۔ وہ دل ہی دل میں جانتا تھا کہ بل گرانٹ جو کچھ اسے بتا رہے ہیں وہ بہت چونکا دینے والی خوفناک حقیقت تھی۔

"یہ ادارے نئے زمانے کی ایسٹ انڈیا کمپنیاں ہیں اور یہ دنیا کو دہشت گردی' اسلام فوبیا' ریڈیکل اسلام جیسی اصطلاحات سے جتنا بھی خوف زدہ کریں' یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ ان کو چلانے والی قوتیں وہی ہیں جو پہلے ہوا کرتی تھیں۔ برطانیہ' امریکہ' جرمنی' اٹلی' فرانس... ممالک وہی پرانے ہیں اور ان کی ڈوریں ابھی بھی انہی امیر ترین کھربوں اربوں کمانے والے خاندانوں کے ہاتھوں میں ہیں جو اس دنیا کے اثاثوں اور وسائل کو اپنے آبا کی میراث سمجھتے ہیں۔ اور ایک بات! آپ اس غلط فہمی سے نکل آئیں کہ یہ خاندان صرف یہودی ہیں' نہیں... اس حمام میں سب عریاں ہیں۔ اس میں عیسائی' ہندو' بدھسٹ اور مسلمان سب شامل ہیں۔ یہ سب وہی لوگ ہیں جو دنیا کے وسائل پر اپنا حق سمجھتے ہوئے آکٹوپس کی طرح "انسان" کو جکڑے رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ وہی ہیں جو کبھی ون ورلڈ آرڈر تخلیق کرکے دنیا کو امن و آشتی کا گہوارہ بنانے کی بات کرتے ہیں' کبھی گلوبلائزیشن کے نام پر دنیا کی آنکھوں میں مٹی جھونکتے ہیں اور کبھی کارپوریٹ کلچر جیسے دل لبھانے والے الفاظ استعمال کرکے انسانوں کی منڈی میں راج کرتے ہیں۔ آئل ریفائنریز' انفارمیشن ٹیکنالوجی کی فیلڈ.... صنعتی زون... بڑے بڑے شاپنگ مالز... فوڈ چینز... سب کے سب ان کے پھیلائے ہوئے جال ہیں۔ ان کے مالکان کا بنیادی مقصد بھی ایک ہے... حکمرانی... ان کی جنگ بظاہر انسان سے ہے بھی نہیں... وہ اللہ کے ساتھ دو بدو مقابلوں میں مصروف ہیں۔

کرتے ہیں۔ حکمرانوں سے اپنی مرضی کے کام کرواتے ہیں' اپنی مرضی کے قوانین بنواتے ہیں۔ بڑے بڑے اداروں میں اپنی مرضی کی بھرتیاں کرواتے ہیں۔ جہاں رقم خرچ کرکے بات بنتی ہے وہاں رقم خرچ کرتے ہیں' جہاں رقم نہیں خرچ کرسکتے وہاں بلیک میل کرکے کام نکلواتے ہیں اور جب یہ دونوں حربے کام نہیں کرتے تو پھر حکومتوں کی بے دخلی' قتل وغارت' امن وعامہ کے مسائل پیدا کیے جاتے ہیں۔"

ان کی باتیں ختم نہیں ہوئی تھیں' لیکن سلمان کا حوصلہ ختم ہوگیا تھا۔ یہ بہت خوفناک حقائق تھے جو کسی بھی عقل و شعور رکھنے والے انسان کو دہلا کر رکھ سکتے تھے۔

"مسٹر سلمان حیدر اب ان سب حقائق کے تناظر میں اپنے ملک کی صورت حال کو جانچ لیجیے۔۔۔ آپ کو مجھ سے کچھ بھی پوچھنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔۔۔ آپ کھلی آنکھوں کے ساتھ اکیسویں صدی کی ابتدا سے لے کر اب تک کے حالات کا جائزہ لے لیجیے' ہر چیز آپ کو خود بخود سمجھ میں آنے لگے گی اور پھر آپ کو حیرانی نہیں ہوگی کہ نور محمد کو کیوں' کس لیے اور کس طرح سے ٹریپ کیا گیا ہے؟ میں نے آپ سے کہا نا کہ پاکستان کا اصل سرمایہ یہاں کی یوتھ ہے جو ہر سال مشروم کی طرح پھل پھول رہی ہے۔ نئی نسل جو واقعی کسی ملک کی تقدیر کو بنا اور بگاڑ سکتی ہے' اسے یہ باطل قوتیں اپنے جال میں جکڑ کر برباد کررہی ہیں۔ این جی اوز نے یہاں بھی سولہ سے پچیس سال کی عمروں کے لوگوں کو ٹارگٹ کیا ہے' کیونکہ ان کے ذہنوں کو بدلنا آسان ہوتا ہے۔ نوجوان نسل جذباتی ہوتی ہے' نڈر ہوتی ہے۔ اور تجربات کرنے یا مہموں میں حصہ لینے سے گھبراتی نہیں ہے۔ ان کو ان کی اساس سے ہٹانے کے لیے بہت سے ذرائع ڈھونڈے گئے۔۔۔ ہر وہ وسیلہ جو ذہنوں کو بدل کر رکھ دے۔ این جی اوز' میڈیا' ٹیکنالوجی' سوشل ایکٹیوسٹ' ادیب شاعر' اساتذہ' ہر وہ ادارہ جو نسلوں کو بنانے میں معاون ہوسکتا ہے' اسے اندر سے کھوکھلا کرکے اپنی معاونت کے لیے استعمال کیا جارہا ہے۔ یہ این جی اوز اور رفاحی ادارے نوجوانوں کے دماغوں کو برین واش کررہے ہیں' انہیں سکھا رہے ہیں کہ ان کا عقیدہ ابتدا سے ہی غلط تھا۔ یہ انہیں (نوجوانوں کو) دو قومی نظریے کو بے بنیاد کہنے کا درس دیتے ہیں' یہ بتاتے ہیں کہ تمام مذاہب ایک ہی ہیں۔۔۔ یہ زندگی' بھوک' جنس' نیند اور موت کے علاوہ کسی دوسری چیز کو انسان کی بنیادی ضرورت نہیں سمجھتے' یہ میڈیا کے ذریعے ناچ گانے' رومانوی داستانیں اور آدھے ادھورے کپڑوں میں ملبوس اداکار دکھا دکھا کر یوتھ کو کلچر لیس کررہے ہیں۔۔۔ جو ثقافت کے نام پر عورتوں کو گھر سے اور پھر کپڑوں سے باہر آنے کو حقوق نسواں قرار دیتے ہیں۔

یہ انہیں (یوتھ کو) سکھا رہے ہیں کہ مذاہب ذاتی معاملہ اور ذاتی معاملے دلوں یا گھروں تک محدود ہوتے ہیں' انہیں گھروں سے باہر لانے یا پھیلانے کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ اس لیے اگر آپ اسلام کے ماننے والے ہیں تو اسلام کو گھر میں ہی رکھیں۔۔۔ معاشرے میں نکل کر اسلام کی بات کرنا' کسی دوسرے مذہب کے ماننے والے کی توہین ہے' اس لیے مذہب پر بات کرنا بد اخلاقی ہے' یہ اس بات کی ترغیب دیتے ہیں کہ کتابوں میں الف اللہ اور ب بسم اللہ پڑھانا شدت پسندی کو ہوا دینے کے مترادف ہے' جو انہیں سمجھاتی ہے کہ اللہ کو بھگوان کہو یا یزدان' اس سے مراد اللہ ہی ہوتی ہے۔ داڑھی پردہ کا درس دینے والا ریڈیکل ہے۔ اور ریڈیکل کا مرجانا ہی بہتر ہے۔۔۔ آپ کی نئی نسل ان باطل قوتوں کے ہاتھوں پروان چڑھ رہی ہے اور یہ سب اپنا نصف سے زیادہ کام کرچکے ہیں۔ 2000ء سے 2005ء تک یہاں سیکولر سوچ تیزی سے پروان چڑھنا شروع ہوئی۔ تین سال بعد 2010ء میں یہاں کی پچیس فیصد آبادی کھلے عام سیکولر ہوچکی ہوگی اور 2015ء میں پچاس فیصد لوگ سیکولرازم کو ہی اصل اسلام اور صحتمند معاشرے کی ضرورت قرار دینے لگیں گے' یہ کسی بھی ریاست کے خلاف کی جانے والی بدترین سازش ہے کہ اس کی نئی نسل کو اس

کرتی۔ انسان جب انسان سے اکتا جاتا ہے تو دو باتیں ہوتی ہیں یا تو وہ خود اپنے آپ میں گم ہو جاتا ہے یا خود اپنے آپ سے گم ہو جاتا ہے۔ یہ مایوسی ہے اور مایوسی اللہ کو پسند نہیں ہے۔ ایسی صورت حال میں قدرت اپنا ایک خود کار بحالی نظام متحرک کرتی ہے۔ میرا ماننا ہے کہ انسان جب بھی کہیں بھٹکنے لگتا ہے یا مایوس ہونے لگتا ہے تو قدرت ایک خود کار نظام کے تحت حتی الامکان کوشش کرتی ہے کہ اسے بھٹکنے سے بچایا جا سکے۔

قدرت کے ذرائع کچھ بھی ہو سکتے ہیں۔۔۔ شمال سے آتی گرم موسم کی شدت کو کم کرتی ٹھنڈی ہوا' تاریکی کو چیر کر دنیا کا چہرہ روشن کرنے والی سورج کی پہلی کرن' اپنی خوراک کو ذخیرہ کرنے کے مقصد سے افقی دیواروں پر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی چیونٹی یا پھر ٹھوکر کھا کر گرتے گرتے سنبھل جانے والا انسانی وجود۔۔۔ کہنے کو یہ بہت چھوٹی چیزیں ہو سکتی ہیں' لیکن یہ سب آپ کو عہد الست کی یاد دلاتے ہیں۔ یہ آپ کو احساس دلاتے ہیں کہ ایک اللہ ہے جو ذرے سے لے کر کائنات تک کے سارے نظام کو آپ سے پوچھے اور آپ کو بتائے بنا متحرک رکھتا ہے۔ آپ مایوس کس سے ہیں۔ اس اللہ سے جو کیڑے کو زمین سے' جانوروں کو فضا سے اور مچھلی کو نمی سے زندہ رہنے کا عنصر عطا فرماتا ہے۔"

وہ بولتے بولتے خاموش ہوئے تھے۔ سلمان کو پہلی مرتبہ ایک عجیب سا احساس ہوا۔ اس کا دل ایک انوکھی سی کیفیت سے دوچار ہوا تھا۔ وہ یہاں کسی مذہبی موضوع پر دیا جانے والا درس سننے تو نہیں آیا تھا۔ وہ تو خالصتاً" ایک سیاسی سازشی ماحول کی خوشبو سونگھتا اس شخص کے سامنے آبیٹھا تھا۔ جبکہ وہ نہتے اچھے طریقے سے اسے مایوسی سے بچنے کے طریقے سکھا رہا تھا۔ وہ شخص جو ابھی باقاعدہ مسلمان نہیں تھا لیکن اس کے پاس ہنر تھا وہ کسی بھی شخص کے سامنے اللہ کی وحدانیت بیان کرنے کی انوکھی صلاحیت سے مالا مال ہو چکا تھا۔ اسے اس پر رشک آیا۔

"معافی چاہتا ہوں لیکن میرا مقصد آپ کو کوئی روحانی کہانی سنا کر بور کرنا نہیں تھا۔ میں صرف ان سازشی عناصر سے مکمل طور پر پردہ اٹھا کر آپ کے سامنے ساری حقیقت واضح کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں آپ کو سمجھانا چاہ رہا تھا کہ نور محمد وہ نہیں ہے جو آپ سمجھ کر یہاں تک آئے ہیں۔ نور محمد وہ ہے جو میں آپ کو بتا رہا ہوں۔۔۔ یہ شخص آپ کے لیے بہت خوش بختی کی علامت ہو سکتا ہے' کیونکہ اس کی وجہ سے آپ بہت سے سازشی عناصر وقت سے پہلے بے نقاب کر سکتے ہیں جو آنے والے سالوں میں پاکستان کے لیے مزید نقصان کا باعث ہوں گے۔ آپ ہمت کریں' میرا ساتھ دیں تو نقصان سے بچا جا سکتا ہے اور میرا دل کہتا ہے کہ ان شاء اللہ ایسا ہی ہو گا۔۔۔ پاکستان وہ واحد ملک ہے جو دنیا سے اللہ کے نام پر لیا گیا تھا۔ اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا' کیونکہ اللہ کے نام پر دی گئی تو چونی اٹھنی نہیں ضائع ہوتی' کوئی ملک کیسے ہو گا۔۔۔"

سلمان کی آنکھیں بھیگنے والی تھیں۔ اس نے خود کو سنبھالا۔ اب کی بار اسے اپنے آپ پر رشک آیا۔ اللہ نے اسے کسی اچھے کام کے لیے چن لیا تھا۔

"ہمیں نور محمد کو تلاش کرنا چاہیے۔ کافی رات ہو چکی ہے۔" اس نے بعجلت کہا۔ کیونکہ وہ اگر کچھ نہ بولتا تو آنسو نکلنے کا خدشہ تھا۔ بل گرانٹ کے چہرے پر مسکراہٹ چمکی۔

"مجھے لگتا ہے صبح ہونے والی ہے۔" وہ بولے تھے' سلمان نے سر ہلایا اور ہلاتا چلا گیا لیکن وہ مسکرا نہیں سکا تھا۔ نمی کہیں ابھی بھی آنکھوں میں دبکی بیٹھی تھی۔

"نور محمد کہاں چلا گیا۔۔؟" اس نے سوال کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میرے پاس ٹھوس ثبوت ہیں کہ وہ "الہاجرون" کے لیے کام کر رہا ہے۔ وہ اپنے آپ کو چھپا رہا ہے' اپنی شخصیت کو چھپا رہا ہے۔۔۔ وہ جھوٹا ہے۔"

یہ سلمان حیدر تھا' نور محمد نے حیرانی سے اس جملے کو ہضم کیا تھا۔ وہ سونے کی غرض سے کمرے میں چلا گیا تھا' لیکن نہ جانے کیوں نیند نہیں آئی تھی۔ وہ دوبارہ

سے ان کے ساتھ بیٹھنے کے لیے اپنے کمرے سے نکل کر آیا تھا' لیکن وہاں جو گفتگو ہو رہی تھی' اس نے اسے باہر ہی رک جانے پر مجبور کیا تھا۔ اسے جلد ہی سمجھ میں آگیا تھا کہ گفتگو کا مرکز وہی ہے۔

"وہ میرے بارے میں اس طرح بات کیوں کر رہا ہے۔" اس نے سوچا تھا۔ اسے پہلے حیرانی اور پھر دلی دکھ ہوا کہ اس کا دوست اس کے بارے میں ایسی باتیں کر رہا ہے' لیکن اسے حیرت نہیں ہوئی تھی۔ لوٹن میں رہتے ہوئے ایک پریکٹیکل مسلم ہونے کا مطلب ہی "ریڈیکل مسلم" تھا اور ریڈیکل مسلم کو سب ہی جہادی سمجھتے تھے۔

یہ وہ اصطلاح تھی جو اکثر ان نمازیوں کے لیے استعمال ہو رہی تھی جو باقاعدگی سے مسجد میں نماز کی ادائیگی کے لیے آتے تھے۔ سفید فام نوعمر لڑکے نمازیوں کو چڑانے کے لیے یہ لفظ کثرت سے استعمال کرتے تھے۔ برداشت کرنے کے باوجود نور محمد کے پورے جسم میں خون کی گردش تیز ہونے لگی تھی۔ وہ سمجھ بھی نہیں پا رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔

"آپ احمد معروف نہیں ہیں۔ آپ کنورٹ نہیں ہوئے ہیں۔ آپ کا نام بل گرانٹ ہے۔" یہ سلمان حیدر کی آواز تھی۔ وہ مزید کہہ رہا تھا۔ "آپ اپنے ناول کے لیے مواد حاصل کرنے کے لیے اس شخص کو استعمال کر رہے ہیں۔ آپ نور محمد کی آڑ میں چھپنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

نور محمد کے تلووں میں یکدم جلن شروع ہوئی تھی۔ اس نے اپنی گردن کو کھجا کر اپنی بے چینی کو کم کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے دو خیر خواہ نظر آنے والے دوست اس کے ساتھ کیا کر رہے تھے۔ اس کے لیے اندر کمرے سے سنائی دینے والا ہر جملہ صرف جملہ نہیں تھا' بلکہ انکشاف تھا۔ اس کی طبیعت کا خلجان بڑھنے لگا۔ اسے خفا ہونے کا پورا حق تھا۔ اس کے وجود پر حیرت' پریشانی' خفگی اور بے دلی ایک ساتھ نازل ہوئی۔

"میں احمد معروف نہیں ہوں۔۔۔ میں بل گرانٹ ہوں۔"

یہ احمد معروف کی آواز تھی۔ نور محمد دروازے سے مزید دور ہوا۔ اس کا منہ جیسے کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ احمد معروف کی اس بات نے اس کا سارا حوصلہ اور ہمت سلب کر لی تھی۔ وہ ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر اپنے کمرے میں واپس آگیا تھا۔ یہ کمرہ احمد معروف اور وہ دونوں مل کر شیئر کرتے تھے۔ وہ کچھ دیر بستر کے سامنے ادھر ادھر ٹہل کر اپنی انگلیاں چٹخاتا رہا' پھر اس نے بنا سوچے سمجھے احمد معروف کی الماری کھول کر وہ بیگ دیکھا جسے احمد معروف اپنی جان سے عزیز رکھتے تھے۔ نور محمد کو یقین تھا کہ اسی بیگ میں اس کا ناول مسودہ ہے۔ جس کا عنوان "عہد الست" ہے۔ یہی ناول فی الحال اسے فساد کی جڑ لگ رہا تھا۔ اسی ناول کی وجہ سے احمد معروف اسے دھوکا دے رہے تھے۔ اس نے وہ بیگ باہر نکال لیا تھا۔ سلمان حیدر کی باتیں سن کر اسے دکھ ہوا تھا' لیکن احمد معروف کے اس اعتراف نے کہ وہ مسلمان نہیں ہوا ہے' اسے غصہ دلا دیا تھا۔ اس کا ہر عمل اضطراری تھا جسے سوچے سمجھے بنا وہ کرتا جا رہا تھا۔

"آپ مسلمان نہیں ہیں احمد معروف۔۔۔ آپ اتنا بڑا دھوکا کسی کو کیسے دے سکتے ہیں۔۔۔ آپ کسی کے ساتھ اس طرح کیسے کر سکتے ہیں۔" وہ بڑبڑا رہا تھا۔

"آپ صرف شہرت حاصل کرنے کے لیے' اپنے ناول کی خاطر مواد جمع کر رہے تھے۔ اسی وجہ سے آپ میرے ساتھ گھل مل کر رہ رہے تھے۔ آپ کو مجھ سے کبھی کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ آپ پہلے دن سے مجھے استعمال کر رہے ہیں۔ آپ میرے ساتھ مخلص نہیں تھے۔ میں نے آپ کو بھی پہچاننے میں غلطی کر دی۔ لیکن آپ کو الزام کیا دینا' اس دنیا نے سدا میرے ساتھ یہی کیا ہے۔ اس دنیا میں مجھے ہمیشہ سب ہی لوگ خود غرض ملے ہیں۔ سب مجھے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے آئے ہیں۔ اسی لیے میں اس دنیا سے منہ موڑنا چاہتا تھا۔ اس دنیا میں سب میرے ساتھ ہی ایسا کیوں کرتے ہیں۔۔۔ میں تو کسی کا برا نہیں چاہتا پھر بھی احمد معروف! آپ نے بھی میرے ساتھ دھوکا کیا

۔۔۔ میں تو دنیا سے کنارہ کر کے خوش تھا۔ میں تو کسی سے کچھ نہیں مانگتا۔ میں تو بس آخرت کے لیے عبادتیں کر کر کے جنت اکٹھی کر رہا تھا اور دنیا میں رہنے والوں کو یہ بھی منظور نہیں تھا۔ میں نے آخر ایسا کیا کر دیا ہے کہ یہ دنیا میری سادگی کا مذاق اڑا کر مجھے "صفر" ثابت کرنے پر تلی ہے۔۔۔ یہ سب لوگ میرا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔"

وہ غصے سے ابل رہا تھا۔ اس کے منہ سے الفاظ بھی ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔ خون میں جیسے آگ سی لگی تھی۔ ایک دفعہ پھر نہ چاہتے ہوئے بھی اس کو اس کیفیت کا سامنا تھا جسے دنیا "پینک اٹیک" یا دورہ کہتی تھی۔ وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا اور پیچھے مڑ کر دیکھے بنا بیرونی دروازہ کھول کر باہر نکل گیا تھا۔ موسم خوشگوار تھا۔ ہوا میں نمی تھی لیکن اس کی آنکھوں سے جیسے خون ابل رہا تھا۔ یہ احمد معروف کا بیگ نہیں تھا جو اس کی بغل میں دبا تھا۔ یہ وہی نوٹس تھے جو اس نے ایک دفعہ اپنے ابو کے منہ پر دے مارے تھے۔ یہ وہ کتابیں تھیں جو پڑھائی کا مشورہ دینے پر وہ ایس ای کی گود میں اٹھا اٹھا کر پھینکا کرتا تھا۔ یہ اس کے رزلٹ کارڈز تھے جو اس کے ابو کے لیے ہمیشہ اسے ڈانٹنے کا جواز بنتے آئے تھے۔ یہ بیگ دراصل اس کا کچا چٹھا تھا جو اسے احساس دلاتا تھا کہ وہ کبھی کسی کا دل جیتنے میں کامیاب نہیں ہو گا۔ لوگ اسے اپنی خوشی کے لیے اپنی ذہنی آسودگی کے لیے ہمیشہ استعمال کریں گے۔۔۔ یہ اس کی نا آسودہ خواہشیں تھیں، یہ اس کے خواب تھے، عزائم تھے۔ یہ اس کی توقعات تھیں، جو اس نے اپنے ارد گرد رہنے والوں کے ساتھ وابستہ کی تھیں اور جن کی بنا پر اسے ہمیشہ دکھ ملے تھے۔ اس نے مزید مضبوطی سے اس بیگ کو بغل میں دبایا۔ یہ اسے اس سینڈ بیگ کی طرح لگ رہا تھا جس پر کھلاڑی مکے مار مار کر کسرت کرتے ہیں اور اپنے ہیجان کو بڑھاتے ہیں۔

"میں ہی کیوں۔۔۔ میرے ساتھ ہی کیوں۔۔۔ کیا اتنا گیا گزرا ہوں میں۔۔۔ کیا میں پاؤں میں پہنے جانے والی چپل ہوں۔۔۔ کیا میں کچرا جمع کرنے والا کچرا دان ہوں؟"

وہ بڑبڑاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔

"ہے کدھر جا رہے ہو؟" اسے کسی نے عقب سے گالی دے کر پکارا تھا۔ اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اس کا دل ہی نہیں چاہا تھا کہ وہ کسی کی طرف دیکھے اور دیکھے بنا بھی وہ جانتا تھا، یہ سفید فام نوعمر اوباش لڑکے تھے جو اس علاقے میں آنے جانے والوں پر آوازے کسنے کے عادی تھے۔ وہ بیئر کے ٹن لے کر ایسے ہی بیٹھے رہتے تھے۔ وہ ان کی جانب توجہ کیے بنا آگے بڑھنے لگا تھا۔

"تم کہاں جا رہے ہو۔۔۔ دو منٹ بات تو سن لو رک کر۔" اسے پھر پکارا گیا۔ اب کی بار کسی نے خالی بیئر کا ٹن کھینچ کر مارا تھا اور چار پانچ لڑکے اس کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔

"اسے مت روکو۔ یہ اللہ سے ملنے کے لیے جا رہا ہے۔" ایک لڑکے نے مضحکہ خیز انداز میں کہا تھا۔ وہ نمازیوں کو چڑانے کے لیے مسلمانوں کے لیے، مسلمانوں کے بارے میں اسی حقارت بھرے انداز میں بات کیا کرتے تھے۔ نور محمد نے کھا جانے والی نظروں سے ان کی جانب دیکھا۔

"تمہیں اللہ سے ملنے کی اتنی جلدی کیوں ہے۔ پہلے ہم سے تو مل لو۔۔۔ اللہ سے تمہیں کچھ نہیں ملنے والا۔۔۔ آؤ ہمارے پاس بیٹھو، تمہیں جنت دکھاتے ہیں۔"

وہ اس کے گرد دائرہ تنگ کر رہے تھے۔ ایک لڑکے نے بیئر کے گھونٹ منہ میں بھر کر اس کی جانب اچھالے تھے۔ یہاں ایسے بہت سے غیر مسلم لڑکے تھے جو نشے میں دھت آنے جانے والے مسلمانوں کا اسی طرح مذاق اڑاتے تھے۔ نور محمد کو بھی ایسے اوباش لڑکوں کو در گزر کرنے کی عادت تھی، لیکن فی الوقت وہ کسی کو بھی معاف کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا بیگ ایک لڑکے کے سر پر مارا تھا تاکہ اسے ہٹا کر گزرنے کے لیے راستہ بنا سکے۔ اس لڑکے نے ایک طرف جھک کر اپنے آپ کو بچایا اور بیگ اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ دوسرے لڑکے نے عقب

سے اس کے سر پر تھپڑ مارا تھا۔

"تم کتیا کی اولاد۔۔۔ تمہاری اتنی ہمت۔" اسے ایک اور مکا رسید کیا گیا۔ وہ منحنی سے وجود کا مالک تھا۔ اس سے اتنی ضرب بھی برداشت نہیں ہوئی تھی۔ وہ نیچے گر گیا۔

"میرا بیگ واپس کرو۔۔۔ خبردار میرے بیگ کو نقصان پہنچایا تو۔" وہ چلایا تھا۔

"اس بیگ میں کیا خاص بات ہے۔ کہیں اس میں تمہارا برقع تو نہیں ہے۔۔۔ لیکن وہ تو تمہاری عورتیں پہنتی ہیں تو پھر اس بیگ میں تمہارے لیے کیا ہے۔" جس لڑکے نے اس سے بیگ چھینا تھا۔ وہ پھبتی کسنے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔ اپنی بات مکمل کرتے اس نے وہ بیگ کھولنا شروع کر دیا تھا۔ نور محمد کا خیال تھا' وہ بیگ مقفل ہو گا یا اس کا کوئی سیکورٹی کوڈ ہو گا اور وہ لڑکا اسے نہیں کھول پائے گا لیکن ایسا کچھ نہیں تھا۔ وہ بیگ بہت آسانی سے کھل گیا تھا۔ نور محمد کے اعصاب ابھی بھی قابو میں نہیں تھے لیکن اسے یہ احساس ضرور تھا کہ یہ بیگ احمد معروف کا ہے اور وہ اس بیگ کو غصے میں اس کی اجازت کے بغیر لے تو آیا تھا لیکن اب اسے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"اوہو ہو۔۔۔ اس میں تو کوران (قرآن) ہے۔۔۔" اسی لڑکے نے سنہری سبزی مائل جلد والی ایک کتاب باہر نکال لی تھی اور وہ بہت بے دردی سے اس کتاب کے اوراق پلٹ رہا تھا۔ نور محمد نے بھی اس کے ہاتھوں کی جانب دیکھا۔ وہ واقعی قرآن کریم تھا۔ نور محمد کو بڑا زور کا جھٹکا لگا۔ اسے یقین تھا احمد معروف جس بیگ کو اتنا سنبھال کر رکھتا ہے وہ اس کی اپنی کوئی ذاتی چیز ہو گی۔ وہ اس کا "معبد الست" ہو گا لیکن وہ تو قرآن پاک تھا۔ نور محمد بجلی کی سی تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھا تھا۔ ان لڑکوں کا کوئی بھروسا تھا۔ وہ قرآن پاک کی حرمت سے واقف نہیں تھے اور وہ نجانے اس مقدس کتاب کے ساتھ کیا کرتے۔ اس نے اس لڑکے کے ہاتھ سے قرآن پاک چھین لیا تھا۔ وہ سب اس کے انداز پر قہقہے لگانے لگے تھے۔

"تم تو بہت طاقت ور ہو۔ کیا کھاتے ہو۔ پورک تو کھاتے نہیں ہو۔ اچھا اچھا۔۔۔ حلال چکن کھاتے ہو نا۔۔۔ یہ طاقت تو حلال چکن سے ہی آسکتی تھی۔" ایک اور لڑکا بولا تھا۔

"دیکھو' میری تمہاری کوئی لڑائی نہیں ہے۔ تم لوگوں نے مجھے مارا ہے' لیکن میں کسی سے شکایت نہیں کروں گا۔۔۔ کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔۔۔ مجھے جانے دو" وہ ان سب کی طرف باری باری دیکھ کر بولا تھا۔ اس کے بدن سے اب پسینہ پھوٹ رہا تھا۔

"تم جانا چاہتے ہو تو جا سکتے ہو لیکن اس قرآن کو وہاں پھینک دو۔" ان میں سے ایک نے فٹ پاتھ پر پڑے ڈسٹ بن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ نور محمد نے کھا جانے والی نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا۔۔۔ یہ ہماری مقدس کتاب ہے۔ یہ قرآن پاک ہے۔ لیکن اگر یہ بائبل بھی ہوتی تب بھی میں اسے نہیں پھینکتا۔ میں مسلم ہوں اور مقدس کتابوں کی حرمت کیا ہوتی ہے' یہ میں اچھی طرح سے جانتا ہوں۔" اس نے سابقہ انداز میں کہا تھا اور ان کے درمیان سے جگہ بنا کر باہر نکلنے کی کوشش کی۔ وہ مزید قریب ہو گئے تھے تاکہ اس کو بھاگنے کے لیے جگہ نہ مل سکے۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ ہمیں بھی سکھاؤ ذرا کہ کیا حرمت ہوتی ہے مقدس کتابوں کی۔" وہ مزید ڈھیٹ ہو رہے تھے۔ لڑکے نے پھر اس کے ہاتھ سے قرآن پاک چھیننا چاہا تھا۔ نور محمد نے اس کا ہاتھ جھٹک کر اسے مزید سینے کے ساتھ لگا لیا تھا۔ جس لڑکے کا ہاتھ اس نے جھٹکا تھا' اس نے اسے ایک مکا رسید کیا تھا۔

"بہت اچھی باتیں کرتے ہو تم۔۔۔ ہم بہت متاثر ہو گئے' ہم بھی اس کتاب کو پڑھنا چاہتے ہیں۔ اب یہ ہمیں دے دو۔" ایک لڑکا جو ان کا لیڈر لگتا تھا بالکل سامنے آکر بولا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بے حد سفاک تھے۔ نور محمد کچھ نہیں بولا لیکن اس نے بازوؤں میں دبا قرآن پاک سینے میں مزید بھینچ لیا تھا۔

"مجھے جانے دو۔" اس نے ایک دفعہ پھر درخواست کی تھی۔ وہ سب ہنسنے لگے۔ ان میں سے دو نے گنگنانا شروع کر دیا تھا۔ ان کے لیے یہ تفریح تھی' مذاق تھا' لطف لینے کا ذریعہ تھا۔

"پہلے یہ کتاب دے دو۔۔۔ دوسری بات اس کے بعد کریں گے۔" وہ یک زبان ہو کر بولے تھے۔

"ہم ہاریں گے نہیں' ہماری رگوں میں جیتنے والی قوموں کا خون ہے۔ ہم قدرت کی طرف سے فاتح ٹھہرائے گئے ہیں۔ ہم جھکنا نہیں جانتے' دشمن ہمارے قدم چومنے کی تیاری کر لے۔ ہم فاتح ہیں اور ہم فاتح ہی رہیں گے۔"

وہ کسی پرانے جنگی اطالوی نغمے کو گانے لگے تھے۔ ان میں سے ہر ایک بیئر کا گھونٹ بھرتا تھا وہی جنگی نغمہ پڑھتے پڑھتے ان سب نے مل کر نور محمد کو زدوکوب کرنا شروع کر دیا تھا۔ کوئی ناک کے نیچے مارتا تھا تو کوئی کان کھینچنے لگتا تھا۔

"تم قرآن پاک کا کرو گے کیا۔ تم اسے پڑھنا نہیں جانتے' تمہیں اس کا کچھ نہیں پتا' مجھے جانے دو۔" وہ بلبلایا تھا۔ اس کی ناک اور ہونٹوں سے خون ابل ابل کر اس کی قمیص کو تر کر رہا تھا۔

"ہمیں اسے پڑھنا بھی نہیں ہے۔ ہم تو اس کے پیج جلا جلا کر سگریٹ پئیں گے۔ اس کے جہاز بنا کر ہوا میں اڑائیں گے' اس کی کشتیاں بنا کر سوئمنگ پول میں چلائیں گے۔" وہی لڑکا جو ان کا لیڈر لگتا تھا کہہ رہا تھا۔ نور محمد نے تڑپ کر اس کی جانب دیکھا۔

"یہ گناہ ہے۔ تم کیوں جہنم کمانا چاہتے ہو۔ ایسے مت کرو۔" وہ ہونٹوں سے رستا خون صاف کرتے ہوئے بولا۔ اس کی بات پر ان کے لیڈر کے چہرے کے تاثرات بدلے تھے۔

"تم اپنی جنت کی فکر کرو۔۔۔ تم بے عقل قوم کے بے عقل انسان! تمہیں کیا خبر کہ جنت اور جہنم ہوتی کیا ہے۔ تم جو ایک تنگ نظر قوم ہو۔ تم جو دہشت گرد ہو، تم جاؤ گے اپنے ریڈیکل نظریات کے ساتھ جہنم میں اور تمہاری یہ کتاب بھی۔۔۔ تم لوگ ہو جو انسانیت کے ماتھے کا گہرا بھدا زخم ہو۔"

وہ غرا کر بولا تھا۔ اس نے کچھ توہین آمیز جملے اسلام اور نبی آخرالزماں سے متعلق مزید کہے۔ نور محمد سے صبر نہیں ہوا تھا۔ اس نے اس لڑکے کے منہ پر تھوک دیا تھا۔ ایک لمحے میں وہ سب اس پر پل پڑے تھے۔ وہ اسے گالیاں دے رہے تھے۔ ٹھڈے مار رہے تھے اور اس کے سینے سے لگا قرآن کریم چھیننے کی کوشش کر رہے تھے۔ نور محمد گھٹنوں میں منہ دے کر بیٹھ گیا تھا۔ اور اس کی گود میں قرآن پاک دبا ہوا تھا۔ اس کی پشت لہولہان ہو چلی تھی لیکن پھر بھی اس نے قرآن پاک کو زمین سے لگنے نہیں دیا تھا۔ اسی دوران پولیس موبائل کا سائرن سنائی دینے لگا۔ ان لڑکوں نے رک کر ایک دوسرے کی شکل دیکھی' شاید کسی راہ گیر نے کاپس کو کال کر دی تھی۔ وہ ایک دوسرے سے چلا کر کچھ کہہ رہے تھے۔ نور محمد کے حواس ساتھ چھوڑنے لگے تھے۔ اس نے دیکھا۔ وہ لڑکے جیبوں سے کچھ نکال رہے تھے۔ انہوں نے اس پر ایک محلول انڈیلنا شروع کیا تھا۔ وہ نجانے مزید اس کے ساتھ کیا سلوک کرنے والے تھے۔ وہ شاید پیٹرول اس پر انڈیل کر اسے آگ لگا دینا چاہتے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے ان اوباش لڑکوں نے ایک نمازی کے ساتھ ایسا ہی کیا تھا تب مسلمانوں کی طرف سے کافی ہنگامہ کیا گیا تھا۔ پولیس موبائل کا ہارن اب قریب سے سنائی دینے لگا تھا۔ نور محمد نے دل ہی دل میں سکون کا سانس لیا۔ مدد قریب ہی تھی۔

اس نے قرآن کریم کو مزید ہمت مجتمع کر کے اپنے ساتھ چپکایا تھا اور ایسا کرنے سے اس کی پشت میں جیسے انگارے جلنے بجھنے لگے تھے۔ تیز آگ کے جیسی چیرتی ہوئی جلن اس کے وجود میں اٹھی تھی۔ اسے اب جا کر سمجھ میں آیا تھا کہ اس پر فائر کیا گیا تھا۔ وہ قرآن کو سینے سے لگائے لگائے سڑک پر لڑھک گیا تھا۔ اس کی آنکھیں دھندلا رہی تھیں۔ تکلیف اتنی بڑھی تھی کہ اس کے منہ سے ایک زوردار ڈکراتی ہوئی کراہ نکلی تھی۔ "امی۔۔۔" اس نے پکارا تھا۔ اسے اپنی آواز

ہی اجنبی لگی۔ اس نے بہت عرصہ بعد اپنی اماں کو اتنی شدت سے پکارا تھا۔ ماں نام تھا ایک حوصلے کا' ایک ہمت کا۔ اسے دونوں چیزیں درکار تھیں۔ اس کے اعصاب و حواس سب دھیرے دھیرے رخصت ہونے لگے۔ ایک قرآن تھا جو سینے پر دھرا رہ گیا تھا۔

وقت ختم ہوا تھا یا شاید وقت شروع ہی اب ہوا تھا!

☆ ☆ ☆

"یہ سب کیوں کر رہے ہیں آپ؟" صوفی صاحب نے خفگی بھرے لہجے میں نور محمد سے کہا تھا' وہ سر جھکائے اپنی انگلیوں کو دیکھ رہا تھا۔ صوفی صاحب بہت عرصہ بعد اس طرح خود اس سے ملنے آئے تھے۔ نور محمد ان کو دیکھ کر مزید بے چین ہو گیا تھا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ بات ان تک پہنچ جائے گی۔

"آپ سچائی کو تسلیم کرنے سے کیوں گھبراتے ہیں۔ آپ کوئی گناہگار نہیں ہیں آپ بزدل نہیں ہیں۔ آپ تو محسن ہیں۔۔۔ پھر کیوں اتنا کتراتے ہیں دنیا سے" وہ اب ڈپٹ کر بولے تھے۔

"وہ بچی بہت دور سے آئی ہے۔ اس کے دل کی حالت کا سوچتا ہوں تو دل دکھتا ہے اور آپ سوچیں کہ اس کی ماں کی کیا حالت ہو گی جو صبح شام "نور محمد" کی تسبیح پڑھتی رہتی ہے۔۔۔ ماؤں کو اتنا نہیں تڑپاتے۔۔۔ آپ کیوں یہ گناہ اپنے سر لیتے ہیں۔۔۔ کیوں اللہ کی ناراضی مول لیتے ہیں۔"

صوفی صاحب التجائیہ انداز میں بولے تھے۔ وہ کافی خفا لگتے تھے۔ ان کی صحت اب پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ وہ بیمار بھی رہنے لگے تھے اور اگر اب وہ خود چل کر نور محمد کو نصیحت کرنے آئے تھے تو یہ اس بات کا مظہر تھا کہ وہ کافی ناخوش ہیں اس سے۔۔۔

"میں اللہ کی ناراضی سے ہی تو ڈرتا ہوں صوفی صاحب۔۔۔! میرے اندر ہمت نہیں ہے۔۔۔ میں کسی کو کیا جواب دوں۔۔۔ میں نہیں کر سکتا کسی کا سامنا۔۔۔ آپ انہیں خود ہی سب بتا دیں۔" وہ اسی انداز میں بیٹھے بیٹھے بولا تھا۔

"نور محمد 2012ء ختم ہونے والا ہے۔ پانچ سال گزر چکے ہیں اس بات کو۔۔۔ آپ کے اندر ابھی تک ہمت کیوں نہیں پیدا ہو سکی۔ آپ کوئی سولہ سال کے بچے ہیں کہ حقائق آپ کو ڈراتے ہیں۔۔۔ یہ کیسا ایمان ہوا نور محمد کہ آپ سچ کا سامنا کرنے سے گھبراتے ہیں' خوف زدہ ہیں۔" وہ پھر ڈپٹ رہے تھے۔

"خوف زدہ کب ہوں۔۔۔ اور سولہ سال کا بھی کب ہوں۔۔۔ سولہ سال کا ہوتا تو جذباتی ہو کر سب کہہ دیتا۔ اب تو سوچتا ہوں۔۔۔ ایک ماں میرا گریبان پکڑ کر سوال کرے گی تو کس منہ سے جواب دوں گا۔" اس کی آواز پر ندامت کا غلبہ تھا۔

"آپ یہ ہی سوچ سوچ کر ہلکان ہوتے ہیں اور تب ہی آپ کو ایسے خواب نظر آتے ہیں کہ ایک ماں آپ سے اپنی اولاد کے متعلق جواب طلبی کرتی رہتی ہے۔ ایک بار سامنے آئیں۔۔۔ حقائق کو مزید مت چھپائیں۔ آپ کو بہت سکون ملے گا۔"

وہ زچ ہو کر بولے تھے۔ نور محمد ان سے اکثر تذکرہ کرتا تھا کہ اسے ایک ہی خواب مسلسل آتا ہے اور صوفی صاحب پڑھنے کے لیے اسے وظائف بتاتے رہتے تھے۔

"میں سلمان حیدر سے بات کر چکا ہوں۔۔۔ وہ سارے حقائق دنیا کو بتانے کی تیاری کر رہے ہیں۔" اس نے روانکھا ہو کر کہا تھا۔

"وہ سلمان حیدر ہیں۔۔۔ آپ نور محمد ہیں۔" وہ دونوں ناموں پر زور دے کر بولے۔

"میں نور محمد نہیں ہوں۔" اس نے جیسے ہتھیار ڈالے تھے۔ صوفی صاحب نے گہری سانس بھری۔

"یہی بات ایک بار اس بچی کے سامنے آ کر کہہ دیجیے۔۔۔ وہ بہت پریشان ہے۔ اس کا حق ہے کہ ہم جو بھی جانتے ہیں' اس اس بارے میں بتایا جائے۔ میں جانتا تھا کہ آپ نے اپنے روم میٹ کے ذریعے اس سے کیا کہلوایا ہے' لیکن اس نے کل مجھے دوسری بار فون کیا تھا۔ وہ سمجھتی ہے کہ اس کا بھائی اس سے ملنا نہیں چاہتا۔۔۔ رو رہی تھی کہ میں نور محمد کی منت کروں

کہ ایک بار اپنی ماں سے مل لے۔ میں چپ کا چپ رہ گیا۔ کیا جواب دیتا اسے۔ ماں، بہنیں روتی ہوئی اچھی لگتی ہیں کیا؟" انہوں نے کہا، پھر آواز کو مزید نرم کرکے بولے۔

"مل لیجئے اس سے ایک بار۔ ماں، بہنیں سب کی سانجھی ہوتی ہیں۔ انہیں راضی کرنے سے رب راضی ہوتا ہے نور محمد! اور رب راضی ہو تو بندہ راضی ہو جاتا ہے۔ پانچ سالوں سے آپ کو بے سکون دیکھ رہا ہوں۔ آپ کو سکون کی ضرورت ہے۔ نکال دیجئے اپنے من کا غبار۔ دنیا کا سامنا کر لیجئے۔"

نور محمد نے اپنی نیلی آنکھوں اور عمر رسیدہ سفید چہرے کے ساتھ ان کی جانب دیکھا تھا۔

"دنیا۔" وہ بڑبڑایا تھا۔

❋ ❋ ❋

"میں نور محمد ہوں۔" اس شخص نے دہرایا تھا۔

شہروز نے بے یقینی کے عالم میں آنکھیں سکوڑ کر عمر کی جانب دیکھا تھا اور عمر اسی انداز میں امائمہ کی جانب دیکھ رہا تھا۔ ان دونوں نے تو نور محمد کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ایک آدھ تصویر جو امائمہ کے پاس اپنے بھائی کی شناخت کے لیے موجود تھی۔ وہ بھی اس قدر پرانی تھی کہ اپنے سامنے بیٹھے اس شخص کو پہچاننا آسان نہیں تھا، لیکن اس کے باوجود وہ تینوں کسی تصدیق کے بغیر یہ کہہ سکتے تھے کہ ان کے سامنے بیٹھا شخص نور محمد تو ہو سکتا تھا، لیکن یہ وہ نور محمد نہیں تھا جو امائمہ کا بھائی تھا۔ اور جس کی تلاش میں وہ یہاں آئے تھے۔

"آپ نور محمد نہیں ہیں۔" امائمہ کے حلق سے آواز بہت دقت کے بعد نکلی تھی۔ وہ اس شخص کو دیکھ کر سب سے زیادہ مایوس ہوئی تھی۔ پچاس پچپن کے لگ بھگ گلابی گلابی رنگت ادھیڑ عمر والا شخص جس کے چہرے پر ہلکے بھورے تل تھے اور سرمئی اور سنہری کھچڑی داڑھی نے آدھے چہرے کو چھپا رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں نیلی تھیں، جن میں گہرے راز چھپے محسوس ہوتے تھے۔ وہ اس کا بھائی نہیں تھا۔ اس نے اپنے بھائی کو بہت سالوں سے نہیں دیکھا تھا، لیکن اس کے سامنے بیٹھا شخص بھی اس کا بھائی نہیں تھا۔ وہ تو ایک سفید فام تھا۔

"آپ میرے بھائی نہیں ہیں۔"

وہ بمشکل اپنی کیفیت پر قابو پا کر بولی تھی۔ وہ سارا جوش، وہ خوشی زائل ہوتی محسوس ہو رہی تھی، جس کے زیر اثر وہ ایک بار پھر الفرڈ سے نوٹن تک آئی تھی۔ اس نے عمر کو بھی ضد کرکے یہاں آنے کے لیے تیار کیا تھا۔ اس نے کتنی منتیں کی تھیں صوفی صاحب کی کہ وہ نور محمد سے اسے ملوا دیں۔

اس شخص نے تھکی ہوئی نگاہیں ذرا کی ذرا اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔

"آپ صحیح کہہ رہی ہیں۔ میں آپ کا بھائی نہیں ہوں۔" اس کی آواز میں بھی تھکن چھپائے نہیں چھپتی تھی۔ امائمہ نے الجھ کر عمر کی جانب دیکھا۔ وہ خود ناسمجھی کے عالم میں اسے دیکھنے میں مگن تھا۔

"دیکھیں۔ شاید کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ ہمیں نور محمد صاحب سے ملنا ہے۔ وہ پاکستانی ہیں اور یہاں موذن ہیں۔ صوفی صاحب نے ہمیں ان سے ملنے کے لیے بھیجا ہے۔" عمر نے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا تھا۔ صورت حال بڑی عجیب سی ہو گئی تھی۔ وہ ایک ایسے شخص سے ملنے آئے تھے جو ان کا رشتہ دار تھا، لیکن جو شخص ان کے سامنے تھا وہ کوئی اور ہی تھا۔

"میں ہی نور محمد ہوں۔ اور میں ہی یہاں موذن کے فرائض سرانجام دیتا ہوں۔ میں ہی ہوں جو امامت بھی کرواتا ہوں اور میں ہی ہوں جس سے صوفی صاحب نے آپ لوگوں کو ملنے کے لیے بھیجا ہے۔" وہ اسی انداز میں بولا تھا۔

"یہ کیسے ممکن ہے۔ وہ نور محمد میرا بھائی تھا۔ وہ سفید فام نہیں تھا۔ وہ بھورا دیسی شخص تھا۔ آپ اگر مذاق کر رہے ہیں تو یہ بہت ہی تکلیف دہ مذاق ہے۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ میں کتنی امید لے کر یہاں آئی ہوں۔ مجھے اپنے بھائی سے ملنا ہے۔ وہ اگر نہیں بھی ملنا چاہتا تو آپ ایک بار میری اس سے فون پر بات

کروادیں۔۔۔ میں اسے رضامند کرلوں گی کہ وہ ایک بار مجھ سے مل۔۔۔ وہاں پاکستان میں میری ماں اس کے انتظار میں مرجائے گی۔" امائمہ نے بہت ضبط سے جملہ مکمل کیا تھا لیکن پھر بھی آنکھ سے آنسو کسی آوارہ گرد کی طرح ٹہلتے ہوئے گالوں پر پھسلنے لگے تھے۔

"میں یہ نہیں کرسکتا۔۔۔ میں کیا کوئی بھی اب آپ کو اس سے نہیں ملوا سکتا۔۔۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔" اس شخص نے امائمہ کی جانب دیکھنے سے احتراز برتتے ہوئے کہا تھا۔ امائمہ کے حلق سے سسکی نکلی۔

"آپ لوگ باربار کیوں جھوٹ بولتے ہیں ہمارے ساتھ۔۔۔ میں نے خود انٹرنیٹ پر چیک کیا ہے کہ لوٹن کی جامع مسجد کی انتظامیہ میں نور محمد نامی ایک شخص موجود ہے۔" وہ زچ ہو کر بولی تھی۔

کمرے کے درمیان میں بیٹھا وہ سفید فام شخص اس سے زیادہ بے چین نظر آرہا تھا۔ یہ سب جو بھی ہو رہا تھا۔ اسے سمجھ پانا اتنا آسان نہیں تھا۔

"ہم معافی چاہتے ہیں۔۔۔ لیکن شاید کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے۔۔۔ ہم نور محمد سے ملنے آئے تھے۔۔۔ جو۔۔۔" شہروز نے سنبھل کر اتنا ہی کہا تھا' پھر اس نے اپنے ساتھ آئے دونوں افراد کے چہرے دیکھے۔ مناسب الفاظ مل ہی نہیں رہے تھے۔

"آپ کون ہیں؟" اس نے یک دم اس سے پوچھا تھا شاید تبھی الجھن سلجھ سکتی تھی۔

اس شخص نے ایک ٹھنڈی گہری سانس بھری پھر امائمہ کے چہرے کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بے چینی بڑھ گئی تھی۔ ایسے جیسے بچہ کسی مشکل سبق سے بچنے کے لیے ڈرتے ڈرتے استاد کا چہرہ دیکھتا ہے' اور دعا کرتا ہے کہ استاد اس سے وہ سبق کبھی نہ سنے۔

"میں بل گرانٹ ہوں۔۔۔ میں نے پانچ سال پہلے جب اسلام قبول کیا تھا تو نور محمد کی عقیدت میں یہ نام اپنایا تھا۔ جب وہ شہید ہوئے تھے۔"

اس نے اعتراف کرلیا تھا۔ وہ امائمہ کو پانچ سال پہلے اس کے بھائی کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کی تفصیلات بتانے کے لیے ہمت مجتمع کرنے لگا۔

☼ ☼ ☼

"نور محمد صوفی صاحب کے ساتھ نہیں ہے۔۔۔ وہ روچڈیل بھی نہیں گیا۔"

بل گرانٹ نے ٹیلی فون ریسیور کریڈل پر رکھتے ہوئے اسے پریشان کن لہجے میں بتایا تھا۔ وہ رات بھر اس کا انتظار کرنے کے بعد اب تمام لوگوں کو فون کرچکے تھے' جن جن کے ساتھ نور محمد کے ہونے کا امکان تھا' مگر اس کا کہیں پتا نہیں چلا تھا۔ پریشانی والی بات یہ تھی کہ اردگرد کے علاقوں سے بھی اس کی کوئی خیر خبر نہیں ملی تھی۔ وہ مسجد میں اذان واقامت کے لیے بھی نہیں آیا تھا۔ حالانکہ اس کا ریکارڈ تھا کہ اس نے کبھی مسجد سے رخصت نہیں لی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے تو نہیں بیٹھے رہے تھے' لیکن جس طرح سے اسے تلاش کیا جانا چاہیے تھا' ویسے کر بھی نہیں پا رہے تھے۔

نور محمد کوئی چھوٹا بچہ نہیں تھا جسے کوئی ٹافی یا لالی پاپ کا لالچ دے کر ساتھ لے گیا تھا۔ وہ اپنے ہوش و حواس میں اپنی پوری رضامندی کے ساتھ گیا تھا اور پھر وہاں سے خفا ہو کر گیا تھا۔ اس لیے بھی اس کے بارے میں کسی سے سوال جواب کرتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔ بل گرانٹ کو سب سے بڑا خدشہ یہ ستا رہا تھا کہ وہ طاقتیں جو پہلے دن سے اس پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ اسے حراست میں نہ لے لیں یا وہ اپنے آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچا لے۔

تین دن وہ ایسے ہی اندھیرے میں تیر چلاتے رہے۔ ادھر ادھر بار بار فون کرتے رہے اور نور محمد کی غیر حاضری کے متعلق استفسار پر لوگوں کو جھوٹے سچے بہانے بنا کر مطمئن کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ پھر صوفی صاحب کے کہنے پر انہوں نے پولیس کمپلینٹ کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ پانچویں دن کی بات تھی۔ وہ گھر سے پولیس اسٹیشن کے لیے نکلنے والے تھے جب نذیر صاحب نے انہیں فون کرکے مسجد آنے کے لیے کہا تھا۔ وہاں پہنچ کر جو کچھ انہیں پتا چلا تھا' وہ ہوش اڑا

دینے کے لیے کافی تھا۔

"پولیس کو ایک پرانے سنسان گھر کے گیراج سے مسخ شدہ لاش ملی تھی جس کی فورینزک رپورٹ اور جامہ تلاشی سے پتا چلا تھا کہ وہ مسلمان تھا۔ اسی لیے وہ پولیس اہلکار ٹوٹن کی جامع مسجد میں پوچھ گچھ کے لیے آئے تھے۔ ان کے پاس ایک قرآن پاک بھی تھا جس پر خون کے دھبے تھے۔ یہ قرآن پاک مسجد کی پراپرٹی نہیں تھا سو کوئی بھی اسے فوراً" شناخت نہ کر سکا تھا۔ یہ صرف بل گرانٹ جانتے تھے کہ یہ قرآن پاک ان کا تھا۔ اور نور محمد کے پاس تھا۔ نور محمد چونکہ بل گرانٹ عرف احمد معروف کا روم میٹ تھا سو انہیں پولیس نے اپنے ساتھ آنے کے لیے کہا تھا۔ پولیس اسٹیشن جا کر انہیں ایک جوڑا سلیپرز اور وہ لباس دیکھنے کا موقع ملا تھا جو پولیس کو ملنے والی لاش کے بدن پر تھا۔ ان کے بدترین اندازوں کی تصدیق ہوئی تھی۔ وہ سب چیزیں نور محمد کی ہی تھیں۔ ان کے لاکھ چاہنے کے باوجود ہر ممکنہ کوشش کے باوجود اور ہر مناجات کے باوجود نور محمد ایک بدترین انجام سے دوچار ہو چکا تھا۔ پولیس نے لاش کو سرد خانے سے ہی دفنا دیا تھا۔ بل گرانٹ کے لیے نور محمد کی موت کا دکھ ان کی اہلیہ کے دکھ سے بھی زیادہ بڑا اور مہلک ثابت ہوا تھا۔ وہ بالکل گم صم ہو گئے تھے۔

"یہ سب میری وجہ سے ہوا۔" انہوں نے خشک آنکھوں سے نور محمد کی چیزیں دیکھتے ہوئے نہ جانے کتنی بار یہ جملہ بولا تھا۔

پولیس معاملے کی تفتیش کر رہی تھی، لیکن تاحال کچھ پتا نہیں چل سکا تھا۔ نور محمد کے انتقال سے دو لوگوں پر دو مختلف اثر ہوئے۔

سلمان کو اس حادثے نے مزید پُرجوش کر دیا۔ اسے نور محمد سے ہمدردی تو تھی، لیکن اس سے کہیں زیادہ ہمدردی اسے سر آفاق سے تھی اور پھر جو نقشہ بل گرانٹ نے کھینچا تھا اور جو سازش انہوں نے بے نقاب کی تھی اس کے سدباب کے لیے وہ اپنے اندر نیا جوش محسوس کرتا تھا۔

جبکہ احمد معروف کے حوصلے بالکل سلب ہو گئے تھے۔ وہ نور محمد کی موت کا ذمہ دار خود کو سمجھتے تھے اور انہیں اس قدر گہرا صدمہ ہوا تھا کہ وہ سمجھنے لگے تھے کہ اللہ نے ان کی معافی کو قبول نہیں کیا تب ہی ان کی نور محمد کے لیے کی جانے والی ہر پُرخلوص کوشش ناکام ٹھہری تھی۔ وہ اسے دنیا کی طرف راغب تو کر پائے لیکن اسے اپنی ماں سے نہیں ملوا پائے تھے جبکہ آخری ایام میں وہ اپنی ماں سے ملنے کے لیے بہت پُرجوش تھا اور یہ بات بل گرانٹ سے بہتر کوئی نہیں جانتا تھا۔ ان کا صدمہ اور نقصان بہت بڑا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ واحد ہے۔"

انہوں نے لرزتی ہوئی آواز وہی جملہ دہرایا تھا جو صوفی صاحب نے ان سے دہرانے کے لیے کہا تھا۔ وہ کلمہ شہادت پڑھ رہے تھے۔ وہ گواہی دے رہے تھے۔ وہ باقاعدہ حلقہ بگوش اسلام ہونے والے تھے۔ ان کا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا اور آنکھوں سے آنسو ٹپک ٹپک کر گود میں دھرے ہاتھوں کو گیلا کرنے لگے۔ یہ لمحہ جاوداں تھا۔ یہ لمحہ ضوفشاں تھا۔ وہ امتی ہونے جا رہے تھے۔ وہ قیمتی ہونے جا رہے تھے۔ خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جو دنیا میں آتے ہی امتی ہوتے ہیں اور بیش قیمت ہیں وہ لوگ جنہیں اللہ "دنیا" میں آنے کے بعد امتی ہونے کا درجہ عطا کرتا ہے۔ بل گرانٹ بیش قیمت ہونے جا رہے تھے۔ ان کا درجہ بڑھ گیا تھا تو آنسو کیوں نہ آنکھوں کو گیلا کرتے۔ اللہ نے انہیں پرکھ کر اپنے لیے الگ کر لیا تھا۔ انہیں امتی نہ ہوتے ہوئے امتی بنا لیا گیا تھا۔

"میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ایک ہے۔ اللہ واحد ہے اور وہی عبادت کے لائق ہے اور محمد ﷺ اللہ کے آخری رسول ہیں۔"

انہوں نے دوبارہ سے گلوگیر لہجے میں پڑھنا شروع کیا تھا اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ ایک عجیب سا رونا تھا جو خود بخود بہہ رہا تھا۔ غموں کے بادل

نہیں تھے' مگر برسات ہو رہی تھی۔ وہ خوش تھے' انہیں چن لیا گیا تھا۔ صوفی صاحب نے بھیگی آنکھوں اور مسکراتے ہونٹوں کے ساتھ آگے بڑھ کر انہیں گلے لگایا تھا۔

"مبروک برادر مبروک۔۔۔ خوش آمدید۔۔۔ خوش آمدید۔"

سلمان حیدر ان کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی بھیگ رہی تھیں۔ اس کا دل بھی لرز رہا تھا۔ اللہ نے اسے کسی کی "الوہی محبت" کا اقرار سننے کا موقع دیا تھا۔ وہ کتنا خوش قسمت تھا۔ اس نے بھی انہیں گلے سے لگا کر مبارک دی۔

"آپ کا نام آج سے نور محمد ہے۔ میری دعا ہے کہ آپ کی خوش بختی کا نیا سفر ہم سب کے لیے خوش بختی کا امین ہو۔۔۔ آمین ثم آمین۔"

"میرا نام آج سے نور محمد ہے۔" انہوں نے آنکھیں صاف کرتے ہوئے مسکرانے کی کوشش میں ہونٹوں کو پھیلاتے ہوئے سر جھکا کر تصدیق کی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میں ابھی "عہد الست" کی اشاعت کے لیے وقت اور حالات کو مناسب نہیں سمجھتا۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ میں اسے نامکمل چھوڑ دوں گا' لیکن میں ابھی سوچنا چاہتا ہوں کہ مجھ جیسے گناہ گار کو اپنی زندگی کے یہ حصے پبلک کے سامنے لانے بھی چاہئیں یا نہیں۔۔۔ میری زندگی میں ایسا کچھ نہیں ہے' جو میں کسی کو بتا سکوں۔۔۔ نور محمد دنیا سے اس طرح نہ جاتے تو میں خوشی خوشی سب کچھ دنیا کے سامنے لاتا۔۔۔ مجھے اپنے اس واحد کام پر فخر ہوتا۔۔۔ لیکن اب میں کچھ دیر انتظار کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ میں اپنے آپ کو وقت دینا چاہتا ہوں۔۔۔ لیکن۔۔۔"

انہوں نے جس روز اسلام قبول کیا' اسی روز شام کو اس سے معذرت کی تھی۔ سلمان خاموشی سے ان کو بات مکمل کرنے دینا چاہتا تھا۔ اس نے پہلے ان کی بات کو جذباتیت میں اہمیت نہ دے کر کوئی نفع حاصل نہیں کیا تھا' سو وہ چاہتا تھا کہ وہ انہیں بات مکمل کرنے کا موقع دے۔

"میں آپ کے ساتھ معاونت کے لیے تیار ہوں۔ آپ جو بھی چاہیں وہ مواد میں آپ کو دینے کے لیے تیار ہوں۔۔۔ ہر وہ ثبوت' ریکارڈ یا کوئی اور مستند معلومات آپ کو چاہیے ہوں گی۔ وہ میں دوں گا۔ میں آپ کی مدد کرنے کا پابند ہوں' لیکن میں اپنے ناول کو ابھی کچھ عرصہ روک کر رکھوں گا۔۔۔ یہ میرا حق ہے۔۔۔ لیکن آپ سچ کا ساتھ دینے کے لیے اپنے ملک و قوم کے مفاد کے لیے ہر معاملے میں آزاد ہیں۔ آپ کو بھی پورا حق ہے کہ وہ باتیں جو میں نے آپ سے شیئر کی ہیں۔ وہ من و عن یا جس طرح آپ چاہیں' جہاں چاہیں شائع کروا کر یا نشر کر کے منظر عام پر لا سکتے ہیں' لیکن میں آپ سے ایک ضرور چاہوں گا کہ آپ میرا یا مرحوم نور محمد کا نام کسی کے سامنے نہیں لائیں گے۔ کم از کم تب تک جب تک میں آپ سے خود نہ کہہ دوں۔"

وہ بااختیار تھے' لیکن عاجزی سے التجا کر رہے تھے۔ سلمان نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

"سر نور محمد! میں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔ میں اپنے آپ کو بہت خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ آپ سے اتنا کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کو جب بھی اپنے ناول کے سلسلے میں میری ضرورت پڑے گی۔ میں آپ کو اپنی سو فیصد توانائی دوں گا۔ میں ہر طرح سے آپ کی مدد کروں گا۔ آپ نے مجھے جو بھی حقائق مجھے بتائے ہیں' میں انہیں ضرور دنیا کے سامنے لاؤں گا اور میں اس بات کا مجاز ہوں کہ میں جب تک آپ نہیں چاہیں گے۔ آپ کا نام کسی کو نہیں بتاؤں گا۔"

اس نے عہد کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کیا کمال کی کہانی لکھ کر لائے ہو۔۔۔ خواب میں کسی بزرگ نے تو آکر نہیں سنائی تھی؟"

رضوان اکرم نے ساری بات سن کر استہزائیہ انداز

میں کہا تھا۔ سلمان حیدر کے دل میں ان کی بہت عزت تھی لیکن اس لمحے ان کا تضحیک آمیز انداز اسے برا لگا۔ وہ چھ مہینے سے اس رپورٹ کو تیار کر رہا تھا۔ اس نے اپنی نیندیں قربان کر کر کے سارے حقائق ایک جگہ جمع کیے تھے۔ اس کے بس میں جو کچھ تھا' اس نے سب کر ڈالا اور یہاں اس کے محترم استاد اور گرو اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔

"سر! یہ آنکھیں کھول دینے والی حقیقتیں ہیں۔۔۔ میں سن کر دنگ رہ گیا ہوں۔۔۔ کیا' کیا نہیں ہو رہا ہماری آنکھوں کے نیچے۔۔۔ ہماری نسلیں تباہ کرنے کی ایسی جامع منصوبہ بندی کی جارہی ہے کہ ہم نے اگر ابھی کچھ نہیں کیا تو آنے والے سالوں میں کف افسوس ملنے کے علاوہ کچھ نہیں رہے گا ہمارے پاس۔۔۔ میں سوچتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں اور آپ میری بات کو سنجیدہ ہی نہیں لے رہے۔"

وہ اپنی جھلاہٹ چھپا کر بولا تھا۔ اس کی خفگی فطری بات تھی۔ وہ سمجھتا تھا اسے سراہا جائے گا' اس کی تعریف کی جائے گی اور اس کا ساتھ دیا جائے گا' لیکن یہاں معاملہ الٹا ہو گیا تھا۔ رضوان اکرم نہ صرف پھبتیاں کس رہے تھے' بلکہ اس کی رپورٹ کی سچائی پر بھی مشکوک تھے' جبکہ اس کے پاس ایک ایک ثبوت پوری محنت اور دیانت داری کے ساتھ موجود تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی یہ رپورٹ رضوان اکرم صاحب اپنے چینل پر بریک کریں اور پھر وہ ان ہی کی مدد سے لندن گیا تھا' اس نے ان کا حق پہلا تھا۔

"کم آن سلمان! جاگو اور کسی ہوش مند انسان کی طرح پیش آؤ۔ اس ملک میں عوام کی فلاح کے لیے اربوں کی گرانٹ آرہی ہے۔۔۔ ملٹی نیشنل مینیز دل کھول کر اس ملک میں انویسٹ کر رہی ہیں۔ غیر ملکی بینک بن رہے ہیں۔ لوگ سیاحت کی خاطر یورپ امریکہ سے آرہے ہیں۔۔۔ ہمارے لوگوں کی بہبود کے لیے ادارے بن رہے ہیں۔۔۔ میڈیا ترقی کر رہا ہے۔۔۔ کتنے ہی چینلز بن رہے ہیں۔۔۔ نئے اسکول کھل رہے ہیں' رفاہی اداروں کا قیام عمل میں لایا جارہا ہے۔ روزگار کے مواقع بڑھ گئے ہیں۔ انٹرنیشنل برانڈز کا جم غفیر لگ گیا ہے اس ملک میں۔۔۔ اور تم اس رپورٹ کا سیاپا ڈال دو۔۔۔ اوہ میرے بھائی! کوئی عقل کے ناخن لے۔۔۔ عوام سکھ کا سانس لے رہی ہے تو تمہاری جان کیوں جل رہی ہیں۔" وہ بھنائے تھے۔

"سر یہ سب آنکھ کا دھوکا۔۔۔ رات کے آخری پہر کا میٹھا خواب جو نماز کے لیے جاگنے نہیں دیتا۔۔۔ یہ ہوا سے بھرا ہوا غبارہ ہے جو پھٹے گا تو بہت زوردار آواز کے ساتھ پھٹے گا۔۔۔ میں یہ سب بلاجواز نہیں کہہ رہا۔۔۔ میرے پاس ثبوت موجود ہیں۔۔۔ ریکارڈ ہے' لیکن آپ سننا نہیں چاہتے تو اور بات ہے۔" وہ چڑ کر بولا۔

"ثبوت؟ اچھا بتاؤ' کون سا پروفیسر ہے وہ جس کا بیٹا ایسا ہیرو بن گیا۔۔۔ کہ ایک بوڑھا ادیب اسے اپنے ناول میں "ہیرا" قرار دے رہا ہے۔ کون ہے یہ نور محمد۔۔۔"

ان کے سوال نے ان کے انداز نے سلمان کو چونکایا تھا۔ وہ اس کی بات کو سنجیدگی سے نہیں سن رہے تھے۔ وہ متذبذب ہو گیا تھا۔ وہ نور محمد کے متعلق کیا بتاتا کہ جسے وہ ہیرا کہہ رہا تھا۔ وہ زیرو بن کر ہوا میں خوشبو بکھیر

کر تحلیل ہو گیا تھا۔ خوشبو کا کوئی وجود ہوتا تو وہ مٹھی میں بند کر کے رضوان اکرم کے ہاتھ میں دے دیتا' لیکن وہ اس پر یقین کرنے کو تیار تھے نہ مدد کرنے کو۔ ان کے سامنے کسی کا نام لینا بھی رسک سے کم نہیں تھا۔

"آپ پھبتیاں کس رہے ہیں سر۔ یہ آپ کی عادت نہیں ہے۔" اب کی بار اس نے بھی سنجیدہ دو ٹوک انداز اپنایا۔

"ابتدا کس نے کی تھی۔ تم نے میرے بھائی۔! کوئی عقل والی بات کرو۔ تم نے لندن جانے سے پہلے مجھے جو کہانی سنائی تھی اب اس کے لیے بالکل ہی ایک مختلف چیز بنا کر لے آئے ہو۔ اس پر یہ بھی چاہتے ہو کہ میں منہ اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کہانی کو سنوں۔ میرے بچے یہ اکیسویں صدی ہے' یہ جو کہانی تم سنا رہے ہو نا۔ الف لیلوی داستان۔ ایک ہیرا تھا جو کسی جن کی قید میں تھا۔ اسے طاغوتی قوتوں نے اپنے کالے مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ مجھے اس پر یقین نہیں تو باقی کروڑوں عوام کو کیسے یقین دلاؤں گا۔" یہ ان کا حتمی انکار تھا۔

"سر! اسی لیے تو آپ کو یقین نہیں آرہا کہ یہ سب کچھ بے حد حیران کن ہے۔ یہ کمرے میں بیٹھ کر لکھی گئی کہانی ہے' نہ میز پر بیٹھ کر گھڑی گئی خبر۔ یہ ایک واقعہ ہے سر۔ اور واقعات ہی حیران کن ہوا کرتے ہیں۔"

"یہ کہانی ہی ہے جو تم خود تخلیق کر کے لے آئے ہو۔ میں اس کو اپنے چینل سے بریک نہیں کروں گا۔ اور تمہیں بھی کہوں گا کہ اس کو اپنے تک محدود رکھو۔ اس ملک کو مزید کہانیوں کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ملک ترقی کر رہا ہے' اسے کرنے دو۔"

"سر! کوئی بڑا نقصان نہ ہو جائے۔" وہ تھک کر بولا۔

"اچھا۔ کیا ہو گا۔ پاکستان تباہ ہو جائے گا۔ ختم ہو جائے گا؟" تحقیر ابھی بھی انداز میں تھی۔ سلمان کو اپنا خون ابلتا ہوا محسوس ہوا۔ پاکستان اس کی دھڑکتی رگ تھی اور رگ بھی وہ جسے شہ رگ کہتے ہیں۔ شہ رگ۔ جہاں اللہ بھی بے حد قریب محسوس ہوتا ہے۔

"یہ تو کبھی مر کر بھی نہیں ہو گا۔ ساری دنیا مل کر بھی آجائے تو وہ ہیرے جو اس مٹی میں موجود ہیں۔ ایسا ہونے نہیں دیں گے۔ ہم جیسے پاکستانی رہیں نہ رہیں سر۔ پاکستان رہتی دنیا تک رہے گا' ان شاء اللہ۔ اللہ کے نام پر دی ہوئی چونی ضائع نہیں ہوتی۔ ملک کیا ضائع ہوں گے سر۔ یہ ملک دنیا سے ہم نے اللہ کے نام پر لیا ہے۔ آپ اور میں یہ بات بھول بھی جائیں تو اللہ کبھی نہیں بھولے گا۔" اس نے بل گرانٹ کے الفاظ کو دہرایا تھا۔ اس کا عزم مصمم تھا اور ارادے نیک۔

وہ اس دن کے بعد سے رضوان اکرم سے دور ہوتا چلا گیا تھا۔ اسے پہلے یہ شخص ایک اچھے صحافی کے طور پر کافی پسند تھا' لیکن اس رپورٹ کو جسے اس نے بھی "عہد الست" کا نام دیا تھا جس کی وجہ سے بہت سے لوگ اس کے سامنے بے نقاب ہوئے' اسے اس رپورٹ کی اشاعت اور براڈ کاسٹنگ کی اجازت کسی نے بھی نہیں دی تھی۔ وہ تب بھی مایوس نہیں تھا۔ اسے اپنے کام پر اتنا بھروسا تھا۔ وہ جانتا تھا۔ وہ کامیاب ہو جائے گا' لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

کنیز نور علی

اُو لالہ کی محبت

"دنیا بھری پڑی ہے ایک سے ایک خوب صورت وجیہہ لڑکوں سے۔ آپ کو میرے لیے وہی گنجا موٹا کالا ہی ملا۔ ساری زندگی انتظار کر کر کے اب آپ یہاں میرا نصیب پھوڑ رہے ہیں' حد ہے۔ یعنی کہ واقعی حد ہے ظلم اور زیادتی کی۔"

تن بدن میں آگ ہی تو سلگ اٹھی تھی اپنی قسمت کا فیصلہ سن کر۔ ہر لڑکی کی طرح نادیہ اس بات پر یقین رکھ کر صاف ستھری زندگی گزارتی آئی تھی کہ اس کی شادی کسی شہزادے سے ہوگی جو عام — لوگوں جیسا کیسے ہو سکتا ہے بھلا۔ کیسے کیسے خوش کن ست رنگ سپنے اس نے سجا رکھے تھے اس شہزادے کے لیے' جو ہینڈسم ہوگا' باوقار ہوگا اور یہاں صرف نام کا وقار

ڈھونڈ لیا تھا اس کے گھر والوں نے۔ نادیہ سخت جلی بھنی بیٹھی تھی۔ بول بول کر وہ اپنی بھڑاس نکال رہی تھی۔

"اتنے لوگ ہیں اس دنیا میں، لیکن ہمارے خاندان نے اپنے ہی کسی کونے کھدرے میں چھپے سابقہ قریبی رشتہ داروں کو ڈھونڈ نکالنا ہوتا ہے۔"

خاندان برادری میں ہی موجود جس لڑکے کو اس نے کبھی اہم سمجھا ہی نہیں تھا وہ اس کے خوابوں کا شہزادہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا۔ نازک سا دماغ قبول کرکے ہی نہیں دے رہا تھا۔ وہ بار بار بولتی اور ناک شوں شوں کرکے ٹشو سے صاف کرتے ہوئے گھر والوں کے ردعمل کا جائزہ لیتی۔ اس کے گھر والے بھی 99.99٪ پاکستانی گھر والوں کی طرح بے حد شانت ہو کر اسے تسلیاں دے رہے تھے اور بہت رغبت سے شادی کی تیاریوں میں مگن تھے۔

✲ ✲ ✲

"ساری دنیا بھری پڑی ہے ایک سے ایک حسین و جمیل لڑکیوں سے، لیکن آپ کو وہ چھینی موٹی سفید بزرگ ہی ملی ہے میرے لیے۔ فرماں بردار بیٹے کی طرح سب آپ پر چھوڑا، لیکن آپ تو مجھ پر ظلم کرنے پر اُتر آئے ہیں۔"

وقار سخت نالاں تھا۔ ایک خاص الخاص بیوی کا خواب چھن کرکے ٹوٹا تھا۔ بھلا وہ نادیہ اس کی بیوی کیونکر۔ اتنے خاص منصب پر اتنی عام سی نادیہ، دل مان ہی نہیں رہا تھا، لیکن یہاں بھی بزرگ بے حد مگن تھے۔ شادی کی تیاریوں پہ زور تھا اور وقار کے لیے ٹھنڈی تسلیاں تھیں کہ گھر والوں کا ماننا تھا کہ ان کا تجربہ وقار کے تجربے سے زیادہ اہم ہے، بھلا اس سارے ردعمل میں نادیہ کا دوش تھا نہ وقار کا، ہمارے ہاں ہر لڑکا لڑکی شادی کے حوالے سے سہانے خواب دیکھتے ہیں۔ اور پھر گھر والے ان میں ایسے ایسے رنگ بھرتے ہیں کہ ساری زندگی اس رنگ بازی سے نمٹتے گزرتی ہے، لیکن یہ تو اولین رشتہ طے ہو جانے کا ــــ اٹیک ہوتا ہے کہ خوف ناک ردعمل دیا جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ دھڑکن معمول پر آتی ہے اور دماغ سوچنے لگتا ہے، سو نادیہ بھی اب غور و فکر میں مشغول تھی۔

"گنجا، موٹا، کالا"

"گنجا تو وہ بالکل بھی نہیں ہے، بس بال گھنے نہیں ہیں۔ موٹا کہاں ہے۔ بڑا رعب دار سا بھرا بھرا جسم ہے اور سانولا رنگ ہے۔"

سانولے رنگ کا سوچ کر اس کی دھڑکن نے لے پکڑی تھی۔

"مجھے تو مردوں کا سانولا رنگ پسند ہے ہمیشہ سے۔ بہت اٹریکشن ہوتی ہے سانولے رنگ میں۔" خود کلامی میں مصروف وہ مسکرائے جا رہی تھی۔

دوسری طرف وقار بھی صدماتی کیفیت سے باہر آرہا تھا۔ اب تو دوست اور بھائی چھیڑنے لگے تھے۔ ظاہر ہے ایک ہفتے بعد شادی تھی۔ اسے بہت مختلف محسوس ہو رہا تھا۔ نادیہ کے حوالے سے سوچتے ہوئے اب وہ مسکرا رہا تھا۔

"خوب صورت تو ہے۔ اخلاق کی بھی اچھی ہے۔ آج تک کوئی لڑائی جھگڑا یا ایسی ویسی بات نہیں سنی اس کے بارے میں اچھی لڑکی ہے۔"

اب اس کے خدوخال کو یاد کرتے ہوئے نہ وہ اسے چھینی لگی تھی نہ ناٹی۔ وہ دل سے مسکرا رہا تھا اور پھر ولیمہ کی دلہن بنی وہ بیٹھی تھی۔ جب اس کی ساس نے دونوں کی نظر اتاری تھی۔

"ماشاء اللہ چاند سورج کی جوڑی ہے میرے وقار اور نادیہ کی۔"

دونوں کی شوخ نظریں ملی تھیں اور وقار کے دل پر نقش ہو گیا تھا کہ دنیا کا حسین ترین چہرہ نادیہ کا ہے۔ کیونکہ وہ اس کے دل میں بستی ہے اور نادیہ حیران تھی کہ وقار سے بڑھ کر کوئی وجیہہ اور شاندار ہو ہی نہیں سکتا۔ اس نے بہت استحقاق سے اسے دیکھا تھا کہ اب وہ سارا کا سارا اس کا تھا اور دونوں کے گھر والے 99.99٪ پاکستانی گھر والوں کی طرح شکر ادا کر رہے تھے کہ فرض ادا ہوا۔

✲

خواہش

تری انگلی میں پہنی ہوئی
میں ڈائمنڈ رنگ نہیں ہوں کہ
جسے تم قیمتی سمجھو
سدا احتیاط سے رکھو
جسے تم بے دھیانی میں
گھماتے جاؤ انگلی میں
میں نیکلس بھی نہیں ہوں کہ
جسے تم پہن کے رکھو
اُتارو سونے سے پہلے تو اُس کو لاک
میں رکھ دو
میں بس اک کانچ کی چوڑی
میری اتنی سی خواہش ہے
کلائی میں سدا رکھنا
تمہیں یہ تو خبر ہو گی
ذرا سی بے دھیانی میں
یہ چوڑی ٹوٹ جاتی ہے

میثم علی آغا

دن ایک ستم، ایک ستم رات کرو ہو
وہ دوست ہو، دشمن کو بھی تم مات کرو ہو

ہم خاک نشیں، تم سخن آرائے سرِ بام
پاس آکر ملو، دور سے کیا بات کرو ہو

ہم کو جو ملا ہے وہ تم ہی سے تو ملا ہے
ہم اور بھلا دیں تمہیں، کیا بات کرو ہو

یوں تو مُنہ پھیر کے دیکھو بھی نہیں
جب وقت پڑے ہے تو مدارات کرو ہو

دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

بکنے دو عاجز کو جو بولے ہے، بکے ہے
دیوانہ ہے، دیوانے سے کیا بات کرو ہو

کلیم عاجز

سراپا حقیقت، مجسم فسانہ
محبت کا عالم، جنوں کا زمانہ

وہ پہلے پہل دونوں جانب یہ عالم
ادابے تعلّق، نظر محرمانہ

نظر اُٹھتے اُٹھتے، نظر ملتے ملتے
دھڑکتے دلوں کا وہ نازک فسانہ

طبیعت شگفتہ، مگر کھوئی کھوئی
ہر انداز دلکش، مگر والہانہ

وہ شعر و ترنم کا پُرکیف موسم
وہ اشک و تبسم کا رنگیں زمانہ

غرورِ تجمل، مگر زخم خوردہ
شکستِ محبت، مگر فاتحانہ

جگر مراد آبادی

مثالِ برگ کسی شاخ سے جھڑے ہوتے ہیں
اسی لیے تو ترے پاؤں میں پڑے ہوتے ہیں

کسی نے میری زمیں چھان کر نہیں دیکھی
وگرنہ کتنے ستارے یہاں پڑے ہوتے ہیں

یہاں سَروں پہ یونہی برف آپڑی ورنہ
بڑے بھی عمر سے اپنی کہاں بڑے ہوتے ہیں

کسی کے حکم سے ایسا جمود طاری ہے
زمیں روانہ ہوئی اور ہم کھڑے ہوتے ہیں

افضل گوہر

شگفتہ نگاہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا، اللہ بھی اس پر رحم نہیں فرماتا۔" (بخاری مسلم)

فائدہ،
اللہ کی مخلوق کے ساتھ رحم و کرم کا معاملہ کرنا، اللہ کو بہت پسند ہے۔ حتیٰ کہ جانوروں اور پرندوں کے ساتھ بھی۔ اس سے انسان اللہ کی رحمت کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ اس حدیث میں انسانوں کا ذکر اس کی خصوصیت کے اعتبار سے ہے۔ ورنہ جانوروں پہ رحم کرنا بھی مطلوب ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا،

شریف آدمی کی پہچان یہ ہے کہ جب اس سے کوئی سختی کرے تو سختی سے پیش آئے اور جب اس سے کوئی نرمی کرے تو نرم ہو جائے اور کمینے کی شناخت یہ ہے کہ جب اس سے کوئی نرمی کرے تو سختی سے پیش آئے اور جب کوئی سختی کرے تو ڈھیلا ہو جائے۔

امام زین العابدین فرماتے ہیں،

اگر تم نے ماں باپ کے حقوق ادا نہیں کیے تو تمہاری کوئی عبادت قبول نہیں ہوگی۔
ایسا نہ ہو کہ وہ تمہارا لہجہ سن کر سہم جائیں اور اپنی ضروریات چھپائیں کہ وہ ضعیف ہو گئے اور تم جوان ہو گئے۔

تم تو بھول گئے، ہو کہ انہوں نے اپنی جوانی تمہیں جوان کرنے کی خاطر قربان کر دی کہ تم کبھی گوشت کا ایک ٹکڑا ہوا کرتے تھے اور اپنے اوپر سے ایک مکھی بھی نہ ہٹا سکتے تھے۔

نادیہ جہانگیر۔ مومیرآباد کشمیر

ہاتھاپائی پر اترنے والا،

دو چینی مزدور ایک ہجوم میں کھڑے بحث و مباحثہ کر رہے تھے۔ ایک غیر ملکی کو حیرت ہوئی کہ ابھی تک ہاتھاپائی کی نوبت نہیں پہنچی۔ ایک چینی نے کہا۔
"جب کوئی شخص ہاتھاپائی پر اتر آئے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے پاس دلیل نہیں رہی ہے۔"
(فرینکلن روزویلٹ)

لیڈر کی بصیرت،

لیڈر کا کام یہ ہے کہ عوام کو اس مقام سے جہاں وہ ہیں اس مقام تک لے آئے جہاں انہیں ہونا چاہیے۔ دنیا لیڈر بنا رہی ہے۔ اسے عوام پوری طرح نہیں سمجھتے۔ لیڈر کو بصیرت کا حامل ہونا چاہیے۔ جو لیڈر یہ بصیرت نہیں رکھتے وہ ناکامی سے دوچار ہوتے ہیں چاہے وہ وقتی طور پر کتنے ہی مقبول کیوں نہ ہوں۔
(ہنری کسنجر)

سرگوشی،

طویل بیماری کے بعد اس کی داڑھی مونچھیں بے تحاشا بڑھ چکی تھیں۔
صحت یابی کے بعد جب وہ آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے اپنی بیوی کے ساتھ ساحل سمندر پر

واقع ایک ہوٹل میں ٹھہرا تو اس نے فیصلہ کیا کہ پہلے روز وہ اپنی داڑھی صاف کرے گا اور اس سے اگلے روز مونچھیں۔ اور اس نے ایسا ہی کیا۔
تیسرے روز جب وہ شیو بنا کر اپنی بیوی کے ہمراہ ہوٹل سے باہر آ رہا تھا تو اس کی بیوی کے کان میں کسی عورت کی سرگوشی کی آواز آئی جو اپنی ساتھی سے کہہ رہی تھی
"یہ عورت مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگتی۔ آج یہ تیسرا مرد ہے جس کے ساتھ یہ باہر جا رہی ہے۔"
شبانہ عندلیب۔ گوجرانوالہ

موتی مالا،

، بے کار مت بیٹھو۔ اس سے زندگی کی مشکلات بڑھتی ہیں۔ (والٹر)
، پیش کرنے کا انداز تحفے سے زیادہ قیمتی ہے۔ (میری کارڈیل)
، ہم جتنا اسلحہ اکٹھا کر چکے ہیں اگر اتنے پھول اکٹھے کرتے تو دنیا مہک جاتی۔ (شیو ڈنار)
، مجھے کسی چیز نے اتنا متاثر نہیں کیا جتنا باعصمت لڑکی کے حیا آلود تبسم نے۔ (نطشے)
، غلطی مان لینے سے انسان کا ذہنی بوجھ کم ہو جاتا ہے۔ (سائرس)

گر جاتی ہے۔ (حضرت علیؓ)
، تکلف کی زیادتی، محبت کی کمی کا باعث بن جاتی ہے۔ (امام غزالیؒ)
طاہرہ ملک۔ جلال پور پیروالا

کامیاب،

جس شخص کے بیوی بچے اس سے راضی ہوں اس کی دنیا کامیاب اور جس کے والدین اس سے راضی ہوں تو اس کا دین کامیاب ہے۔
مدیحہ نورین مہک۔ برنالی

بات سے بات

- انسان کی فطری کمزوری ہے کہ وہ اس بات کو بار بار سننا چاہتا ہے جو اسے پسند آئے۔
- آنکھیں بند کرلینے سے سورج کی روشنی کم نہیں ہوجاتی۔
- علم دل کو اس طرح زندہ کرتا ہے جیسا بارش زمین کو۔
- اکثر لوگ زندگی کی کتاب پڑھنا شروع کر دیتے ہیں بغیر اس کے کہ انہوں نے زندگی کی زبان سیکھی ہو۔
- زندگی ایک طویل اکتا دینے والی کہانی ہے اس کو وہی شخص کامیابی کے ساتھ پڑھ سکتا ہے جس کی توجہ ہمیشہ کہانی کے اگلے پیراگراف پر لگی رہے۔
- اجتماعی زندگی کا سب سے کم اہم لفظ "میں" اور سب سے زیادہ اہم "آپ" ہے۔
- مواقع کو استعمال کرنے کا نام "قیادت" اور مواقع کو برباد کرنے کا نام حماقت۔

صدف عمران۔ کراچی

گھر کا بھیدی

ایک لمبی سی کار آکر رکی۔ اس میں سے ایک نہایت معزز شخصیت، برآمد ہوئی۔
کسی نے پوچھا۔ "آپ کی تعریف؟"
جواب ملا۔ "ادیب۔"
پھر پوچھا گیا۔ "کیا لکھتے ہیں؟"
"طبیعت جس کام پر مچل جائے، کرگزرتا ہوں۔ ویسے شاعر بھی ہوں، ناول نگار بھی ہوں اور افسانہ... "
ابھی وہ صاحب بول ہی رہے تھے کہ ڈرائیور نے آکر کاغذوں کا پلندہ ان کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔
"یہ افسانہ ہے۔ میں نے رات کو لکھا تھا۔ بہت سخت بھوک لگی ہے۔ برائے مہربانی سو روپے دے دیں۔"

انجل۔ ڈہرکی

آرزو

امام جعفر صادق کا فرمان ہے۔
"وہ شخص جو دنیا سے دل لگا بیٹھا ہے اور خود کو اس دنیا کی رنگینیوں کا اسیر بنا لیتا ہے وہ ہمیشہ تین قسم کی نفسیاتی مشکلات میں مبتلا رہتا ہے۔
ایک تو ایسا غصہ اور غم جو اس کے صفحۂ دل سے ہرگز نہ مٹ سکے۔
دوسرے ایسی آرزو جو کبھی پوری نہیں ہوگی۔
تیسرے ایسی امید جس تک ہرگز اس کی رسائی ناممکن ہے۔"

سیدہ نسبت زہرا۔ کہروڑ پکا

اختصاریے

- اچھی چھلانگ لگانے کے لیے کچھ پیچھے ہٹنا ضروری ہے۔
- حد سے بڑھی ہوئی ہر شے ایک عذاب ہے۔
- لمبی بات اثر کھو دیتی ہے۔
- ٹھوکر کے لیے تیار رہو تاکہ گرنے سے بچ سکو۔
- وقت کم ہو تو بھی نماز پڑھو، ہاں مختصر کرلو۔
- ملنے کے دو ہی معیار ہیں۔ خیالات ملتے ہوں یا خون۔
- عزت کا کوئی متبادل نہیں۔

(خالد حنیف۔ اختصاریے سے اقتباس)

گڑیا شاہ۔ کہروڑ پکا

سرورق کی شخصیت

ماڈل	نیناں بتول
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹوگرافر	موسیٰ رضا

نمرہ، اقراء ———— کراچی

قدموں میں تھکن تھی، گھر بھی قریب تھا
پر کیا کریں کہ اب کے سفر ہی عجیب تھا
نکلے اگر تو چاند دریچے میں رُک بھی جائے
اس شہرِ بے چراغ میں کس کا نصیب تھا

انجل ———— ڈہرکی

نہ کوئی خواب ہمارے ہیں نہ تعبیریں ہیں
ہم تو پانی پہ بنائی ہوئی تصویریں ہیں

صدف عمران ———— کراچی

یہ جو شکوے تم کو وطن سے ہیں یہ بجا سہی میرے دوستوں
مگر ایک بات نہ بھولنا! یہ تمہارا گھر ہے، ارم نہیں
میں خطاب کرتا ہوں روبرو، میری بات جو ہے بے وجود
میرے سامعین کی خیر ہو، مجھے احتیاجِ قلم نہیں

نادیہ جہانگیر ———— موسیٰ آزاد کشمیر

عنوانِ محبت پہ ہم بس اتنا ہی لکھ پائے
بہت کمزور رشتے تھے بہت مضبوط لوگوں کے

ثناء عابد ———— نارووال

وہ نہ ہی ملتا ہمیں تو اچھا تھا
بے کار میں محبت سے نفرت ہو گئی

ثناء عبدالقیوم ———— بنکہ چیمہ

بھلا کب یاد رکھے گا وہ بچپن کی محبت کو
نئی دنیا میں وہ باتیں پرانی بھول جائے گا

نجبہ اکرم ———— گاؤں گوئیکی

ہمیں یہ زعم کہ ہم حسن کے معبود ہیں
انہیں یہ ناز کہ تصویر تو ہماری ہے

رضوانہ ملک ———— جلال پور پیر والا

کوئی وعدہ نہیں پھر بھی انتظار تھا
دور ہونے پر بھی اپنے پیار پر اعتبار تھا
نہ جانے کیوں بے رخی کی اس نے ہم سے
کیا ہم سے بھی زیادہ کوئی اس کا طلبگار تھا

حمیرا نوشین ———— منڈی بہاؤالدین

صبح کے تخت نشین شام کے مجرم ٹھہرے
ہم نے پل بھر میں نصیبوں کو بدلتے دیکھا

ملیحہ رضوان ———— اسلام آباد

یہ جو ہم ہیں نا، احساس میں جلتے ہوئے لوگ
ہم اگر زمیں زاد نہ ہوتے تو ستارے ہوتے

سحرش خان بھٹو ———— کراچی

آواز دے کر زندگی ہر بار چھپ گئی
اور ہم ایسے سادہ دل کہ ہر بار آ گئے

عائشہ جہانگیر مرالی ———— کبیر والا

اداس دل کی ویرانیوں میں بکھر گئے ہیں خواب سارے
یہ میری بستی سے کون گزرا، بکھر گئے ہیں گلاب سارے
نہ جانے کتنی شکایتیں تھیں، نجانے کتنے گلے تھے تم سے
جو تم کو دیکھا تو بھول بیٹھے، سوال سارے جواب سارے

عزیا ججا ———— کہروڑ پکا

گل کی طرح بلند ہیں سب حوصلے میرے
کشتی بھنور میں آئی ہے کردار تو نہیں

سیدہ نسبت زہرا ———— کہروڑ پکا

سونے تو شب کے واسطے آنکھوں میں چل پڑے
جاگے تو جیسے خواب کا موسم ٹھہر گیا
اس نے کہا کہ آنکھ میں گہرا غبار کیوں
میں نے کہا عذاب کا موسم ٹھہر گیا

آمنہ اُجالا ———— ڈہرکی

اس دیس میں لگتا ہے عدالت نہیں ہوتی
جس دیس میں انسان کی حفاظت نہیں ہوتی
مخلوقِ خدا جب کسی مشکل میں پھنسی ہو
سجدے میں پڑے رہنا عبادت نہیں ہوتی

نمرہ، اقراء کی ڈائری سے

کلاسیکی شاعری میں گلنار ایک ایسا نام جس کی شاعری میں بے ساختگی ہے۔ اس نظم میں وہ زندگی سے گفت و شنید کرتے نظر آتے ہیں۔

ایک روز زندگی کے روبرو آ بیٹھے
زندگی نے پوچھا
دکھ کیا ہے؟
کیوں ہوتا ہے؟
کہاں ہوتا ہے؟
یہ بھی تو پتا نہیں چلتا
تنہائی کیا ہے آخر؟
کتنے لوگ تو ہیں پھر تنہا کیوں ہوں؟
میرا چہرہ دیکھ کر زندگی نے کہا۔
میں تیری جڑواں ہوں
مجھ سے ناراض نہ ہوا کر
تجھ سے ناراض نہیں زندگی
حیران ہوں میں
تیرے معصوم سوالوں سے
پریشان ہوں میں

ملیحہ رضوان کی ڈائری سے

اردو کا مقبول جان محبتوں کا شاعر، ان کی یہ کاوش مجھے بہت پسند ہے۔

ہم کوئی جگ سے نرالے تو نہیں ہیں لوگو!
ہم بھی اس وقت میں جیتے ہیں جہاں
تتلیاں، خواب ہیں اور پھول
شہر ہم کو بھی مقدر میں ملا ہے جس میں
دھڑکنیں گم ہیں
اور شور سے ہو کا عالم
ہم بھی اس شہر کے مکین ہیں کہ جہاں
وقت کے کاٹتے ہی بجھ جاتی ہے اس عمر کی لو

ایک بے معرف و گم نام ارادے کی طرح
ہم بھی لوگوں کی طرح ہیں کہ ہمیں
دکھ چھپانا بھی ہے اور جینا سربازار بھی ہے
ہم پر بھی عہد جوانی کا عذاب اترا ہے
ہم نے بھی دور کسی شہر میں
بستے ہوئے، ہنستے ہوئے
اک شخص کو چاہا ہے بہت
دھڑکنیں
آنکھ کے آنسو تو نہیں ہیں لیکن
ہم نے گن گن کے
گنوائی ہیں کسی شخص کے نام
ان ہواؤں کو صدا جانا ہے
جیسے اس شہر سے پیغام وفا لائی ہیں
ہم!
نرالے ہی تو نہیں
جس نے اس غم کو غم جاں سا بنا رکھا ہے
عمر جس میں نہ کوئی آس
نہ آنسو، نہ ہنسی
ہم نے اس عمر کا افسانہ بنا رکھا ہے... !

English
سر نہ کُھجائیں..
Healthy ہوجائیں!
English
ANTI - LICE
SHAMPOO
جوؤں اور لیکھوں سے مکمل نجات
English
ANTI - LICE
SHAMPOO
5 منٹ میں جوؤں اور لیکھوں سے مکمل نجات
facebook.com/snscares
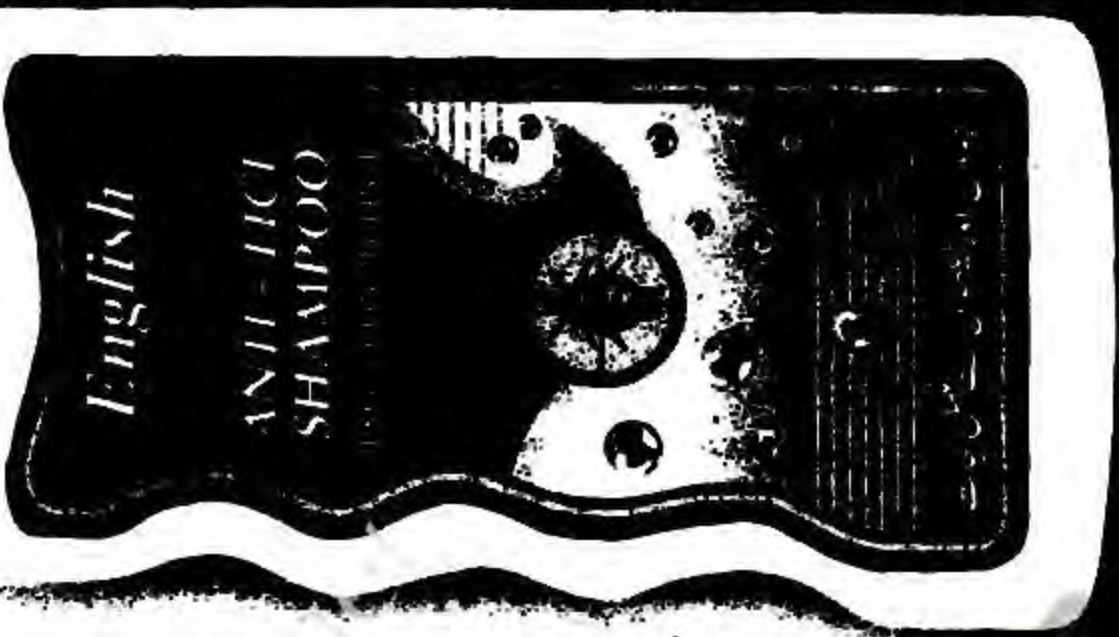
خط بھجوانے کے لیے پتہ

خواتین ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔

Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

مسرت الطاف احمد..... کراچی

ٹائٹل نے موسم بہار جیسا خوشگوار تاثر دیا "آب حیات" کی یہ قسط سپرہٹ رہی 'ہر بار کی طرح کردار نگاری لاجواب ہے "من مانگی دعا" اس بار بھی انٹرسٹنگ رہا۔ "نمل" نمرہ احمد بہت ہی خوب صورتی سے ماضی کے اوراق سے پردہ ہٹا رہی ہیں "کٹھ پتلی" آؤٹ اسٹینڈنگ 'اے ون تحریر تھی۔ تحریر کی پختگی ہو کردار نگاری ہو یا منظر نگاری 'ہر ایک چیز پرفیکٹ اور لاجواب "عہد الست" کی یہ قسط بھی زبردست تھی۔ نیچو کی باتیں مسکرانے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ زارا کا کردار سب سے زیادہ پسند ہے۔

افسانوں میں "خزاں کے چاند تلے" فنٹاسٹک تحریر تھی 'اینڈ نے بہت ہی اداس کر دیا۔ "ایکسچینج پالیسی" بھی سبق آموز تحریر تھی۔ "فسانے کا فسانہ" نے لبوں کو مسکرانے پر مجبور کر دیا "الزتھ اور شارٹ" بھی قابل تعریف تحریر تھی۔

ج: پیاری مسرت! ہمیں افسوس ہے کہ مارچ میں آپ کی کوئی بھی تحریر شامل نہ ہو سکی۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

عائشہ خان..... ٹنڈو محمد خان

سرورق کی تو آپ بات ہی نہ کریں..... اب تو بہت پیارے ٹائٹل دیتے ہیں..... بڑے تکتے ہی نہیں۔ قسط وار ناول تمام ہی سپرہٹ جا رہے ہیں.....

افسانوں میں ثمینہ عظمت کا افسانہ بہت مزا دے گیا... ہلکی مزاحیہ تحریر نے دل و دماغ پر چھائی اداسی غائب کر دی۔ ویل ڈن ثمینہ عظمت.....

صدف آصف کا 'چھوچھک' واہ صدف ایک انوکھا موضوع لے کر آئیں ..... بہت دلچسپ اضافہ تھا..... خصوصاً "اڈین اسٹائل میں خانہ..... حیدر آبادی دکنی لہجہ میں مزا آگیا۔

ج: پیاری عائشہ! سب سے پہلے تو مبارک باد کہ آپ قارئین کے ساتھ ساتھ مصنفین کی فہرست میں بھی شامل ہو گئی ہیں۔ آپ کے افسانے اور آرٹیکل شائع ہو رہے ہیں۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

سیدہ تحسین زاہرہ علی..... لاہور

سب سے پہلے بات ہو جائے "نمل" کی پہلی قسط سے پڑھ رہی ہوں۔ فارس کا کردار شروع سے ہی اچھا لگا۔ "کٹھ پتلی" نے اداس کیا مگر دیا نے ارباز کا ہاتھ تھام کر اچھا فیصلہ کیا "عہد الست" میں نور محمد کے ساتھ سلوک دل دکھا گیا۔ ثمینہ عظمت کا افسانہ پڑھا۔ کئی فقروں پر خوب ہنسے۔ کبابوں میں دو کا پیازہ اچھا لگا چھوچھک سمجھاتی ہوئی تحریر۔ آب حیات میں امامہ کا رویہ اتنا بچکانہ کیوں ہے جبکہ اسے ماں باپ کا گھر چھوڑے کئی سال ہو گئے ہیں۔ اتنا زیادہ حق مہر اور ویڈنگ گفٹ 'سالار میں لگتا ہے میچورٹی نہیں آئی۔ تاہم اس کا امامہ کے لیے اتنا پیار بہت اچھا لگا ہے۔ الزتھ اور شارٹ بھی سمجھاتی ہوئی تحریر تھی۔ نفسیاتی ازدواجی الجھنیں شوق سے پڑھتے ہیں۔ آپ کا باورچی خانہ میں فرح رضوی کا بے باک 'سادہ انداز اچھا لگا۔ اگر ممکن ہو تو "آپ کا باورچی خانہ" اور "میری خامشی کو زبان ملے" کے سوال کسی شمارے میں دوبارہ شائع کر دیں۔ مرگ وفا کا تذکرہ ضرور کرنا چاہوں گی۔ ہم پڑھتے بھی گئے روتے بھی

گئے۔ پچھلے شمارے میں "مسکراتی ہے زندگی" اور "اب خزاں کے چاند تلے" پلیز ذرا ہتھ ہولا رکھا کریں۔ ایک سوال شعاع اور کرن تو جلدی آجاتے ہیں پھر خواتین ہی کیوں دیر سے آتا ہے۔ کچھ اپنے بارے میں بات کرتے چلیں۔ شادی شدہ ہوں' شوہر صاحب ڈائجسٹ خود لا دیتے ہیں۔ چار بچوں کی والدہ حضور ہوں۔ ایک اسکول میں جاب بھی کرتی ہوں۔

ایک اور بات کا ذکر کرتی چلوں کہ ساڑھے دس سال بعد لاہور میں ہارس اینڈ کیٹل شو منعقد ہوا ہے۔ ہم نے بھی ایک شام وہاں گزاری۔ پچیس سے تیس ہزار افراد نے شرکت کی۔ دہشت گردی کے خطرے کے باوجود۔ بھئی موت تو برحق ہے۔ جہاں لکھی ہے آجاتی ہے۔ تو پھر اگر موقع ملے تو زندگی کو کیوں نہ انجوائے کیا جائے۔

ج : جی سیدہ! ہمارا بھی یہی خیال ہے اور ہم سمجھتے ہیں' پاکستانی قوم دنیا کی بہادر ترین قوم ہے۔ کراچی کو ہی دیکھ لیں۔ دہشت گردی' قتل بھتہ کے باوجود کراچی میں رات گئے تک جاگتا رہتا ہے۔ چہل پہل رونق نظر آتی ہے۔

سیدہ! سب سے پہلے شعاع آتا ہے' پھر خواتین' کرن اس کے بعد آتا ہے۔ آپ اپنے بک اسٹال والے کو تاکید کریں کہ وہ خواتین جلد لے کر آئے۔

عتیقہ فاطمہ... بچا سودا' فاروق آباد' تحصیل و ضلع شیخوپورہ

میری امی گزشتہ بارہ سال سے شعاع اور خواتین ڈائجسٹ پڑھ رہی ہیں اور مجھے پڑھتے ہوئے تقریباً" چھ سال گزر گئے ہیں۔ گریجویشن کے بعد تعلیم کو خیرباد کہہ دیا' اور ایک سال سے گھر میں فارغ بیٹھی ہوں۔ ایسے میں یہ دونوں رسالے کسی نعمت سے کم نہیں ہیں۔ میری پسندیدہ لکھاریوں میں عمیرہ احمد' نمرہ احمد' فائزہ افتخار' سائرہ رضا' عنیزہ سید' راحت جبیں' فاخرہ جبیں' آسیہ رزاقی اور بہت ساری نئی رائٹرز بھی شامل ہیں۔ نمرہ احمد تو آتے ہی چھائی تھیں۔ یقین نہیں آتا تھا کہ اتنی کم عمر لڑکی کی تحریر میں اتنی پختگی ہو سکتی ہے۔ "مصحف" نے مجھے جتنا بدل کے رکھ دیا' آپ سوچ بھی نہیں سکتی ہیں۔ "نمل" زبردست جا رہا ہے۔ سعدی' حنین' زمر کے کردار میرے فیورٹ ہیں۔

"پیر کامل" جب پہلی بار پڑھا تو مجھے یاد ہے' مجھے ارد گرد کا کوئی ہوش نہیں تھا اور میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اس لیے خدارا "آب حیات" میں سالار اور امامہ کے ساتھ کچھ بھی برا مت کیجئے گا۔

اور "عہد الست" پر تنزیلہ ریاض صاحبہ کو جتنی شاباش ملے وہ کم ہے۔ اس کے سارے کردار پرفیکٹ ہیں۔ اس ناول کے اکثر مکالمے اقوال زریں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نور محمد کی نماز سے متعلق گفتگو بہت متاثر کن تھی۔

"بن مانگی دعا" ذرا طویل ہو گیا ہے' لیکن یہ بھی ایک اچھا ناول ہے۔

فروری کے شمارے میں "تکمیل ذات" سمیرا ایاز نے اچھا لکھا۔ خصوصاً" اس میں انتقار سے متعلق تحمل اور عمر ہادی کے درمیان مکالمہ بہت پسند آیا۔

یہاں پر میں "سائرہ رضا" کے ناول "محبت داغ کی صورت" کی بھی بے پناہ تعریف کرنا چاہتی ہوں۔ حالانکہ اسے شائع ہوئے تو کافی دیر ہو گئی۔ بہت آؤٹ اسٹینڈنگ ناول تھا۔ بہت متاثر کن تحریر اور موضوع۔ آپ سے ایک اور درخواست ہے کہ ایف ایم 103 لاہور کے پریزنٹر رجے ہادی سید اور ایف ایم 100 کے پریزنٹر "عماد ظفر" کے انٹرویو ضرور لیں اور اس کے علاوہ ٹی وی اداکار اور ڈرامہ سیریل "کس سے کہوں" کے ہیرو "آغا علی" کا بھی انٹرویو ضرور لیں۔ پلیز...

ج : پیاری عتیقہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

آپ کی فرمائش نوٹ کر لی ہے' جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

توشہ سید... فیصل آباد

17 مارچ کی اس حسین شام میں مجھے یہ خط لکھنا بہت اچھا لگ رہا ہے۔ اس ڈائجسٹ کے 290 صفحات پڑھ کر مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے اس ملک میں ایسا انقلاب ضرور آئے گا جہاں عورت وہ مقام حاصل کرے گی جو اسلام نے اس کے لیے منتخب کیا ہے۔

ج : توشہ! خواتین کے محفل میں خوش آمدید۔ ہمارا بھی یہی یقین ہے کہ اللہ نے چاہا تو پاکستان ایک اسلامی ملک بن کر ابھرے گا جہاں عورت کو اس کا جائز مقام ملے گا۔ اسے

اپنی زندگی کے فیصلے خود کرنے کی آزادی حاصل ہوگی۔

ماہم حمید۔۔۔ میرپور خاص

آب حیات کی پہلی قسط پڑھتے ہی میں نے پیر کامل منگوانے کی جدوجہد کرنی شروع کردی۔ پیر کامل پڑھنے سے پہلے میری موسٹ فیورٹ رائٹر نمرہ احمد تھیں۔ لیکن اب عمیرہ احمد بھی میری موسٹ فیورٹ رائٹر ہیں۔ اور پلیز یہ جو لڑکی پاسٹ کو ہاتھ دکھا رہی ہے وہ امامہ نہیں ہونی چاہیے۔ خواتین ڈائجسٹ میں نمرہ احمد کی کہانی نمل بھی بہت اچھی جا رہی ہے۔ لیکن جنت کے پتے کی تو بات ہی اور تھی شاید ہی کبھی اس ناول کو ہم بھلا پائیں۔ آخر میں ایک بات۔ مجھے کچھ ناول منگوانے ہیں بتا دیں کیسے منگواؤں؟

ج : پیاری ماہم! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ ناول منگوانے کے لیے آپ اس نمبر پر فون کر لیں۔ 021 32735021

نسرین زیبا۔۔۔ سکھ پورہ لاہور

ہم تقریباً پندرہ سولہ سال سے خاموش لبوں سے آپ کو پڑھ رہے ہیں پہلے بن مانگی دعا بہت اچھا چل رہا تھا مگر اب وہ اک عام سی کہانی لگ رہی ہے "آب حیات" عمیرہ کا نام پڑھ کر اچھل پڑے تھے۔ مگر ابھی ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ امامہ اور سالار وہ نہیں ہیں جو ہم نے سوچے تھے۔ اب آتے ہیں "نمل" اس کے لیے تو ہمارے پاس الفاظ بھی نہیں ہیں وہ تو پورے رسالے کی جان ہیں۔ مزید نمرہ جی! آپ کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس ناول کا انجام اچھا ہی کرنا۔ اور فارس، زمر کو ضرور ملوانا "عہد الست" میری بھانجی زیبا کو بہت پسند ہے۔ تنزیلہ ریاض بھی اچھا لکھ رہی ہیں جنوری کے شمارے میں "مرگ وفا" پڑھا۔ اس نے انتہائی متاثر کیا۔

اگر ہو سکے FM-101 کے سجاد بری کا انٹرویو۔۔۔ تو شائع کیجیے گا۔

ج : نسرین اور زیبا! آپ کا خط شامل اشاعت ہے۔ آپ نے اتنا عرصہ صرف یہ سوچ کر خط نہیں لکھا کہ شائع نہیں ہوگا۔ جبکہ ہمارے لیے صرف آپ کی رائے جاننا اہم ہے اور اسی لیے ہم تمام خطوط بڑی توجہ سے پڑھتے ہیں آئندہ ہمیں خط ضرور لکھیے گا۔

اقصیٰ مریم ملغانی، اسوہ مریم ملغانی۔۔۔ کاسی اسٹریٹ کوئٹہ

اس ماہ کا شمارہ زبردست۔ ہر کہانی خوب صورت، ہر حرف شاندار ہر لفظ موتی۔۔۔ کیا کہتے ہیں جی۔۔۔ لکھنا جنون ہے، جنون کی کوئی حد نہیں ہوتی میں بھی بضد ہوں کہ پہلی کہانی "خواتین" میں ہی چھپے گی بھلے دیر سے ہی سہی نہ شائع نہ کرنا۔۔۔ عمیرہ احمد نایاب ہیں بہت نایاب، آب حیات جوں جوں آگے بڑھ رہا ہے۔ دل کے کینوس پر رنگ بکھیر رہا ہے۔ نمرہ احمد کے کیا کہنے ہیں بھئی۔ نمل بہت زبردست ہے۔ تنزیلہ ریاض صاحبہ! میں بیان نہیں کر سکتی کہ آپ کے اس ناول نے جھنڈے گاڑ دیے ہیں۔ (فتح کے بھئی) ہاہاہا! افسانے سارے اچھے تھے۔ ایمل رضا سے ایک بار پھر درخواست ہے رحم کریں اور مکمل ناول لکھ ڈالیں۔

ج: اقصیٰ اور اسوہ! آپ کی نانی کی وفات پر بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کی مغفرت فرمائے۔ آمین

ایمل رضا تک آپ کی فرمائش پہنچا رہے ہیں، آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے۔ ان شاء اللہ ضرور کامیاب ہوں گی اور خواتین ڈائجسٹ میں آپ کی تحریر شائع ہوگی۔

حنا سلیم اعوان، کنزی شاہین اعوان۔۔۔ گاؤں آخون باندی

آب حیات۔۔۔ عمیرہ احمد بہت عمدہ لکھ رہی ہیں اور امامہ و سالار کی جوڑی بہت اچھی لگ رہی ہے۔ "بن مانگی دعا" اب کچھ دلچسپ ہونے لگا ہے۔ ابیہا کا اپنے حق کے لیے بولنا اچھا لگا۔۔۔ اور ثانیہ کی کایا پلٹ مزا دے رہی ہے۔ "عہد الست" تنزیلہ بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ ویلڈن تنزیلہ۔۔۔ اور میری بیسٹ اور فیورٹ تحریر نمل۔۔۔ نمرہ۔۔۔ یہ کیسا جادو ہے آپ کے قلم میں۔۔۔ پڑھنے والے کو انجانے سحر میں جکڑ لینے والا۔۔۔ زمر اور فارس۔۔۔ میرے پسندیدہ کردار۔۔۔ دونوں کے ساتھ اب اور برا نہیں ہونا چاہیے۔۔۔ باقی کہانیوں میں حیا بخاری کی تحریر بہت اچھی لگی۔

ج : پیاری حنا! آپ نے کرکٹ ٹیم کے بارے میں جن جذبات کا اظہار کیا ہے صفحات کی کمی کی بنا پر ہم اسے شائع نہ کر سکے لیکن اتنا ضرور کہنا چاہتے ہیں کہ کھیل کو کبھی بھی اتنی سنجیدگی سے نہیں لینا چاہیے وہ نہیں کھیلتی ہیں تو

ایک کو تو بار نا ہی ہوتا ہے۔ اصل چیز تو میدان میں اتر کر مقابلہ کرنا ہے۔ فتح و شکست تو نصیبوں سے ہے۔

خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ نمرہ احمد کو آپ ہماری معرفت خط لکھ سکتی ہیں۔

اسماء سیف۔۔۔ ملک پورہ ایبٹ آباد

پچھلے آٹھ سال سے میں خواتین ڈائجسٹ پڑھ رہی ہوں اور میں خواتین ڈائجسٹ کو بہت پسند کرتی ہوں۔ میری کہانی اور شاعری کے بارے میں آپ نے نہیں بتایا نہ ہی میرا خط شامل کیا۔

ج : پیاری اسما! ہمیں افسوس ہے کہ آپ کے خط شائع نہ ہو سکے آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں شاعری قابل اشاعت نہیں ہے۔

بنت خلیل۔۔۔ سمندری

نمل کو کھولا۔ نمرہ احمد بھئی سچ ہے کہ تم بہت محنت سے لکھتی ہو۔ اپنے ہر کردار کے ساتھ انصاف کرتی ہو اور تنزیلہ ریاض کے تو کیا ہی کہنے۔ آج کے موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور کیا خوب لکھا ہے۔

ج : خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ نمرہ اور تنزیلہ تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

رامین انصاری' صبا انصاری' رضیہ انصاری۔۔۔ حافظ آباد

سب سے پہلے "نمل" کا ذکر کروں گی ویل ڈن نمرہ جی! کیا کمال کرتی ہیں۔ آپ میری موسٹ فیورٹ رائٹر ہیں۔ آپ کا ایسا کوئی بھی ناول نہیں ہے جسے میں نے نہیں پڑھا۔

"بن مانگی دعا" عفت جی آپ کا ناول بہت اچھا جا رہا ہے۔ ویسے میں بھائی کو بولتی ہوں کہ آپ کے شہر کی رائٹر عفت سحر طاہر تھوڑا فلمی لیکن بہت مزے کا لکھتی ہیں۔ عہد الست کو پڑھ کر روح تازہ ہو جاتی ہے۔ لیکن مجھے یہ پتا نہیں چل رہا کہ زارا کی جوڑی شہوز کے ساتھ ہی رہے گی یا سلمان حیدر کے ساتھ۔ "آب حیات" میں بڑا مزہ آرہا ہے لیکن دل میں اک خلش ہے کہ پیر کامل دل میں ایسا بسا ہے کہ اب کچھ غلط نہ ہو جائے۔ سالار کا امامہ کے لیے اتنی مہنگی انگوٹھی لے کر دینا بہت اچھا لگا لیکن اگر امامہ کو تھوڑی عقل آجائے۔

ج : رامین' صبا اور رضیہ! خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

☆

قارئین متوجہ ہوں!

1- خواتین ڈائجسٹ کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جاسکتے ہیں، تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔

2- افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کر سکتے ہیں۔

3- ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔

4- کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔

5- مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، ناقابل اشاعت کی صورت میں تحریر واپسی ممکن نہیں ہوگی۔

6- تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

7- خواتین ڈائجسٹ کے لیے افسانے، خطوط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

خواتین ڈائجسٹ
37- اردو بازار کراچی

"رسپانس کیا ہے اس پروگرام کا۔"
"بہت اچھا۔ ہمارے پروگرام میں جو نامور شخصیات آتی ہیں وہ ہمیں بتاتی ہیں کہ جب ہم ملک سے باہر جاتے ہیں تو لوگ اس پروگرام کی بہت تعریف کرتے ہیں اور ملک سے باہر رہنے والوں کے ای میلز سے بھی ہمیں اندازہ ہو رہا ہے کہ ہمارا پروگرام کافی مقبول ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ جو آڈینس ہمارے پروگرام میں شریک ہوتی ہے وہ بھی دوسرے شہروں سے آتی ہے۔ تو آپ خود ہی اندازہ لگالیں کہ ہمارا پروگرام کتنا مقبول ہے۔ ہمارے جو مستقل مہمان ہیں انہیں لوگ بہت پسند کرتے ہیں ان میں کہیں نہ کہیں میرا بھی نمبر آجاتا ہے۔"
"ارے نہیں بھئی۔ آپ کی پرفارمنس تو لاجواب

مذاق رات کے ڈی جے

محسن عباس سے ملاقات

شاہین رشید

"خبرناک، حسب حال" اور "مذاق رات" یہ وہ پروگرام ہیں جو ناظرین میں بے حد مقبول ہیں اور مقبولیت میں اچھا اسکرپٹ تو ہوتا ہی ہے مگر فنکاروں کی پرفارمنس مزید نکھار دیتی ہے' اسکرپٹ کو بھی اور پروگرام کو بھی جب سے پروگرام "مذاق رات" شروع ہوا اس کے ڈی جے "محسن عباس حیدر" کے انٹرویوز کی فرمائشیں آرہی تھیں۔ سو آج موصوف ہاتھ آئے تو اپریل کے سالگرہ نمبر کے لیے ان کا انٹرویو کیا۔
"کیسے ہیں ڈی جے صاحب؟"
"الحمدللہ۔ بالکل ٹھیک۔"
"کیا مصروفیات ہیں؟"
"مذاق رات ہی بہت بڑی مصروفیت ہے ہفتے میں تین دن یہ پروگرام ہوتا ہے اور اس میں ہم سب بہت مصروف رہتے ہیں۔"

ہوتی ہے۔ بہت اچھا گاتے ہیں آپ اور شاعری بھی خوب ہوتی ہے۔ تو کون کرتا ہے شاعری؟"
"شاعری دو لوگوں کی ہوتی ہے۔ شاہد بلال اور محسن عباس حیدر۔ یعنی میں پیروڈی کی بھی اور دیگر گانے کی۔"
"فنی سفر کا آغاز آر جے سے کیا۔ ساتھ ساتھ گلوکاری کی اور معروف پروگرام 4 مین شو کا حصہ بھی بنے۔ اب فلم بھی کی۔ ماڈلنگ بھی کر رہے ہیں اور مذاق رات بھی۔ اس ترقی کے سفر کے بارے میں کچھ بتائیں گے؟"
"نامعلوم افراد۔" میری پہلی فلم ہے اس تک رسائی اس طرح ہوئی کہ "نبیل قریشی" میرا بہت اچھا دوست ہے۔ ہم دونوں آج ٹی وی پہ بھی کام کرتے تھے' پھر

"جیو" میں بھی ایک ساتھ لیے۔ اور میرا ایک گانا "بے پرواہ ڈھولا" کا ڈائریکٹر بھی نبیل قریشی ہی تھا۔ نبیل ماشاء اللہ کری ایٹو ذہن کا مالک ہے اور اس کے پاس ہمیشہ سے بہت سے آئیڈیاز ہوتے تھے فلم کے لیے۔ اور پیسے کی کمی ہوتی تھی' تو ہم صرف ڈسکس کر لیا کرتے تھے۔ اور جب تک ہم کراچی میں تھے ہمارے پاس پیسہ نہیں تھا اور نہ ہی کوئی پروڈیوسر تھا۔ اور جب میں مذاق رات کی وجہ سے لاہور شفٹ ہوا تو اتفاق سے نبیل کو ایک اچھی پروڈیوسر مل گئیں۔ تو نبیل نے مجھے کال کی کہ میں ایک فلم کرنے لگا ہوں اور تمہارا کریکٹر تمہیں سوچ کر لکھا ہے۔ تو کس طرح ٹائم دے سکتے ہو۔ میں نے نبیل کو بتایا کہ چار دن تو بہت ہی مصروفیت کے ہوتے ہیں تو تم بتاؤ کہ کیسے کریں؟ تو نبیل نے کہا کہ تمہیں سوچ کر ہی میں نے تمہارا کردار لکھا ہے اور بس تمہیں ہی کرنا ہے' نبیل کو مجھ پر کچھ زیادہ ہی اعتماد ہے۔ کیونکہ ہم دونوں کافی کام کر چکے تھے ایک ساتھ۔ اور میں شکر گزار ہوں نبیل کا اور پروڈیوسر فضا کا کہ انہوں نے مجھ پر اعتماد کیا اور ایک نئے بندے کو فلم میں لینے کا رسک لیا' جبکہ اس فلم میں جاوید شیخ اور فہد مصطفیٰ جیسے بڑے آرٹسٹ کام کر رہے تھے اور سلمان شاہد جیسے لیجنڈ اداکار تھے۔ اور مجھے ان سب کے درمیان "مین لیڈ" رول دے دیا تو یہ بہت بڑی بات تھی اور الحمدللہ میں نے بھی نبیل کو مایوس نہیں کیا' اور میں نے نبیل کو پراؤڈ فیل کروایا۔ اور جب فلم ریلیز ہوئی تو سب سینئر فنکاروں کے ساتھ میرا ذکر بھی ہوتا تھا۔۔۔ کہ یہ نیا لڑکا تھا' مگر اس نے بہت اچھا پرفارم کیا۔۔۔ اور یہاں میں آپ سے ایک بات ضرور شیئر کرنا چاہوں گا کہ۔۔۔ لاہور میں ہماری پریس کانفرنس ہو رہی تھی اور اس میں ہمارے ایک صحافی بھائی جو کہ مجھ سے شاید ناراض نظر آتے تھے' وہ سب سے مل رہے تھے' مگر مجھ سے نہیں مل رہے تھے اور جب سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا' انہوں نے مجھے نظر انداز کر کے نبیل سے۔ میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ "آپ نے ان کو کیوں چانس دیا' ان سے بہت زیادہ ٹیلنٹڈ لوگ موجود ہیں۔ آپ نے ان کو کیوں چانس دیا' کیا اپنی دوستی کی وجہ سے آپ نے ایسا کیا؟"

"اوہو۔ نبیل نے کیا جواب دیا۔۔۔ اور آپ کا دل تو برا ہوا ہو گا؟"

"نبیل نے تو خیر ٹھیک ٹھاک جواب دیا اور ظاہر ہے کہ میرا بھی دل برا ہوا۔۔۔ لیکن میں آپ کو بتاؤں کہ یہ غلط فہمی بہت سے لوگوں کو ہے کہ شاید نبیل نے دوستی کی وجہ سے چانس دیا۔ نبیل بہت پروفیشنل بندہ ہے اور وہ کبھی بھی کمپرومائز نہیں کرتا۔ اس کی ایک مثال دوں میں آپ کو کہ "نیر اعجاز" صاحب کا بہت چھوٹا سا کردار ہے اور اس کردار کے لیے اس نے خاص طور پر نیر اعجاز صاحب کو بلایا' ان کو ٹی اے ڈی اے سب کچھ دیا اور اس کردار کو کر کے نیر اعجاز صاحب نے کہا کہ نبیل جیسے ڈائریکٹر ہمیں مل جائیں تو ہم فلم میں بہت جلدی ترقی (grow) کر سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ میرا والا کردار کراچی کے کسی بھی آرٹسٹ سے کروا سکتا تھا' مگر اسے "میں" چاہیے تھا' اس لیے اس نے میرے تمام اخراجات برداشت کیے اور مجھے لاہور سے بلوایا اور اس کردار کے لیے کمپرومائز نہیں کیا۔ تو آپ خود سوچیں کہ لیڈ رول کے لیے وہ کیسے کمپرومائز کر سکتا تھا۔ تو الحمدللہ اس نے میرا انتخاب میرٹ پہ کیا' اور جب کام سامنے آیا تو نہ نبیل کا سر جھکا' نہ پروڈیوسر مایوس ہوئیں' اور میرے جتنے بھی haters تھے میرا کام دیکھ کر الحمدللہ ان سب کے منہ بند ہو گئے۔ اور آپ کو یہ بھی بتاؤں کہ اس فلم کے لیے پانچ ایوارڈز تو میرے نام ہو چکے ہیں تو میں ان تمام haters کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ جنہوں نے میرے اندر کی آگ بجھنے نہیں دی اور میں ان کی وجہ سے اتنا کام کر گیا۔"

"مزید آفر آئی؟"

"جی کیوں نہیں۔۔۔ ہماری انڈسٹری کا یہ رول بھی

ہے اور المیہ بھی کہ چڑھتے سورج کو ہم سلام کرتے ہیں تو جب فلم آئی اور ہٹ بھی ہو گئی تو میں وہی لڑکا تھا جو دس سال سے انڈسٹری میں کام کر رہا ہے' جو پہلے بھی اسی طرح گانے بھی گاتا تھا اور ایکٹنگ بھی کرتا تھا' مگر اُس وقت میں سی وی لے کر لوگوں کے پیچھے بھاگتا تھا تو رد بھی ہوتا تھا' دھتکارا بھی جاتا تھا' لیکن آج میں وہی لڑکا ہوں' جس کو لوگ دھتکارتے تھے' رد کرتے تھے' آج وہی اس کو آفر کرتے ہیں' منت کرتے ہیں کہ آپ ہمارے لیے کام کریں' اور میرے لیے تو سچ پوچھیں کہ بڑی عزت کی اور اونر کی بات ہے کہ اللہ پاک نے مجھے یہ دن دکھایا اور مجھے میری محنت کا ثمر دیا۔ اللہ پاک کبھی ناانصافی نہیں کرتے' مگر لوگ ضرور ناانصافی کرتے ہیں۔ تو الحمدللہ آفرز ہیں' مگر بہت محتاط ہو کر آفرز کو قبول کروں گا۔ اور ویسے بھی سچ بات تو یہ ہے کہ ٹائم نہیں ملتا' مذاق رات کی وجہ سے' کیوں کہ یہ پروگرام لاہور سے ہوتا ہے اور ہماری ڈرامہ انڈسٹری کراچی میں ہے' اور ڈرامے کے لیے لوگوں کے پاس اتنا بجٹ نہیں ہوتا کہ وہ مجھے ہر ہفتے ٹریولنگ کروا سکیں۔ فلم جب کر رہا تھا تو تین دن کراچی میں ہوتا تھا اور تین دن لاہور میں' اور یہاں میں نامعلوم افراد کے پورے کریو کا اور جاوید شیخ جیسے سینئر اداکار کا بھی کہ جنہوں نے میرے ٹائم کے حساب سے شوٹ مینیج کیں' صرف اس لیے کہ وہ ایک بندہ لاہور سے آتا ہے تو جن تین دنوں میں وہ آئے گا ہم سب شوٹ کریں گے۔ تو بہت زیادہ کوآپریٹ کیا میرے سینئرز نے۔"

"سینئرز کے ساتھ کام کا تجربہ کیسا رہا؟"

"سینئر اداکار جاوید شیخ کے ساتھ کام کرنا میرے لیے بہت اعزاز کی بات تھی' اور سیٹ پہ سب سے زیادہ جوان آدمی جاوید شیخ تھے اور وہ جب سیٹ پر آتے تھے تو لگتا تھا کہ جیسے جو غلط ہو رہا تھا وہ بھی صحیح ہے' جو برا ہے وہ بھی اچھا ہے۔ اور جیسے کہ ہمارے اکثر سینئر فنکار بہت روڈ اور Arrogant" ہوتے ہیں۔ اپنی "میں" میں رہتے ہیں' مگر وہ بالکل بھی ایسے نہیں ہیں انہوں نے ہمارے ساتھ چٹائی پہ بیٹھ کر بھی کھانا کھایا۔ وہ ہمارے ساتھ ناچتے بھی تھے' گاتے بھی تھے' اور ان کے ساتھ ہم نے اتنے مزے کیے کہ بتا نہیں سکتا انہوں نے احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ ایک سینئر آرٹسٹ ہیں اور اس طرح فہد مصطفیٰ کے ساتھ ہم نے آئیڈیل وقت گزارا اور میرے لیے اس سے اچھا "ڈیبیو" ہو ہی نہیں سکتا۔ سلمان شاہد کے ساتھ کام کر کے بہت اچھا لگا اور سلمان صاحب کے میرے لیے یہ الفاظ تھے کہ "یار یہ لڑکا کہاں سے ڈھونڈا ہے" پہلے ہی سین کے بعد تو یہ بھی میرے لیے بڑے اعزاز کی بات تھی' اس طرح کی تعریف سے ڈھیروں خون بڑھ جاتا ہے' میری اچھی پرفارمنس کا سارا سہرا میرے سینئرز کے سر جاتا ہے۔ انہوں نے مجھے بہت اعتماد دیا۔"

"اس فیلڈ کو پروفیشن بنانا ہے' یہی آپ کی منزل ہے؟"

"اگر منزل کا تعین کرنا ہوتا تو پھر شاید میں صرف آر جے ہوتا یا کسی ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں کاپی رائٹنگ کرتا' جنگلز لکھتا یا ساری زندگی پیروڈی کر رہا ہوتا' یا وائس اوور کر رہا ہوتا' یا پھر کسی ڈرامے میں چھوٹے موٹے رول کر رہا ہوتا۔۔۔ تو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر میں خود منزل کا تعین کرتا تو پھر شاید ان ڈھیروں کاموں میں سے کوئی ایک کام کر رہا ہوتا۔ مگر میری منزل کا تعین تو کوئی اور کر رہا تھا' جس نے مجھ سے سب کچھ کروایا اور کروا رہا ہے اور وہ میرا رب ہے اور الحمدللہ جہاں جہاں کام کیا وہاں پسند ہی کیا گیا۔"

"اللہ نے راستے ہموار کیے تو کبھی سوچا تھا کہ اتنی ترقی کر جاؤں گا؟"

"اتنی ترقی کر جاؤں گا' واقعی کبھی نہیں سوچا تھا۔۔۔ ہاں۔۔۔ ایک دفعہ ایسا لگا تھا کہ میں بہت مشہور ہو جاؤں گا اور وہ اس وقت لگا تھا جب میں فیصل آباد سے کراچی آ رہا تھا اور ٹرین سے اترا تھا تو سوچا تھا کہ پتا

میں پڑھوں گا' وہاں سے میوزک سیکھوں گا' گلوکاری کروں گا اور پوری دنیا میں مشہور ہو جاؤں گا' اور پھر پہلے ہی ہفتے میں اندازہ ہو گیا کہ ایسا کچھ نہیں ہونے والا' میں بہت غلط توقعات لے کر آیا تھا' جب غم روزگار میں پڑا جب سروائیول کی جنگ شروع ہو گئی' جب فاقے ہونے لگے' جب محنت کر کے ہاتھوں پیروں سے خون نکلنے لگا' جب بیماریاں شروع ہوئیں' پیروں میں چل چل کے آبلے پڑنے لگے تب میں نے سوچا کہ میں تو کچھ اور سمجھ رہا تھا یہ تو کچھ اور ہو گیا۔ تو پھر اپنے دل سے مشہور ہونے کا خیال نکال کر روزگار کی فکر میں لگ گیا۔ تو پھر اللہ کو شاید رحم آ گیا اور وہ راستے کھولتا گیا۔"

"آپ نے ہی بتایا تھا کہ اتنی کمائی نہیں تھی جتنا کمرے کا کرایہ تھا۔"

"جی بالکل 2700 روپے کماتا تھا اور 5 ہزار کمرے کا کرایہ تھا۔ اوپر کے اخراجات علیحدہ تھے تو بہت برا وقت دیکھا میں نے....."

"تو اب بیلنس بڑھا' اکاؤنٹ بھرا؟"

"جی الحمدللہ اب اللہ کا بڑا کرم ہے اور میں یہ بھی نہیں چاہوں گا کہ کوئی کہے کہ ہائے بے چارے نے بڑی محنت کی' میں ایک سیلف میڈ آدمی ہوں اور میرا پراؤڈ یہ ہے کہ میں محنت کر کے یہاں تک پہنچا... میں نے جو کچھ کیا اپنے لیے کیا اس لیے کسی سے شیئر نہیں کرتا۔"

"ریڈیو ابھی بھی چل رہا ہے اور مذاق رات میں آپ کا انتخاب کیسے ہوا؟"

"یہ ایک بڑا المیہ ہے کہ میں ریڈیو میں کر پا رہا... میرا پہلا پیار میرا ریڈیو ہی تھا' میرے کیریئر کی بیک بون ہی میرا پروگرام "بھنگڑا" تھا' اس کے بغیر میں بس ڈنگا رہا ہوں' اور کوئی ریڈیو سے انٹرویو کرنا چاہتا ہے تو میں کبھی انکار نہیں کرتا اور اب بات کرتے ہیں مذاق رات کی' تو جیسا کہ میں نے بتایا کہ بی فار بھنگڑا میرے کیریئر کی بیک بون ہے' مجھے جب "فور مین شو" کے لیے بلایا گیا تو اس شو کو سن کر بلایا... جہاں کہیں بھی بلایا گیا اس شو کے حوالے سے بلایا گیا تو مذاق رات میں ایک صاحب ایف ایم 107 جب لاہور میں لانچ ہوا تو وہ میرا شو سنا کرتے تھے' ان کا تعلق دنیا نیوز سے تھا۔ تو انہوں نے میرا پروگرام ریکارڈ کیا' اپنی مینجمنٹ کو سنایا اور کہا کہ ہم اس طرح کا ایک شو ٹی وی کے لیے کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بات تو ان کو مجھ سے ملاقات کے بعد پتا چلی کہ میں تو پی این این (جیو کا شو) اور 4 فور مین شو بھی کر چکا ہوں اور دس سال سے اس فیلڈ میں ہوں اور مذاق رات کی شکل اس طرح سے نہیں تھی جس طرح اب ہے' آخر انہوں نے میری ریکارڈنگز کی اپنے طور پر اور پھر مجھے اپروچ کیا کہ ہم آپ کے ساتھ شو کرنا چاہتے ہیں' تو بس اس طرح میں اس شو کا حصہ بنا۔"

"کبھی مشکل ہوئی؟ مہمانوں نے نخرے دکھائے... شو ہونے میں ٹائم کم ہے اور مہمان نہیں آئے؟"

"اکثر ہوتا ہے اور آپ خود بہتر جانتی ہیں اس انڈسٹری کو۔ اور بہت احترام کے ساتھ یہ بات کہنا چاہوں گا کہ ہمارے فنکار نقلی ہیں اور ہمارے سیاست دان اصلی ہیں۔ ایک تو وقت پر پہنچتے ہیں' نمبر دو وہ سچی بات کرتے ہیں... یعنی اگر آپ ان سے کوئی پرسنل بات کریں تو وہ بناوٹی ہونے کی کوشش نہیں کرتے' نہ جھوٹ بولتے ہیں۔ جبکہ ہماری فنکار برادری میں بناوٹ بہت ہے' بلاوجہ سب فلسفیانہ گفتگو کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اکثر ایسے بھی ہوتے ہیں جو ٹائم دے کر نہیں آتے۔"

"بابے کا آئٹم سب سے زیادہ اچھا ہوتا ہے؟"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ بابے کا جواب نہیں اور یہ بابا ہمارے لیجنڈ اداکار ببو برال کے بھانجے ہیں اور ان کا نام چاند برال ہے اور بہت نرم دل' ڈاؤن ٹو ارتھ ہیں' رحم دل ہیں اور مزید آپ کو انٹرٹین کریں گے۔"

"اب تو پیسہ بھی ہے' عزت بھی' شہرت بھی... پھر شادی کیوں نہیں کی آپ نے...؟"

"بالکل... الحمدللہ سب کچھ آ گیا ہے' مگر بیوی

نہیں آئی ابھی تک اور بیوی لانے کا ابھی کوئی پلان بھی نہیں ہے کیوں کہ ابھی تو موٹروے پر چڑھے ہیں ابھی سواریاں بٹھائیں گے تو میرا خیال ہے کہ رفتار ست ہوجائے گی۔ ابھی گاڑی دوڑانے دیں ابھی کام کرنے دیں پہلے لوگوں کو انٹرٹین کرلیں پھر خود کو کریں گے۔"

"جدوجہد کی گھر والوں سے دور رہے جدائیاں اٹھائیں تو کبھی مایوس ہو کر بری عادت میں بھی مبتلا ہوئے؟ اور گھر والے آپ کے خوش ہیں؟"

"الحمدللہ گھر والے بہت خوش ہیں اور میں کشتیاں جلا کر گھر سے نکلا تھا۔ اور کراچی آکر میرے پاس بگڑنے کے بہت مواقع تھے اور بہت آسان بھی تھا۔ آٹھ سال اکیلا رہا کسی سے روم شیئر نہیں کیا اس اکیلے رہنے میں میں ڈرنک بھی کرسکتا تھا سگریٹ نوشی بھی کرسکتا تھا۔ بہت کچھ کرسکتا تھا مگر میرے لیے میری فیملی کو فخر دینا ضروری تھا نہ کہ ذلت دینا۔ اور کشتیاں جلا کر انسان بگڑنے کے لیے نہیں آتا کچھ اچھا بننے کے لیے آتا ہے اور میں اپنے ہر انٹرویو میں یہ ضرور کہتا ہوں کہ میری "چار مائیں" ہیں۔ ایک ماں جس نے جنم دیا دو بڑی بہنیں جو ماؤں جیسی ہیں اور ایک خالہ ہیں جنہوں نے مجھے میری ماں سے لے کر پالا اور میں اپنی ان چار ماؤں کے سر جھکانا نہیں چاہتا تھا بلکہ یہ بتانا چاہتا تھا کہ ان کا اکلوتا بیٹا ان کا فخر ہے۔ میں اپنے نوجوانوں کو یہی کہوں گا کہ اگر آپ اپنے ماں باپ کا اور اپنا سر فخر سے بلند کرنا چاہتے ہیں تو خدارا محنت کریں اور اپنی انرجی کو پوزیٹو سائیڈ پر لگائیں اور میری ان چاروں ماؤں کی شدت سے خواہش ہے کہ میں اپنی فیملی بناؤں اور سب میری "ہاں" کے انتظار میں ہیں۔"

"کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟"

"میں 18 اگست 1986ء میں فیصل آباد میں پیدا ہوا وہیں تعلیم حاصل کی۔ اپنی فیملی میں میں ہی ایک باغی نکلا جو اس فیلڈ میں آیا۔ کوشش کی اور کامیابیاں حاصل کیں جس وقت میں نے فیصل آباد چھوڑا میں بہت ینگ تھا اور کراچی آکر پڑھنا چاہتا تھا۔ کراچی ہی میرے لیے میرے سپنوں کا شہر تھا۔"

"کراچی تو سپنوں کا شہر تھا لاہور کیسا لگا؟"

"لاہور بھی بہت اچھا ہے لوگ بہت اچھے ہیں ہر مزاج کے لوگ ہیں یہاں پر اور مزے کی بات تو یہ کہ کراچی والے کہتے ہیں کہ یہ پنجابی ہے اور لاہور والے کہتے ہیں کہ یہ کراچی والا ہے۔ میں ہر چیز کو انجوائے کرتا ہوں۔ اب خواہش ہے کہ اپنے پختون بھائیوں کے پاس جا کر بھی کچھ کام کروں بلوچستان بھی جاؤں اور سب کے ساتھ کام کروں اور اپنے اوپر میں کسی "زبان" کی چھاپ لگوانا نہیں چاہتا بلکہ چاہتا ہوں کہ صرف اور صرف پاکستانی کی چھاپ لگے۔"

"نعمان اعجاز صاحب کو کیسا پایا؟"

"بہت کو آپریٹو بہت سپورٹیو ہیں۔ ہر موقع پر کچھ نہ کچھ سکھاتے رہتے ہیں اور مجھے لگتا ہے کہ خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جن کو کوئی بتانے اور سکھانے والا ہوتا ہے۔ امان اللہ صاحب سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملتا ہے پوری ٹیم بہت اچھی اور بہت کو آپریٹو ہے۔ الحمدللہ۔"

"فارغ اوقات میں کیا کرتے ہیں اور کھانے پینے میں کیا پسند ہے آپ کو؟"

"کھانے پینے میں سب کو پتا ہے کہ مجھے "بھنڈیاں" بہت پسند ہیں۔ مجھے بڑا بہت پسند ہے اور اگر جنرل بات کی جائے تو میں کچھ چھوڑتا ہی نہیں ہوں کھانے میں میں خوش خوراک اور پیٹو آدمی ہوں اور خوش قسمت ہوں کہ سب کچھ کھانے کے باوجود میرا وزن نہیں بڑھتا۔ ورنہ تو لوگ ہوا کھا کے بھی موٹے ہوجاتے ہیں۔ اور فارغ اوقات میں آج کل میں آرام کرنے کی کوشش کرتا ہوں سوشل میڈیا میں اپنے فینز کے ساتھ رابطے میں رہنے کی کوشش کرتا ہوں اور یہاں میں ایک نام لینا چاہوں گا "حنا متین صاحبہ" کا وہ میری بہت بڑی سپورٹر ہیں اور انہوں نے میرا "فین پیج" اس وقت بنایا تھا جب میں کچھ بھی نہیں تھا۔ صرف ایک آر جے تھا اس طرح سارہ شیخ بھی میری فین تھیں اور انہوں نے کال کرکے مجھ سے

پوچھ کر میرے "فین پیج" بنائے تھے اور مجھے ایسے لوگ بھی ملے جو میرے نشیب و فراز میں میرے ساتھ رہے۔ میں بہت خوش قسمت ہوں کہ مجھے ہمیشہ اچھے فینز ملے اور جو ہمیشہ میرے ساتھ رہے' اب وہ فینز نہیں ہیں بلکہ میری فیملی کا حصہ ہیں اور ایک نام اور لینا چاہوں گا "لبنیٰ ماں" کا جن کے پاس کراچی جا کر قیام کیا تھا۔ انہوں نے مجھے بالکل میری ماں کی طرح سپورٹ کیا اور رات کے تین بجے جب ریڈیو پروگرام کر کے جاتا تھا تو میرے کمرے میں میرا کھانا رکھا ہوا ہوتا تھا اور اتنے اہتمام کے ساتھ کہ مجھے لگتا ہی نہیں تھا کہ میں پردیس میں ہوں اور وہ میرے لیے اکثر بھنڈیاں پکا کر رکھتی تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ محسن کو یہ پسند ہیں' اب وہ جہاں کہیں بھی ہوں اپنا نام پڑھ کر مجھ سے رابطہ ضرور کریں۔ وہ میری پانچویں ماں کی طرح ہیں۔"

"مزاج کے کیسے ہیں؟"

"میں اس بات پہ یقین نہیں رکھتا کہ آپ اچھوں کے ساتھ اچھے رہیں۔ اور آپ بروں کے ساتھ بھی اچھے رہیں۔۔۔ میں اچھوں کے ساتھ بہت اچھا ہوں اور لوگ مجھے کہتے ہیں کہ آپ اتنا جھک کر نہ ملا کریں' ہمیں برا لگتا ہے۔ اور لوگوں کے ساتھ یعنی اچھے لوگوں کے ساتھ جھک کر ملنا کوئی بناوٹ نہیں ہے۔ میں ہوں ہی ایسا۔ کیوں کہ یہ ساری باتیں میں نے اس انڈسٹری سے نہیں سیکھی ہیں کہ جو اچھے ہیں ان کے ساتھ بہت اچھے رہیں اور جو برے ان کے ساتھ بھی اچھے رہو' یہ میری فیملی کی تربیت ہے۔ لیکن مجھے اس انڈسٹری نے' میری جدوجہد نے اور اکیلے رہ کر جو سیکھا وہ یہ کہ جو اچھے ہیں ان کے ساتھ تو بہت اچھے رہیں' لیکن جو برے ہیں ان کے ساتھ دس گنا برے رہیں کوئی ایک تھپڑ مارے گا تو معذرت کے ساتھ میں دوسرا گال آگے نہیں کروں گا' بلکہ میں اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دوں گا۔ بہت برا حال کروں گا اس کا' تو آپ نے پوچھا کہ آپ مزاج کے کیسے ہیں تو میں مزاج کا ایسا ہوں۔"

"لوگوں سے کچھ کہنا چاہیں گے' کوئی شکایت؟"

"میں لوگوں سے درخواست کرنا چاہوں گا کہ آپ آرٹسٹ کو عزت دیں۔ خواہ وہ کامیڈین ہے' خواہ وہ سنگر ہے یا ڈرامہ آرٹسٹ ہے' کیوں کہ وہ آپ کو انٹرٹین کرتا ہے اس لیے نہیں کرتا کہ آپ اس سے تو تڑاخ سے بات کریں۔ اسے "اوئے" کہہ کر بلائیں۔۔۔ میں نے دیکھا ہے کہ "امان اللہ" صاحب ہمارے سینئر آرٹسٹ ہیں' لیکن لوگ کبھی کبھی ۔۔۔ ان کو بھی بدتمیزی سے پکارتے ہیں۔ میراثی کہنا' ان کو بھانڈ کہنا اور ان کے لیے ہتک آمیز الفاظ کہنا بڑے افسوس کی بات ہے' سب کی عزت کریں کیوں کہ ہر انسان قابلِ احترام ہوتا ہے۔"

"کوئی سوال جو بہت زیادہ کیا جاتا ہے؟"

"جی۔۔۔ جب لوگ ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہاں تو آپ سنجیدہ نظر آ رہے ہیں ٹی وی میں تو بڑے مزاحیہ ہوتے ہیں۔ تو میں ان کو یہی جواب دیتا ہوں اور پلیز آپ بھی ضرور لکھیے گا کہ جو آن اسکرین ہے وہ میری نوکری ہے اور آپ سب کو انٹرٹین کرنے کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی ہے اور جو آف اسکرین آپ کو نظر آ رہا ہے وہ اصل میں' میں ہوں۔۔۔ میں اصل میں ڈی جے جتنا چھچھورا نہیں ہوں' میں لاؤڈ نہیں ہوں' میں نامعلوم افراد کے "نمبوں" والا ایکسٹریم پر جا کر بات کرنے والا نہیں ہوں۔ میں بہت خاموش طبع اور اپنے ساتھ رہنے والا آدمی ہوں۔ تو لوگوں کی غلط فہمی دور ہونی چاہیے کہ میں جیسا نظر آتا ہوں ویسا عام زندگی میں بھی ہوں۔"

"بہت شکریہ محسن کہ آپ نے ہمارے میگزین کے لیے ٹائم نکالا۔"

آمنہ شیخ نے کہا کہ فنکاروں کو فلم کی ناکامی یا کامیابی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ (جی وہ اپنا معاوضہ جو پہلے لے چکے ہوتے ہیں۔) آمنہ نے مزید کہا کہ ٹی وی اداکاروں نے فلم کے پردے پر جاندار اداکاری کر کے یہ ثابت کردیا ہے کہ اداکار کسی بھی میڈیم کا محتاج نہیں ہوتا۔ (آمنہ یہ بات کسی کسی پر سوٹ کرتی ہے ورنہ ماضی کے ٹی وی کے سپر ہیروز فلم میں چل نہ سکے تھے) ہماری فلموں کو ملکی و بین الاقوامی دو سطح پر کامیابی مل رہی ہے جو کہ خوش آئند ہے (جی ان کے لیے جنہیں بڑوسی ملک میں کام نہیں مل سکا) اب ڈراموں کا نہیں فلموں کا دور ہے۔ (آمنہ! اتنا اونچا نہ اڑیں' یہ ڈراما ہی ہے جس سے آپ فلم میں پہنچی ہیں کہیں ایسا نہ ہو.....؟) اب فنکار پروفیشنل ہو چکے ہیں۔ (کب نہیں تھے.....؟)

خبریں و بریں

واصفہ سہیل

فضائی آلودگی

سائنس دانوں نے اپنی ایک تحقیق میں ثابت کیا ہے کہ پرائمری اسکولوں کے وہ بچے جو روزانہ ٹریفک کے دھوئیں سے آلودہ ہوتے ہیں ان میں سیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیتیں ان بچوں کے مقابلے میں کہیں کم ہوتی ہیں' جو صاف اور ہوادار ماحول میں رہتے ہیں۔

طبی جائزے کی رپورٹ میں لکھا گیا ہے کہ نتائج سے پتا چلتا ہے کہ بچوں کے نشوونما پانے والے دماغ کو فضائی آلودگی سے شدید خطرات لاحق ہو سکتے ہیں اور بچپن کے وسط تک نقصانات کا سلسلہ جاری رہ سکتا ہے۔ اس لیے اپنے بچوں کو صاف ستھرا اور کھلا ماحول دینے کی کوشش کی جائے۔

سفارش

گلاب چانڈیو کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں' پی ٹی وی دیکھنے والے آج بھی ان کو دیکھ رہے ہیں۔ گلاب چانڈیو کہتے ہیں کہ "میں اپنی زندگی کے پینتیس سال شوبز کو دے چکا ہوں لیکن مجھے اب تک پرائڈ آف پرفارمنس ایوارڈ نہیں دیا گیا (اس زیادتی کا شکار ہماری انڈسٹری کے بہت سے فنکار ہیں۔) گلاب چانڈیو کہتے ہیں کہ یہ ملک کا سب سے بڑا اعزاز اور ایوارڈ ہے اسے سفارش پر نہیں میرٹ پر دینا چاہیے (گلاب چانڈیو صاحب! آپ کو اب تک اندازہ نہیں ہوا کہ ایوارڈ میرٹ پر دیے جاتے ہیں یا___؟) میں 1980 سے اردو اور سندھی ڈراموں میں کام کر رہا ہوں میں نے فلمیں بھی کی ہیں اس کے باوجود میری حق تلفی کی گئی اور ہر حکومت نے مجھ سے جونیئرز کو ایوارڈ دیے۔

پروفیشنل

(چاند نو صاحب! یہ شکوہ تو زبان زد عام ہے کہ ـــــ)

مقدمہ

لبنانی گلوکارا "امل حجازی" بہت بہادر اور نڈر ہیں اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اس کمپنی پر ہی مقدمہ درج کر دیا جس کے ساتھ وہ کام کر رہی تھیں (ہائیں یعنی وہ شاخ ہی کاٹ ڈالی جس پر ـــــ) ہوا کچھ یوں کہ امل کا ایک میوزک کمپنی کے ساتھ معاہدہ ہوا کہ وہ ان کا ہر سال ایک نیا البم نیا ڈیو ریلیز کریں گے، لیکن امل کو ابھی تک صرف انتظار ہے اس کمپنی نے تاحال امل کا کوئی ویڈیو یا گانا ریلیز نہیں کیا۔ تو امل نے اس کمپنی کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ امل کا کہنا ہے کہ بہت جلد ان کا گانا اور ویڈیو ریلیز ہو گی۔ (بھئی یہ کام اب کون ـــــ کرے گا؟)

معاوضہ

لیجیے جناب خبر ہے کہ ہمایوں سعید نے جاوید شیخ اور بشریٰ انصاری کی مصروفیات کی وجہ سے ان کی شوٹنگ کا معاوضہ ایک لاکھ روپے یومیہ طے کر لیا ہے۔ (ہائیں کیا اب فنکار بھی ڈیلی ویجز پر دستیاب ہیں؟) خبر یہ ہے کہ بشریٰ انصاری اور جاوید شیخ کا ہمایوں سعید کی فلم جوانی پھر نہیں آنی میں معاوضہ طے نہ ہونے کی وجہ سے کام باقی تھا۔ اس لیے ان دونوں فنکاروں کو ایک لاکھ روپے روزانہ کے معاوضہ پر سائن کر لیا گیا ہے۔ (انکم ٹیکس والے! ہوشیار ہو جائیں ـــــ!)

کچھ اِدھر اُدھر سے

زرداری ہاؤس میں ہونے والے عشائیے میں انواع و اقسام کی 20 سے زیادہ ڈشوں کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جن میں بریانی، چکن اچاری، مٹن پالک، مختلف سبزیاں اور دالیں، فنگر فش باربی کیو، وائٹ چکن اور بریانی بھی تھی۔ وزیر اعظم کھانا کھائے بغیر رخصت ہو گئے تو ایک سیاسی راہنما نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ وزیر اعظم اگر زرداری ہاؤس میں نمک والی کوئی چیز نہیں کھانا چاہتے تو کم از کم سوئیٹ میں ہی کچھ لے لیتے اس معنی خیز تبصرے کو وہاں موجود لوگوں نے خوب انجوائے کیا۔ (اخبار جہاں)

آپ کا باورچی خانہ

حرا قریشی

محفل میں اس خیال سے پھر آگئے ہیں ہم شاید ہمیں نکال کر کچھ کھا رہے ہوں آپ!

1 - "جی ہاں!" باورچی خانہ "ایک ایسی جگہ جہاں انٹری دیتے ہی یا تو اشتہا انگیز خوشبوئیں آپ کا استقبال کریں گی یا جو فرد خاص کچن کے اندر قدم رنجا فرمائیں گے "کچھ کھانے کو ہے؟" پوچھنے کا تردد کیے بغیر بطور "غذا" جو ملے گا ہڑپ کر جائیں گے۔ جسے جو مل گیا پکا پکایا اور جس موصوف نے کرلیا ہضم' وہی جیت گیا اور وہی بن گیا سکندر! پھر جب بھوک' لگ رہی ہو تو کیا غذا؟ کیسی غذائیت؟ "ٹوٹ پڑو مجاہدو" کا نعرہ لگایے اور اگر کسی اور کا حصہ بھی کھا گئے ہوں تو بھاگنے میں وقت نہ لگایے! کہ ابا جی کی صلواتیں اور مما جی کی جوتی آپ کی منتظر بھی ہو سکتی ہے۔۔ کیا سمجھے! تو بھلا ایسی صورت حال میں بھی کیا انصاف کا علم لیے رکھیے۔۔؟ جس کی لاٹھی' اس کی بھینس کے مصداق پیٹ جناب کو خالی نہ رکھیے۔ (بجا فرمایا ناں؟)

2 - "مہمان۔۔۔ رحمت خداوندی! منہ بنائیں ہم۔۔؟ نہ جی توبہ کیجیے! جھوٹ بولا۔۔؟ ارے ایسا بھی نہیں! قادر مطلق بخشے ہماری قلب جاں اماں حضور کو جن کی بدولت اکثر ہی فریج نت نئے لوازمات کی زینت بنا رہتا تھا' سو کبھی مہمانوں کی آمد پر مشکل نہ ہوئی۔ بس فریج سے نکالا قیمے کا شاپر یا پھر شامی کباب کی ٹرے ۔۔۔ سب جھٹ پٹ تیار!

لیکن؟ آہ۔۔۔! اب "بابا" مہمانوں کے آنے پر ہی فوراً "کچھ نہ کچھ لے آتے ہیں جن میں رائس فرسٹ نمبر پر اور چکن کو تو آپ کبھی مت بھولیے گا۔ اور پھر ان سب کی تیاری کے ساتھ ساتھ حرا کی شامت خاص اور پریڈ بھی جاری رہے گی۔ (ارے بھئی ہنسنے مت۔۔۔ بھلا یوں بھی کوئی کرتا ہے!) چھوڑیے جناب اب تو عادت ہو گئی ہے۔ مہمان رائے دیں یا نہ' بابا کی رائے۔۔۔ اگر۔۔۔؟ اچھی ہو تو سیروں خون بڑھا دیتی ہے ۔۔۔! اگر کچھ گڑبڑ ہو جائے تو سسٹرز کے کلمات ۔۔۔ جانے کیا بنے گا اس لڑکی کا سسرال میں۔۔۔؟ اور ہم دل ہی دل میں ۔۔۔ خوش گماں' خوش امیدی کا دامن تھامے' جو بھی ہو گا اچھا ہو گا! (دل پر مت لے یار!)

چونکہ چکن "بابا" کا اور میرا فیوریٹ ہے' سو مہمانوں کے آنے پر یہ ڈش جلد بھی بنے گی اور اچھی بھی! داد بھی ملے گی اور آپ کی دعائیں تو حرا' کے ساتھ ہیں ہی (کوئی شک نہیں) چٹ پٹی مصالحے دار چکن آملیٹ کی ترکیب حاضر ہے!

چکن آملیٹ

اشیاء :

چکن بریسٹ	ایک عدد (چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ لیں)
نمک' سیاہ مرچ	حسب ذائقہ
تیل	ایک چائے کا چمچہ / ایک چوتھائی کپ
انڈے	تین عدد (پھینٹ لیں)
ہرا دھنیا	ایک کھانے کا چمچہ (باریک کٹا ہوا)
ہری مرچ	ایک عدد (کاٹ لیں)
ٹماٹر	ایک عدد (باریک کاٹ لیں)

ترکیب :

چکن میں نمک اور سیاہ مرچ ملائیں اور ایک چائے کا چمچہ آئل میں پکا کر ایک طرف رکھ دیں۔ پھینٹے ہوئے انڈوں میں نمک اور سیاہ مرچ کے علاوہ ہری مرچ اور ہرا دھنیا ملا کر مزید پھینٹ لیں۔ اس کے بعد

ایک چوتھائی کپ آئل' فرائنگ پین میں گرم کریں۔ پھر انڈوں کا آمیزہ پین میں پھیلالیں اس کے اوپر چکن اور ٹماٹر پھیلا کر ڈالیں اور ہلکی آنچ پر پکنے دیں۔ جب آملیٹ ایک جانب سے پک جائے تو پلٹ دیں' چند سیکنڈ تک دوسری طرف سے پکنے دیں۔ اس کی بعد احتیاط سے فولڈ کر کے پلیٹ میں نکال لیں۔

(آگیا ناں منہ میں پانی ؟خود بھی پکائیں اور حرا کو بھی کھلائیں۔۔۔ ہاہاہا!)

3 - کچن کی صفائی۔۔۔ ؟اور حرا کریں۔۔۔ کیا ہو گیا ہے بھئی' حرا ہی کرتی ہے صفائی' اب وہ۔۔۔ مت سمجھیے ہمیں! صاف جگہ پر تو کام کرنے میں مزا آتا

ہے اور کچن کی صفائی میں تو نصف نہیں' پورا ہی ایمان کا حصہ کرلیجیے زیادہ ثواب ملے گا۔ (سچ ہے بالکل!)

رخ روشن کے علاوہ فرش کچن بھی رونمائی دیتا ہے
سلیقہ ہو تو جناب من دکھائی دیتا ہے!
نہیں وہ مزا لاہوری شوارمے میں ہے
جو مزا صبح کے ناشتے میں ہے!

صبح کے ناشتے میں پراٹھوں کی کئی قسمیں وجود میں آ چکی ہیں۔ جو شوق سے کھائی بھی جاتی ہیں اور بنے بھی حرا کے ہاتھ کے پلے پتلے پراٹھے' تو لذت خصوصی ہوتی ہے۔

4۔ روایتی سادہ سے لوگ چائے پراٹھا اور آملیٹ بھی نوش فرمالیتے ہیں۔ کچھ نہیں تو سیب اور دودھ کا گلاس (ایک عدد) بھی چلتا ہے۔ لیکن بصد شوق خصوصی فرمائش کر کے پراٹھے ہی بنوائے جاتے ہیں۔ جن میں آلو کو بھی' مٹر قیمہ' آلو کے مکسڈ ویجی ٹیبل بھیا کے پراٹھے سرفہرست ہیں۔ "آلو کے قیمے بھرے پراٹھوں" کی ترکیب حاضر ہے۔

آلو کے قیمے بھرے پراٹھے

اشیا :

قیمہ	باریک ایک پاؤ
آلو	بڑے اور سفید آدھا کلو
بیسن	بھنا ہوا تین چمچے

ترکیب :

پہلے گھی میں آدھی پیاز کے لچھے کتر کر سرخ کر کے نکال لیں پھر لہسن کے چار' جوے' پیاز کی آدھی گٹھی' کالی مرچ' لونگ' الائچی' زیرہ' دھنیا' ادرک اور نمک حسب ضرورت ایک جگہ پیس لیں اور قیمہ کو گھی میں بھونیں اس کے بعد مسالہ ڈال کر بھونیں' پھر تھوڑا پانی ڈال کر پکائیں کہ قیمہ خوب گل جائے' لیکن خیال رہے قیمہ میں پانی نہیں رہنا چاہیے۔ اب اسے چولہے سے اتار کر ہرا دھنیا یا پودینہ تھوڑی سی ادرک اور ہری مرچ باریک کاٹ کر ملا دیں۔ اس مرکب کو الگ رکھ لیں' اسی میں پیاز کے تلے ہوئے لچھے بھی پیس کر ملا دیجیے۔ آلوؤں کو ابال لیں' پھر چھیل کر کچل لیں اس کے بعد اس میں بیسن ملا دیں۔ جی جناب! بھرتہ تیار ہے' اب اسے حسب مقدار لے کر آٹے کے چھوٹے چھوٹے پیڑوں کے درمیان میں رکھیں اور گول گول سرخ پراٹھے بنا لیجیے۔ (اگر مزا نہ آئے۔۔۔ تو پراٹھے ہمارے حصے کے بھی آپ کھالیں' ڈونٹ وری!)

5 - باہر تو شاذ و نادر ہی جانا ہوتا ہے ہاں گھر میں ہی اکثر مل کر سارے پارٹی ارینج کر لیتے ہیں پھر بہت مزا آتا ہے۔ (باہر جانا ویسے بھی حرا کو جانے کیوں وقت کا زیاں لگتا ہے ہو سکتا ہے شادی کے بعد تبدیلی آئے!)

6 - موسم ہو بارش کا تو گڑ کے چاول اور شلجم کے اچار کو بہت مس کرتے ہیں (والدہ بناتی تھیں) بیسن کا حلوہ' میٹھے گلگلے اور آلو کے چپس تو موسم کا مزا دوبالا کر دیتی ہیں۔ لیکن اب تو "بابا" پکوڑے بنواتے ہیں اور ساتھ املی کی چٹنی!

7 - محنت کے بغیر تو کوئی کام کاملیت کے درجے پر نہیں جاپاتا' کبھی کبھی چھوٹا بھائی موڈ میں ہو تو تجربے کرتا ہے اور کامیاب بھی ہوتا ہے۔ سموسے اور سینڈوچ بہت عمدہ اور مہارت سے بناتا ہے۔

لوکی کی بہار

خالدہ جیلانی

لوکی جسے گھیا بھی کہتے ہیں' موسم گرما کا خاص تحفہ ہے۔ قرآن مجید میں حضرت یونس علیہ السلام کے ذکر میں لکھا ہے کہ جب آپ مچھلی کے پیٹ سے نکلے تو اللہ تعالیٰ نے آپ پر بیل دار پودے (بعض روایات کے مطابق) لوکی کی بیل کا سایہ کردیا۔ لوکی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پسندیدہ ترکاری تھی۔ زیادہ تر لوگوں کو سبزیاں پسند نہیں ہوتیں' بچے بھی شوق سے نہیں کھاتے۔ گرمی کے موسم میں بہت اچھی لوکی آتی ہے۔ آج ہم آپ کو لوکی سے بنائے کھانوں کی ترکیبیں بتارہے ہیں۔ آپ یہ بنائیں' گھر میں سب شوق سے کھائیں گے۔

گرمی کا موسم ہو اور لوکی کا رائتہ نہ بنے ایسا ممکن ہی نہیں۔

لوکی کا رائتہ

اجزا:

لوکی	ایک پاؤ (کدوکش کی ہوئی)
لہسن' ادرک	ایک چائے کا چمچہ
لال کٹی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
نمک	چٹکی بھر
ہری مرچ	دو سے تین
زیرہ	ایک کھانے کا چمچہ
ثابت لال مرچ	چار سے پانچ

ترکیب:

لوکی کو چھیل کر کدوکش کرلیں اور اسے ابال لیں۔ جب لوکی گل جائے چھان کر پانی پھینک دیں' پھر دہی کو پھینٹ کر اس میں لوکی' لہسن ادرک' نمک' کٹی مرچ' ہری مرچیں کاٹ کر ملالیں' زیرہ' ثابت مرچ اور کڑی پتے کا اوپر سے بگھار دیں۔

لوکی کی بھجیا

اجزا:

لوکی	آدھا کلو
ٹماٹر' شملہ مرچ	دو' دو عدد
ہری مرچ	چار عدد
نمک' کٹی مرچ	حسب ذائقہ
زیرہ	ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب:

ایک پتیلی میں تیل گرم کرکے زیرہ ڈال دیں۔ پھر اس میں کٹی ہوئی لوکی ڈال کر ٹماٹر' نمک' کٹی مرچ' ہری مرچ ملالیں اور چمچہ چلادیں۔ جب لوکی گل جائے تو اس میں شملہ مرچ کاٹ کر ملادیں اور اسے ہلکی آنچ پر ڈھانپ کر دم پر رکھ دیں۔ پانچ منٹ کے بعد اسے سرونگ ڈش میں نکال کر ہرا دھنیا چھڑک کر نوش فرمائیں۔

لوکی کے کباب

اجزا:

لوکی	ڈیڑھ کلو
لال مرچ ثابت	دس عدد
سیاہ زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
انڈا	ایک عدد
ڈبل روٹی کے سلائس	چار عدد
چنے کی دال	ایک پیالی
دھنیا ثابت	ایک چائے کا چمچہ
ادرک	ایک چھوٹا سا ٹکڑا

تیل، گھی حسب ضرورت
پیاز (باریک کٹی ہوئی) دو عدد

ترکیب :

سب سے پہلے لوکی کو چھیل کر باریک کدوش کرلیں۔ پھر اپنے ہی پانی میں بھاپ دے کر خشک کرلیں۔ چنے کی دال میں لونگ چار عدد، کالی مرچ ثابت چھ عدد، لہسن کے جوے چھ عدد، نمک، ہری مرچ اور ادرک ڈال کر ہلکی آنچ میں پکنے کے لیے رکھ دیں۔ پانی اتنا ڈالیں کہ دال زیادہ نہ گل جائے، بکھری بکھری رہے، جب دال کا پانی خشک ہوجائے تو چاپر میں پیس لیں۔ بھاپ دی ہوئی لوکی کو چھلنی میں رکھ کر دبا دبا کر پانی خشک کرلیں۔ پھر پسی ہوئی دال میں ملائیں۔ انڈا اور سلائس کے چاروں کنارے کاٹ کر درمیان کا حصہ باریک چورا کرکے ملائیں۔ ہرا دھنیا اور پیاز ملا کر گوندھ لیں۔ آدھے گھنٹے بعد گول ٹکیہ بنا کر ہلکے تیل میں تل لیں۔

تلے ہوئے لوکی کے چھلکے

اجزا :

لوکی کے چھلکے	باریک کٹے ہوئے دو کپ
لیموں	ایک عدد
پسی لال مرچ، کالی مرچ	آدھا، آدھا چائے کا چمچہ
تیل	دو کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
ہری مرچ	دو عدد باریک کٹی ہوئی

ترکیب :

ایک فرائنگ پین میں تیل گرم کریں اور چھلکے ڈال دیں۔ جب چھلکے براؤن ہونے لگیں تو نمک، کالی مرچ، لال مرچ، ہری مرچ اور لیموں کا رس ڈال کر اچھی طرح سے بھون کر اتار لیں۔ سرونگ ڈش میں نکال کر ہرا دھنیا چھڑک کر نوش فرمائیں۔

لوکی کا حلوہ

اجزا :

لوکی	آدھا کلو
دودھ	ایک کلو
چینی	حسب ذائقہ
سبز الائچی	چار سے چھ عدد
گھی	حسب ضرورت

ترکیب :

لوکی چھیل کر کدوکش کرلیں، پھر دودھ میں ڈال کر پکالیں۔ جب دودھ خشک ہوجائے تو ایک دیگچی میں گھی گرم کرکے الائچی ڈال کر ساتھ ہی دودھ اور لوکی کا آمیزہ اس میں ڈال دیں۔ تھوڑی دیر تک بھون کر چینی ملا دیں۔ چینی کا پانی خشک ہوجائے تو اتار لیں اور دو قطرے کیوڑہ ڈال کر ڈش میں نکالیں اور چاندی کے ورق سے سجالیں۔ اس کے اوپر حسب پسند پستہ، بادام اور اخروٹ باریک کاٹ کر ڈال دیں۔ مزے دار لوکی کا حلوہ تیار ہے۔

گاجر کا حلوہ

ضروری اجزا :

گاجر	ایک کلو
دودھ	دو کلو
کھویا، چینی	ایک ایک پاؤ
میوہ	حسب پسند
گھی	حسب ضرورت

ترکیب :

گاجروں کو دھو کر چھیل لیں اور کدوکش کرلیں۔ پھر دودھ میں ڈال کر پکنے کے لیے رکھ دیں۔ جب دودھ خشک ہوجائے تو گھی ڈال کر اچھی طرح بھونیں۔ جب حلوہ گھی چھوڑ دے تو میوہ شامل کرلیں۔ ٹھنڈا ہونے پر کھویا شامل کردیں۔ گاجر کا حلوہ تیار ہے۔

عدنان

ف۔م

آپ شادی شدہ ہیں۔ زندگی میں کسی قسم کی کمی نہیں ہے۔ آپ نے خود لکھا ہے کہ شوہر پیار بھی کرتے ہیں۔ پھر بھی ایسی حرکت کا ارتکاب اور پھر اس حد تک آگے بڑھ جانا۔ آپ کے شوہر بہت اچھے انسان ہیں۔ اور آپ سے محبت بھی کرتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے آپ کو معاف کردیا لیکن جو کچھ انہوں نے دیکھا اسے بھولنا آسان نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب ان کے اور آپ کے درمیان پہلے جیسی بات نہیں رہی ہے۔ آپ اللہ کا شکر ادا کریں کہ شوہر نے آپ کو معاف کردیا۔ اپنا گھر اور نام آپ سے نہیں چھینا ورنہ آپ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتیں۔

اگر آپ یہ سمجھتی ہیں کہ ایک دم سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے گا تو یہ آپ کی خوش فہمی ہے' معاف کرنا الگ بات ہے اور بھول جانا دوسری بات۔ آپ کو صبر سے وقت گزرنے کا انتظار کرنا ہوگا' انہیں یقین دلانا ہوگا کہ آپ اپنی غلطی پر پشیمان ہیں تاکہ وقت کی گرد آہستہ آہستہ اسے دھندلا دے۔ لیکن ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ آپ ایک بار بڑی غلطی کرچکی ہیں۔ اب آپ کے پاس غلطی کی گنجائش نہیں ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ شوہر کے اکھڑے ہوئے رویے سے مایوس ہو کر آپ دوبارہ بے راہ روی کی طرف مائل ہو جائیں۔ آپ ——— وقت کا انتظار کریں' جب آپ کے شوہر سب بھول جائیں اور سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے لیکن یہ آپ کے آئندہ کے رویوں پر منحصر ہے۔ ازدواجی زندگی میں وفا اور سچائی بہت اہم ہے۔ عورت ہو یا مرد اپنے جیون ساتھی کو مکمل وفاداری اس رشتے کی مضبوطی کی ضامن ہے۔

صباحت۔ کراچی

آج سے دس سال پہلے جب ایم اے کی طالبہ تھی۔ ایک کلاس فیلو سے میری دوستی ہوئی اور اس دوستی نے بہت جلد محبت کی شکل اختیار کرلی۔ تعلیم مکمل ہوئی تو ہم دونوں نے شادی کا فیصلہ کیا۔ لیکن ہم دونوں کے ہی گھر والوں نے اس فیصلہ کی مخالفت کی' وجہ صرف ایک تھی ہم دونوں کے عقائد مختلف تھے۔ شادی کا پہلا سال تو بہت اچھا گزرا۔ ان کے گھر والوں نے انہیں معاف کردیا۔ ہم چونکہ کرایہ کے گھر میں رہتے تھے۔ ان کے والد کا گھر بہت بڑا تھا۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے ساتھ آکر رہو۔ میرے شوہر نے مجھ سے پوچھا۔ میں تھوڑی سی متذبذب تھی' لیکن ان کی مرضی دیکھتے ہوئے خاموشی اختیار کی۔ میرے تذبذب کی وجہ ان کے گھر کا ماحول تھا جہاں ان کے عقائد کے مطابق عمل ہوتا تھا۔ جو میرے عقائد سے متصادم تھا۔

ہم سسرال میں منتقل ہو گئے۔ مجھے قدم قدم پر جھٹکا لگتا۔ کچھ باتیں میرے لیے ناقابل برداشت تھیں۔ میں احتجاج کرتی تو بحث چھڑ جاتی جو ہمیشہ مزید بدمزگی پر ختم ہوتی۔ میرے شوہر بھی ساس نندوں کی حمایت کرتے۔ اس دوران ہمارے دو بچے ہو چکے تھے۔ شادی کے وقت ہم نے بچوں کے بارے میں سوچا ہی نہ تھا۔ اب بچے بڑے ہو رہے ہیں۔ وہ بچوں کے ذہن میں اپنے عقائد ٹھونس رہے ہیں' جو میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔ بچوں کے متعلق سوچتی ہوں تو دماغ پھٹنے لگتا ہے۔ اب کیا کروں۔ واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے اور میرے لیے اب ایک

ایک پل مشکل ہو رہا ہے۔ محبت تو نہیں پیچھے رہ گئی ہے، مجھے رہ رہ کر پچھتاوا ہوتا ہے کہ یہ میں نے کیا کیا۔ اپنی آخرت کو بھول کر دنیا کو ہی سب کچھ سمجھ لیا۔

ج : اچھی بہن! آپ کا طویل خط پڑھا۔ ظاہر ہے پورا خط شائع کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔ خط میں جو باتیں آپ نے لکھی ہیں۔ وہ واقعی ناقابل برداشت ہیں۔ انہیں سننا اور خاموش رہنا واقعی مشکل ہے۔ لیکن یہ

بھی حقیقت ہے کہ آپ کو یہ باتیں پہلے بھی معلوم تھیں آپ کو یہ فیصلہ کرتے ہوئے یہ ساری باتیں سوچنا چاہیے تھیں عقیدہ انسان کی رگوں میں خون کی طرح ہوتا ہے۔ اسے بدلنا آسان نہیں ہوتا۔

جس طرح آپ اپنا عقیدہ نہیں بدل سکتیں، آپ کے شوہر کے لیے یہ آسان نہیں ہوگا۔ جوانی میں ہوش کے بجائے جوش زیادہ ہوتا ہے اس وقت بہت کم لوگ عقل سے کام لیتے ہیں اور اس طرح کی غلطیاں کر بیٹھتے ہیں۔ عقائد مختلف ہوں تو کبھی بھی شادی نہیں کرنا چاہیے۔ اس طرح کی شادیاں بہت کم کامیاب ہوتی ہیں۔ اگر درمیان کا کوئی راستہ ہو تو نکالنے کی کوشش کریں کیونکہ علیحدگی کی صورت میں بھی ضروری نہیں ہے کہ وہ بچے آسانی سے آپ کو دے گا۔ آپ تعلیم یافتہ ہیں نوکری کرکے گزارہ کر سکتی ہیں لیکن کیا بچوں کے بغیر رہ پائیں گی؟ بہتر یہ ہے کہ آپ اپنے والدین سے اس کے متعلق مشورہ کریں۔

ملیحہ۔ راولپنڈی

ہم دو بہنیں، تین بھائی ہیں۔ بہن سب سے بڑی ہیں۔ اس کے بعد دو بھائی پھر میرا نمبر ہے، ہمارے گھر میں شروع سے ہی بڑی بہن کو اہمیت حاصل رہی ہے۔ بہن کو پڑھائی سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی انہوں نے میٹرک کے بعد تعلیم کا سلسلہ ختم کر دیا۔ میں شروع سے ہی پڑھائی میں اچھی تھی۔ میٹرک کے بعد آگے پڑھنا چاہا تو بہن نے مخالفت کی اور مجھے کالج میں داخلہ لینے نہیں دیا۔ بہانہ بنایا کہ ان کو اکیلے گھر سنبھالنے میں دقت ہوتی ہے۔ دراصل چھوٹے بھائی کی پیدائش کے بعد امی بیمار رہنے لگی تھیں، بہن نے گھر سنبھالا تو انہوں نے تھوڑا بہت جو کام کرتی تھیں اسے چھوڑ کر بستر سنبھال لیا۔ ابو اور بھائیوں نے بھی ان کی تائید کی۔ نتیجہ یہ کہ میں کالج میں ایڈمیشن نہ لے سکی۔ مجھے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ میری دوستیں جو پڑھ رہی تھیں، میں نے ان سے رابطہ رکھا اور ان کی مدد سے انٹر کا امتحان دیا اور پاس بھی ہو گئی۔ اس سے میرا حوصلہ بڑھا اور آگے پڑھائی کا سلسلہ جاری رکھا بی اے کے امتحان میں کامیابی کے بعد گھر میں سب نے میری بہت تعریف کی اور ابو بھی بہت خوش ہوئے۔ اس کے بعد سے بہن کا موڈ خراب رہنے لگا۔ وہ بات بات پر جھگڑتی ہیں۔ گھر میں کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاتیں۔ اب نیا مسئلہ یہ ہوا کہ میری دوست اپنے بھائی کا رشتہ لے کر آئی ہے۔ اس کا بھائی تعلیم یافتہ ہے۔ اچھی جاب ہے، لیکن بہن نے طوفان کھڑا کر دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ میں نے کوئی چکر چلایا ہے، جبکہ میرا اس میں کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ بہن آئے دن بیمار رہنے لگی ہیں۔ امی، ابو پریشان ہیں۔ ابو چاہتے ہیں کہ رشتہ کر دیا جائے، لیکن امی کہتی ہیں کہ پہلے بڑی بہن کی شادی ہوگی۔

ج : اچھی بہن! کبھی کبھی حالات ایسا رخ اختیار کر جاتے ہیں کہ کوئی خطا نہ ہوتے ہوئے بھی انسان مجرم بن جاتا ہے۔ آپ کی بڑی بہن کو پہلا بچہ ہونے کے سبب گھر میں شروع سے ہی اہمیت ملی گھر سنبھالا تو یہ اہمیت مزید بڑھ گئی۔ گھر کے تمام معاملات ان کے ہاتھ میں آ گئے۔ آپ تعلیم میں ان سے آگے نکل گئیں پھر رشتہ آنے سے ان کے جذبات کو مزید ٹھیس لگی۔

اگر رشتہ اچھا ہے تو آپ کے والدین کو آپ کا رشتہ کر دینا چاہیے اور کوشش کی جائے کہ آپ کی شادی سے پہلے بہن کا رشتہ ہو جائے۔

آمنہ شیخ۔۔۔ کوئٹہ

س :۔ میرے گالوں پر سرخ نشانات ہیں اور ماتھے اور گال دونوں پر چھوٹے چھوٹے دانے بھی ہیں۔ جب میں گالوں پر بیٹنو ویٹ لگاتی ہوں تو سرخ نشانات ختم ہو جاتے ہیں، لیکن ایک دو دن بعد پھر وہی نشانات نظر آنے لگتے ہیں۔ اس کے لیے مجھے کوئی ٹوٹکا بتائیں جو میں آسانی سے گھر پر کر سکوں۔

ج : آمنہ! لگتا ہے آپ کو کسی قسم کی الرجی ہے۔ بہتر ہو گا کہ آپ ڈاکٹر کو دکھالیں۔ چہرے پر دانے مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ بغیر دیکھے اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ البتہ ایک بات بے حد ضروری ہے کہ صاف شفاف چمک دار جلد کے لیے سب سے ضروری چیز چہرے کو صاف رکھنا ہے۔ اچھی قسم کا فیس واش یا صابن استعمال کریں۔ کلینزنگ ملک لگائیں، دوسری اہم بات یہ ہے کہ اپنے معدہ کا خیال رکھیں۔ قبض نہ ہونے دیں۔ چٹنی، تلی ہوئی بیکری کی اشیا اور مٹھائیوں کا استعمال کم کریں۔

ساجدہ اقبال۔۔۔۔ کراچی

س :۔ میری عمر تیس سال ہے، لیکن میرا چہرہ بہت مرجھایا ہوا، بے رونق نظر آتا ہے۔ بالوں میں چمک نہیں ہے۔ رنگ صاف ہے لیکن منہ دھونے کے بعد بھی چہرہ میلا میلا سا لگتا ہے بظاہر صحت ٹھیک ہے۔ ڈاکٹر کو دکھا چکی ہوں۔ سب ٹھیک ہے۔ اس نے کچھ وٹامن کی ٹیبلیٹ اور سیرپ دیے۔ انہیں استعمال کیا لیکن کوئی فرق نہیں پڑا۔

ج : آپ نے دوائیں استعمال کیں کوئی فرق نہیں پڑا، اب تھوڑی سی توجہ غذا پر بھی دے کر دیکھ لیں۔ ان شاء اللہ آپ فرق محسوس کریں گی۔

کچھ غذائیں ہمیں ذہنی تناؤ اور تھکاوٹ سے محفوظ رکھتی ہیں۔ ان میں سے ایک دہی کا استعمال بھی ہے۔ اپنے دوپہر کے کھانے میں دہی ضرور استعمال کریں اگر دہی کی پتلی سی لسی بنالیں تو یہ زیادہ زود ہضم اور مفید ہو جائے گا۔ دہی بہترین غذا ہے اس میں موجود پروٹین دماغ کے نیورو ہارمونز کو بڑھا دیتے ہیں جس سے تھکے ہوئے اعصاب کو سکون ملتا ہے، رات کو سونے سے پہلے ایک گلاس گرم دودھ پئیں، اس سے آپ کو پرسکون نیند آئے گی اور صبح خود کو تر و تازہ اور ہشاش بشاش محسوس کریں گی۔ اپنے کھانے میں موسمی اور رس دار پھل ضرور شامل کریں آج کل سیب کا موسم ہے۔ روزانہ ایک یا دو سیب کھائیں۔ چند دنوں میں کینو آنے لگیں۔ یہ وٹامن سی کا خزانہ ہے۔ کینو روزانہ کھائیں۔ کیلا تو ہر موسم میں ملتا ہے اسے آپ اپنی خوراک کا حصہ بنالیں۔

آپ خود کو تھکا تھکا سا محسوس کرتی ہیں۔ اس کے لیے ایک بہترین نسخہ ہے۔ روزانہ رات کو تین بادام پانی میں بھگو دیں۔ صبح ان کا چھلکا اتار کر کھالیں۔ آپ کو دن بھر توانائی کا احساس ہو گا یہ آزمودہ ہے اپنے چہرے پر موئسچرائزر ضرور لگائیں۔ سردی کے موسم میں روزانہ زیتون یا بادام کے تیل سے مساج کریں آپ کا چہرہ دمکنے لگے گا۔

شہد، لیموں اور انڈے کی سفیدی برابر مقدار میں لے کر اچھی طرح مکس کرلیں۔ اسے چہرے پر لگائیں اور بیس منٹ بعد چہرہ دھولیں۔

☆